معروف اور مقبول قلم کار

طاہر جاوید مغل

کی نئی سلسلے وار کہانی

انگارے

جولائی ۲۰۱۵ء سے

جاسوسی ڈائجسٹ

میں پیش کی جارہی ہے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی

جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر

خود کو مجبور پائیں گے

جلد 25 ❖ شمارہ 07 ❖ جولائی 2015ء

ماہنامہ کراچی
شعاع

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد عثمان خان	0333-2168391
	راشد محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی بخش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ گزشتہ کئی سال سے دشمنانِ وطن نے ملکِ عزیز کو مقتل بنا رکھا تھا۔ ہر قریہ ہر شہر سے تواتر کے ساتھ خبریں ملنے لگی تھیں۔ اربابِ اقتدار پریشان، عوام حراساں، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یکا یک یہ کیسا طوفان آ گیا ہے۔ یکا یک نفرت کی اتنی تیز آندھی کیسے شروع ہو گئی ہے۔ سب اپنی اپنی سوچ میں غلطاں تھے کہ ملک کے حقیقی محافظ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ضربِ عضب کی چوٹ سے دشمنانِ وطن تلملا اٹھے۔ ان دہشت پسندوں پر قابو کے بعد اب ان محافظوں نے اپنا دائرہ وسیع کیا اور معصوموں کے خون کی ہولی کھیلنے والوں کے علاوہ دوسری اور تیسری قسم کے دہشت گردوں پر بھی کڑے تیوروں کے ساتھ نظر ڈالی ہے تو اب ان کی صفوں میں گھبراہٹ اور ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ معاشرے کے دشمنوں میں کس کس کی باری آنے والی ہے یہ تو وقت بتائے گا۔ ہم عوام تو فقط اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ملک ترقی کرے، استحکام حاصل کرے اور امن وسکون کا ماحول قائم رہے، بقول شفیع اللہ خاں راز

وقت کا فیصلہ ضروری ہے
مجرموں کو سزا ضروری ہے
بند دروازے کھولیے صاحب
گھر میں تازہ ہوا ضروری ہے

معراج رسول

باکمال

سرگزشت

14 اپریل 1893ء کو عروس البلاد دہلی میں اس نے آنکھ کھولی۔ یہ شہر برصغیر کے قلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے یہاں امرا کی تعداد زیادہ تھی۔ خود اس کے گھرانے کا شمار شہر کے شرفا میں ہوتا تھا۔ اس کے دادا حاجی محمد ابراہیم ایک خوش بیان شاعر تھے۔ اپنے زمانے کے اچھے ادیب مانے جاتے تھے۔ بہت سی کتب کے مصنف تھے مگر انگریز اور انگریزی سے حد درجہ نفرت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے بھی ان ''لال منہ'' والوں سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہند ہمارا ہے۔ ہم نے تقریباً ایک ہزار سال تک اس ہند پر حکمرانی کی ہے اور اب یہ اس پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس صغیر سنی میں بھی وہ اپنی نفرت کا اظہار فی الفور کردیا کرتا تھا۔ اسی دوران کی بات ہے۔ ان دنوں وہ تیسری جماعت میں تھا اس دن جب وہ مدرسہ کے لیے نکلا۔ اس کا مدرسہ کچھ دوری پر تھا، چاندنی چوک کے قلب میں، مدرسہ جانے کے لیے اسے کمپنی باغ سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ راستے میں گھنٹا گھر بھی تھا۔ گھنٹا گھر کے بالمقابل ٹاؤن ہال تھا اور اس کے دروازے کے نزدیک ایک سنگی چبوترے پر ملکہ وکٹوریہ کا بت تھا۔ اس روز جب وہ صبح صبح مدرسے کے لیے نکلا تو گھنٹا گھر کے سامنے پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ وہاں اور بھی لوگ جمع تھے لیکن ان سب کے چہرے خوف سے زرد تھے۔ ہوا یہ تھا کہ رات کے اندھیرے میں کسی دل جلے نے ٹوٹی جوتیوں کا ہار بنا کر ملکہ وکٹوریہ کے گلے میں پہنا دیا تھا۔ اسے ہنستے دیکھ کر کسی ایک نے ڈانٹا اور اسے وہاں سے بھگا دیا کیوں کہ پولیس آنے والی تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر یہی سمجھا جاتا کہ یہ کام اسی کا ہے۔ اس دن وہ سارا دن اسی منظر کو یاد کر کے لطف لیتا رہا۔ انگریزوں کے لیے اس کے دل میں چھپی نفرت کا یہ اظہار تھا۔ یہ نفرت وقت کے ساتھ بڑھتی ہی رہی۔ جب اس نے عملی زندگی کی شروعات کیں تو اس کے دل میں پنپ رہی نفرت مزید بڑھ چکی تھی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو اسے بچپن ہی سے تھا۔ ہمہ وقت وہ کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی اس کے ہاتھ میں کتاب ہوتی۔ داہنے ہاتھ سے نوالہ اٹھا رہا ہوتا اور بائیں ہاتھ میں کتاب ہوتی۔ گھر والے ٹوکتے تو وہ گھڑی بھر کے لیے کتاب رکھ دیتا پھر جیسے ہی موقع ملتا وہ مطالعہ شروع کردیتا۔ ایک دن وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ مولوی سید وحیدالدین سلیم (لٹریری اسسٹنٹ سرسید) نے اسے آواز دی۔ ایک اجنبی کا بلانا اسے حیرت زدہ کر گیا۔ وہ رک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ مولوی وحید نے اسے قریب بلا کر نام پتا پوچھا پھر بولے۔ ''میاں مجھے قیافہ شناسی کا شوق ہے۔ میرا علم کہتا ہے کہ ایسے چہرے والے کامیاب مصنف کامیاب ادیب بنتے ہیں میرے پاس میرے مکان پر آیا کرو۔ میں تمہیں مضمون نگاری سکھاؤں گا۔ میرا دعویٰ ہے کہ تم ایک بہت بڑے مشہور انشا پرداز بن جاؤ گے۔ اس نے مولوی سلیم سے کہا مگر میں تو کسی سے کچھ سیکھتا سکھاتا ہی نہیں۔ اگر مضمون نگاری آنا ہوسکتی تو خود ہی آجائے گی۔ آنے والے وقت نے بتا دیا کہ واقعی اس کا کہا سچ ہے۔ اس نے خود ہی کوشش کر کے ایسا لکھنا شروع کیا جو ہر ایک کے دل پر اثر کرتا۔ اس کی تحریر دیکھ کر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے فرمائش کی کہ ان کے نصاب کے لیے کچھ لکھو۔ اس نے 1914ء میں لوریاں اور پہیلیاں لکھیں۔ ملازمت کا وقت آیا تو اس نے پہلی ملازمت حالی مسلم ہائی اسکول میں کی پھر وہاں سے وکٹوریہ میموریل لائبریری میں لائبریرین بن گیا۔ پھر مولانا حالی کی لائبریری میں لائبریرین بنا۔ 1918ء میں اس نے اپنی لائبریری قائم کی اور اس کا نام ''اورینٹل پبلک لائبریری'' رکھا۔ 1924ء میں اس نے پانی پت سے جام جہاں نما کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالا۔ جس کا نام مولوی وحیدالدین سلیم کے مشورے پر کائنات کردیا۔ حالی مسلم ہائی اسکول کی طرف سے ایک ادبی ماہنامہ مشعل نکالا۔ پھر وہ جھنگ آگیا اور یہاں سے ہفت روزہ عروج نکالا۔ 1930ء میں لاہور سے رہنمائے تعلیم جاری کرایا۔ ملک تقسیم ہوا تو ستمبر 1947ء کو وہ لاہور آگیا۔ فسادات نے تمام قیمتی مسودات، عظیم الشان لائبریری، پرانے اخبارات کا ریکارڈ سب کچھ چھین لیا جس کا قلق اسے زندگی بھر رہا۔ اس باکمال ادیب کا نام شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ہے۔

☆☆☆

شہرِ خیال

☆ مجید احمد جائی نے ملتان سے لکھا ہے۔ ''ماہ رمضان کی مبارک اور پیشگی عیدالفطر کی مبارک باد۔ ٹائیٹل دیدہ زیب تھا۔ ہم واقعی سست ہیں۔ اپنی خطاؤں، گناہوں کا الزام دوسروں کو ٹھہرا دیتے ہیں۔ حکمران بھی تو ہم نے چنے ہیں۔ 1947ء سے آج تک پاکستان کی حالت ویسی کی ویسی ہے۔ بھوک ناچ رہی ہے۔ پانی سے انسان وحیوان مر رہے ہیں۔ خوف وہراس ہر سو پھیلا ہوا ہے۔ خونریزی، قتل وغارت وہی منظر پیش کر رہی ہے جو پاکستان وجود میں آنے کے وقت تھی۔ سڑکیں خون سے نہا رہی ہیں۔ شہر سنسان ویران ہیں۔ ہر چہرہ اداسی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ قصور صرف اور صرف اپنا ہے۔ آج بھی ہر بندہ اپنی جگہ رہتے ہوئے انصاف کرنے لگ جائے تو قسمت بدل سکتی ہے۔ پاکستان بدل سکتا ہے۔ دہشت گردی امن میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ ملک ترقی کرسکتا ہے۔ ہر شہری سکون اور آزادی سے رہ سکتا ہے۔ شکارِ طبیب والس متھائس کے بارے میں پڑھ کر حیران رہ گئے۔ اے کاش ان کی انگلی نہ ٹوٹتی تو؟ جو خدا کو منظور۔ ''شہرِ خیال'' میں اعجاز حسین سٹھار صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ مبارکاں جی۔ نجمی رحمان، سلمٰی غزل، محمد احمد رضا انصاری، اعجاز احمد راحیل مختصر خیال پیش کررہے تھے۔ سدرہ بانو ناگوری، احمد خان توحیدی، فقیر غلام حسین چنا، رانا محمد شاہد، ملک جاوید، محمد خان سرکانی، اویس شیخ خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ محمد سلیم قیصر، رب رحمان آپ کو جیل کی مشکلات سے رہائی عطا فرمائے، آمین۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا آپ نے مجھ سے خط وکتابت کی تھی۔ ہے ناں......؟ عبدالجبار رومی انصاری، منشی محمد عزیز مئے، سید انور عباس شاہ آپ کے الفاظ مجھ ناچیز تک پہنچ گئے۔ خط کی پسندیدگی کا شکریہ۔ طاہرہ گلزار آپ نے بھائی کہا۔ میرا دو کلو خون بڑھ گیا، شاہد جہانگیر شاہد آپ کیسے ہیں؟ میرا ذکر ''شہرِ خیال'' میں کیا۔ رانا محمد شاہد! والدہ کا خلا کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔ بس خود کو سنبھالیں۔ رب رحمان آپ کو اور سبھی مسلمانوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ سچ بیانی میں قدم نکلے تو ''تیسرا اسبق'' سب سے پہلے پڑھی۔ فہیم نوید کے ساتھ بہت برا ہوا۔ نازیہ کے باپ نے دھوکا دیا۔ ضروری نہیں کہ چہرے سے معصوم نظر آنے والے معصوم ہی ہوں، اکثر معصوم چہرے ہی دھوکا دے جاتے ہیں۔ زبردست سچ بیانی تھی۔ اس کے بعد سرورق کی کہانی ''نادانیاں'' بھلی لگی۔ ''راکھ'' سعید احمد، ''صحیح طریقہ'' شریف الدین، ''بھکاری'' حسن رزاقی، ''لمس'' ثوبیہ، ''جل پری'' فائزہ، ''بے ثمر مسافت'' زویا اعجاز، ''وفا گزیدہ'' نے تو کمال ہی کردیا۔ سبھی ایک سے ایک بڑھ کر ایک تھیں۔ مبارکاں۔ ''ماہ جون'' تذکرہ خاص پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ رفیع خاور جسے ہم ننھا کے نام سے جانتے تھے۔ ان کی فلمیں اور الف نون دیکھ کر دل لوٹ پوٹ سا جاتا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ اللہ جنت نصیب فرمائے، آمین۔ ماہ جون میں پیدا ہونے والی ہستیاں، شخصیت کامیاب وکامران زندگی گزار گئیں۔ ''پودے'' منظر امام نے ہمیں حیران کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ ان کے قلم میں ایسا جادو ہے کہ بندہ تحریر میں ڈوب جاتا ہے۔ ''ایور گرین'' بالی ووڈ کے فنکار کے حالاتِ زندگی جان کر خوشی ہوئی۔ ''کیسے کیسے لوگ'' شیراز خان نے مشہور افراد کا ذکر کرکے کمال کردیا۔ معلومات کا ذخیرہ تھا۔ ''رنگون کا سفر'' پڑھ کر اسی میں کھوئے رہے۔ گمنام جاسوس، شق القلب، المونڑہ کا آدم خور پڑھ کر لرزہ طاری ہوگیا۔ اُف توبہ۔ امیرِ ملت، ڈاکٹر ساجد امجد پڑھ کر دل منور کیا۔ اللہ تعالیٰ کے ولی باعمل لوگوں کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ''سراب'' ابھی پڑھنی باقی ہے۔ ''شک'' محمد ایاز راہی نے خوب قلم کے ساتھ انصاف کیا۔ بے شک، شک زندگیوں کو تباہ وبرباد کردیتا ہے۔ شک کی آگ رشتوں کے گھر کو جلا کر بھسم کردیتی ہے۔ جب سے سرگزشت کی محفل میں آیا ہوں ماہ جون کے پرچے کو شاندار پایا۔ یوں تو ہر پرچہ بڑھ کر ہوتا ہے مگر جون کے سرگزشت نے کمال کردیا۔ یہ سب لکھاریوں اور آپ کی محنتوں کا ثمر ہے۔ اُمید ہے یہ سفر جاری وساری رہے گا۔ (کہانی پھولوں والی قبر میں کافی سقم ہے معذرت)۔''

☆ رانا محمد شاہد کی بورے والا سے حاضری۔ ''معراج رسول صاحب کا اداریہ ہماری اقتصادی تنزلی بیان کررہا تھا۔ چین،

جاپان، جرمنی، ملائیشیا، سنگاپور جیسے ممالک نے سائنس و ٹیکنالوجی میں محنت کی اور خوب ترقی کی جب کہ ہمارے ہاں یہی ترقی کرپشن میں ہوئی۔ بے روزگاری و افلاس میں ہوئی۔ درج بالا ممالک یونیورسٹیز و کالجز بناتے رہے جب کہ ہم صرف باتیں کرتے رہے۔ جہاں قابلیت نے سر اٹھانا چاہا تو اسے کچل دیا گیا۔ ابن الہیثم ایک ایسا مسلمان سائنسداں تھا جس پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ آج دنیا میں ہر سال 70 لاکھ لوگ اندھے پن کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ ابن الہیثم تھے جنھوں نے 1021ء میں دنیا کو بتایا کہ اندھے پن کی 90 فیصد وجہ قرینہ ہوتا ہے۔ ہم قرینے کی سائنس کو کھو بیٹھیں تو اندھا پن چلا جائے گا۔ چند ہفتے پہلے چین کے ایک سائنس داں نے مصنوعی قرینہ ایجاد کرلیا۔ یہ ایک ایسی انقلابی ایجاد ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ اب دنیا کے 50 فیصد اندھوں کی بینائی لوٹ آئے گی۔ ابوعلی الحسن بن حسین ابن الہیثم نے دو سو عظیم ایجادات کی بنیاد رکھی تھی اور آج کی سائنس و ریسرچ اس عظیم سائنسداں کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کے کیا کیا کارنامے تھے اور آج ہم خود کن تنزلیوں کا شکار ہیں۔ ہمارے اسلاف نے انسانیت کی بھلائی کے لیے کیا کچھ کیا اور آج ہم آنے والے انسانوں کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ اگر ہم دوسروں کی تحقیق کے سہارے ہی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو پھر ہم ترقی یافتہ ملک کیسے بن سکتے ہیں؟ ڈاکٹروں کی غفلت کے کیس ہم آئے روز اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں۔ افسوس ایک اچھے کرکٹر کا مستقبل ڈاکٹروں کی غفلت کی نذر ہو گیا مگر اپنی اچھی کارکردگی کی بدولت والس متھائس نے اپنا نام پاکستانی کرکٹ میں درج کروالیا۔ اعجاز حسین سٹھار کی رائٹرز کے تعارف والی تجویز اچھی لگی۔ عمل ہونا چاہیے۔ مجی رحمٰن ہر انسان اپنے میں یکتا ہے۔ 19 ویں صدی کے مشاہیر ہوں یا بیسویں کے، سبھی کو اللہ تعالیٰ نے علم و ذہانت کی دولت عطا کی تھی۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس بندے سے جو کام لینا ہوتا ہے وہ لے لیتا ہے۔ اب یہ بندہ ہے کہ جسے اپنی قسمت پر رشک کرنا چاہیے کہ اس کے رب نے اسے کتنے عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا۔ سدرہ بانو ناگوری! صحیح کہا آپ نے کائنات کی ہر شے فانی ہے اور باقی رہ جانے والی ذات تو صرف رب کریم کی ہے۔ جانے والے چلے گئے اور کسی دن ہم بھی چلے جائیں گے، رہے نام اللہ کا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! اللہ تعالیٰ آپ کی اہلیہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ، آپ کے بچوں کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ عبدالجبار انصاری! ماں کیا ہے؟ دو ہستیوں کو معلوم ہے کہ ماں کیا ہے؟ ایک ماں کو بنانے والا اور دوسرا ماں بننے والی۔ منشی محمد عزیز مئے! دعاؤں کے لیے آپ کا مشکور ہوں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے۔ دنیا سے جانے والے کے لیے سب سے بہترین تحفہ دعا ہی ہوتی ہے اور ہماری دعا ہے کہ آج تک جتنے مسلمان اپنے رب کے حضور پہنچے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ والدہ کے لیے جن افراد نے دعا کی ان سب کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ منظر امام، سلیم الحق فاروقی اور شیراز خان کی تحریریں نہ صرف معلوماتی تھیں بلکہ انفرادیت بھی رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد اور شبیر بلوچ نے مجاہد ملت اور صوفی بزرگ کی روشن اور اجلی زندگیوں کے حوالے سے بہت خوب صورت لکھا۔ ان بزرگوں کی زندگیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ عید آرہی ہے۔ ماں کے بغیر عید بھی کیا عید ہے۔ ماں کی عظمت و جاہت کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔“

☆ **عبدالحمید جانی** بہاولپور سے لکھتے ہیں۔ ”میں تہہ دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ جناب معراج رسول صاحب اور سرگزشت کے دیگر لکھاریوں کو صحت کاملہ عطا کرے، آمین۔ میرا پسندیدہ سرگزشت اپنے وقت پر ملا اور ورق گردانی کرنے لگا کہ میری نظر ”ایور گرین“ پر ٹھہر گئی۔ مجھے فوراً آفاقی صاحب (مرحوم) یاد آگئے۔ ان کو مرحوم لکھنا کچھ عجیب سا لگا کیوں کہ وہ ہم سب کے دلوں میں زندہ جاوید ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ میں آپ سب کو رمضان المبارک کی آمد پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور سب کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس نیک اور بابرکت مہینے کی بدولت ہمارے ملکِ پاکستان کی حفاظت فرمائے، آمین۔“

☆ **محمد سلیم قیصر** سینٹرل جیل ملتان سے رقمطراز ہیں۔ ”حالتِ غم اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ میں سانحہ صفورا گوٹھ اور سانحہ مستونگ کی مذمت اور افسوس کرتا ہوں۔ اللہ اپنے پاس بلانے والوں کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ ورثاء کو غم برداشت کرنے کی ہمت، حوصلہ اور صبر عطا فرمائے۔ اللہ ہمارے ملک کو دہشت گردوں کے ناسور سے پاک فرمائے اور ارض پاک کو قائم و دائم رکھے، آمین۔ حسب سابق ماہ کے ابتدائی ایام میں دیدار شمارہ تاخیر سے ہوتا ہے۔ اس بار بھی کچھ ایسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔ شمارہ مئی کے لیے کاوش جو لکھ بھیجی تھی اس کا تذکرہ تاخیر سے ملے خطوط میں بھی نہ تھا۔ یہ تو نوازش جناب رانا محمد سجاد، جناب سید انور عباس شاہ، جناب مجید جانی، جناب شاہد جہانگیر اور پیاری بہن محترمہ بشریٰ افضل کا جنھوں نے محبت کا ثبوت دیتے ہوئے بندہ ناچیز کا نام تحریروں میں لکھ ڈالا۔ جیتے رہو۔ یقین کیجیے آپ کی یہ محبت کال کوٹھڑی میں رسوا ہوتی میری بے نور زندگی کے لیے ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوتی ہے۔ اپیل کروں گا کہ کشیدہ صورتِ حال اور نازک حالات میں سلیم کے زندہ رہنے اور غم سے نجات پانے کی دعائیں ضرور کیجیے گا۔ محسن صاحب کے اس خوب صورت شعر کے ساتھ آگے بڑھوں گا بقول محسن ”خزاؤں میں ہوتا ہے وفاؤں کا امتحان محسن۔ جو شجر کو پیارے ہوں وہ پتے نہیں گرتے“ میری پیاری ہر دل عزیز گل باجی کو بالکل بھی اچھا نہیں لگتا کہ کسی تحریر میں ان کا نام نہ ہو لیکن انہوں نے خود مجھ سے میرا حال تک پوچھا اور نہ میرا نام لکھنے کی زحمت کی۔ جناب منشی عزیز کے ساتھ ساتھ چند دیگر معززین کو گویا میرا نام لکھنا نہیں آتا۔ ہمیشہ جیو اور سلامت رہو۔ میں تو آپ سب کے لیے یہی کہوں گا۔ آئی لو اینڈ مس یو۔ سرگزشت اور آپ سب پیارے قارئین میری زندگی میں وجہ تسکین ہیں۔ ہو سکے تو محض طفل تسلی کے لیے مجھے یاد کرنا اور رکھنا گوارہ کیجیے

گا۔ شمارہ مئی میں مریم کے خان کی انقلابی، منظر امام کا کمپل اور محمد عارف محمودی کی تحریر حقیقت، پسند آئی جب کہ باقی تحریریں اپنا مزہ لیے تھیں۔ اشعار میں انیس احمد ملتان کا شعر پسند آیا۔ آخر میں محترمہ طاہرہ گلزار، محترمہ ڈاکٹر قرۃ العین، محترمہ سدرہ بانو ناگوری، محترمہ بشریٰ افضل، محترمہ آصفہ ضیا، محترمہ شگفتہ مشتاق اور جناب احمد رضا توحیدی، سید انور عباس شاہ، اویس شیخ، رانا محمد سجاد، احمد رضا انصاری، قیصر خان، ایم انور، اعجاز سحار، مجید احمد جائی، منشی عزیز مئے، ناصر حسین رند، فیروز علی عاجز، عبدالجبار رومی، رانا محمد شاہد، ملک عاشق حسین، فیض بخش، احمد تبریز، فرحت اللہ نیازی و دیگر معزز قارئین کو ادب سے السلام علیکم!۔"

☆ محمد احمد رضا انصاری کا مکتوب کوٹ ادھو سے۔ "ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ اس مہینے تو سرگزشت 30 تاریخ کو ہی مارکیٹ میں آ گیا تھا۔ سب سے پہلے "شہر خیال" میں پہنچے۔ اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اعجاز حسین کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ عبدالجبار رومی انصاری، طاہرہ گلزار، سید انور عباس، مجید احمد جائی اور دیگر قارئین کے تبصرے اچھے لگے۔ "سراب" کی یہ قسط بہت سسپنس فل تھی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ امیر ملت، پودے، ماہ جون، کیسے کیسے لوگ معلومات سے بھرپور تحریریں تھیں۔ جب کہ گمنام جاسوس، المونڑہ کا آدم خور، رنگون کا سفر، مست توکلی بھی خوب تھیں۔ اُمید ہے آپ آیندہ بھی سرگزشت میں اچھی اچھی تحریریں شائع کرتے رہیں گے۔ "نادانیاں" ایک نصیحت آموز سچ بیانی تھی۔ "بے ثمر مسافت" ایک عبرت انگیز تحریر تھی۔ جب کہ "جل پری" پڑھ کر بہت حیرت ہوئی۔ "صحیح طریقہ" کچھ خاص نہ تھی۔ دوسری سچ بیانیوں میں راکھ، بھکاری، لس، تیسرا سبق اور وفا گزیدہ اچھی لگیں اور اب آخر میں سرگزشت کے قارئین اور اسٹاف کو ماہ رمضان مبارک ہو۔"

☆ منظر علی خاں کا خلوص نامہ لاہور سے۔ "جون کا شمارہ زیرِ نظر ہے۔ معلوماتی اور انتہائی دلچسپ ہے۔ سچ بیانیوں میں "نادانیاں" سبق آموز ہے۔ شرعی طور پر ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے اگرچہ اپنی بیوی اور محرم ہی کیوں نہ ہو۔ "راکھ" سگریٹ یا کسی نشے کی بھی کیوں نہ ہو بالآخر انسان کو راکھ بنا دیتی ہے۔ بچوں کو بری صحبت اور سگریٹ نوشی سے بچانا اور کڑی نگاہ رکھنا نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ "صحیح طریقہ" درست طریقہ کار نہیں ہے۔ ارتکاز توجہ اور یکسوئی کے مقاصد حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آفتاب بینی، ماہتاب بینی، شمع بینی، سایہ بینی وغیرہ کی مشقوں کا مذاق اڑایا جائے۔ دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے ارتکاز ضروری ہے۔ یکسوئی کے بغیر دنیاوی کام بھی آؤٹ پٹ نہیں دے سکتے اور عبادات میں بھی بلاتمیز مذہب و ملت یکسوئی ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مظاہر پرستی اور محدودیت لازوالی ولامکانی حقیقت کبریٰ سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔ بھکاری، لس، جل پری میں سے خصوصاً جل پری پسند آئی۔ سمندر دو تہائی رقبہ پر ہے۔ اس میں زندگی کے کئی رنگ پوشیدہ ہیں اور انسان اتنی ترقی کے باوجود سمندر کے اسرار سے آگاہی حاصل نہیں کر پایا۔ "وفا گزیدہ" بہت پسند آئی۔ "تیسرا سبق" پہلی بار ہی سبق حاصل کر لیا جائے تو نتیجہ مثبت نکلتا ہے مگر دھوکا اور وہ بھی پولیس والے شخص کو کچھ عجیب سا لگا۔ "سراب" اچھی جا رہی ہے۔ دلچسپ ہے مگر ایک ہی دائرے میں گھوم رہی ہے کہ وسعتِ نظر بہت ضروری ہے۔ پودے، ماہ جون معلومات افزا ہے۔ "المونڑہ کا آدم خور" شکاریات پر مبنی دلچسپ تحریر ہے۔ "ایور گرین" معیار پر پوری نہیں اتری تاہم انور فرہاد صاحب اچھے لکھاری ہیں۔ "رنگون کی سیر" نے معلومات میں اضافہ کیا۔ رسالہ دیر سے ملتا ہے۔ تبصرہ بغیر پڑھے ممکن نہیں۔"

☆ قیصر خان بھکر سے لکھتے ہیں۔ "السلام علیکم شہرِ خیال کے باسیو کو میرا سلام۔ پیارے دوست آفتاب اشرفی کی شریکِ حیات کے بچھڑ جانے پر دلی افسوس۔ اللہ تعالیٰ آفتاب صاحب کو صبر جمیل عطا کرے۔ پہلے بھی ہمارے دوست رانا محمد شاہد کی والدہ کا صدمہ ہم سب کو تھا اور اب ہمارے دوست آفتاب صاحب کی زوجہ کا بچھڑ جانے کا صدمہ، اللہ تعالیٰ دونوں کو جنت میں اعلیٰ مقام دے (آمین)۔ شاہد جہانگیر صاحب کی واپسی اور صحت یابی خوشی کی نوید ہے۔ پیارے انکل جی شکریہ کی کیا بات ہے ہم دعا گو ہیں آپ کی سلامتی کے لیے۔ حاجی اعجاز صاحب کرسی صدارت پر تھے اور بہت خوب صورت تبصرہ تھا۔ مبارک باد حاجی صاحب۔ مجی رحمان صاحبہ ثانی قائداعظم ناممکن ہے۔ سلمٰی غزل صاحبہ اللہ کرے آپ اپنے بیٹوں کے ہمراہ خوش رہیں (آمین)۔ خوب صورت تبصرہ کے ساتھ سدرہ بانو ناگوری بھی حاضر تھیں۔ اللہ تعالیٰ خوش رکھے (آمین)۔ محمد سلیم قیصر صاحب سرگزشت کی تعریف اور شہرِ خیال کے ساتھیوں کو یاد کر کے حاضر تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات دور کرے، (آمین) احمد خان توحیدی اپنے آبائی گھر میں ہیں لیکن تبصرہ اور منشی عزیز صاحب کے علاقے سے گزرتے ہوئے سلام نہیں بھولے۔ ویلڈن جناب امید ہے عزیز صاحب تک آپ کی آواز نہ پہنچی ہو لیکن محبت بھرا اسلام پہنچا ضرور ہوگا۔ آپ کی یک مٹھی والی تجویز میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بھکر سے قیصر غلام حسین ضیا صاحب مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ آپ کی طرح ہم بھی ابن کبیر کے دیوانے ہیں۔ اعجاز حمید راحیل صاحب اللہ کرے آگے کوئی مشکل نہ آئے آپ پر۔ رومی صاحب حکومت اگر کام کرے تو مسائل کا حل ہونا مشکل نہیں۔ منشی محمد عزیز کی طرح ہم بھی ڈاکٹر روبینہ نفیس اور ڈاکٹر قرۃ العین کی خیریت مطلوب چاہتے ہیں اللہ کرے ٹھیک سلامت ہوں۔ "شہرِ خیال" میں نوک جھوک والا کرارا تبصرہ لکھنے والی گل باجی میری آپا طاہرہ گلزار صاحبہ حاضر تھیں۔ تبصرہ تھا بس پڑھتے گئے خوشی بڑھتی گئی۔ آپا جان آپ کی بچی بات سے کسی کو تکلیف نہیں ہوتی۔ آپ کا اندازہ غلط ہے۔ اللہ گستاخی معاف اور جون کے پرچے میں "راکھ" کہانی پڑھ کر رائے ضرور دیں ہم انتظار کریں گے آپ کو سلامت رکھے، (آمین)۔

میری پسندیدہ تبصرہ نگار ہیں آپ، میرے ضلع بھکر کی بہترین شخصیت سید انور عباس شاہ اپنی طرح جامع تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے اور ساتھ ٹیلی کیو نیکیشن سے بہت نالاں تھے، اس ٹیلی فون موبائل کمپنیوں نے ناک پر دم کیا ہوا ہے۔ شاہ جی آپ سے ملاقات شاید کبھی ہو خدا آپ کو سلامت رکھے، (آمین)۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی صاحب آپ پریشان نہ ہوں۔ اتنا مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ اویس شیخ صاحب چین سے دوستی کے حق میں تھے، ہماری دعا ہے تمام منصوبے کامیاب ہوں پہلی کہانی ''نادانیاں'' بہت بے وقوف سی اور اسلام سے دوری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ''راکھ'' عورت صنف نازک جنس کی خطرناک اور بھیانک روپ کی کہانی ہے۔ ''بھکاری'' ایک دولت پرست اور حق سے دور رہنے والا کبھی صحیح راستے پر نہ آسکا۔ زاہدہ کو اللہ صبر دے وہ ایک عظیم عورت ہیں۔ ''بے ثمر مسافت'' زویا اعجاز صاحبہ بہت دردناک کہانی لے کر آئیں واقعی غرور اور انا انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی اور والدین سے دھوکا اور پھر خود کو قابل سمجھنا لے ڈوبا اور اب والی زندگی بہت دردناک ہے۔ اللہ مشکل آسان کرے۔ عمیر جیسے کردار ناسور ہیں۔ ''وفا گزیدہ'' سچے رشتے کی کہانی دنیا میں ماں سے زیادہ سچی محبت کا رشتہ کوئی نہیں ہے۔''

☆ انور عباس شاہ کا خلوص نامہ دریا خان بھکر سے۔ ''جون کا شمارہ پہنچ چکا ہے۔ واقعی ترقی کے میدان میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہم ترقی کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ ہمارے حکمران مختلف طریقوں سے غریب عوام کو لوٹ رہے ہیں۔ دہشت گردی، غنڈہ گردی ہمارے ملک میں عام ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب وہی شخص زندہ رہے گا جس کے پاس دھن دولت ہو یا پھر سیاسی طاقت، غریب عوام بے بسی کی تصویر بنے رہیں گے۔ رمضان شروع ہو چکا ہے اب مہنگائی یقیناً رنگ دکھلائے گی۔ اعجاز حسین سحار بھائی کرسی صدارت مبارک ہو۔ خوب تبصرہ تھا۔ نجمی رحمان بہت دور سے تشریف لائیں خوش آمدید بہن۔ مختصر سے خط میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ سلمٰی غزل دیار غیر میں بھی جا کر حاضری دیتی رہیں، شکریہ۔ محمد سلیم قیصر بھی حاضر تھے خدا آپ پر اپنی رحمتوں کی برسات عطا فرمائے۔ بھائی آفتاب احمد نصیر اشرفی آپ کی اہلیہ کی وفات کا پڑھ کر ہمیں دلی طور پر دکھ ہوا۔ رانا محمد شاہد آپ کی والدہ ماجدہ کے لیے رب العزت کے حضور ہم ایک دفعہ پھر دعا گو ہیں کہ آپ کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ اس کے علاوہ عبدالجبار انصاری، منشی محمد عزیز مے، طاہرہ گلزار، اویس شیخ اور شاہد جہانگیر شاہد کے خطوط بھرپور تھے۔ قیصر عباس خان اس دفعہ محفل میں شامل نہیں تھے۔ شہنشاہ شہر خیال رانا محمد سجاد اس دفعہ بلیک لسٹ ہو گئے۔ باقی قارئین کے خطوط اور تبصرے بھی خوب اور دلچسپ تھے۔ ''تیر اسبق'' ایک بہترین کاوش تھی۔ موصوف جیسے ہمدرد نیک اور رحمدل انسان کے ساتھ بھی ان لوگوں نے دھوکا کیا حالانکہ ایسے انسان قابل ستائش ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے زیادتی کی خدا کے ہاں ان کو کڑی سزا ملے گی۔ ''نادانیاں'' کچھ نادان سی تحریر تھی۔ بظاہر ان تمام وجوہات کا اصل ذمہ دار تاقب جا ٹھہرتا ہے۔ نہ وہ اس قسم کی الٹی سیدھی فرمائش کرتا اور نہ اس قسم کی نوبت آتی۔ اللہ تعالیٰ تمام بہن بھائیوں کے پردے سلامت رکھے، آمین۔ شک ایک سبق آموز تحریر تھی۔ انسان کو اس قسم کے شک و شبہات سے دور رہنا چاہیے۔ شک انسان کے دل و دماغ میں زہر گھول دیتا ہے۔ اس کا انجام بہت بھیانک ہوتا ہے جیسا کہ اس کہانی میں ہوا۔ ''کیسے کیسے لوگ'' میں بہت ہی مشہور ہستیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ ان نامور ہستیوں کے مختصر حالات اور دلچسپ عادات خوب سے خوب تر تھیں۔ ایکشن پر مبنی تحریر ''سراب'' تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ ''پودے'' ایک بہترین کاوش تھی۔ دنیا جہان کے پودوں کے متعلق کافی دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں۔ ان میں سے بعض پودوں کو تو ہم جانتے تک نہ تھے اس تحریر سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ روحانی تحریر ''مست توکلی'' بھی ایک بے نظیر تحریر تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ''اسیر ملت'' بار بار پڑھنے کے لائق تحریر تھی۔ ماہ جون کے اہم واقعات اور شخصیات کے حوالے سے تحریر خاصی دلچسپ تھی اس دفعہ کچھ اہم شخصیات زیادہ تھیں۔ ''جل پری'' ایک پُراسرار تحریر تھی خاص طور پر ہمیں تو بہت اچھی لگی کیوں کہ ہم ایسی پُراسرار اور سچی کہانیاں پڑھنے کے شوقین ہیں۔''

☆ فیروز علی عاجز کی گل آباد جگی ضلع چارسدہ سے آمد۔ ''شکار طبیب'' پڑھا تو اپنا واقعہ یاد آیا کہ ڈاکٹر کی غفلت کی وجہ سے میری زندگی برباد ہو گئی اور سلسلہ تعلیم ادھورا رہ گیا۔ ڈاکٹر نے بندہ عاجز کو ایکسپائر انجکشن لگایا جس کی وجہ سے میرا وجود خراب ہو گیا اور پھر پشاور کے حیات خان شیر پاؤ اسپتال میں تین ماہ زیر علاج رہا اور چوبیس آپریشن کرائے۔ اب بھی ایک پاؤں میں فرق ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے اور سب لوگوں کی دعائیں ہیں کہ اب میں بالکل فٹ ہوں۔ اب آتے ہیں 'معمر خیال' میں اعجاز حسین سحار کو صدارت کی کرسی پر براجمان پایا۔ بھائی کرسی صدارت مبارک ہو۔ مجید احمد جائی صاحب کا خط بھرپور تھا۔ مجید صاحب آپ کی بات ٹھیک ہے۔ جعلی ادویات اور انجکشن کی وجہ سے بہت لوگوں کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مجھے ہی لے لیں۔ عبدالجبار رومی انصاری آپ کو خوش آمدید۔ آپ کے خطوط تو میں سسپنس ڈائجسٹ میں بھی پڑھتا ہوں۔ طاہرہ گلزار بہن! آپ کیسی ہیں؟ اپنے اس چھوٹے بھائی کو دعا میں ضرور یاد رکھا کرو۔ سید انور عباس شاہ کا خط بہت خوب صورت الفاظ کی چناؤ سے مزین تھا۔ نجمی رحمان، سلمٰی غزل، سدرہ بانو ناگوری، محمد سلیم قیصر، احمد خان توحیدی، فقیر غلام حسین ضیا، محمد احمد رضا انصاری، اعجاز احمد راحیل، آفتاب احمد، منشی محمد عزیز مے، رانا محمد شاہد، ملک جاوید محمد خان، اویس شیخ، شاہد جہانگیر شاہد سب کے خطوط بہت ہی پیارے تھے۔''

☆ اعجاز حسین سحار نے نور پور تھل سے لکھا ہے۔ ''جون کا گرم ترین مہینا بھی ہلکی پھلکی بارشوں کی وجہ سے ٹھنڈا ٹھار ہو گیا ہے۔

ایسے آئیڈیل موسم میں سرگزشت کی آمد نے لطف دوبالا کر دیا ہے۔ خود کو مسند صدارت پر فائز دیکھ کر خوشی ہوئی اور سچی بات ہے اگر محض خط شاملِ اشاعت ہو جائے تو وہ خوشی اس سے بڑھ کر ہوتی ہے، یوں دوستوں سے روبرو ملاقات کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے جن قارئین نے میرے تبصرہ کو سراہا ہے ان کا شکریہ۔ اللہ اس محفل کو شاد و آباد رکھے، آمین۔ ''پودے'' کافی تحقیق اور جستجو کے بعد ہمارے ذوق طبع اور معلومات میں اضافے کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ منظر امام صاحب ہمارے لیے ایسے تحفے لاتے ہیں وہ لمبی زندگی جئیں تاکہ ہماری دل بستگی کا سامان ہوتا رہے۔ ''شقی القلب'' نے ہمارے دہشت گردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے لیکن وہ جلد گرفت میں آ کر اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ ''ماہ جون'' کے حوالے سے مختلف تاریخ میں اپنا نام زندہ چھوڑ جانے والی شخصیات کا تذکرہ بھی دل کو بھایا۔ کافی سال پہلے کی بات ہے مجھے آیت اللہ خمینی کی قبر پر جانے اور فاتحہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ کئی ایکڑ کھلے ایریا کے درمیان قبر تھی اور اوپر اتنا کھلا ہال تعمیر ہو رہا تھا جس کا مجھے اندازہ بھی نہیں رہا کہ اس کی لمبائی چوڑائی کتنی تھی۔ ''کیسے کیسے لوگ'' میں کتنی حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ پاکستانی تو کیا کوئی مسلمان نہیں ہے۔ ''المورہ کا آدم خور'' نے واقعی خون گرم کر دیا ہے اور یہ سب آسان دکھائی دینے لگا ہے کہ ایسی مہم ہم بھی سر کر سکتے ہیں لیکن منصوبے ترتیب دینے اور عملی میدان میں کودنے میں کتنا فرق ہے۔ سب جانتے ہیں اور آخر میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ایسے سنسنی خیز واقعات پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔ ''نادانیاں'' دراصل دونوں میاں بیوی کی محبت اور والہانہ وارفتگی کی کہانی ہے جسے ناتجربہ کاری کا شاخسانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ زبیدہ اور ثاقب کو سخت سست کہنے اور سمجھانے کا وقت گزر چکا ہے۔ احتجاج کرنے کا کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ البتہ دوسرے جوڑوں کے لیے آئینہ ہے، وہ اسلامی روایات سے روگردانی کریں گے تو اس سے بھی برے پھنسیں گے۔ ''راکھ'' پرانے دور کا عکس ہے اب تو نوجوان سگریٹ پیتے ہوئے چٹکی مار کر بڑے اسٹائل سے راکھ جھاڑتے ہیں جیسے یہ کوئی قابلِ فخر کام ہو۔ سعد یہ بھابی جتنا خطرناک کھیل کھیل رہی تھیں اس سے ہٹ کر خوشی کی خبر یہ ہے کہ سعید اس کے اخلاقی گراوٹ کے ہتھکنڈوں سے بچ گئے۔ وہ نشے کی عادت سے پیچھا چھڑا لیتے لیکن بدنامی کی جو کالک بھابی سے ملنے والی تھی وہ کسی صورت دور نہ ہو سکتی اور مستقبل تباہ ہو جاتا اور بھابی جس تباہی کا شکار ہوئی ہوگی اس کے کرتوتوں اور نیت کے تناظر میں سوچ کی تختی پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ''صحیح طریقہ'' منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے مناسب کہانی ہے۔ مسلمان کو ''بھکاری'' اپنوں نے کہا ہے۔ دراصل یہ القاب اسے دیارِ غیر سے ملنا چاہیے تھا۔ ''ولس'' میں فروزاں کا اعتبار نہ کیا جائے بلکہ کسی قابل ڈاکٹر کی رائے لی جائے اور والدین کی مجبوریوں کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ انہیں معاشرے اور شریکہ برادری میں رہنا ہوتا ہے اور دیہات میں رہنے والی کوئی ایسی نازک بات پر تبادلہ خیال کر ہی نہیں سکتے۔ اس مسئلے کے کئی حل پیش کیے جا سکتے ہیں جس کی طوالت کا یہ کالم متحمل نہیں ہو سکتا اور شاید کچھ اخلاقی پہلو بھی نظریں چراتا نظر آ رہا ہے لہٰذا اس قصے کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ''جل پری'' عجیب اور حیرت انگیز کہانی ہے۔ اس مخلوق کے متعلق کسی مستند عالم یا اسلامی اسکالر کی رائے ضروری ہے جو حتمی ہونی چاہیے اور اس موضوع کو کسی ایک کنارے لگایا جائے تاکہ ہمیشہ کے لیے ابہام دور ہو جائیں۔ رزاق شاہد حاضری لگواتے رہنا، ہمیں انتظار رہے گا۔''

☆ عمران نقشبندی کا پیغام راولپنڈی سے۔ ''پنجاب میں خواتین کو ہراساں کرنے سے روکنے کے لیے قانون نافذ ہونے جا رہا ہے۔ لڑکے لڑکیاں رویوں پر دھیان دیں۔ یہ آپ کا اعلیٰ درجے کا رسالہ ہے کہ جس میں شروع سے آخر تک صرف حقیقت ہی بتائی جاتی ہے۔ یہ سب اسی معاشرے کے سچ ہیں جو کوئی اور سامنے نہیں لاتا۔ ماہ جون کا رسالہ پڑھا جس میں ''جل پری'' کے عنوان سے چھٹی سچ بیانی میں ایک انجانی حقیقت آشکار کی گئی ہے۔ جب کہ ''ولس'' کے عنوان سے پانچویں سچ بیانی میں فروزاں کا قصہ ابھی ادھورا ہے اگر اس کی دوبارہ شادی نہیں ہوئی یا ابھی علاج ہو رہا ہو اس طرح کے کیسز میں ایک آپشن ''مریم ثانی'' بننا ہے یعنی سرپرستی ہونا اور اولاد ہونا۔''

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا مکتوبِ خاص پشاور سے۔ ''فکر انگیز اداریہ نظر نواز ہوا۔ اس بار بھی ایک سلگتے ہوئے موضوع کا احاطہ کیا ہے اور وطنِ عزیز کی ترقی معکوس کا ذکر ہے۔ جس ملک کے اداروں کو کرپشن کا پانی پلا پلا کر پروان چڑھایا گیا ہے، جس کے باشندے کبھی ایک قوم نہ بن سکے بلکہ صرف عوام بن کر رہ گئے ہوں جس ملک میں تعلیم اور صحت کا انتہائی غیر معیاری نظام رائج ہو جہاں میٹرک جیسے بنیادی اور اہم امتحان کو نقل کے ذریعے پاس کیا جاتا ہو جو کہ آئندہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا پہلا دروازہ ہوتا ہے۔ اس دروازے کو نقل کی چابی سے کھولا جاتا ہو۔ وہاں سے علم و آگہی کی بجائے جہالت کے سوتے ہی تو پھوٹیں گے اور اپنی محنت سے علم حاصل کرنے والوں کی حق تلفی الگ ہوگی۔ میڈیا قوم کے آئندہ کے معماروں کے نقل کے نت نئے کارنامے ہر روز دکھاتا رہا۔ خاص طور پر صوبہ سندھ کے دیہی اور شہری علاقوں کے امتحانی مراکز میں جو کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن حکومتِ سندھ اس کھلے جرم پر آنکھیں بند کیے خواب خرگوش کے مزے لیتی رہتی ہے۔ باقی صوبوں کا بھی حال کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اب آتے ہیں جون کے تازہ شمارے کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ''امیرِ ملت'' میں ڈاکٹر صاحب نے حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی جدوجہد کا ایمان افروز تذکرہ کیا ہے جو کہ بہت خوب ہے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کے رفقا کا بہت بڑا احسان ہے۔ ''مست توکلی'' بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں پرورش پانے والے

عشقِ حقیقی کی ایک مختصر اور پُر اثر کہانی ہے۔ منظر امام صاحب کی تحقیق ''پودے'' ایک معلوماتی تحریر ہے جس سے جڑی روایات بھی بڑی دلچسپ ہیں۔ ماہِ جون کی مناسبت سے سلیم الحق فاروقی نے مختصر مختصر خاکوں میں بہت بڑی بڑی شخصیات کو یکجا کیا ہے، بہت خوب۔ انور فرہاد بہت اچھے جا رہے ہیں۔ ان کی تحریر ''ایور گرین'' سپر اسٹار دیو آنند کے حالاتِ زندگی بہت خوب صورت انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ حاجی صاحب اعجاز حسین سٹھار آپ کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ آپ کی دعاؤں کے لیے مشکور ہوں۔ رانا محمد شاہد والدہ کے بغیر گھر قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ اللہ آپ کو صبر اور آپ کی والدہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے آمین۔ طاہرہ گلزار آپ نے درست فرمایا کہ اللہ نے مجھے نئی زندگی عطا فرمائی ہے۔ سدرہ بانو ناگوری، احمد خان توحیدی، مجید احمد جائی، منشی عزیز مئے، جاوید خان سرکانی، رانا محمد شاہد، عبدالجبار رومی انصاری، سید انور عباس شاہ، وحید ریاست، شوکت رحمٰن خٹک اور دیگر قارئین سرگزشت میں آپ سب کا بے حد مشکور ہوں۔ میری نئی زندگی آپ سب کی دعاؤں کا قرض ہے جو مجھے اپنے خلوص سے ادا کرنا ہوگا۔''

☆ ناصر حسین رند کا مکتوب بہاولپور سے۔ ''اس مہینے خط لکھنے کی وجہ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین کہانی ''جل پری'' بنی۔ کیا شاہکار کہانی ہے۔ واقعی دنیا میں ایسا کچھ ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ محترمہ فائزہ کے یہ الفاظ کہ وہ (جل پری) اس قدر حسین تھی کہ اس کا حسن پاگل بنا دینے والا تھا کہ کاش اگر میں مرد ہوتی تو اس سے شادی کر لیتی۔ یہ تو ایک عورت کے خیالات تھے اگر اس خوب صورت بلا کو ہم جیسا کوئی مرد دیکھ لیتا تو شاید وہ اپنے حواس کھو دیتا۔ بلکہ راہی عدم ہو جاتا۔ دوسری کہانی ''وفا گزیدہ'' پڑھ کر خوب انجوائے کیا۔ اس میں سبق بھی تھا اولاد کے لیے۔ کامیڈی، رومانٹک، ایکشن سب کچھ تھا۔ کیا خوب کہانی تھی۔ آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ پُراسراریت نمبر کی کامیابی کے بعد حیرت انگیز نمبر یا ناقابلِ یقین نمبر نکالیں اور کاش ان دونوں کہانیوں کو ایسے کسی نمبر کے لیے رکھ لیتے تو کیا خوب ہوتا۔ محترم اعجاز حسین سٹھار سلور جوبلی نمبر کے لیے تجویز دے رہے تھے جس کی ہم بھرپور تائید کرتے ہیں۔ سدرہ بانو ناگوری آہ بھرتی نظر آئیں۔ احمد خان توحیدی بھی حاضر تھے۔ مجید احمد جائی ویلکم۔ ''شہرِ خیال'' کے پرانے ساتھی آفتاب احمد نصیر کی اہلیہ کا سن کر انتہائی افسوس ہوا محترم تہہ دل سے دعا گو ہوں کہ رب العزت آپ کی اہلیہ کو اپنی خاص رحمت میں جگہ دیں اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائیں، آمین۔ منشی عزیز مئے پچھلے مہینے آپ ہماری غیر حاضری سے پریشان ہوئے۔ دل کی گہرائی سے آپ کی محبت کی قدر کرتے ہیں، شکریہ۔ رانا محمد شاہد آپ کے خط سے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ ابھی تک اپنی والدہ کے غم سے باہر نہیں نکل سکے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ماں کے بغیر گھر قبرستان ہے۔ آپی طاہرہ گلزار آپ کو ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھا ہے۔ سید انور عباس کا خط بھی خوب تھا۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی آپ کا خط دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ ویسے جناب اتنے مہینوں سے کہاں غائب تھے۔ وحید ریاست بھٹی کی غیر حاضری ذرا طویل ہو گئی ہے۔ بشریٰ افضل شاہد گریزن پارک میں گم ہو گئی ہیں اور آخر میں سہیل احمد عباس یار وقتاً فوقتاً حاضری لگوا لیا کرو دل پریشان ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد صاحب سے گزارش ہے کہ آپ کا مقام کسی مسلک سے بہت اونچا ہے اپنے اوپر کسی خاص طبقے کی چھاپ نہ لگائیں۔ ہر کسی کے لیے اپنے دل میں مقام پیدا کریں۔ کبھی حضرت احمد رضا خان بریلوی پر بھی لکھ دیں، شکریہ۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیا بھکر سے مرقوم ہیں۔ ''جناب معراج رسول صاحب آپ کا بہت شکریہ آپ نے اس قوم کو جگانے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک غلامی کے نشے میں مدہوش ہے۔ ہم ابھی آزاد نہیں ہوئے بڑی طاقتوں کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ قرض مل جاتا ہے تو کچھ پیٹ بھر جاتا ہے۔ ''امیرِ ملت'' ایک ولی کامل کا زندگی نامہ ہر مسلمان کو پڑھنا چاہیے۔ ہمارے اسلاف نے آزادی، انگریز سے بڑی قربانیوں سے حاصل کی ہے۔ ہم کہاں کھڑے ہیں ذرا سوچیں۔ ''شک'' محمد ایاز راہی صاحب کی تحریر ہے۔ شک کی بنا پر گولی ماری گئی اور بندہ ناجائز محبت کی وجہ سے مارا گیا۔ ''سراب'' کاشف زبیر صاحب کی لاجواب تحریر ہر ماہ نیا رنگ دکھلاتی ہے مگر اب زبیر صاحب کچھ تھکے تھکے لگتے ہیں۔ ''نادانیاں'' زبیدہ صاحبہ نے کینیڈا سے سچ بیانی بھیجی ہے۔ یہ تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ بیوی کٹھ پتلی کی طرح اپنے خاوند کے اشاروں پر ناچتی رہی یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کر۔۔۔ شرمائیں یہود۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ''اداریہ پڑھا انکل معراج رسول نے جاپان اور جرمنی کی ترقی کا ذکر کیا۔ یہ سچ ہے کہ ان ممالک کی کامیابی میں ان کی محنت اور خلوص کا بڑا دخل ہے۔ جبھی تو ان کی مثالیں فخر سے دی جاتی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ہر سو نفرتوں کے درخت لگا رکھے ہیں۔ اچھائیاں تو دور کی بات ہم نے تو برائیوں کی مثالوں کے انبار لگا رکھے ہیں۔ وطنِ عزیز کا بیڑہ غرق کرنے والوں نے اسے بڑے برے حالوں میں پہنچا دیا ہے۔ دوسرے ملکوں کی نظروں میں اس کا امیج اس کا چہرہ مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ اجالے بانٹ دینے سے اجالے کم نہیں ہوتے۔ ''شہرِ خیال'' کی صدارت اعجاز حسین سٹھار کے حصے میں آئی، مبارک باد۔ مجی رحمان کے خیالات کا اظہار اچھا لگا۔ بھائی سلیم قیصر آپ کے سلیقے سے لکھے گئے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقدیر نے آپ کو بڑی غلط جگہ پر پہنچا دیا ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کی تمام مشکلات کو آسان فرمائے۔ اویس شیخ درست فرمایا سب یہاں لوٹ کھسوٹ اور اپنی جیبوں کو بھرنے میں لگے ہیں اگر ہمارے حکمران اچھے ہوتے تو فکر کس بات کی تھی۔ طاہرہ گلزار آپا اس بار آپ کے خط میں میرا نام نہیں تھا آپ اپنے دانا دشمن سے ناراض ہو گئیں مگر میرے خط میں

اور میری دعاؤں میں ہمیشہ آپ کا نام رہے گا۔ رانا شاہد بھائی خدا آپ کے لیے صبر اور آپ کی والدہ کے لیے اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ ابتدائی صفحات پر ''امیرِ ملت'' کے ساتھ ڈاکٹر ساجد امجد چھائے رہے۔ بہت خوب ڈاکٹر صاحب ویلڈن آپ جو بھی لکھتے ہیں کمال لکھتے ہیں۔ واقعی یہ فن تو کوئی آپ ہی سے سیکھے۔ ''پودے'' منظر امام خوب صورت اور نایاب پودوں کا ذکر خاص لے کر آئے اور سرگزشت کے صفحات پر خوشبو بکھیر گئے۔ سلیم الحق فاروقی کا تحفہ خاص ''ماہ جون'' پسند آیا۔ ''گم نام جاسوس'' کی جاسوسی اچھی لگی۔ ابن عقار رنگون کی سیر میں رنگینیاں نظر نہیں آئیں۔ ہاں رنگون کی سیر کا عنوان پڑھ کر ایک بہت پرانا گانا گنگنانے کو جی چاہا مگر اسی قریب ہی بیٹھی تھیں سو دل ہی دل میں گنگنا کر خواہش پوری کی بھی وہی گانا جس میں ٹیلی فون کا ذکر خیر ہے۔ انور فرہاد نے دیو آنند کا تذکرہ اچھے لفظوں میں کیا ہمیں ان کی تحریر کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ جو جیسا کر کے جائے گا اسی طرح یاد رکھا جائے گا۔ ''کیسے کیسے لوگ'' کے کارنامے حیران کن تھے۔ شک کا انجام برا ہوا وفادار عورت کی وفا بڑی دیر میں آئی۔ ''سراب'' اب سراب نہیں رہی بلکہ منزل بن گئی ہے گھوم پھر کر تمام ہی کردار عجیب بستی میں پہنچ گئے ہیں اور لگتا ہے کہ اب اس کا انجام قریب ہے۔ بے شک ہر شے کو ایک دن ختم ہونا ہے چاہے وہ کردار ہوں یا کہانی۔ بس خدا کی ذات باقی رہنے والی ہے۔ زویا اعجاز کی ''بے ثمر مسافت'' میں نازیہ صاحبہ آپ کو اپنے چاہنے والوں کے دل توڑنے کی سزا ملی ہے آپ اسے ثمر مسافت مت سمجھیے لیکن غلطی کی ہے اس کی سزا سمجھ کر اسے قبول کیجیے اور سب سے معافی طلب کیجیے وہ آپ کو اکیلا نہیں چھوڑے گا ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ فہیم نوید شکر ادا کیجیے کہ ''تیسرے سبق'' نے آپ کو سبق سکھا دیا۔ خوابوں کے ذریعے زندگی سنوارنے والی آخری تحریر کا انجام خوب ہوا اور ہمیں بھی یہ سبق ملا کہ اپنے تو اپنے ہوتے ہیں باقی سب سپنے ہوتے ہیں۔''

☆ محمد عرفان رندھاوا کا خط۔ ''میں کافی عرصہ دراز سے کہانیاں لکھ رہا ہوں اور لکھ لکھ کر اکٹھی کر رہا ہوں لیکن آج تک شائع نہیں کر سکا۔ میری کہانیاں عام زندگی سے ہی اخذ شدہ ہیں اور نتیجہ خیز ہیں۔ ہر کہانی دوسری کہانی سے بالکل مختلف لیکن ذہن پر رہ جانے والا تاثر ایک جیسا۔ بات کو مختصر کرتے ہوئے گزارش یہ ہے کہ آپ اپنے ماہنامہ ڈائجسٹ سرگزشت میں اس ناچیز کی کہانیوں کو شامل کر کے شرف باریابی عنایت فرمائیں۔'' (پڑھ کر فیصلہ کیا جا سکے گا)۔

☆ احسان سحر کی آمد میانوالی سے۔ ''انکل معراج رسول کے مختصر مگر احساس ندامت دلاتے مضمون پر نظریں اٹک کر رہ گئیں۔ یہ احساس ہمیں زندگی میں چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔ ہم کیوں اقوام عالم سے دن بدن پیچھے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اقوام عالم کا رویہ ہمارے ساتھ جیسا بھی ہو پہلے ہم اپنا رویہ تو اپنوں کے ساتھ ٹھیک کریں۔ اپنے گھروں اور علاقوں میں ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کرنا، ایک کو اس کے مقام سے گرا کر خود اس کے مقام پر پہنچنے کا دستور جب تک ختم نہ ہوگا پاکستان تو کیا پاکستان کا گھر اور محلہ بھی خوش حال اور ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوگا۔ شکار طبیب پڑھا۔ جہاں ایک کم سن اور ابھرتا ہوا کرکٹر نام نہاد طبیبوں کی بھینٹ چڑھا۔ والس متھائس ایک دیا جو بجھ گیا۔ ماضی تو خیر ماضی ٹھہرا حال بھی ویسے کا ویسا ہی ہے ماضی جیسا۔ آج بھی لوگ ڈاکٹروں کی لاپروائی کا شکار ہو رہے ہیں جس ملک کے عوام کا مقصد محض پیسا ہی ہوتا ہے وہ انسان اور انسانیت کی پہچان کھو دیتے ہیں جنہیں بھرنا ہی اس کا مقصد حیات ہے۔ ''مشہر خیال'' کے باسیوں میں رنگ بکھرے نظر آتے ہیں اور ہر رنگ کی اپنی کشش اور خوب صورتی ہوتی ہے۔ ''ایور گرین'' دیو آنند کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ دادا اور پوتوں کے درمیان مکالمے اچھے لگے اور ساتھ اپنا بچپن بھی یاد آ گیا۔ جب ہم بھی دادا ابو سے ایسے ہی بیٹھ کر کہانیاں سنا کرتے تھے۔ کتنے اچھے تھے وہ دن۔ ''کیسے کیسے لوگ'' بھی مختصر اور جامع مضمون تھا، اچھا لگا۔ ''شک'' مختصر پر ذہن کی پراگندگی کا شاخسانہ رہی۔ ایسے مرض کا علاج ناممکن ہے۔ ''انوکھا جاسوس'' حب الوطنی کے جذبے سے سرشار متاثر کن مضمون رہا۔ سچ بیانیوں میں پہنچے۔ ''نادانیاں'' جوانی میں اور پیار و محبت میں ایسی نادانیاں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ آج کے زمانے میں عام ہوتے انٹرنیٹ اور مختلف ویب سائٹ جہاں فوائد پہنچا رہی ہیں وہاں بہت سے لوگوں سے ایسی نادانیاں بھی ہوتی رہتی ہیں جس کا سبق کافی تلخ ہوتا ہے۔ ''راکھ'' بے شک غلط کام چاہے چھوٹے طریقے سے کرو یا بڑے سے وہ غلط ہی ہوتا ہے اور سگریٹ تو آج کل فیشن بن گیا ہے۔ جس سے بہت سی بیماریاں اور پتا نہیں کیا کچھ ہونے کا اندیشہ ہے۔ ''بھکاری'' دولت کی ہوس انسان کو نہ اپنا رہنے دیتی ہے اور نہ اپنوں کا۔ یہ اندھیروں میں بھی بھٹکائے رکھتی ہے اور انجام آخر وہی ہوتا ہے جیسا اس کے پیچھے بھاگنے والوں کا ہوتا ہے۔ ''ولسن'' اچھی کاوش تھی۔ بعض گھروں میں ایسے مسائل پائے جاتے ہیں۔ ''جل پری'' پڑھ کر حیرت ہوئی ہم نے بعض جگہ پڑھا اور دیکھا ہے کہ واقعی جل پری کا اوپر کا حصہ عورت کی طرح ہوتا ہے اور نیچے کا دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے۔ پر یہاں تو مکمل لڑکی تھی۔ خیر کیا کہہ سکتے ہیں۔ ''بے ثمر مسافت'' خواہشوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے انسان اپنی انسانیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کیوں کہ خواہشات بڑی ہوں یا اچھی ہوش میں رہنے نہیں دیتیں۔ ''تیسرا سبق'' واقعی تیسرا سبق تھی انسان چاہے جیسا بھی ہو وہ آخر انسان ہے اور غلطی کرنا اور دھوکا کھانا انسان کے مقدر میں ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ آخری کہانی مجھے بہت پسند آئی جہاں ماں باپ کی محبت بھلا کر انسان ہمیشہ خسارے میں رہا وہاں دنیا و آخرت میں بھی خسارہ ہی رہا۔ دونوں کے درمیان مکالمے بھی پسند آئے اور ہنسی بھی کافی۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''مئی کا مہینہ پاکستانیوں کے لیے آخر خوشی لے ہی آیا۔ کرکٹ کے دونوں میچ جیت کر۔
مبارک ہو سب کو اللہ کرے شعیب ملک اسی طرح اچھی پرفارمنس دے (آمین) خط لکھتے ہی دل میں خیال آیا کہ اس بار کا خاص نمبر
سنہرے لوگ ہونا چاہیے جو ہر فیلڈ سے تعلق رکھتا ہو۔ ہاں یاد آیا ادارے والوں نے مجھے جواب دیا ہے کہ طاہر جاوید مغل سفرنامے نہیں
لکھتے لیکن انہوں نے مجھے خود کہا ہے کہ ایک سفرنامہ لکھا ہے (آپ خود پوچھ لیں وہ چھپا کہاں ہے)۔ اس بار سرگزشت کا سرورق بہت
مختلف لگا۔ ایک خوب صورت درگاہ سبز رنگ میں بہت سکون دے گیا۔ ایک کونے میں مشہور شخصیت کی تصویر۔ ایک لڑکی گرمی کے
ہاتھوں بے ہوش۔ اس بار تو انکل معراج نے جرمنی، چین، جاپان، ملائیشیا اور سنگاپور جیسے ترقی یافتہ قوم کے ذکر لے کر ہمارے حکمرانوں
کے منہ پر تماچا مارا ہے لیکن صد افسوس کہ آخر ہم کب اس خواب غفلت سے جاگیں گے۔ شکارِ طبیب میں کرکٹ کے پاکستانی کھلاڑی
والس متھائس کا ذکر کر کے شائقین کرکٹ کو اس ماضی کے کھلاڑی سے ملایا۔ افسوس کہ میں خود بھی شکار طبیب ہو کے اپنی اچھی بھلی صحت
گنوا چکی ہوں۔ چلتے ہیں اب اپنے دوستوں کے خطوط کی طرف۔ سب سے پہلے نمبر پر بھائی اعجاز حسین سٹھار کا خط مبارکاں بھائی کافی
دلچسپ خط ہے۔ سدرہ بانو کا طویل خط بھی جاندار تھا۔ محمد سلیم قیصر بھائی آپ ہمیشہ میرا نک نیم باجی گل کو الٹا کر کے گل باجی کیوں کہتے
ہو۔ اللہ آپ کو رہائی عطا کرے۔ بھائی ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں۔ احمد خان تو حیدی خط تو بہت شاندار تھا لیکن مجال ہے کہ بہن کا ذکر کیا
ہو۔ محمد احمد رضا انصاری خوش نہیں ہو کہ سرگزشت کی وجہ سے ہنسی آئی ورنہ لوگ تو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ مجید احمد جائی تبصرہ بہت
جاندار تھا۔ بھائی سب کو یاد کیا آخر اس بہن سے کیا دشمنی ہے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی بھائی اللہ آپ کو صبر دے۔ اب اپنے بچوں کی
تربیت سے غافل مت ہو جانا۔ عبدالجبار رومی انصاری کا تبصرہ بھی لاجواب رہا۔ رانا محمد شاہد، اللہ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں
جگہ دیں اور آپ کو صبر عطا کریں، آمین ثم آمین۔ سید انور عباس شاہ بھائی سدرہ بانو اور سہیل عباس دونوں تو ویسے ہی میرے پیچھے پڑ
گئے ہیں خدا خیر کرے۔ بھائی شکریہ آپ نے یاد کیا اللہ کا کرم ہے میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ کا تبصرہ بہت تفصیلی اور شاندار رہا۔ خوشی
سے دل جھوم اٹھا جب خطوط میں بھائی ملک جاوید سرکانی کو موجود پایا اویس شیخ واہ کیا شاندار اور تفصیلی خط ہے۔ اتنے لمبے لمبے خطوط واہ
کیا انصاف ہے میں احتجاج کرتی ہوں (خط میں اہم نکتے ہوں تو کوئی بات ہے۔ سلام دعا سے صفحات بھرنا ضروری ہے کیا) آخر میں
اپنے شہر پشاور کے شاہد جہانگیر شاہد صاحب کا خط رہا۔ شاہد اللہ آپ کو صحت کاملہ دے۔ سرگزشت کے تمام دوست ایک خاندان کی
طرح ہیں۔ اس لیے پلیز No thanks کہانیوں میں حسب عادت پہلے اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی تحریر ''سراب'' پڑھی۔
ایک بار شروع کیا تو ختم کر کے ہی دم لیا۔ اب تھوڑا سچ بیانیوں پر تبصرہ پہلی کہانی نادانیاں واقعی موبائل اور اب فیس بک نے زندگیاں
تباہ کر دیں۔ اللہ ہمیں اس گندگی سے بچائے (آمین)۔ دوسری کہانی ''راکھ'' بہت دکھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ سعید احمد تو باہمت نکلا
اس کی بھابی اور کزن بہت گھناؤنے لوگ تھے۔ تیسری کہانی ''صحیح طریقہ'' واہ جی واہ محبت حاصل کرنے کے ٹوٹکے بھائی اب محبت جیسا
جذبہ اتنا سستا ہو گیا کہ لوگ کتابوں میں ٹوٹکے دیکھ کے محبت ڈھونڈیں گے۔ چوتھی کہانی ''بھکاری'' وہی مرد کی ازلی کمینگی اور خود غرضی۔
حسن رزاقی آپ کا دوست کبھی سکون سے نہیں رہ پائے گا۔ زاہدہ نے بھکاری کہہ کے خوب تھوکا ہے۔ پانچویں کہانی ''لمس'' فیروزاں کی
ایک دکھ بھری کہانی کاش کہ والدین تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنے بچوں کی جسمانی صحت کا بھی خیال رکھیں تو فیروزاں جیسی زندگی نہ ہو۔
چھٹی کہانی ''جل پری'' کچھ ہونی انہونی سی کہانی لگی۔ ماورائی سی۔ ساتویں کہانی ''بے ثمر مسافت'' زویا اعجاز کی زیرک کاوش ہے۔
کاش کہ لڑکیوں کو عقل آئے مرد کبھی سچی محبت نہیں کر سکتا۔ اس کی فطرت میں یہ پاکیزہ جذبہ اللہ تعالیٰ نے رکھا ہی نہیں۔ مرد صرف
عورت سے ہوس پوری کرتا ہے۔ آٹھویں کہانی ''تیسرا سبق'' پڑھ کے ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آگئے کہ پولیس کے ساتھ دھوکا۔ نویں
کہانی ''وفا گزیدہ'' موضوع تو بہت اعلیٰ اور سبق آموز تھا لیکن فلمی سا انداز تھا لگ رہا تھا کوئی پاکستانی فلم یا پی ٹی وی کا ڈراما دیکھ رہے
ہیں۔ ہاں اینڈ تو لاجواب رہا۔ شیراز خان کی تحریر ''کیسے کیسے لوگ'' بھی کافی دلچسپ اور معلوماتی تھی لیکن افسوس صد افسوس کہ ہمارے
رائٹرز کا قلم اپنے لوگوں پر کیوں نہیں لکھتا کب ہم اس احساس کمتری سے نکلیں گے۔ اس سرزمین پاکستان پر بھی بہت نامور اور کامیاب
لوگ گزرے ہیں۔ ہماری نئی نسل کو اپنے آباؤ اجداد کی کوئی ہسٹری معلوم نہیں لیکن امریکا، برطانیہ، اسپین اور فرانس کے بارے میں
ایک ایک لفظ پوری تاریخ کے ساتھ معلوم ہے۔ انور فرہاد نے ''ایور گرین'' کی معلوماتی اور دلچسپ تحریر اپنے وقت کے ایور گرین اداکار
دیو آنند پر لکھی۔ بہت اچھا لگا۔

تاخیر سے موصول خطوط

اشفاق محمد، لاڑکانہ۔ منظر اعوان، ساہیوال۔ احمد تبریز، جہلم۔ فرحت اللہ نیازی، شیخوپورہ۔ واجد حسن واجد، خان پور۔
نیاز بٹ، جھنگ۔ فرمان علی سید، چنیوٹ۔ فیض بخش، فیصل آباد۔ نگار ارم، ممتاز حسن، سرگودھا۔ ہدایت علی، ملتان۔ بخش ملہی،
کوٹ ادو۔ فرقان حسن خان، ڈی آئی خان۔ ارباز خان، کوئٹہ۔ ناصر حسن، پشاور۔ سندس امتیاز، سرگودھا۔ عنبر نعیم، ساہیوال۔
انوار خان، منڈی بہاؤالدین۔

بلند اقبال

ڈاکٹر ساجد امجد

زبان و بیان کی سلاست، اسلوب و تراکیب کا منفرد انداز، فصاحت و بلاغت کا موجزن دریا، برجستگی و بے ساختگی کا برمحل اظہار، سوز و گداز کی ندرت اور احساسات و جذبات کا نادر شعور اگر دیکھنا ہے تو اقبال عظیم کی کاوشوں پر نظر ڈالیں، تصورات و خیالات کی جدت اور شعور و فکر کی شدت کا حامل یہ شاعر خود میں کہانی ہے۔ زندگی کی پیچ در پیچ راہوں کو اس نے کس خوش اسلوبی سے برتا یہ ایک سبق ہے۔ ہلکی سی افتاد پر لوگ گھبرا اٹھتے ہیں لیکن اس نے زندگی کو نیا انداز دینے کی خاطر کیا کیا نہیں کیا۔ سنگلاخ و پُرخار راہوں کو کس طرح گل آراستہ کیا۔ یہ ہر ایک کے لیے سبق آموز ہے۔

اس شاعر کا زندگی نامہ جس نے آدھی زندگی اندھیرے میں بسر کی

ابھی زندگی کی طلسم ہوش ربا نے ہوش میں آنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا کہ سید مقبول عظیم عرش کا تبادلہ میرٹھ سے کان پور ہوگیا۔ بچوں کی زنجیر پاؤں میں تھی لیکن صحرا نوردی کے لیے جانا بھی ضروری تھا۔ انہوں نے ملازمت کی ڈور کو ٹوٹنے نہیں دیا اور میرٹھ جیسے پُررونق ادبی شہر کی فرقت یہ سوچ کر گوارا کرلی کہ کان پور کی ادبی وقعت بھی کچھ کم نہیں۔ وہ انسپکٹر پولیس ہونے کے باوجود ایک اچھے شاعر بھی تھے لہٰذا ہم جنسوں کی صحبت کے مشتاق رہتے تھے۔ کان پور ادبی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ لکھنو سے قریب ہونے کی وجہ سے بھی یہ دوسرا لکھنو بن گیا تھا۔ مقبول عظیم عرش نے کان پور میں قدم رکھتے ہی پولیس کے سپاہیوں سے زیادہ ادب کے سپاہیوں سے تعلقات استوار کیے۔ یہاں پہنچتے ہی اپنے گھر ایک شاندار محفل مشاعرہ منعقد کیا۔ کانپور کے تمام شعرا کو مدعو کیا اور یوں ایک ہی رات میں سب سے تعارف ہوگیا۔

اس رات کی صبح ہوئی تو ہر طرف مقبول عظیم عرش کے چرچے ہو رہے تھے۔ وہ اچھے شاعر تو تھے ہی محکمہ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لہٰذا شعرائے کرام ان سے تعلقات مستحکم رکھنے کے خواہاں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا گھر سخن کدہ بن گیا۔ یہاں کے مشاعروں نے میرٹھ کے نوچندی میلے کے مشاعروں کی یاد تازہ کردی۔ ان کا دل لگنے لگا۔

لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ سید فضل عظیم فضل جیسے نعت گو شاعر کے فرزند ہیں اور ادیب میرٹھی کے داماد ہیں تو ان کی وقعت و اعتبار میں مزید اضافہ ہوگیا۔

کان پور کی ادبی فضا میں وہ ایسے رچ بس گئے کہ اب کہیں اور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

چھٹی والے دن دوستوں کی آمد و رفت میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ اس دن بھی چھٹی تھی۔ ایک پنڈت جی جنہیں ہندی اور ریاضی پر بڑا عبور حاصل تھا۔ کسی اسکول میں پڑھاتے بھی تھے اور ادب سے شغف کی بدولت کبھی کبھی مقبول عظیم عرش سے ملنے آنکلتے تھے۔ اس دن بھی آئے

ہوئے تھے۔

جب کوئی دوست آجاتا تھا تو بچوں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ باپ کے پاس آکر کھڑے ہو جائیں لیکن اس وقت اتفاق تھا کہ پنڈت جی آئے تو مقبول عظیم کا بیٹا اقبال عظیم کھیلتا ہوا اس طرف آنکلا۔ ہر چند کے اس نے بڑے ادب سے پنڈت جی کی خدمت میں آداب عرض کیا تھا لیکن مقبول عظیم کو اس کی یہ مداخلت پسند نہ آئی اور انہوں نے اسے ڈانٹ کر وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ پنڈت جی کو بھی یہ بے جا ڈانٹ قطعی نہیں بھائی۔

"انسپکٹر صاحب، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی بالک نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ اسے ڈانٹا جائے۔ کیسی موہنی صورت ہے اور کیسا تمیز دار بچہ ہے۔"

"پنڈت جی، مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ بچے بڑوں کے درمیان بیٹھیں۔ مجھے یہ بات ناگوار ہوئی کہ یہ نہ صرف بغیر اجازت یہاں آیا بلکہ ایک طرف بیٹھ کر ہماری باتیں بھی سننے لگا۔"

"یہ عقل میں ہمارے برابر ہے، اس لیے ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔"

"پنڈت جی، آپ کو تو ہر بات میں مذاق کی سوجھتی ہے۔"

"مذاق کی بات نہیں ہے۔ میں اس کی پیشانی پر اس کے بھاگ لکھے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے ماتھے پر صاف لکھا ہوا ہے کہ یہ بہت بڑا کوی بنے گا۔"

"شاعر کیسے نہیں بنے گا۔" مقبول عظیم نے کہا۔ "اس کا باپ شاعر، دادا شاعر، نانا شاعر پھر یہ موصوف کس گنتی میں ہیں۔"

"اگر پولیس میں بھرتی کروانا ہے تو دوسری بات ہے ورنہ شاعر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اچھی تعلیم کا بندوبست بھی ہو۔"

"بھئی میرٹھ میں اتنی فرصت نہیں ملی۔ کان پور آکر بھی اپنے بکھیڑوں میں پڑا رہا۔ اب سوچ رہا ہوں کسی اسکول میں داخل کروادوں۔ ویسے اس کی ماں نے اسے بہت کچھ عالم فاضل بنا دیا ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں اسے کوئی دقت ہوگی نہیں۔"

"انسپکٹر جی، ایک بات کہوں۔"

"کہیے ابھی تک آپ کہہ ہی تو رہے ہیں۔ ہم تو سننے کے لیے ہیں۔"

"پرائمری اسکول کے بکھیڑوں میں کیوں پڑتے ہیں۔ ایک دو سال آپ نے اس کے ضائع بھی کر دیے ہیں ان کی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔ اسے آپ میرے پاس بھیج دیا کریں۔ میں تیاری کرا کے اسے پانچویں جماعت میں داخل کروادوں گا۔ بالک ہوشیار ہے جلد ہی چل پڑے گا۔"

مقبول عظیم نے وعدہ کرلیا۔ وقت طے ہوگیا اور اقبال عظیم کو پنڈت جی کے پاس بھیجا جانے لگا۔

اقبال عظیم باقاعدگی سے پنڈت جی کے پاس جارہا تھا۔ ذہن کا تیز ثابت ہوا۔ جو کچھ پنڈت جی پڑھاتے وہ ذہن نشین کرلیتا۔ کھیل کود سے اسے کم ہی سروکار تھا۔ وہ سال ڈیڑھ سال کی محنت کے بعد ہی اس لائق ہوگیا کہ داخلے کا امتحان پاس کر کے پانچویں جماعت میں داخل ہوسکتا تھا۔

اس نے امتحان دیا اور گورنمنٹ کالج کان پور میں پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ وہ ابھی پانچویں کلاس پاس نہیں کرسکا تھا کہ مقبول عظیم کا تبادلہ اناؤ ہوگیا۔ پنڈت جی اس روز آئے تو بہت اداس تھے۔

"بہت جی لگ گیا تھا انسپکٹر صاحب آپ کے ساتھ۔"

"مجھے بھی ایسے دوست کہاں ملیں گے جیسے کان پور میں میسر آئے لیکن کیا کروں سرکاری ملازمت ہے جانا تو پڑے گا۔"

"اقبال کی تعلیم کا بہت حرج ہوگیا۔ اس کا ایک سال ضائع ہوجائے گا۔ کوشش کرنا اس کا داخلہ وہاں چھٹی جماعت میں ہوجائے۔ میں نے اس کا حساب ایسا پکا کروادیا ہے کہ چھٹی کیا ساتویں کی ریاضی بھی خوب کرلے گا۔"

"ریاضی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ ویسے پنڈت جی آپ فکر نہ کریں۔ میں حالات دیکھ کر ہی کوئی نہ کوئی فیصلہ کروں گا۔"

والدین کے جلد جلد تبادلے ہوں اور اسکول تبدیل ہوتے رہیں تو بچوں کی تعلیم پر یقیناً اثر پڑتا ہے۔ اقبال عظیم کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اناؤ آکر اسے ایک مرتبہ پھر پانچویں جماعت میں داخلہ لینا پڑا۔ اس کا ایک سال ضائع ہوگیا۔

اناؤ کی ادبی اہمیت بھی کچھ کم نہیں تھی۔ یہ وہی ضلع اناؤ تھا جس نے دنیائے شعر و ادب کو مولانا حسرت موہانی اور سید آل رضا جیسے اکابر مستحق عطا کیے۔ مقبول عظیم اناؤ پہنچے

توان حضرات کی غزلیں فضا میں گونج رہی تھیں۔
مقبول عظیم نے جلد ہی یہاں کے ادبی ماحول میں اپنی جگہ بنالی۔ اثر لکھنوی، جگت موہن رواں، رضی جون پوری، فرخ بنارسی، ثاقب بریلوی وغیرہ ان کے دوستوں میں شامل ہو گئے۔ یہ حضرات اکثر ان کے گھر مہمان ہوتے تھے اور شعر پڑھتے تھے۔
اقبال عظیم کا بچپن ان محفلوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔
وہ پانچویں پاس کر کے گورنمنٹ ہائی اسکول اناؤ میں داخل ہوا تو جیسے ایک شہر سے دوسرے شہر میں تبادلہ ہو گیا۔ یہاں کی فضا ہی دوسری تھی۔ یہاں ایک ادبی تنظیم بنی ہوئی تھی جو بیت بازی کے مقابلے اور مشاعرے منعقد کرواتی رہتی تھی۔ اس تنظیم کے سرپرست اسکول کے ہیڈ ماسٹر نرائن تیواری تھے۔ مشاعرہ تو خیر سال چھ مہینے ہی میں منعقد ہوتا تھا لیکن بیت بازی کے مقابلے اکثر و بیشتر ہوتے رہتے تھے۔
وہ ابھی اسکول میں نوارد تھا کہ ایک ایسا ہی مقابلہ منعقد ہوا۔ وہ شاعری سے بھی واقف تھا اور بہت سے شاعروں سے بھی۔ شاعر اکثر اس کے گھر آتے تھے اور اشعار پڑھتے تھے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ بیت بازی کیا ہوتی ہے۔ اس نے اسکول کے بڑے ہال میں دو مختلف جماعتوں کے درمیان ہونے والے اس مقابلے کو بڑے غور سے دیکھا اور صرف اتنا سمجھ سکا کہ ایک شعر ایک لڑکا پڑھتا ہے دوسرا شعر دوسرا لڑکا پڑھتا ہے لیکن کیوں پڑھتا ہے اور نہ پڑھے تو کیا ہو، یہ سب اسے معلوم نہیں تھا بلکہ ایک لحاظ سے یہ کھیل اسے بے لطف معلوم ہوا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ سے یہ سمجھ سکا تھا کہ اس کھیل کے لیے بہت سے اشعار یاد کرنے ہوتے ہیں اور ایک ایک کر کے سنانے ہوتے ہیں لیکن جب وہ اسکول کے بعد گھر پہنچا اور اپنے بڑے بھائی وقار عظیم کے پاس اسکول کا کام کرنے کے لیے بیٹھا تو اس پر اس کھیل کے اسرار و رموز کھلے۔ اس نے ذکر کیا کہ اسکول میں بیت بازی ہوئی تھی۔
''تمہیں معلوم بھی ہے بیت بازی کیا ہوتی ہے؟'' بڑے بھائی نے پوچھا۔
''کیوں نہیں معلوم، ایک شعر ایک پڑھتا ہے دوسرا شعر دوسرا پڑھتا ہے۔''
''یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیوں پڑھتا ہے؟''
''یہ بتانے کے لیے کہ مجھے تم سے زیادہ شعر یاد ہیں۔''
''معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔'' وقار عظیم کو ہنسی آ گئی۔ ''تم اس کھیل کو سمجھے ہی نہیں۔ اسی لیے یہ کھیل تمہیں بے لطف معلوم ہوا۔ دیکھو صرف شعر پڑھنا نہیں ہوتا بلکہ جس حرف پر شعر ختم ہوتا ہے دوسری پارٹی کو کوئی ایسا شعر پڑھنا ہوتا ہے جو اسی حرف سے شروع ہو رہا ہو۔''
اس کے بڑے بھائی نے اس کھیل کے قواعد و ضوابط اچھی طرح ذہن نشین کروائے تو اسے یہ کھیل نہایت دلچسپ نظر آنے لگا۔ اگلی مرتبہ جب یہ مقابلہ منعقد ہوا تو اس نے قواعد و ضوابط کی روشنی میں اس مقابلے کو پرکھا۔ اسے یہ کھیل نہایت دلچسپ نظر آیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بھی اس مقابلے میں شرکت کرے گا۔ اس نے خود ہی ایک شعر پڑھا اور جس حرف پر شعر ختم ہو رہا تھا اس حرف سے شروع ہونے والا شعر سوچا۔ چند اشعار کے بعد ہی اس کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ اب اس پر کھلا کہ اگر اسے مقابلہ کرنا ہے تو اشعار یاد کرنے ہوں گے۔
اس کے والد نے گھر میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ مہیا کر رکھا تھا۔ ان کتابوں میں سیکڑوں شعرا کے دواوین بھی تھے۔ حسرت موہانی اور آل رضا کی غزلوں سے اناؤ کی فضا گونج رہی تھی۔ اس نے بھی ان شعرا کے نام سنے تھے اور ان کا کلام کتب خانے میں موجود بھی تھا۔ اس نے ان کی غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار یاد کرنے شروع کر دیے۔
اسی اثنا میں امتحان کا زمانہ آ گیا۔ اسے اشعار چھوڑ کر اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔
اب وہ ساتویں کلاس میں تھا اور خاطر خواہ اشعار یاد ہو چکے تھے۔ وہ ہیڈ ماسٹر نرائن تیواری کے پاس پہنچ گیا۔
''میں اسکول میں ہونے والے بیت بازی کے مقابلوں میں شرکت کا خواہش مند ہوں۔''
''خواہش تو بہت اچھی ہے لیکن ابھی تم ابتدائی جماعتوں میں ہو یہ مقابلے تو بڑی جماعتوں کے لڑکوں کے درمیان ہوتے ہیں۔''
''آپ میرا امتحان لے سکتے ہیں۔ مجھے بڑی جماعتوں کے لڑکوں سے زیادہ اشعار یاد ہیں۔''
ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے اس لڑکے کو بلایا جو بیت بازی کے مقابلوں میں ہمیشہ فاتح رہتا تھا۔

''یہ اقبال عظیم ہے، کلاس ہفتم کا طالب علم۔ بیت بازی کے مقابلوں میں شرکت کے خواہش مند ہیں۔''

''سر، آپ کو تو معلوم ہے اگر ان مقابلوں کے لیے نچلی جماعتوں کے طلبہ کو منتخب کیا گیا تو معیار وہ نہیں رہے گا جو اب ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ کورس کی کتابوں کے اشعار یاد ہوں گے، کیا مزہ آئے گا۔'' یہ براہ راست اس کی قابلیت پر حملہ تھا لہٰذا وہ خاموش نہ رہ سکا۔

''جب تک آپ میری قابلیت کا امتحان نہیں لے لیتے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے معیاری اشعار یاد نہیں۔''

اقبال کے اس دعوے کو اس لڑکے نے بھی اپنے لیے چیلنج سمجھا اور مقابلے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے ایک شعر پڑھا۔ اقبال نے اس کا جواب دیا اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس لڑکے کو بھی سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ نہ وہ ہار ماننے کو تیار تھا نہ اقبال۔ مقابلہ درمیان میں روکنا پڑا لیکن یہ اندازہ ہوگیا کہ اقبال کے اشعار زیادہ معیاری تھے۔

اسے یہ اجازت مل گی کہ وہ آیندہ ہونے والے مقابلوں میں حصہ لیا کرے گا۔ اسکول میں ہر سال ایک مشاعرہ بڑے پیمانے پر منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے میں لکھنو، کانپور، فیض آباد، جونپور وغیرہ کے شعرا شرکت کرتے تھے۔

اقبال عظیم اس وقت تک شاعر نہیں تھا لیکن مشاعروں کی اہمیت سے بھی واقف تھا اور مشاعرے کے آداب سے بھی بلکہ بہت سے شعرا سے اس کا تعارف تھا۔ اس نے ان مشاعروں کے انعقاد کے لیے رضا کاروں میں اپنا نام لکھوالیا۔

ان مشاعروں سے پسندیدہ غزلیں نقل کرکے لانا اور انہیں ازبر کرکے احباب کو ترنم سے سنانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ترنم اتنا شاندار تھا کہ احباب اس کے گرویدہ تھے۔ اسکول میں جب کوئی پیریڈ خالی ہوتا، دوست اسے گھیر لیتے اور وہ چھوٹا موٹا مشاعرہ برپا کردیتا۔

یہ اس کی ذہنی تربیت کا دور تھا ابھی وہ شاعر نہیں بنا تھا۔

قدرت اس کے ذوق کی آبیاری کے لیے سامان فراہم کرتی جارہی تھی۔ جب وہ میٹرک کا امتحان پاس کرچکا تو اس کی آیندہ کی تعلیم کا سوال پیدا ہوا۔

انٹرمیڈیٹ کرنے کے لیے اسے گورنمنٹ کرسچین کالج، لکھنو میں داخل کروادیا گیا۔ لکھنو کیا تھا اسے یہ معلوم ہوا جیسے کسی بڑے مشاعرے میں آگیا ہے۔ ہر طرف قافیوں کی بھرمار، شاعروں کی بھرمار تھی۔ شاعری ہر ایک کے گلے کا ہار تھی۔ بچہ بچہ اسی فن شریف کا قائل تھا۔ جو شعر نہ کہتا گویا جاہل تھا۔ دکاندار تک مصرعوں میں صدا لگاتے تھے، تانگے والے قافیوں کا سہارا دے کر سواریاں بٹھاتے تھے۔ لکھنو کی بہار کسی حد تک خزاں یافتہ ہوچکی تھی لیکن اب بھی شگوفے چٹک رہے تھے کلیاں مہک رہی تھیں۔

وہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا تھا لیکن گھومنے پھرنے پر قدغن تو نہیں تھی۔ نظارہ بازی پر پابندی تو نہیں تھی۔ اس کی جوانی یہاں کی رنگینیوں سے فیض یاب ہوئی تو طبیعت خود بخود شعر گوئی کی طرف مائل ہوگئی۔ اسکول میں ہونے والی بیت بازی اور کثرت مطالعہ نے ذہنی تربیت پہلے ہی کردی تھی۔ اب جو ذہن پر زور ڈالا تو کاغذ کے طشت پر اشرفیوں کے ڈھیر لگتے چلے گئے۔ جب بہت سی غزلیں جمع ہوگئیں تو خیال آیا یہ غزلیں ہیں بھی یا میں نے انہیں غزلیں سمجھ لیا ہے۔

اس نے روایتی غزل گو شعرا کا مطالعہ کثرت سے کیا تھا جبکہ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اردگرد کے شعرا اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کررہے ہیں۔ اس نے بھی کوشش کی کہ اپنی غزلوں میں روایتی رنگ بھی برقرار رکھے اور نیا اسلوب اپنانے کی بھی کوشش کرے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اور نہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوسکا تھا لیکن اس کا شعور ہوجانا بڑی بات تھی جو آگے چل کر کسی کام آسکتی تھی۔ اس کے اسی شعور نے اس کی غزلوں کو لکھنوی رنگ کے اس پہلو سے بچالیا جسے ابتذال کہا جاتا تھا۔

غزل کا ایک اہم موضوع حسن و عشق ہے اس کے اردگرد بھی یہی موضوع بکھرے پڑے تھے (یاد رہے کہ وہ لکھنو میں تھا اور عمر جوانی کی تھی) غم دوراں سے ابھی واسطہ نہیں پڑا تھا لہٰذا یہ غزلیں حسن و عشق کے موضوعات پر مشتمل تھیں۔

یہ نگاہ حسن جھکی جھکی یہ جبین ناز دھواں دھواں
مرے بس کی اب نہیں داستاں مرا کانپتا ہے رواں رواں
مرے دل پہ نقش ہیں آج تک وہ یہ احتیاط نوازشیں
وہ غرور و ضبط عیاں عیاں وہ خلوص و ربط نہاں نہاں
مری خلوتوں کی یہ جنتیں کئی بار سج کے اجڑ چکیں

مجھے بارہا یہ گماں ہوا کہ تم آ رہے ہو کشاں کشاں
وہ موج تبسم شگفتہ شگفتہ وہ بھولا سا چہرہ کتابی کتابی
وہ سنبل سے گیسو سنہرے سنہرے وہ مخمور آنکھیں گلابی گلابی
نظر نظر میں کسی سے کسی کا افسانہ
بیاں ہوا ہے سر بزم راز دارانہ
بغیر لفظ و بیاں گفتگو سر محفل
نفس نفس میں فسانے نظر نظر میں پیام
قدم بڑھیں تو بدل جائے وقت کی رفتار
قدم رکیں تو ٹھہر جائے گردش ایام

اس نے اپنی دو غزلیں منتخب کیں اور قدیر لکھنوی کی خدمت میں پہنچ گیا۔ انہوں نے یہ غزلیں دیکھیں اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسرے لفظوں میں کہہ دیا کہ اصلاح کی گنجائش نہیں۔

دوسرے دن اس نے مزید دو غزلیں منتخب کیں اور اس وقت کے ایک دوسرے استاد شاعر آرزو لکھنوی کے پاس حاضر ہو گیا۔ انہوں نے کچھ مشورے دیے اور نہایت محبت سے رہنمائی کا وعدہ کیا۔ اسی طرح اس نے اپنی دو غزلیں صفی لکھنوی کو دکھائیں۔

ان بزرگوں کی مثبت آرا نے اس میں اعتماد پیدا کر دیا۔ وہ ان تینوں بزرگوں کو استاد سمجھتا بھی رہا اور ان کی رہنمائی میں چلتا بھی رہا لیکن کسی کا باقاعدہ شاگرد نہ بنا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مطالعہ ہی سب کچھ ہے۔ یہ مطالعہ کتابوں تک محدود نہیں انسانوں کا مطالعہ بھی بڑی چیز ہے۔

اس کے بعد وہ تمام زندگی اسی اصول پر کاربند رہا۔

اسے لکھنو آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس کے والد (مقبول عظیم عرش) نے بھی پنشن لے کر لکھنو میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اس نئے گھر کے قریب ہی نیاز فتح پوری کا گھر اور ماہ نامہ نگار کا دفتر تھا۔ عبدالباری آسی، قدیر لکھنوی اور اثر لکھنوی بھی اسی علاقے میں مقیم تھے۔ ان سب سے اس کے والد کے محبانہ مراسم تھے۔ رفتہ رفتہ بہزاد لکھنوی، بیدم وارثی، وصل بلگرامی اور سراج لکھنوی بھی اس کے والد کے حلقہ احباب میں شامل ہو گئے۔

اس کے والد نے کان پور اور اناؤ کی طرح یہاں بھی اپنے مکان پر شعری نشستوں کا انعقاد شروع کر دیا۔ ان نشستوں میں لکھنوی شعرا پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ وہ اس وقت بی اے سال اول کا طالب علم تھا۔ ان نشستوں میں شریک ہو رہا تھا لیکن سامع کی حیثیت سے۔ اس کے والد کو شاید ابھی معلوم بھی نہیں تھا کہ صاحبزادے بھی شاعری فرمانے لگے ہیں۔ باپ کی اجازت کے بغیر وہ کسی مشاعرے میں شریک ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جیسے کسی شکاری کے ہاتھ میں بندوق دے دی گئی ہو لیکن فائر کرنے کی اجازت نہ ہو۔

ایک روز قدیر لکھنوی اس کے گھر آئے تو وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ”آپ کو تو معلوم ہے میں شعر کہتا ہوں۔“

”اس میں کیا شک ہے، شعر کہتے ہو اور اچھے کہتے ہو۔“

”آپ ابا جان سے کہہ کر مجھے مشاعروں میں شرکت کی اجازت دلوا دیں۔“

”انہیں کیا اعتراض ہوگا؟“

”وہ اکثر کہتے رہتے ہیں کہ جو شوق پورا کرنا ہے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کرنا۔“

”کہتے تو وہ بھی ٹھیک ہی ہیں لیکن میں تمہاری سفارش کروں گا۔“

انہوں نے سفارش کی اور اسے اجازت مل گئی۔ کہیں دور تو جانا نہیں تھا۔ طرحی مشاعرے گھر پر ہی ہوتے تھے۔ اس نے ایک طرحی مشاعرے میں شرکت کی۔

قدیر لکھنوی اس کی شعر گوئی سے تو واقف تھے لیکن اس کے ترنم سے بے خبر تھے۔ اس نے جب نرم و نازک لہجے میں رومانی غزل ترنم کے ساتھ شروع کی تو جیسے مشاعرے میں جان پڑ گئی۔ آواز کی کھنک اور لہجے کا سوز عجب سماں پیش کر رہا تھا۔ وہ جب اس شعر پر پہنچا

کوششیں کر رہا ہوں ہنسنے کی
اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں

تو بقول شخصے چھتیں اڑ گئیں۔ اس کی کم عمر، نو آموزی، صاف اور سادہ انداز، نپے تلے الفاظ اور ایسا شاندار ترنم۔ اس کے شاندار مستقبل کی پیش گوئیاں ہونے لگیں۔

شاعری کے علاوہ اس کی نوجوانی کئی اور رستوں پر بھی نکلی۔ یونیورسٹی ہاکی ٹیم کا ممبر بھی رہا۔ بیڈمنٹن بھی کھیلتا رہا اور خالی اوقات میں فلمیں بھی کثرت سے دیکھیں۔

اس نے شاندار نمبروں سے بی اے پاس کرلیا۔ اس زمانے میں بی اے پاس کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی جس طرح آج ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے لیے چند طلبہ ہی ہوتے تھے جو اس معراج تک پہنچتے تھے۔ اس کے دل میں بھی طرح طرح کے عزائم تھے جن کی تکمیل کے لیے اس نے ایم اے میں داخلہ بھی لے لیا کہ قسمت آڑے آگئی۔ پہلے والد کا انتقال ہوا پھر والدہ کی وفات ہوگئی۔

اس کی دوسری ماں تھیں۔ سگی والدہ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ پہلی والدہ کے انتقال کے بعد اس کے والد نے اپنی سالی کلثوم فاطمہ سے شادی کرلی تھی جن سے اوپر تلے سات اولادیں ہوئیں۔ پے در پے والد اور والدہ کے رخصت ہوجانے کے بعد سات چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ اس کے کاندھوں پر آپڑا۔ اس کا بڑا بھائی وقار عظیم الہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ گھر کے اخراجات میں ایک خاص حد تک ہی ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا اقبال عظیم ہی کو کرنا تھا۔ وہ عجیب دوراہے پر کھڑا ہوا تھا۔ ایک طرف اس کا شاندار تعلیمی مستقبل تھا دوسری جانب ذمے داریوں کا بوجھ۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس بوجھ کا وزن بڑھتا ہی جائے گا۔ اس کا بندوبست ابھی سے کرلینا چاہیے۔ اس نے ایم اے اردو کو خیرباد کہا اور ٹیچرس ٹیریننگ کالج لکھنو میں داخلہ لے لیا تاکہ اس ڈگری کے حصول کے بعد ملازمت کی دستیابی میں آسانی ہو۔ سوال یہ تھا کہ ڈگری کے حصول تک کیا ہو؟ ضرورتیں منہ کھولے کھڑی تھیں۔ انہیں ڈگری حصول تک ٹالا تو نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے وقتی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پرائیوٹ ٹیوشنز پڑھانی شروع کردیں۔ صبح کالج چلا جاتا۔ شام کا وقت ٹیوشنوں میں گزر جاتا۔ رات میں اگر کہیں کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ اپنی غزل لے کر وہاں پہنچ جاتا۔

اس دور کی شاعری میں وہ جگر و داغ کی پیروی کرتا نظر آتا تھا۔ وہی کیفیات وہی معاملہ بندی۔ زبان و بیاں کا وہی رکھ رکھاؤ جو ان دو شعرا کے یہاں نظر آتا ہے۔ یہی اندازِ شعری اس دور کے اور بہت سے شعرا اپنائے ہوئے تھے۔

ترقی پسند کا غلغلہ بلند ہوچکا تھا۔ لکھنو انجمن ترقی پسند مصنفین کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ نوجوان اس طرف کھنچے چلے جارہے تھے لیکن اقبال عظیم اپنی جڑوں سے الگ ہونے کو تیار نہیں تھا۔ نئے موضوعات اسے اپنی طرف بلا ضرور رہے تھے لیکن اس کی شاعری کا انداز اب بھی وہی تھا۔ سماجی شعور اور سیاسی بصیرت نے ابھی اس کی غزلوں میں جگہ نہیں بنائی تھی۔

مجھ سے ملنے میں اگر رسوائی کا ڈر ہے تمہیں
میرے گھر کیوں آتے ہو تم کو بلاتا کون ہے
روٹھ جانا تو تمہارا روز کا معمول ہے
روٹھ جاؤ شوق سے تم کو مناتا کون ہے
تم نہیں آتے نہ آؤ تم سے شکوہ بھی نہیں
تم سے کہتا کون ہے تم کو بلاتا کون ہے
تم بظاہر تو بہت معصوم صورت ہو مگر
سچ بتاؤ یہ ہنر تم کو سکھاتا کون ہے

☆☆

تمہیں ناراض ہونے کا سلیقہ بھی نہیں آتا
شکن ماتھے پہ ڈالو اور روکو اس تبسم کو

☆☆

تم غیروں سے ہنس ہنس کر ملاقات کرو ہو
اور ہم سے وہی زہر بھری بات کرو ہو

☆☆

تلخیٔ زیست کو ہنس ہنس کے بھلا رکھا ہے
ہم نے ہر زخم کو سینے سے لگا رکھا ہے
غم کے احساس پہ ڈالی ہے تبسم کی نقاب
تابہ مقدور ترا راز چھپا رکھا ہے

یہ سخت شبانہ روز جاری رہے۔ ٹیوشنز پڑھاتا رہا اور شاعری کرتا رہا۔ اسی خزاں میں ایک گل شاداب نے اس کا دامن تھام لیا۔ ٹریننگ کالج لکھنو میں ایک کرسچین لڑکی نئی نئی داخل ہوئی تھی۔ اس شاعر نما لڑکے سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس کا بھی وہی حال ہوا جو اس لڑکے کا تھا۔ اس لڑکے کا نام اقبال عظیم تھا۔ دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔ اب اقبال کی غزلیں اس لڑکی کے گرد چکر کاٹ رہی تھیں۔ وہ اپنی ذات میں سچا تھا۔ اس نے اس عشق میں بھی سچائی سے کام لیا۔ دوستی کا بندھن مضبوط ہوتے ہی اس نے اس لڑکی سے کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لڑکی نے وہی کہا جو ہر لڑکی کو کہنا چاہیے تھا۔ میرے ڈیڈی سے بات کرو اگر وہ اجازت دیں گے تو ٹھیک ہے۔

''اگر انہوں نے اجازت نہ دی؟''

''میں پوری کوشش کروں گی کہ وہ انکار نہ کریں۔''
''میں پھر کب تمہارے گھر آجاؤں؟''
''میں پتا کر کے بتاؤں گی۔''
اس لڑکی نے اپنے والد سے تذکرہ کیا اور انہوں نے اقبال عظیم کو ملاقات کا وقت دے دیا۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں جن پر سیاہ چشمہ لگا ہوا، اونچی چوڑی پیشانی، اچھا لمبا قد، شیروانی پاجامے میں ملبوس۔ وہ لڑکی کے والد سے ملا تو انہیں صاف انکار کی ہمت ہی نہ ہوسکی۔ انہوں نے فوراً رضامندی دے دی لیکن ایک شرط کے ساتھ۔
''آپ اگر اپنا مذہب تبدیل کرلیں تو میں اپنی لڑکی کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے سکتا ہوں۔''
''ہمارے مذہب کے مطابق اہل کتاب لڑکی سے شادی ہوسکتی ہے اس لیے مجھے مذہب تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔''
''میں ایک مسلمان لڑکے سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرسکتا۔''
''مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ میں اپنا مذہب تبدیل نہیں کرسکتا۔''
''اپنی محبت کے لیے بھی نہیں؟''
''میری پہلی محبت میرا مذہب ہے۔''
''آپ سوچ لیں۔''
''یہ سوچنے کی بات ہی نہیں۔''
''میں سمجھ لوں کہ انکار آپ کی طرف سے ہوا ہے؟''
''میں نے شادی سے نہیں مذہب کی تبدیلی سے انکار کیا ہے۔'' اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ تبدیلی مذہب پر تیار نہیں اور اٹھ کر چلا آیا۔ بعد میں اس لڑکی نے بھی بہت زور دیا کہ وہ اس کے باپ کی بات مان لے۔
''تم بعد میں پھر مذہب اسلام اختیار کرلینا لیکن اس وقت تو مان جاؤ۔''
''یہ دھوکا ہوگا۔ اپنے اللہ کو بھی دھوکا دینا ہوگا اور تمہارے والد کو بھی۔''
''میری محبت کے لیے تم اتنا بھی نہیں کرسکتے۔''
''میں تم سے محبت ضرور کرتا ہوں لیکن اس کے لیے میں ایمان نہیں بیچ سکتا۔''
''کیا تم عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتے؟''
''میں یہ بحث کم از کم تم سے کرنا نہیں چاہتا۔''
''اگر میں مسلمان ہوجاؤں؟''
''تمہارے والد کا اصرار ہے کہ میں عیسائی مذہب قبول کروں اور یہ ہو نہیں سکتا۔ تمہارا مسلمان ہونا یا نہ ہونا اتنا اہم نہیں۔''
''اگر میں اپنے ڈیڈی سے چھپ کر تم سے شادی کرلوں؟''
''مجھے یہ منظور نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے والد ہیں جو کچھ ہوگا ان کی مرضی سے ہوگا۔''
''میں بالغ ہوں اپنی مرضی سے شادی کرسکتی ہوں۔''
''بے وقوفی مت کرو۔ کیا یہ اچھا لگے گا کہ ہم اپنے مفاد کے لیے اپنے والدین کا دل دکھائیں۔''
وہ لڑکی ضد کرتی رہی لیکن اقبال نے یہ گوارا نہیں کیا اور یہ کہتا ہوا لوٹ آیا۔

ترے غم کی یادگاریں مرے شعر میری غزلیں
تری اک نظر کا حاصل مرا ذوق شاعرانہ

اس کی عشقیہ شاعری میں ایک اور کسک کا اضافہ ہوگیا۔ اب تک جس خیالی دوشیزہ کو وہ ذہن کے مہمان خانے میں سجائے ہوئے تھا اس کی جگہ وہ لڑکی آگئی۔ اب اس کی عشقیہ شاعری خیالی کی بجائے حقیقی ہوگئی۔

....

یہ فقط غرور کی بات ہے کہ زباں سے اپنی نہ تم کہو
تمہیں ورنہ اس کی خلش تو ہے کہ تمہاری بزم میں ہم نہیں

☆☆

ٹیچرس ٹریننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے عارضی طور پر گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہ دن اس کے لیے معاشی اعتبار سے نہایت سخت تھے۔ اخراجات بڑھتے جارہے تھے جنہیں پورا کرنے کے لیے وہ سخت محنت کررہا تھا۔ اب وہ بہ حیثیت شاعر پہچانا جانے لگا تھا۔ اسی شاعری کی برکت تھی کہ اسے آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن پر ڈراما سیکشن میں ملازمت مل گئی۔
ترقی نامی ایک ہفت روزہ اخبار کی ادارت بھی سنبھال لی۔ ان ٹوٹی پھوٹی ملازمتوں سے گزارا ہورہا تھا کہ اسے گورنمنٹ ہائی اسکول ہمیر پور میں باقاعدہ سرکاری ملازمت کا پروانہ مل گیا۔ اسے لکھنؤ کی گلیوں کا فراق گوارا نہیں تھا لیکن جس ملازمت کے لیے اتنے پاپڑ بیلے تھے اسے ٹھکرا بھی نہیں سکتا تھا۔
ہمیر پور ایک عجیب و غریب قسم کی بستی تھی جسے نہ شہر کا نام دیا جاسکتا تھا نہ قصبے کا نہ گاؤں کا۔ ایک طرف جمنا دوسری

طرف دریائے بیتوا اور دونوں دریاؤں کے درمیان سطح سمندر سے سیکڑوں فٹ کی بلندی پر 30,35 ہزار نفوس کی آبادی تھی۔ یہ تھا ہمیر پور جو کہنے کو ڈویژن کا صدر مقام تھا۔ وہاں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن کان پور تھا اور قریب ترین ہونے پر چالیس میل تھا۔ اس بستی میں جدید دور کی کوئی بھی سہولت موجود نہیں تھی۔

یہ کون سی شاندار جگہ تھی لیکن تقدیر کے چکر نے یہاں بھی چین سے رہنے نہ دیا۔ مختلف جگہوں پر تبادلے ہوتے رہے۔ مہوبہ، باندہ، کونچور، بارہ بنکی، سلطان پور وغیرہ دیکھ لیے۔

اس کی فطرت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی ایک صورتِ حال سے مطمئن ہو کر بیٹھنے والا نہیں۔ اس نے اس ملازمت کو بھی حرف آخر نہ سمجھا اور اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرتا رہا تا کہ ترقی کے دروازے کھلتے چلے جائیں۔ اسی ملازمت کے دوران اس نے سلطان پور سے ہندی کا ہائی اسکول لیول امتحان پاس کیا اور اسی سال 1941ء میں اس نے ایم اے اردو کے لیے آگرہ یونیورسٹی سے بہ حیثیت پرائیوٹ امیدوار رجسٹریشن کروالیا اور دو سال بعد اس نے فرسٹ کلاس فرسٹ میں ایم اے پاس کرلیا۔

اس دوران وہ مقامی مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔ اس کا پہلا بڑا مشاعرہ وہ تھا جو 1942ء میں فہیم کالج کانپور کی جانب سے نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد وہ تواتر کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتا رہا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، احسان دانش وغیرہ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان شعرا کی موجودگی میں اپنی جگہ بنالینا آسان نہیں تھا لیکن نوجوان اقبال عظیم کو غور سے سنا جانے لگا تھا۔ اس کی غزلیں ساقی، زمانہ، ادب لطیف، ہمایوں اور نیرنگ خیال میں شائع ہونے لگیں۔

اس کے بڑے بھائی سید وقار عظیم مشہور ادبی جریدے آج کل کے مدیر تھے۔ انہوں نے اقبال کی غزل کسی رسالے میں دیکھی تو مدیر کی حیثیت سے اسے خط لکھا اور کلام بھیجنے کی فرمائش کی۔ یوں اقبال عظیم کا کلام آج کل میں بھی شائع ہونے لگا۔

1943ء میں اس کی شادی تایازاد زینت جہاں سے ہوئی۔ زینت جہاں ایسی بیوی ثابت ہوئی جسے شوہر کی خدمت کے سوا کوئی کام ہی نہیں تھا۔ شاعر شوہر کو سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔ زینت جہاں نے یہ فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ان کے ہاں دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ شاہین اقبال، فرخ اقبال بیٹیاں تسکین اقبال اور فردوس اقبال۔

اس کی قسمت میں تبادلے اور تبادلے ہی لکھے ہوئے تھے۔ کبھی گورکھپور میں کبھی الہ آباد میں کبھی فیض آباد میں۔ کبھی بیوی ساتھ کبھی اکیلے ہی سیر خوباں کو چلے جاتے ہیں۔

ان مصروفیات سے ذرا نظر چوکی تو اندازہ ہوا کہ حالات تو کسی اور ہی طرف جا رہے ہیں۔ اب لڑکپن نہیں تھا کہ صرف آئینہ ہی سامنے ہوتا۔ غم جاناں سے نکل کر بات غم دوراں تک آگئی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات دگرگوں ہیں۔ اب وہ غم ذات سے نکل کر ادھر ادھر نظر ڈال رہا تھا۔ سیاسی فضا بہت مکدر ہونے لگی تھی۔ فضا میں قیام پاکستان کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا کہ اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالے۔ کسی کے سوچتے رہنے سے وقت نہیں تھم جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی ہندوستان تقسیم ہوگیا۔ ایک نئی مملکت پاکستان کے نام سے وجود میں آگئی جس کے دو بازو تھے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔

یہ تقسیم یونہی نہیں ہوگئی تھی، فسادات کی آندھیوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد ہوئی تھی۔ اس نے اس سفاکی کو نہایت قریب سے دیکھا تھا۔ مدتوں گھر میں دبکا بیٹھا رہا تھا اگر کہہ رہا تھا تو یہ

بستیاں خاموش ہیں خلق خدا خاموش ہے
راستے ویران ہیں ساری فضا خاموش ہے
ایک ایسا سانحہ پیش آگیا ہے راہ میں
کارواں تو کارواں خود رہنما خاموش ہے

یہ کہہ کر دل کو صبر کی تلقین کرتا رہا۔

جو گزر رہی گزار دو نہ برا کہو نہ گلہ کرو
جو تمہارا حال ہے دوستو وہی سارے شہر کا حال ہے
دعا کرو کہ رہیں اپنی بستیاں آباد
ہمارا کیا ہے کوئی اپنا گھر نہ ہو نہ سہی

جب کچھ حالات سنبھلے تو اس نے ایک مرتبہ پھر ملازمت کی دہلیز پر قدم رکھ دیا لیکن دہلیز پار کرتے ہی اسے اجنبیت کا احساس ہونے لگا۔

اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طواف در و دیوار کرے ہے

پاکستان بنتے ہی ہندوؤں کی آنکھیں ماتھے پر چلی گئیں۔ اچانک سب کچھ بدلا بدلا نظر آنے لگا۔ صاف نظر آنے لگا کہ اس چمن میں اب اپنا گزارا نہیں۔ اجنبیت کا احساس فزوں سے فزوں تر ہوتا گیا۔ جب تک انگریز حکومت کررہا تھا مقابلے کی فضا پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہندو، مسلمان ایک ہی کشتی پر سوار تھے لیکن انگریز کے رخصت ہوتے ہی مسلمانوں کا وجود ہندوؤں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ وہ کھلے بندوں یہ کہتے نظر آنے لگے کہ مسلمانو! جب تمہارا الگ ملک بن گیا تو ہندوستان میں کیوں ہو؟ پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟ یہ طعنے اسے روز سننے کو ملتے تھے۔ زبان سے نہ سہی آنکھوں سے سہی۔ مسلمان اقلیت میں تھے۔ یہاں ان کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ وہ سوچتا تھا وہ تو یہاں جیسے تیسے گزارلے گا اس کے بچوں کا کیا ہوگا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا کہ اسے پاکستان چلے جانا چاہیے۔ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ بہت سے دوسرے مسلمانوں کی طرح اس کے سامنے بھی یہ مشکل تھی کہ بزرگوں کی ہڈیاں یہاں دفن ہیں۔ وہ بہت دنوں اس الجھن میں مبتلا رہا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اس نے بیوی سے مشورہ کیا لیکن وہ گھر میں بیٹھنے والی اتنا اہم فیصلہ کیسے کرسکتی تھی بس اتنا ہی کہہ سکی، میں تو آپ کے ساتھ ہوں جو فیصلہ کریں مجھے قبول ہے۔

بہت سے رشتے دار بھی پاکستان جاچکے تھے۔ کئی دوست بھی رخصت ہوچکے تھے، بالآخر اس نے بھی فیصلہ کرلیا۔ خاموشی سے خط کتابت کے ذریعے کسی معقول ملازمت کے لیے کوششیں کرتا رہا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج ڈھاکا سے پیشکش آئی تو اس نے سامان سفر باندھنا شروع کردیا۔ ایک مرتبہ پھر اودھ کی گلیاں چھوڑنے کا دکھ اس کی روح میں اتر گیا۔

دیوانے کے ہاتھوں میں یہ مٹی ہے کہاں کی
چومے ہے کبھی اور کبھی آنکھوں سے ملے ہے

1950ء کا کوئی مہینا تھا کہ وہ ڈھاکا (مشرقی پاکستان) پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی ایک شاندار ملازمت اس کی منتظر تھی۔ اسے ڈھاکا کالج میں بطور لیکچرر تعینات کردیا گیا۔

ایک باعزت ملازمت اور یہ خوشی کہ وہ ایک اسلامی ملک میں ہے اس کی روح کی بالیدگی کے لیے بہت تھا۔ یہاں کی شاندار ادبی فضا بھی اس کے لیے باعث تقویت تھی۔ نہایت بڑے نام یہاں کے مشاعروں میں دادِ سخن

ایک غیر مطبوعہ غزل

بوجھ جو اٹھ نہیں سکتا وہ اٹھاتے کیوں ہو
عشق کرتے ہو تو پھر اشک بہاتے کیوں ہو
عشق تو نام ہے اک جرأت رندانہ کا
عشق جب کر ہی لیا ہے تو چھپاتے کیوں ہو
شہر کے شور میں معیار سماعت معلوم
تم گراں گوشوں کو روداد سناتے کیوں ہو
تتلیاں بھی کھرے کھوٹے کی پرکھ رکھتی ہیں
پھول گلدانوں میں کاغذ کے سجاتے کیوں ہو
کہیں ایسا نہ ہو تم ترکِ سخن کر بیٹھو
ناشناسوں میں غزل اپنی سناتے کیوں ہو

خراج تحسین

بنیادی طور پر اقبال عظیم غزل کے شاعر ہیں لیکن ذرا ان کی غزلوں کے اشعار دیکھیے ان کی علامات کے تجزیے کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ محض فاعلاتن فاعلاتن فاعلات نہیں۔ اس میں ایک پورے دور کی تاریخ ہے اور یہ تاریخ غزل کی زبان میں ہے۔

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

اقبال عظیم نعت کے سلسلے میں نہ تو اساتذہ کے چربہ گر ہیں اور نہ جدیدیت کے شعبدہ کار۔

(احسان دانش)

انہیں پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ان کا محرک مشاعرہ نہیں بلکہ وہ عشق ہے رسولؐ ہے جو فی الواقع شاعر کی روحانی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

(نظیر صدیقی)

دے رہے تھے۔ وحشت کلکتوی، عندلیب شادانی، فضلی، سرور بارہ بنکوی، سلیم اللہ فہمی، افسر ماہ پوری وغیرہ کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی۔ ایسے مشاعرے بھی ہوئے جن میں مغربی پاکستان کے شعرا نے شرکت کی۔ اپنے کلام کے ذریعے وہ مغربی پاکستان بھی متعارف ہوگیا۔

کچھ دنوں ڈھاکا کی گلیوں میں گھومنے کے بعد اسے ڈاکٹر عندلیب شادانی سے ملاقات کا خیال آیا۔ ان کا نام وہ اس وقت بھی سنتا رہا تھا جب وہ لکھنؤ میں تھا لیکن ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب جو اسے معلوم ہوا کہ وہ ڈھاکا

یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہیں تو اس پر فرض ہوگیا کہ وہ ان سے ملاقات کرے۔ وہ بہ آسانی یونیورسٹی جا کر ان سے ملاقات کرسکتا تھا لیکن اس نے یہی بہتر سمجھا کہ ان کے گھر جا کر ان سے ملاقات کرے۔

چھٹی کا دن تھا، وہ صبح کے دس گیارہ بجے گھر سے نکل پڑا۔ پتا پہلے ہی معلوم کرلیا تھا۔ گلیوں گلیوں ہوتا ہوا وہ اس بنگلے کے گیٹ تک پہنچا جسے شادانی صاحب کی قیام گاہ بتایا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر گیٹ کے سامنے کھڑا رہا کہ شاید کوئی باہر نکلے اور اس سے آنے کا سبب پوچھے۔ اتنے میں ایک صاحب کمرے سے نکلے اور برآمدے میں آئے۔ سفید براق کرتہ پاجامہ پہنے، آنکھوں پر عینک، پاؤں میں چپل، صاف رنگ چھریرا جسم، نکلتا ہوا قد، ایک تخت پڑا تھا اس پر بیٹھ گئے۔ وہاں کچھ کاغذ پہلے ہی رکھے ہوئے تھے وہ ان کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ اب اقبال کی ہمت ہوئی۔ وہ بیرونی گیٹ سے تو پہلے ہی اندر آچکا تھا ہمت کرکے برآمدے میں چلا گیا۔ ان صاحب نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے سلام کیا اور شادانی صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ''میں شادانی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''فرمایئے میں ہی شادانی ہوں۔''

''قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔'' اس نے کہا اور شادانی صاحب نے بڑی شفقت سے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''تو اب کچھ اپنے بارے میں بتایئے۔''

''میرا نام اقبال عظیم ہے۔ حال ہی میں لکھنو سے آکر ڈھاکا کالج میں لیکچرر مقرر ہوا ہوں۔''

''تو آپ ہیں اقبال عظیم۔ مجھے کسی نے بتایا تو تھا غالباً آپ کی شاعری پر بات نکلی تھی۔ اتفاق یہ ہے کہ پچھلے دنوں کئی مشاعروں میں شریک نہ ہوسکا ورنہ آپ سے ملاقات ضرور ہوجاتی۔''

وہ تھوڑی ہی دیر میں ایسے بے تکلف ہوگئے جیسے برسوں سے اسے جانتے ہوں۔ وہ ان بڑے لوگوں میں سے نہیں تھے جو گفتگو کے دوران اجنبیت کی دیوار کھڑی کیے رہتے ہیں اور گفتگو یک طرفہ رہتی ہے۔ وہ خود بھی بول رہے تھے اور اسے بھی بولنے کا موقع دے رہے تھے۔

اس ملاقات کے بعد وہ اکثر ان سے ملاقات کے لیے جانے لگا۔ بات یہ تھی کہ ڈھاکا میں بنگالی زبان بولی جاتی تھی لہٰذا جہاں اردو بولنے والے یا اردو سے شغف رکھنے والے مل جاتے تھے خوب دل بستگی سے ملتے تھے اور شادانی صاحب تو سر سے پاؤں تک اردو تھے۔ ڈھاکا میں کوئی ادیب و شاعر ایسا نہیں تھا جو شادانی صاحب کے پاس حاضری نہ دیتا ہو۔

ایک روز وہ ان کے پاس بیٹھا تھا اور مختلف جامعات کی تعلیمی حالت پر گفتگو ہو رہی تھی کہ شادانی صاحب نے اچانک گفتگو کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔

''میاں تم ریسرچ کیوں نہیں کرتے۔ تعلیمی قابلیت بڑھا لوگے تو ترقی کے امکانات بھی ہوں گے اور تمہارے ذوق کی آبیاری بھی ہوگی۔''

''سوچتا تو ہوں لیکن ذرا یہاں قدم تو جم جائیں۔''

''قدم جمانے کے لیے ہی تو کہہ رہا ہوں۔ سختیاں آسانیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ پی ایچ ڈی کرلوگے تو ذرا بااعتبار ہوجاؤ گے۔ نوجوان ہو ابھی تمہیں بہت آگے جانا ہے۔''

''آپ کوئی موضوع دیجیے میں کام شروع کرتا ہوں۔''

''موضوع تو بڑے سامنے کا میرے ذہن میں ہے۔ تم بہ آسانی اس پر کام کرلوگے۔ بنگال میں اردو پر قلم کے جوہر دکھایئے۔''

اس نے شادانی صاحب کے مشورے سے ڈھاکا یونیورسٹی میں بطور ریسرچ اسکالر داخلہ لے لیا اور مواد جمع کرنا شروع کردیا۔

تحقیقی مقالہ دو سال کے اندر مکمل کرنا تھا لیکن ضابطے کے مطابق ڈھاکا میں کم از کم ایک سال کا قیام ضروری تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ جب ایک سال پورا ہونے میں ایک مہینا رہ گیا تھا اس کا تبادلہ چاٹگام ہوگیا۔ یوں اس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا اضافہ نہ ہوسکا۔

چاٹگام میں اس نے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے سات سال گزارے۔ 57ء تک وہ چاٹگام میں رہا اور اس کے بعد اس کا تبادلہ دوبارہ ڈھاکا کالج میں ہوگیا جہاں وہ 70ء تک صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

☆☆☆

اس کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی لیکن اب وہ استاد اردو کی حیثیت سے بھی اپنی ذمے داریاں محسوس کررہا

تھا اس کے لیے اس نے نہایت سنجیدگی سے نثر کی طرف توجہ مرکوز کردی۔ ادبی، لسانی، ثقافتی اور معاشرتی موضوعات پر مضامین لکھے اور علم وادب میں گرانقدر اضافہ کیا۔

اس کی سب سے پہلی کتاب سات ستارے تھی۔ اس کتاب میں سات معماران پاکستان کی مختصر سوانح تھی۔

ان شخصیات میں سر سید احمد خان، سر سلیم اللہ، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، قائد اعظم اور لیاقت علی خان شامل تھے۔ یہ کتاب ڈھاکا سے شائع ہوئی۔

دوسری کتاب ''مشرقی بنگال میں اردو'' لکھی۔ یہ غالباً اسی مواد پر مشتمل تھی جو انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے جمع کیا تھا۔ اس کتاب میں انہوں نے تقریباً دو صدی کے چوبیس مشاہیر اور 132 دیگر ارباب قلم کے حالات درج کیے۔ یہ کتاب بھی ڈھاکا سے شائع ہوئی۔

وہ تحقیقی کاوشوں میں برابر مشغول رہا۔ حکیم ناطق لکھنوی کا دیوان مرتب کیا اور اس کا مقدمہ تحریر کیا۔ اس کے علاوہ درجنوں نصابی و غیر نصابی کتب لکھیں جو اب نایاب ہیں مثلاً بہار اردو اور اقبال اردو، عندلیب شادانی کے ساتھ ایک ٹیکسٹ بک بھی لکھی جسے ڈھاکا ٹیکسٹ بک بورڈ نے شائع کیا۔

انگریزی زبان میں ''ایسٹ پاکستان ڈسٹرکٹ گزیٹر'' شائع ہوا۔ اس کے لیے اس نے صوبے کے انیس اضلاع کے متعلق اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر انگریزی زبان میں ابواب لکھے۔

اس نے بنگالی افسانوں کے تراجم بھی کیے۔ لاتعداد مضامین لکھے جو ماہ نو، مہر نیمروز، ادب لطیف اور ساقی وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ ریڈیو ڈھاکا سے تقریری سلسلے بھی جاری رہے۔

☆☆☆

1963ء میں زندگی بھر کی ساتھی رفیقہ حیات زینت جہاں اچانک ساتھ چھوڑ گئیں۔ شادی کو صرف بیس سال ہوئے تھے کہ وہ تنہا رہ گئے اور تنہا بھی اس عالم میں کہ بڑے بیٹے کی عمر صرف سترہ سال تھی اور چھوٹی بیٹی صرف نو سال کی تھی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا تمام تر بوجھ اس پر آن پڑا۔ یہ صدمہ ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ ملازمت کا جھنجٹ، لکھنے پڑھنے کا کام اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار۔ دوستوں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ اس کی عمر بھی صرف پچاس سال تھی اور کوئی بچہ اپنے پیروں پر

تصانیف نثر

سات ستارے، مشرقی بنگال میں اردو، آنکھوں دیکھی روح سخن، رہنمائے تلفظ، دیوان ناطق (مرتب)، بنگلہ سے اردو میں تراجم، درجنوں نصابی کتب جواب ناپید ہیں

شعری مجموعے

مضراب، مضراب ورباب، لب کشا، ماحصل (کلیات)، نادیدہ، چراغ آخر شب، پیکر نور، زبور حرم

کھڑا نہ ہوسکا تھا۔ یہ مشورہ نہایت صائب تھا کہ وہ دوسری شادی کرلے۔ کئی اچھے رشتے آئے بھی لیکن اس نے مرنے والی سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری بچیاں کسی اور کے حوالے نہیں کروں گا۔ اسے یہ وعدہ پورا کرنا تھا اس نے شادی سے انکار کردیا۔

اس نے بچوں کی تربیت اور پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور بچوں کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور جب شادی کا وقت آیا تو شادی کے انتظامات خود اپنی نگرانی میں کروائے۔

بیوی کے انتقال کو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کی آنکھیں جواب دینے لگیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی بینائی تیزی سے خراب ہورہی ہے۔ یہ بظاہر کوئی تشویش کی بات نہیں تھی، لکھنے پڑھنے والوں کی آنکھیں کمزور ہوہی جاتی ہیں۔ وہ بھی اسی خیال سے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا کہ چشمہ لگ جائے گا اور آنکھیں ٹھیک ہوجائیں گی لیکن ڈاکٹر نے معائنے کے بعد جو انکشاف کیا وہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

''آپ کو گلوکوما یعنی آنکھوں کا بلڈ پریشر ہوگیا ہے۔''

''اس کا علاج ہے؟''

''کیوں نہیں۔ علاج سے ٹھیک ہوسکتا ہے۔''

جب علاج شروع ہوا اور مزید معائنہ ہوا تو ایک انکشاف اور ہوا۔ ''بائیں آنکھ تو زیادہ خراب ہوگئی ہے البتہ دائیں آنکھ علاج سے ٹھیک ہوجائے گی۔''

علاج ہوتا رہا اور کچھ بہتری آگئی۔ دو سال آرام سے گزر گئے۔ 1965ء میں ایک مرتبہ پھر سخت درد اٹھا۔ اب اسے بتایا گیا کہ اس کا علاج آپریشن ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے سے وہ آپریشن کے لیے تیار ہوگیا۔ سرجن نے آنکھ کا آپریشن کیا جو کامیاب نہ ہوا اور اس کی بینائی معمولی

رہ گئی۔

اس معمولی بینائی کے باوجود وہ عضو معطل بن کر نہیں رہا حصول علم کا جو شوق تھا اس میں بھی مصروف رہا اور تخلیقی و تحقیقی کام بھی انجام دیتا رہا۔

اس کمزور بینائی کے باوجود اس نے بنگلہ زبان کا اعلیٰ معیار کا امتحان بنگلہ اکیڈمی سے پاس کیا۔ اس کی اسی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت مشرقی پاکستان نے اس کی خدمات مستعار لے لیں اور وہ مشرقی پاکستان چھوڑنے تک (عارضا) یعنی ڈپوٹیشن پر سینئر ریسرچ آفیسر کے طور پر سیکریٹریٹ حکومت مشرقی پاکستان میں کام کرتا رہا۔

اس کی ذاتی زندگی غموں اور الجھنوں سے بوجھل تھی لیکن وہ مسکراتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ذاتی غموں میں دوسروں کو شریک کرنے کا قائل نہیں تھا۔

ہمارا غم ہمارا ایک ذاتی مسئلہ ہے
زمانے بھر کو افسانہ سنا کر کیا کریں
زخم دل سارے زمانے کو دکھانے سے رہے
آبرو ہم سر بازار لٹانے سے رہے

وہ اپنے ذاتی غم چھپا سکتا تھا لیکن جب یہ غم پھیل کر زمانے کے غم بن گئے تو وہ خاموش نہ رہ سکا۔ اس کی غزلیں چیخ چیخ کر اس کا اظہار کرنے لگیں۔

اس دیار غیر میں وہ لٹ چکی مدت ہوئی
جس کو خوش فہمی سے اب تک آبرو کہتے ہیں لوگ

....

جہاں بھی ہم نے صدا دی یہی جواب ملا
یہ کون لوگ ہیں پوچھو کہاں سے آئے ہیں

....

نکلے تھے گھر سے جس کے تحفظ کے واسطے
مٹی میں مل گئی وہ شرافت رہی سہی

....

مشرقی پاکستان کی سیاست میں شروع ہی سے تعصب کے رنگ کو شامل کردیا گیا تھا۔ پہلے پہل اردو، بنگلہ تنازع نے زور پکڑا اور نفرت کا یہ زہر زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی گھل گیا۔ غیر بنگالیوں اور مہاجروں کے لیے زندگی دوبھر ہوگئی۔ اقبال نے اس کرب کو شدت سے محسوس کیا۔ نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کی شاعرانہ حس نے وقت سے پہلے اسے باور کروادیا کہ صوبائی عصبیت انجام کار اپنا رنگ ضرور دکھائے گی۔ اس نے ان حالات کو اپنی غزلوں کے ذریعے دوسروں کو بھی دکھایا۔

ہم سزا کے مستحق ہوتے تو کوئی غم نہ تھا
بے خطا حکم سزا ہوجائے تو ہم کیا کریں
ظلم سے ہم ڈر گئے یہ تم سے کس نے کہہ دیا
ظلم قانوناً روا ہوجائے تو ہم کیا کریں
شکوہ سنجی کی ہمیں اقبال عادت تو نہیں
زندگی صبر آزما ہوجائے تو ہم کیا کریں

خدا بچائے گلستان کو باغبانوں سے
یہ گل فروش ہیں ان میں کسی کا ٹھیک نہیں

حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ وہ بنگالیوں کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ جلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ ویسے ہی الاؤ تھے جو وہ ہندوستان میں ہندوؤں کی آنکھوں میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے آنے والے بحران سے پہلے ہی ہجرت کا فیصلہ کرلیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اسی دوراہے پر کھڑا تھا جہاں وہ ہندوستان سے ہجرت کے وقت کھڑا تھا۔ اس نے مشرقی پاکستان میں زندگی کا بہترین حصہ گزارا تھا۔ اب اسے یہاں سے دیس نکالا مل رہا تھا لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ بعض جگہوں پر خونریز ہنگامے شروع ہوچکے تھے۔ یہ وہ زمین تھی جہاں اس کی بیوی دفن تھی لیکن اب وہ اپنی اور بچوں کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دیا، بچوں کو سمیٹا اور اپنے بھائی وقار عظیم کے پاس لاہور چلا آیا۔ یہ فروری 1970ء کی بات ہے۔

مشرقی پاکستان سے جو خبریں آرہی تھیں اس کے بعد اس کا یوں بخیر و عافیت مغربی پاکستان چلے آنا خوشی کی بات تھی۔ بھائی کے گھر میں خوشیوں کے چراغ جل اٹھے۔

لاہور کی ادبی حیثیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ یہاں پہنچتے ہی اسے شاعروں نے گھیر لیا۔ اس کے بھائی نے اس کی دل بستگی کے لیے اپنے گھر باہانہ نشستوں کا انتظام کیا۔ ان نشستوں میں ناصر کاظمی، صوفی تبسم، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور محبوب خزاں جیسے معروف شعرا شریک ہوتے تھے۔

وہ لاہور میں اپنی بے پناہ پذیرائی کے باوجود نہ جانے کیوں لاہور میں چند ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے اور کراچی

چلے آئے۔ کراچی میں بھی اس کے چاہنے والے کم نہ تھے۔

وہ کراچی ہی میں تھے کہ سقوطِ ڈھاکا کا وہ سانحہ پیش آگیا جس کی پیش گوئی اس کے دل نے پہلے ہی کر دی تھی۔ مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہوگیا۔ وہ شدتِ غم سے چیخ اٹھا۔ رومانوی شاعر اب کسی اور ہی انداز میں نغمہ سرا تھا۔

بستیاں خاموش ہیں خلق خدا خاموش ہے
راستے ویران ہیں ساری فضا خاموش ہے
ایک ایسا سانحہ پیش آگیا ہے راہ میں
کارواں تو کارواں خود رہنما خاموش ہے
پا شکستہ ہو کے یوں بیٹھا ہے سارا قافلہ
دم بخود ہیں منزلیں بانگ درا خاموش ہے

☆☆☆

جب اس سانحے کی حیرانی کچھ کم ہوئی اور ذہن تجزیہ کرنے کے قابل ہوا تو بقول مومن خاں مومن ''ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا والا'' معاملہ پیش آیا۔ لوگ اسے تقدیر کا فیصلہ کہتے تھے اور وہ اسے اپنا کیا دھرا کہہ رہے تھے۔

تم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں اپنے
بے سبب گردشِ ایام کو الزام نہ دو
عین مقصود سمجھ بیٹھے تھے آغاز کو تم
اب اس آغاز کے انجام کو الزام نہ دو

اس کے نزدیک مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی سازش میں غیروں کے علاوہ اپنے بھی شریک تھے۔

چمن کے لوگ جب خود ہیں شریک گل فروشی
تو ہم اپنا نشیمن ہی بچا کر کیا کریں گے

اس عظیم سانحے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اپنا محاسبہ کرتے اور وجوہ تلاش کرتے لیکن ہوا یہ کہ ہم نے حتی الوسع چاہا کہ اس پر پردہ پڑا رہے۔

زخموں پہ تاکہ اوروں کی نظریں نہ پڑ سکیں
زخمی بدن سلیقے سے کفنا دیا گیا
مقتل کو نام گنج شہیداں عطا ہوا
نغموں سے سوگواروں کو بہلا دیا گیا
جشن شکست ہم نے منایا بالا اہتمام
غیرت کو دھوم دھام سے دفنا دیا گیا

☆☆

اس نے ہجرت کے غم کو بھلانے کی بہت کوشش کی لیکن یادیں تھیں کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ اب تو وہ یہ چاہتا تھا کہ ان واقعات کا ذکر ہی نہ چھیڑا جائے۔

اب تو آنسو بھی میرے پاس نہیں
بے سہاروں کا ذکر مت چھیڑو
چند یادیں ہیں جن سے وابستہ
ان دیاروں کا ذکر مت چھیڑو

اس کی شاعری اب ایسا نوحہ بن گئی تھی جسے مشرقی پاکستان کی تاریخ کہا جاسکتا تھا۔ وہ جب مشاعروں میں جا نکلتا اور یہ نغمے چھیڑتا تو خود بھی روتا اور دوسروں کو بھی رلاتا۔

☆☆☆

کراچی کے خالقدینا ہال میں کوئی مشاعرہ تھا۔ اس کے لیے گاڑی آچکی تھی۔ وہ جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا کہ اچانک آنکھ میں شدید درد اٹھا۔ یہ ویسا ہی درد تھا جس کی چمک اس نے اس وقت محسوس کی تھی جب مشرقی پاکستان میں تھا البتہ یہ اضافہ ہو چکا تھا کہ اب اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے اس گاڑی میں جو اسے لینے آئی تھی مشاعرے کی بجائے ڈاکٹر کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے مختلف معائنوں کے بعد واضح کر دیا کہ ایک آنکھ تو بالکل ہی ختم ہو چکی ہے دوسری آنکھ کا آپریشن ہوگا۔

سوانحی خاکہ

نام...... سید اقبال عظیم
والد...... سید مقبول عظیم عرش
دادا...... سید فضل عظیم فضل
نانا...... ادیب میرٹھی
والدہ...... محمود فاطمہ
دوسری والدہ...... کلثوم فاطمہ
بھائی...... سید وقار عظیم
اولاد...... شاہین اقبال، تسکین اقبال، فردوس اقبال، فرخ اقبال
زوجہ...... زینت جمال
تعلیم...... ایم اے اردو
وطن...... میرٹھ
پیدائش 8 جولائی 1913ء
وفات...... 22 ستمبر 2000ء
تدفین...... سخی حسن قبرستان، کراچی

یہ آپریشن بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ ایک آنکھ تو ختم ہو ہی چکی تھی دوسری میں بھی صرف اتنی روشنی بحال ہو سکی کہ بڑے نمبر کی عینک لگا کر چیزوں کو نزدیک سے دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

وہ کئی مہینے اندھیروں سے جنگ کرتا رہا اور ایک مرتبہ پھر مشاعروں میں جانے کے قابل ہو گیا لیکن اس طرح کہ مشاعروں کے منتظمین اسے سہارا دے کر اسٹیج تک پہنچا دیتے۔ وہ کلام پڑھتا تو زبانی پڑھتا۔ حافظہ ایسا تھا کہ کوئی فرمائش ہوتی تو کچھ دیر سوچنے کے بعد پوری غزل پڑھ دیتا۔ فرمائشیں ہوتی رہتیں اور وہ حافظے کا دفتر کھنگالتا رہتا۔ کبھی بیاض کھولنے کی ضرورت پڑتی بھی تو ابھی اتنی روشنی تھی کہ دبیز عینک کی مدد سے پڑھ سکتا تھا۔

اس وقت کراچی کی ادبی فضا اپنے عروج پر تھی۔ وہ قابل ذکر شعرا موجود تھے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی آئے تھے۔ آرٹس کونسل ہو یا خالقدینا ہال نشتر پارک ہو یا کٹرک ہال یا وائی ایم سی اے گراؤنڈ بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ مضافاتی بستیاں بھی مشاعروں کا بار سنبھالے ہوئے تھیں۔ بیرون شہر بھی شعرا کے قافلے روانہ ہوتے رہتے تھے۔ اس کا شاعرانہ ترنم، پُرسوز لہجہ، ملکی سیاست کی دردمندانہ عکاسی ان مشاعروں کی جان بنے ہوئے تھے اور وہ ہر مشاعرے میں بلایا جاتا تھا۔ کیسے کیسے نام تھے جن کی ہمراہی میں وہ راتیں کاٹ رہا تھا۔ سید آل رضا، رعنا اکبرآبادی، سید محمد جعفری، بہزاد لکھنوی، ماہرالقادری، اقبال صفی پوری، امید فاضلی، قمر جلالوی کتنے نام تھے جن کے جھرمٹ میں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اب اس کی عشقیہ شاعری نے سماجی شعور کا روپ دھار لیا تھا۔ اس نے کمال یہ کیا تھا کہ غزل کی زبان ہجرت کی تاریخ رقم کر دی تھی۔ اس نے اپنی غزلوں کو قوم کے لیے وقف کر دیا تھا۔

وطن سے اس کی محبت کا تقاضا تھا کہ وہ وطن کی مٹی کو باہر کے ممالک کے سنگ مرمر پر ترجیح دے

اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

....

دعا بھی صرف عزائم کا ساتھ دیتی ہے
دوا کے درد بھی ڈھونڈو فقط دعا نہ کرو

....

اس کی اسی حب الوطنی کا تقاضا تھا کہ وطن کے حالات پر تعمیری تنقید کرتا ہے۔

جو لوگ نذر سیل ہوئے ان کا غم نہیں
شہروں کے لوگ خوش ہیں کہ دریا اتر گئے

عہد حاضر کی ہر اک بات ہمیں دل سے قبول
صرف توہین روایت نہیں ہوگی ہم سے

....

جو نظر بچا کے گزر گئے مرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ مرے ہی شہر کے لوگ تھے مرے گھر سے گھر ہے ملا ہوا

....

گلشن کی بہاروں میں شامل ہے لہو جن کا
وہ لوگ ہیں گلشن میں اب صرف تماشائی
اے قافلے کے لوگو ذرا جاگتے رہو
سنتے ہیں قافلے میں کوئی رہنما بھی ہے

....

بہت کم شاعر ہوں گے جنہوں نے غزل کو اس طرح استعمال کیا ہوگا۔ اس نے غزل کو اس ملک کی تاریخ بنا دیا اور وہ بھی اس طرح کہ غزل کی نزاکتیں اور لطافتیں مجروح نہیں ہونے دیں۔

غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں کلاسیکی روایت سے استفادہ کرنے کی گنجائش دیگر تمام اصناف سے زیادہ ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا چنانچہ اس نے غزل کی روایت سے بھرپور اکتساب کیا لیکن وہ وہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ موضوعاتی وسعت پیدا کرنے کے لیے کامیاب کوششیں کیں۔ اسے ایک لحاظ سے جدید غزل گو نہیں کہا جاسکتا لیکن اگر جدید غزل کا تقاضا یہ ہے کہ انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف سفر کیا جائے تو وہ جدید غزل گو تھا۔ اس نے انفرادی دکھوں کو اجتماعی مسائل میں گم کر دیا۔

پاکستانی غزل کا ایک وصف اعلیٰ قدروں کا فروغ ہے لیکن غزل میں ان قدروں کی تبلیغ نہایت نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ اقبال عظیم کا یہ کمال ہے کہ وہ ان مراحل سے اس طرح گزرتا ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کوئی ہمیں نصیحت کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں انہی قدروں کا حامل تھا۔

جھک کر سلام کرنے میں کیا حرج ہے مگر
سر اتنا مت جھکاؤ کہ دستار گر پڑے
احساس حمیت اہل نسب کی سب سے بڑی کمزوری ہے

وہ اپنوں سے بھی حالِ پریشاں کہتے ہوئے شرماتے ہیں

☆☆

ہم نے خود پیدا کیے ہیں مسئلے
ورنہ سچی بات ہے مسئلہ کوئی نہیں

اعلیٰ اقدار کی اس تبلیغ و ترسیل نے اسے نعت گوئی کی اعلیٰ منازل تک پہنچا دیا۔ اس نے جب نعت نگاری شروع کی تو پاکستان میں اس پاکیزہ صنف کی خوب گرم بازاری تھی۔ ایسے شعرا بھی تھے جنہوں نے مشاعرے کی ضرورت کے لیے نعتیں لکھی تھیں اور ایسے شعرا بھی تھے جنہوں نے اس صنف سخن پر خاص توجہ دی تھی۔ اقبال عظیم نے جب مدح رسول کو اپنایا تو اپنا شمار اس قبیل کے شعرا میں کرا لیا جنہوں نے نعت گوئی کو اپنا شعار بنا لیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے نعت گوئی اس کی شناخت بن گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کی نعتوں کو عوام میں بے حد مقبولیت ہوئی۔ کلام کی سادگی، روانی، موسیقیت، خلوص اور جاذبیت کی بدولت نعت خوانوں نے اس کے کلام کو اپنایا اور عوام تک پہنچایا۔ بعض نعتیں تو ایسی مقبول ہوئیں کہ وردِ زباں ہو گئیں۔

اس نے اپنی نعتوں میں صرف عقیدت و محبت کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ فنی باریکیوں اور نعت گوئی کے بنیادی تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا۔

نعت لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر عاشق رسول ہونے کے ساتھ ساتھ توحید و رسالت اور عبدیت کے نازک رشتوں کو پوری طرح سمجھتا ہو۔ اقبال نے بھی محبت کا حق ادا کیا لیکن شریعت کی پاسداری کے ساتھ

بہت جی چاہتا ہے سجدہ کرلوں پائے اقدس پر
شریعت سے مگر مجبور ہے شوقِ جبیں سائی

سراپا نگاری نعت گوئی کا ایک بڑا حصہ ہے۔ ہر نعت گو شاعر نے سراپائے حضور کو اپنے لفظوں میں اپنی بساط کے مطابق ادا کیا ہے، اقبال عظیم بھی غزل کی پوری روایت کو سامنے رکھتے ہوئے جمالِ محمد کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

رخِ پُرنور پر شمس الضحیٰ کی تاب و تابانی
جبینِ پاک پر بدرالدجیٰ کی جلوہ فرمانی
تکلم حرفِ قدوسی تبسم رمزِ لاہوتی
سراپا حسن و رعنائی تمامی زیب و زیبائی
کھنچی ہے کس نے نور کی تصویر آج تک
سمجھائے کوئی کیسے سراپا حضور کا

مدح رسول کا تقاضا ہے کہ حضورؐ کے اوصاف حمیدہ بیان کیے جائیں۔ اقبال عظیم کی نعتیں ان اوصاف کی مفصل تصویریں ہیں لیکن وہ اس مشکل کو جانتے بھی ہیں

اسوۂ پاک محمد کا بیاں کیسے کروں
روح قرآن کی تفسیر کہاں سے لاؤں

....

لیکن وہ اسے بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ بھی نہیں دیتے

خطاب رحمت عالم ہے وہ خطاب جلیل
بجز حضور جو زیبا نہیں کسی کے لیے

....

ان کا در وہ در دولت ہے جہاں شام و سحر
بھیک ملتی ہے فقیروں کو صدا سے پہلے

....

کوئی رسول رؤوف ورحیم ہے نہ کریم
خدا کے نام ہیں مختص حضور ہی کے لیے

....

سیرت پاک نبی کیا ہے نبی خود کیا ہیں
پوچھتے کس سے ہو قرآن اٹھا کر دیکھو

....

یہ اوصاف حمیدہ اپنی جگہ لیکن نعت گوئی کا اصل محرک ہے حضور پاک سے والہانہ عقیدت، اقبال عظیم نے کسی پیشہ وارانہ ضرورت کے لیے نعت نہیں لکھی بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں نبی کریم کی محبت کا جذبہ موجزن ہے جو انہیں نعت گوئی پر مجبور کرتا ہے۔

دل پہ جب قابو نہ ہو تو نعت گو بھی کیا کرے
ورنہ مدحت کی جسارت اور کرسکتا ہے کون

یہی وہ جذبۂ خاص ہے جس نے اسے خوب صورت الفاظ کے چناؤ میں اس کی مدد کی۔ یہ الفاظ اور طرز بیان اس کی نعتوں کو ایک ایسی پاکیزہ فضا میسر کرتے ہیں جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

نقاب شب عروس مہر نے چہرے سے سرکائی
شفق پھوٹی چمن جاگے کرن پھوٹی سحر آئی
ہوا کے نرم جھونکوں سے مہ و انجم کو نیند آئی
نمود صبح صادق اک پیام جانفزا لائی
حریم قدس میں محفوظ تھی جو روز اوّل سے
وہ نعمت آمنہ کی محترم آغوش نے پائی
جناب مصطفیٰ صلی علیٰ تشریف لے آئے

سواد طیبہ و بطحا پہ رحمت کی گھٹا چھائی

اور جب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی اس دنیا میں تشریف آوری ہوگئی تو پھر دنیا کی حالت بدلنی شروع ہوگئی تو

اجالا ہوگیا ظلمت کدوں میں مہر تاباں سے
طلسم جہل ٹوٹا زندگی نے روشنی پائی
شعور آدمیت جاگ اٹھا خواب غفلت سے
میسر آگئی اک قوم نابینا کو بینائی
عرب کے ریگزاروں میں کھلے توحید کے غنچے
وہ کیا آئے زمانے میں بہار مستقل آئی

☆☆

جب وہ عمرے کے لیے جانے لگے تو بے اختیار وہ نعت مبارک زبان سے ادا ہوئی جس نے انہیں عوامی حلقوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ
جبیں افسردہ افسردہ قدم لغزیدہ لغزیدہ
چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانب طیبہ
نظر شرمندہ شرمندہ بدن لرزیدہ لرزیدہ
کسی کے ہاتھ نے مجھ کو سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ راستے پے چیدہ پے چیدہ
غلامان محمدؐ دور سے پہچانے جاتے ہیں
دل گرویدہ گرویدہ سر شوریدہ شوریدہ

....

جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو کس حسرت سے کہا

چند سانسیں اور باقی ہیں ذرا جلدی کرو
قافلے والو مدینہ اور کتنی دور ہے

اور پھر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

بصارت کھوگئی لیکن بصیرت تو سلامت ہے
مدینہ ہم نے دیکھا ہے مگر نادیدہ نادیدہ

....

تھوڑی سی دیر کو مجھے بینائی چاہیے
بس اک جھلک حضور کا روضہ دکھائی دے

....

وہ عوام میں بہ حیثیت نعت گو تیزی سے مقبول ہورہا تھا اور اہل دانش بھی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے پر مجبور تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس کی نعتیں صرف عقیدت مندانہ جذبات کی تصویریں نہیں تھیں بلکہ اس نے مقصدیت کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا تھا۔

تعلیم مصطفیٰ کا تقاضا ہے بندگی
اور بندگی بھی کس کی غفور الرحیم کی
ہر در پہ سجدہ ریزی غلامانہ فعل ہے
توہین ہے یہ دین رسولِ کریم کی

....

عمل بھی شرط ہے اقبال عشق صادق کی
تمہارا فرض فقط مدحت و ثنا تو نہیں

....

غزل کی سابقہ مشق اس کے کام آرہی تھی۔ وہ شعری نزاکتوں سے آگاہ اور صنائع بدائع سے بخوبی بہرہ ور تھا۔ تشبیہات اور استعارات کے موزوں استعمال سے اس کے شعر نگینوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس نے ایک عرصہ تک غزل کو اپنائے رکھا تھا لیکن جب نعت اختیار کی تو اسی صنف سخن کا ہو کر رہ گیا۔

لطف غزل بھی اپنی جگہ خوب ہے مگر
نعت نبی کا کچ ہے مزا ہی کچھ اور ہے
غزل سرائی سے اقبال وہ کہاں حاصل
سرور و کیف جو ذکر نبیؐ سے ملتا ہے

معذوریِ چشم کے بعد اچھے اچھوں کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن اس کی زبان پر گلہ تک نہیں تھا۔ وہ تو یہ کہہ کر صبر کر لیا کرتا تھا

”جو دیدہ ور ہیں انہیں بھی نظر نہیں آتا۔“

وہ اپنی زندگی معمول کے مطابق گزار رہا تھا۔ مشاعروں میں شرکت بھی تھی، بیٹیوں کی شادی بیاہ کے مسائل بھی تھے۔ وہ صبح چار بجے بیدار ہوتا، تہجد کے بعد تسبیح پڑھتا اور پھر نماز فجر ادا کرتا۔ نماز پڑھنے کے بعد بالکونی میں چلا جاتا اور ایک گھنٹے تک چہل قدمی کرتا۔ چھ بجے کمرے میں واپس آتا اور ریڈیو پر حی علی الفلاح پروگرام سنتا پھر خبریں سنتا۔ سات بجے ناشتا کرتا، کپڑے بدلتا، شیو کرتا اور پھر گھنٹا بھر قرآن پاک سنتا۔ اس کے بعد دوستوں کو فون کرنے کا مرحلہ آتا۔ گیارہ بجے سے ایک بجے تک کا وقت دوستوں کے لیے مخصوص تھا پھر کھانا کھا کر نماز سے فارغ ہوتا۔

نماز مغرب کے بعد ریڈیو سننا شروع کرتا۔ بی بی سی سے خبریں اور نو بجے خبرنامہ سنتا۔ آخر میں بی بی سی سے خبریں سن کر پونے گیارہ بجے روشنی بند کر دیتا۔ دوسرے دن پھر صبح چار بجے بیدار ہونا ہوتا تھا۔

مہمان خلیفہ

عباسی خلیفہ مہدی شکار کھیلتے ہوئے ساتھیوں سے بچھڑ گیا اور ایک ویرانے میں جا نکلا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دور ایک خیمہ نظر آیا۔ گھوڑا دوڑا کر وہاں پہنچا تو خیمے کے سامنے ایک بدو بیٹھا تھا۔ خلیفہ نے اس سے کہا۔ ”بھائی میں راستہ بھول گیا ہوں اور اب تیرا مہمان ہوں۔“ بدو نے کہا۔ ”آپ امیر آدمی ہیں اگر مجھ غریب کا مہمان بننا پسند ہے تو جو کچھ میرے پاس ہے حاضر کیے دیتا ہوں۔“ خلیفہ نے کہا۔ ”اس وقت میں سخت بھوکا ہوں۔ جو کچھ ہے لے آؤ۔“ بدو نے اس کے سامنے ستو رکھ دیے۔ خلیفہ نے پیٹ بھر کر ستو کھائے۔ پھر بولا۔ ”مجھے پہچانتے بھی ہو؟ میں خلیفہ مہدی کے دربار میں افسر ہوں۔ کوئی پیاس دور کرنے والی چیز لاؤ۔“ بدو نے دودھ کا پیالہ پیش کر دیا۔ مہدی نے دودھ پی لیا مگر پیاس دور نہ ہوئی۔ وہ بولا۔ ”بھائی! مجھے پہچانتے بھی ہو۔ میں خلیفہ کی فوج کا سپہ سالار ہوں۔ کچھ اور لاؤ۔“ اب بدو نے ٹھنڈے پانی کا پیالہ پیش کیا۔ پانی پی کر خلیفہ نے کہا۔ ”بھائی سچ تو یہ ہے میں خود خلیفہ مہدی ہوں کچھ اور پانی لاؤ۔“ یہ سن کر بدو نے پیالہ ایک طرف رکھ دیا اور کہا۔ ”خدا کی قسم! اب تمہیں کچھ نہ دوں گا۔ ستو کھا کر تم دربار کے افسر بن گئے۔ دودھ پی کر سپہ سالار ہونے کا اعلان کیا اور اب پانی پی کر تم خلیفہ مہدی بن بیٹھے۔ اب اگر مزید پانی دے دیا تو تم پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرو گے۔“

خلیفہ مہدی اس کی مدلل بات سن کر ہنسنے لگا۔ اتنے میں اس کا لشکر وہاں آ گیا اور سپاہی جھک جھک کر اسے سلام کرنے لگے تو بدو سمجھ گیا کہ واقعی یہ خلیفہ مہدی ہے۔ وہ بے چارہ ڈر کر کانپنے لگا لیکن خلیفہ نے اس کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر بہت سی اشرفیاں دے کر اسے خوش کر دیا۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مے، لڈن ضلع وہاڑی

وہ اپنی بے نور آنکھوں سے مطمئن ہو چلا تھا لیکن دوسروں کو فکر ضرورت تھی۔ اس کا ایک شاگرد لندن میں مقیم تھا۔ اس نے مجبور کیا کہ وہ لندن آجائیں۔ یہاں ممکن ہے علاج ہو جائے۔ وہ لندن گئے کئی معائنے ہوئے لیکن علاج وہاں بھی نہیں ہو سکا۔

وہ واپس آگیا۔ اس کا ایک مجموعہ کلام مضراب کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ واپس آیا تو دوسرے مجموعے کے تقاضے ہونے لگے اس نے دوسرا مجموعہ کلام مضراب و رباب کے نام سے ترتیب دیا جس میں مضراب کی غزلیں اور رباب کے نام سے تازہ غزلیں تھیں۔

وہ ان کتابوں سے فارغ ہی ہوا تھا کہ 1985ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس حملے نے اس کی بینائی کو بالکل ہی ختم کر دیا۔ اب تک وہ موٹی عینک سے قریب کی چیزیں کچھ نہ کچھ دیکھ لیا کرتا تھا لیکن اب بینائی بالکل جاتی رہی۔ یہ بھی خدا کی قدرت تھی کہ فالج کے حملے نے اس کے جسمانی اعضا کو متاثر نہیں کیا۔ وہ جسمانی اعتبار سے مفلوج نہیں ہوا۔ دماغ بھی ٹھیک طرح کام کرنے لگا حافظہ بھی قائم رہا لیکن اس کا ترنم فالج کے زیرِ اثر آیا اور وہ اشعار ترنم سے سنانے کے قابل نہیں رہا۔

تمام عمر ترنم ہی سے پڑھا تھا۔ ترنم چھن گیا تو وہ پہلی مرتبہ اپنی کسی معذوری پر افسردہ ہوا۔ وہ ایک مرتبہ پھر مشاعروں کے لیے اجنبی بن گیا۔ تحت اللفظ کلام پڑھنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ تو یہ خیال آیا کہ مشاعروں میں شرکت کرنا ہی چھوڑ دے لیکن لوگ کب چھوڑنے والے تھے۔ وہ پھر مشاعروں میں جا پہنچا اور مشاعرے لوٹنے لگا۔ اس کے پرستار اسے ہر حال میں قبول کرنے کو تیار تھے۔

زندگی پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔

1987ء میں اسے ہندوستان جانا پڑا۔ دہلی سے اس کی کلیات ماحصل کے نام سے شائع ہوئی تھی لہٰذا اسے دہلی بلایا گیا تھا۔ اس کے دل پر کیا گزری ہو گی جب دہلی میں اس کے عزیز و اقارب اس کے سامنے تھے لیکن وہ انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

نادید کے نام سے اس کا ایک مجموعہ 1989ء میں شائع ہوا۔ لب کشا کے عنوان سے نعتوں اور غزلوں کا مجموعہ 1987ء میں شائع ہو چکا تھا۔ نعتوں کا ایک اور مجموعہ 1995ء میں شائع ہوا۔ 1997ء میں ماحصل ہی کے نام سے کلیات غزل کراچی سے شائع ہوا۔ ایک مجموعہ نعت زبور حرم کے نام سے شائع ہوا۔ یہ دراصل کلیات نعت ہے۔

اس معذوری چشم کے باوجود اس نے کئی ممالک کے سفر بھی کیے عمرے بھی ادا کیے۔

☆☆

12 ستمبر 2000ء کو وہ اپنی بیٹی تسکین اقبال کے گھر گیا ہوا تھا۔ وہاں صبح کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد اس نے ایک کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی جو اس کے خیال میں وہاں رکھی ہوئی تھی جبکہ کرسی وہاں نہیں تھی چنانچہ وہ گر پڑا۔ بیٹی نے دوڑ کر اٹھایا۔ معلوم ہوا کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے ضروری سمجھا کہ آپریشن کیا جائے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ کولہے کی ہڈی اکثر لوگوں کی ٹوٹ جاتی ہے اور آپریشن کے بعد ٹھیک بھی ہو جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اسٹک کے ذریعے لوگ چلنے پھرنے لگتے ہیں۔ اس کا آپریشن بھی کامیاب ہوا۔ وہ گھر بھی آگیا تھا کہ 21 ستمبر کی شام کو اچانک سانس کی تکلیف ہو گئی۔ اسے پھر اسپتال لے جایا گیا۔ ابتدائی طبی امداد کے بعد طبیعت بحال ہو گئی۔ وہ بضد تھا کہ اسے گھر لے جایا جائے لیکن ڈاکٹروں نے ابھی ایک دو روز مزید اسپتال میں رکھنے کا مشورہ دیا۔

اس نے اسی روز اپنی زندگی کی آخری نعت اسپتال میں فی البدیہہ لکھوائی۔

ظہور کرتی ہے جس دم سحر مدینے میں
اذانیں دیتے ہیں دیوار و در مدینے میں
گلی گلی میں وہ سیلاب نور ہے جیسے
اتر کے آگئے شمس و قمر مدینے میں
ہوا کے جھونکوں میں خوشبو بسی ہوئی ہے وہاں
درود پڑھتا ہے اک اک شجر مدینے میں

22 ستمبر 2000ء رات کے ابتدائی حصے میں دوبارہ سانس کی تکلیف ہوئی جو جان لیوا ثابت ہوئی اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

وہ اس وقت نارتھ ناظم آباد کے سخی حسن قبرستان میں مدفون ہے۔

ماخذات

اقبال عظیم، حیات و ادبی خدمات...... ناصر حیات
تذکرہ شعرائے میرٹھ...... نور احمد میرٹھی
ڈاکٹر عندلیب شادانی...... نظیر صدیقی

تسمیہ نام

مریم کے خان

اس وقت پوری دنیا میں ہر روز جس ملک کا نام نفرت کے اظہار کے لیے ایک بڑی تعداد میں لیا جاتا ہے، جس کے پرچم کو سب سے زیادہ جلایا جاتا ہے، سب سے زیادہ جس ملک کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور سب سے زیادہ جس ملک میں جاکر بسنے کے خواہشمند ہیں، اس ملک کا یہ نام کیوں پڑا۔ کس نے رکھا، یہ ایک دلچسپ بات ہے۔ اس ملک کا نام ایک ایسے شخص کے نام پر کیوں رکھا گیا جو اس ملک کا باشندہ بھی نہیں ہے۔

ایک دلچسپ معلوماتی اور بھرپور تحریر

اگر غور کیا جائے کہ ہم پاکستانی اور شاید باقی دنیا کے لوگ اپنے ملک کے علاوہ کسی اور ملک کا نام سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں تو بھلا وہ کون سا نام ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اختلاف کریں لیکن ہمارے نزدیک وہ نام امریکا ہے

جو ہم دن میں بہت زیادہ بار لیتے ہیں۔ امریکا برانڈ، سیاست، آرٹ، تہذیب، جدت اور بلند و بالا عمارتوں کے ساتھ ساتھ دہشت، جبر اور دھونس کی ایسی علامت بھی ہے جس کی مثال گزشتہ ہزاروں سال میں شاید ہی کوئی سلطنت

دے سکے۔ اپنے میڈیا، ٹی وی اور فلم انڈسٹری کے سہارے امریکا ہر ملک اور ہر گھر میں ہے۔ شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس نے بھی امریکن برانڈ کی کوئی چیز استعمال نہ کی ہو۔ یہ عجیب ملک ہے کہ بہت سے لوگ اس سے نفرت بھی کرتے ہیں اور وہاں جانے کی چاہ بھی رکھتے ہیں۔ اگر امریکا اپنے دروازے دنیا کے لیے کھول دے تو شاید نصف سے زیادہ دنیا امریکا جانے کو تیار ہو جائے۔ دور کیوں جاتے ہیں جب ہمارے ہاں امریکن ویزا لاٹری کا اجرا ہوا تو کروڑوں لوگوں نے اس کے لیے درخواست بھیج دی تھی۔ ہم دن میں بیسیوں بار امریکا کا نام لیتے ہیں۔ مگر شاید ہی کبھی کسی نے غور کیا ہو کہ یہ نام امریکا کہاں سے آیا اور کس کے نام پر رکھا گیا۔ آج ہم آپ کو اس شخصیت کے بارے میں بتاتے ہیں جس کے نام پر دنیا کا یہ سب سے با اثر ملک ہے۔

☆☆☆

اٹلی کی سرزمین بہت زرخیز رہی ہے۔ زمانہ قدیم سے جب وحشی رومن مہذب (کھانے پینے، پہنے اوڑھنے اور رہنے سہنے کی حد تک) ہوئے اور انہوں نے رومن سلطنت قائم کی تب سے یہاں مشاہیر کی پیدائش کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو آنے والی صدیوں میں جاری رہا۔ چھٹی صدی عیسوی تک رومن سلطنت کا خاتمہ ہوا اور اٹلی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ اب وہاں پاپائے روم ویٹی کن سے حکومت کرتا ہے مگر سلطنت کا مشرقی بازو خاصے عرصے برقرار رہا اور بالآخر عثمانیوں کے ہاتھوں اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

زمانہ قدیم سے اٹلی یورپ کا وہ ملک تھا جس کا مشرق سے سب سے زیادہ واسطہ اور رابطہ رہا۔ فوجی مہمات اور تجارت میں یورپ کا کوئی اور ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ نصف سے زیادہ یورپ پر رومنوں کا قبضہ تھا۔ مشرق میں یونان اور دوسرے خطے بھی اس کے زیر نگیں تھے۔ سمجھ لیں جو حیثیت آج امریکا کو حاصل ہے وہ اس وقت اٹلی کو حاصل تھی۔

اٹلی نے سب سے پہلے مصر کی افریقی سلطنت اور شام کی ایشیائی سلطنت سے رابطہ کیا۔ اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ جب یہ سلطنتیں کمزور ہوئیں تو حملہ کر کے یہاں قابض ہو گیا۔ فتوحات سے قطع نظر رومنوں کو ان فتوحات کا یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے سب سے پہلے مشرقی علوم سیکھے اور مسلمانوں سے بھی سب سے پہلے ان کا واسطہ پڑا تھا۔ جب مسلمان اسپین پر قابض ہوئے تو اپنی مذہبی شدت پسندی کی وجہ سے ان سے دور رہے لیکن اٹلی والے یہاں آئے اور انہوں نے مسلمان درس گاہوں میں داخلہ لے کر اس وقت کے جدید علوم سیکھے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے اولین آثار اٹلی میں نظر آتے ہیں۔ فلکیات، طب اور خاص طور سے بحری علوم میں اٹلی کے ماہرین سب سے آگے رہے۔

حالانکہ ویٹی کن کے تسلط کے بعد اٹلی میں بھی جدید علوم کو بدعت قرار دے دیا گیا تھا۔ وہاں بائبل کے علاوہ کوئی کتاب پڑھنا قابل تعزیر جرم ہوتا تھا۔ ویٹی کن کے حکم پر قدیم ترین کتابوں کے نسخوں کو یا تو جلا دیا گیا یا پھر انہیں بکسوں میں بند کر کے ویٹی کن کے تہہ خانوں میں پہنچا دیا گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اٹلی کے لوگوں کو جدید علوم سے کتنا شغف تھا۔ ان پر قدغن لگیں۔ ان کو سزائیں دیں گئیں اور ملک کے ماحول کو اتنا گھٹا ہوا کر دیا گیا کہ یہاں کوئی سائنسی انکشاف کرنا بھی جرم قرار پایا جیسے کوپر نیکس نے بتایا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے اور گلیلیو نے اس کی تائید کی تو دونوں قابلِ سزا قرار پائے۔ اہل علم یہاں سے دوسرے ملکوں کو جانے پر مجبور ہو گئے اور جو اٹلی کے باعث افتخار ہو سکتے تھے وہ دوسرے ملکوں کے سپوت قرار پائے۔

اٹلی نے ایک ہی زمانے میں دو بہت ماہر جہاز ران اور مہم جو پیدا کیے۔ ان میں سے ایک تو مشہور زمانہ کرسٹوفر کولمبس ہے۔ جس نے جنوبی امریکا، کیوبا اور ویسٹ انڈیز دریافت کیے تھے۔ مگر وہ کبھی بھی شمالی امریکا کا ساحل نہیں دیکھ سکا اور پھر وہ دریافت شدہ ویسٹ انڈیز اور برازیل کو ایشیا کا مشرقی حصہ سمجھ رہا تھا۔ مرتے دم تک اسے یقین تھا کہ اس نے ایشیا کا مشرقی حصہ دریافت کر لیا ہے۔ کرسٹوفر کولمبس کی یہ غلط فہمی اس کے ہم وطن ماہر جہاز ران، مہم جو اور نقشہ نویسی کے ماہر امریگو ویس پوسی نے دور کی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے کہا کہ نو دریافت شدہ ویسٹ انڈیز کے جزائر (کیوبا بھی اسی میں شامل سمجھا جاتا تھا) اور برازیل (اصل میں جنوبی امریکا) ایشیا کا حصہ نہیں ہیں بلکہ وہ نئے برِ اعظم ہیں۔

جب سیکسن قوم نے یورپ کے انتہائی شمال مغربی خطے سے اٹھ کر بحر اوقیانوس کے خوفناک سمندروں میں جہاز رانی کی اور نیو فاؤنڈ لینڈ دریافت کیا۔ تب مہذب یورپ

اور اسپین پر قابض مسلمان اس سمندر میں گھسنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ کولمبس سے کئی سو سال پہلے ایک نورس بحری کپتان ایرک دی ریڈ نے آئس لینڈ سے سفر کر کے پہلے گرین لینڈ کا جزیرہ دریافت کیا جس کا صرف جنوبی حصہ ہی برف سے آزاد تھا۔ برف کی وجہ سے ایرک اور اس کے ساتھی گرین لینڈ پر آگے نہیں جا سکے اور اسے ایک چھوٹا سا جزیرہ سمجھتے رہے۔ حالانکہ ایرک کئی سال وہاں رہا اور پھر اس نے آگے سفر کیا اور نیو فاؤنڈ لینڈ دریافت کیا۔ مگر وہ اسے افریقا کا دوسرا کنارہ سمجھا تھا۔ یہ امریگو تھا کہ جس نے وضاحت کی کہ یہ افریقا نہیں بلکہ ایک نیا برِاعظم ہے جو ممکنہ طور پر نئی دنیا ہے۔

☆☆☆

فلورنس کے ایک پبلک نوٹری اور سرکاری ملازم انا ستاسیو اور اس کی بیوی لیزا بیتا مینی کے گھر تیسرے بیٹے نے جنم لیا۔ یہ کھڑی رومن ناک اور بڑے گول سر والا بچہ ان کا پانچواں بچہ بھی تھا۔ سرکاری ملازمت کے باعث انا ستاسیو ایک متمول آدمی تھا اور اس کا ذاتی گھر بڑی سی حویلی کی صورت میں تھا۔ پتھروں سے بنا ہوا یہ گھر دوسری جنگ عظیم تک برقرار رہا تھا اور پھر اتحادی بمباری نے اسے تقریباً صفحہ ہستی سے نابود کر دیا۔ یہ بڑے پتھروں سے بنا ہوا دو منزلہ گھر تھا۔ جس کے دروازے اور کھڑکیاں آرچ کی صورت کے تھے۔ داخلی دروازے پر بڑا سا شیڈ بنا ہوا تھا۔ اس کا نچلا حصہ انا ستاسیو کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور اوپر والے حصے میں اس کی رہائش تھی۔ جنگ کے بعد اسے پرانی صورت میں بحال کیا گیا تھا۔ سرکاری ملازم ہونے کے ناطے انا ستاسیو کو کچھ آسانیاں حاصل تھیں ان میں سے ایک تعلیم کی سہولت تھی۔

عام اطالویوں کے برعکس وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکتا تھا۔ اس کے بڑے بیٹے بھی پڑھے لکھے تھے اور امریگو جب ذرا بڑا ہوا تو اسے اس کے انکل فرا جیار جیو انتونیو ویس پوسی کے سپرد کر دیا گیا۔ امریگو کا رشتے کا چچا جار جیو نہ صرف عالم تھا بلکہ وہ فلورنس کے معروف مدرسے سان مارینو میں سیاست اور فلسفے کا استاد بھی تھا۔ یہ امریگو کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بچپن سے جار جیو جیسا استاد ملا اور اس نے امریگو کی ذہانت بھانپ کر اسے وہ سب پڑھایا جس کی وہ خواہش رکھتا تھا۔ اس دوران میں اس کے بڑے بھائی یونیورسٹی آف پیسا میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ پُر آسائش زندگی سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔ پندرھویں صدی کا اٹلی یورپ کا سب سے ترقی یافتہ ملک تھا۔ صرف اسپین اس سے آگے تھا جب وہاں مسلمان عروج پر تھے۔ مگر جب وہاں وحشی گاتھک حکمران ہوئے اور مسلمانوں کو دیس نکالا گیا تو اس کا حال بھی یورپ کے باقی ملکوں کا سا ہو گیا تھا۔

سولہ سال کی عمر میں امریگو نے ابتدائی تعلیم مکمل کر لی اور اس کے باپ انا ستاسیو نے اسے فلورنس کے تاجروں کی انجمن ہاؤس آف میڈیسی میں بہ طور کلرک رکھوا دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ امریگو یہاں تجارت کے اسرار و رموز سیکھے۔ ہاؤس آف میڈیسی کا سربراہ لورنزو ڈی میڈیسی کا شمار فلورنس اور اٹلی کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ انجمن کا مالک بڑا لورنزو تھا مگر وہ برائے نام ہی اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا۔ اس لیے تمام معاملات لورنزو ڈی میڈیسی کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے کچھ ہی عرصے میں بھانپ لیا کہ اس نوجوان میں بہت زیادہ صلاحیتیں ہیں۔ اس نے امریگو کو براہ راست اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد لورنزو اس انجمن کا مالک بھی بن گیا۔

اس کا سب سے زیادہ فائدہ امریگو کو ہوا تھا۔ وہ ایک کلرک کے طور پر بھرتی ہوا تھا مگر تیزی سے ترقی کرتا ہوا لورنزو کا دست راست بن گیا۔ ابھی وہ تیس سال کا بھی نہیں ہوا تھا اور وہ ادارے میں نمبر دو ہو چکا تھا۔ لورنزو کی دیگر اولاد اور بھائیوں کی بھی وہ حیثیت نہیں تھی جو امریگو کی تھی۔ اس کی تیز رفتار ترقی سے مطمئن ہو کر اس کے باپ نے اسے ذاتی کاروبار کے لیے مجبور نہیں کیا۔ اوّل لورنزو کی انجمن اس وقت اٹلی بلکہ یورپ کی سب سے بڑی تجارتی کارپوریشن تھی۔ اس کا کاروبار نہ صرف تمام یورپ بلکہ ایشیا اور افریقا میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ یہاں وہ جو سیکھ سکتا تھا وہ اسے کہیں اور سیکھنے کو ہرگز نہ ملتا اور ممکن ہے اگر امریگو اپنا ذاتی کاروبار کرتا تو اسے وہ موقع نہیں ملتا جو بعد میں اسے ملا اور جس کی وجہ سے اس کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔

اگرچہ امریگو تاجر خاندان میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔ پھر اس نے ایک تجارتی انجمن میں نوکری کی اور اس سے منسلک رہا مگر اس کا ذہن ہمیشہ علم کا پیاسا رہا۔ جب وہ لورنزو کی ملازمت میں آیا تو اسے موقع ملا اور وہ پورے اٹلی میں جگہ جگہ گھوما۔ وہ جہاں کوئی درس گاہ پاتا یا اسے کسی عالم کا

پتا چلتا وہ وہاں ضرور جاتا تھا۔ اسے سسلی جانے کا موقع بھی ملا جو ان دنوں مسلمانوں کے قبضے میں تھا اور اس نے وہیں سے بحری علوم اور خاص طور سے نقشہ سازی میں مہارت حاصل کی تھی۔ بحری علوم اور نقشہ سازی کا سب سے بڑا مسلم ماہر اوریسی دنیا سے دو صدی پہلے گزر چکا تھا مگر اس کے بنائے نقشے اور کتابیں جو بحریات کے بارے میں تھیں اب بھی موجود تھیں۔ امریگو نے ان نقشوں کی نقول اور کتابوں کے نوٹس حاصل کیے۔ اس کی ذاتی لائبریری میں سینکڑوں کتب اور ہزاروں نقشے تھے۔

فارغ اوقات میں وہ کتابیں پڑھتا اور نقشوں کا آپس میں موازنہ کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے محسوس ہونے لگا کہ یورپی ماہروں کے بنائے ہوئے نقشوں میں بنیادی خامیاں تھیں۔ اوّل ان کا کوئی معیار نہیں تھا۔ ہر نقشہ نویس اپنی مرضی سے نقشے بناتا تھا اور اس میں اپنے معیار استعمال کرتا تھا جس سے مختلف نقشوں میں فرق بہت زیادہ آجاتا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے بنائے نقشوں میں زیادہ فرق نہیں تھا کیونکہ وہ ایک ہی معیار استعمال کرتے تھے۔ دوسرے وہ زمین کی ساخت کو یورپ والوں سے بہتر سمجھتے تھے اور ریاضی و فلکیات جیسے علوم میں ماہر تھے۔ اسی وجہ سے بہتر نقشے بناتے تھے۔ جب کہ یورپی نقشہ نویس زمین کی ساخت کو سمجھنے میں غلطی کرتے تھے اور وہ ریاضی اور فلکیات میں اتنی مہارت نہیں رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے نقشوں میں بنیادی غلطیاں آجاتی تھیں۔ امریگو ان غلطیوں پر غور کرتا اور اپنے نقشوں میں ان کو درست کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر امریگو بھی ریاضی اور فلکیات سے نابلد تھا اس لیے وہ جو اصلاح بہت آسانی سے کر سکتا تھا اسے کرنے میں اسے بہت وقت لگا تھا۔

امریگو کا ایک دوست سسلی کے دورے سے واپس آیا تو اس نے امریگو کو بتایا کہ اس نے سسلی میں ایک پیالہ دیکھا ہے جس میں دنیا کا نقشہ بنا ہوا ہے اور دو پیالوں کی مدد سے پوری دنیا کا گول نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ امریگو یہ سن کر بے چین ہو گیا۔ اس نے اپنے دوست سے درخواست کی کہ کیا وہ اسے پیالوں میں ان نقشوں کی نقل بنا کر دے سکتا ہے؟ دوست ماہر نہیں تھا مگر اس نے امریگو کو بتایا اور اس نے دھات کے بنے دو بالکل نصف گول پیالوں میں ویسا ہی نقشہ بنا دیا۔ اس کے دوست نے تصدیق کی کہ یہ نقشہ سو فیصد تو نہیں مگر نوے فیصد اسی نقشے جیسا تھا۔ ممکنہ طور پر امریگو کے دوست نے اوریسی کا چاندی کے پیالے میں بنایا ہوا نقشہ دیکھا تھا۔ اس نقشے میں شمالی امریکا کا فلوریڈا کا ساحل بھی واضح ہے۔ مگر امریگو کا دوست یہ بات سمجھا نہیں سکا تھا اس لیے امریگو کے بنائے نقشے میں شمالی امریکا کا ذکر نہیں ہے۔

دوست کی اس اطلاع اور پھر پیالوں میں بنے نقشوں نے امریگو کے خیالات کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اب تک نقشہ نویسی میں بنیادی غلطی کر رہا تھا جب تک اسے زمین کی درست ساخت کا علم نہیں ہوگا وہ درست نقشے کیسے بنا سکتا ہے۔ بیس سال کی عمر میں وہ فلورنس کے ایک پوش علاقے کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہاں اس نے ایک کمرے میں اپنا کتب خانہ اور نقشہ نویسی کا سیٹ اپ لگایا ہوا تھا۔ پیالے والے نقشے اپنی حد تک مکمل کر کے بھی اس کا ذہن زیادہ تر اسی میں اٹکا رہتا تھا۔ اس نے اس میں یورپ کے اور بحیرہ روم کے نقشوں سے معیار کا اندازہ لگایا اور اسے لگا کہ اس نے درست نقشہ تیار نہیں کیا ہے۔ اسے معیار درست کرنا ہوگا۔ یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ اس وقت فلکیات اور ریاضی کے علوم میں یورپ اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا۔ جیسا کہ بتایا ہے خود امریگو بھی ان علوم کے بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کوئی اس کی مدد کرنے والا تھا۔ اس لیے وہ از خود غلطیوں سے سیکھ کر پیالے کے نقشے کو درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کام میں اسے سالوں لگ گئے تھے۔

چوبیس یا پچیس برس کی عمر میں اس نے پہلی شادی کی۔ تاریخ اس شادی اور اس کے انجام کے بارے میں خاموش ہے۔ حد یہ کہ اس لڑکی کا نام بھی کسی کو نہیں معلوم جس سے امریگو نے شادی کی تھی۔ شاید یہ شادی خاموشی سے ہوئی تھی اور اس کا انجام بھی خاموش تھا۔ امریگو نے بعد میں لکھے ایک خط میں اس شادی کا سرسری ساذکر کیا تھا۔ شاید وہ خاتون امریگو کو داغ مفارقت دے گئی تھی یا ان کے درمیان علیحدگی ہو گئی تھی۔ کٹر رومن کیتھولک ملک ہونے کی وجہ سے اٹلی میں بیسویں صدی کے دوسرے نصف تک طلاق کا قانون سرے سے نہیں تھا اس وقت تو سوچا بھی نہیں جا سکتا ہوگا۔ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات اور پھر دوسرے مشاغل کے سبب شاید اس کے پاس عائلی زندگی گزارنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ نقشہ نویسی اور دوسرے بحری علوم کے ساتھ ساتھ امریگو نے بحری سفر اور جہاز رانی کا عملی تجربہ بھی حاصل کیا

ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خود اور پھر قدرت بھی اسے بڑے کام کے لیے تیار کر رہی تھی۔

اب تک امریگو نے بحر پیمائی اور نقشہ نویسی سے متعلق جو سیکھا تھا اسے استعمال نہیں کیا تھا۔ اپنی اسٹڈی سے ہٹ کر اس کی ساری سرگرمیاں تجارت سے متعلق ہی ہوتی تھیں۔ لورنزو ڈی میڈیسی نے 1492 میں اچانک ہی امریگو اور اس کے ساتھی ڈوناٹو نیکولینی کو اسپین کے شہر کاڈز جانے کا حکم دیا۔ کیسا عجیب اتفاق ہے اسی سال کولمبس نے ویسٹ انڈیز دریافت کیا۔ لورنزو کا اسپین کاڈز میں ایک تجارتی دفتر پہلے ہی کام کر رہا تھا مگر اسے شبہ تھا کہ وہاں منیجرز گھپلے کر رہے تھے اور اس کے تجارتی مفادات کو نقصان پہنچا کر ذاتی فائدے حاصل کر رہے تھے۔ لورنزو نے امریگو اور ڈوناٹو کو بہ طور ایجنٹ بھیجا تھا کہ وہاں جا کر معاملات کی چھان بین کریں اور اسے اصل حقائق سے آگاہ کریں۔ یہ پہلا موقع تھا جب امریگو اٹلی سے نکل کر کسی دوسرے ملک پہنچا تھا اور اسپین پہنچتے ہی سب سے پہلے اسے کولمبس کے مغرب کی طرف سفر کی اطلاع ملی۔

امریگو بے چین ہو گیا کیونکہ یہ اس کا پسندیدہ شعبہ تھا اور اس نے کئی ایک نقشوں میں وہ سب دیکھا تھا جیسے دریافت کرنے کا کولمبس دعویٰ کر رہا تھا۔ اب اسے انتظار تھا کہ کولمبس واپسی میں وہاں کے کیا نقشے سامنے لاتا ہے۔ امریگو جانتا تھا کہ جو دریافت ہو گا وہ بہت خفیہ رکھا جائے گا اور اسے دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ پہلے اسپین میں اپنی پوزیشن مضبوط کرے۔ اس نے محسوس کیا کہ یہاں کولمبس کو پسند نہیں کیا جاتا ہے۔ اسے ایک غیر ملکی تصور کیا جاتا تھا جس نے بادشاہ اور ملکہ سے حد سے زیادہ مراعات حاصل کر لی تھیں اور اس نے مغرب کی دریافت شدہ زمین پر ایک طرح سے اجارہ داری حاصل کر لی تھی۔ اس کے سوا کوئی اس طرف نہیں جا سکتا تھا۔ لازمی بات ہے یہ حقیقت امریگو اور اس جیسے دوسرے کئی مہم جوؤں کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ وہ بھی مہم جوئی کے لیے بے چین تھے۔

امریگو نے پہلے لورنزو کے تجارتی دفتر کے معاملات درست کیے۔ یہاں کے منیجرز نے سچ مچ اندھی مچائی ہوئی تھی اور لورنزو کو لاکھوں لیرے کا نقصان پہنچا چکے تھے۔ جب معاملات درست ہو گئے اور بدعنوان منیجرز کو ان کی ذمے داریوں سے فارغ کر دیا گیا تو امریگو نے دفتر ڈوناٹو کے حوالے کر دیا۔ وہ خود اب اپنے اصل مشن کی طرف توجہ دینا چاہتا تھا۔ مگر اسے یہاں تعلقات بنانے اور خود کو سفر کے لیے مزید تیار کرنے میں تین سال لگ گئے تھے۔ اس دوران میں کولمبس نئی دنیا کے جسے اس نے ویسٹ انڈیز کا نام دیا تھا، تین سفر کر چکا تھا۔ ان تین مہمات سے جو حاصل ہوا تھا وہ دولت کولمبس کی ملکیت تھی مگر ساتھ ہی اس نے جو معلومات حاصل کی تھیں وہ اسے بھی اپنی ملکیت قرار دے رہا تھا اور اس نے اسے عام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر اسپین میں کولمبس کی عدم مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ شاہ فرڈی نینڈ اس کا مخالف ہو گیا تھا مگر ملکہ ازابیلا ابھی تک کولمبس کی حامی تھی۔

شاہی دربار میں فی الوقت کولمبس کے مخالفوں کی نہیں سنی جا رہی تھی اس لیے امریگو اور دوسرے مخالفوں نے طاقت کے ایک اور مرکز کا رخ کیا۔ اسپین کے بشپ جان روڈریگز ڈی فونسیکا سے رابطہ کیا اور اسے آمادہ کیا کہ وہ شاہی دربار سے دوسرے مہم جوؤں کو بھی مغرب کی طرف جانے کی اجازت دلوائے۔ بشپ خود کولمبس کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ اس نے اوّلین سفر میں ہی عیسائی راہبوں کو شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک بھی فالتو آدمی نہیں لے جا سکتا تھا۔ پھر وہ تیسرے سفر میں بہت مجبور کرنے پر چند عیسائی مبلغوں کو لے کر گیا تھا مگر یہ مبلغ نئی دنیا کی جان لیوا بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ بشپ جان کو شبہ تھا کہ اس کے آدمیوں کو جان بوجھ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ ورنہ کولمبس کے آدمی تو نہیں مرے تھے۔ صرف پہلی اور دوسرے بار پیچھے رہ جانے والے وباؤں کا شکار ہوئے تھے۔ بشپ کے پہلے سے موجود عناد کی موجودگی میں اسے راضی کرنا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔

بشپ جان نے کامیابی سے امریگو اور دوسرے مہم جوؤں کو شاہی دربار سے اجازت دلوا دی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ اب دربار کسی مہم جو کی مالی مدد نہیں کرے گا ہاں وہ اجازت دے گا اور مہم جو جو حاصل کریں گے اس میں حکومت کا حصہ بھی ہوگا۔ یہ سن کر بہت سے دوسرے مہم جو پیچھے ہٹ گئے کیونکہ وہ سرکاری مدد سے مہم جوئی کی اُمید لگا کر آئے تھے۔ مگر امریگو پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اگرچہ دوسرے مہم جوؤں کی طرح وہ بھی خالی ہاتھ تھا۔ البتہ اس کے پاس ایک واضح منصوبہ اور اس پر عمل درآمد کے لیے ضروری علم تھا۔ اسپین آمد کے بعد وہ نقشہ نویسی پر

مسلسل کام کرتا رہا اور خاص طور سے اس نے پیالہ نما نقشہ مزید بہتر کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کا نام رہتی دنیا تک کے لیے امر ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

اسپین میں قیام کے دوران اس نے دولت تو خاص نہیں کمائی تھی مگر اس نے اپنے تعلقات اور تجربے میں ضرور اضافہ کیا تھا۔ اٹلی کا ایک دولت مند تاجر گائی نوٹو برارڈی اس کا دوست بن گیا۔ پہلے امریگو نے اس کے نمائندے کے طور پر کام کیا تھا اور وہ اس کا تجارتی سامان لے کر پرتگال اور فرانس کی بحر اوقیانوس کے ساحلی شہروں تک گیا تھا۔ اس سفر میں اسے دنیا کے اس خطرناک گہرے سمندر میں سفر کا تجربہ ہو گیا ساتھ ہی اسے بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس میں یورپی زمین کے درست ترین نقشے بنانے کا موقع بھی ملا تھا۔ اس سفر سے واپسی پر اس نے نئے نقشوں کا موازنہ پرانے نقشوں سے کیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ پرانے نقشوں میں کیا کیا خامیاں تھیں۔ اس کا پیالے نما دنیا کا نقشہ دن بہ دن بہتر ہوتا جا رہا تھا اگرچہ وہ اس وقت دنیا کے کل نقشے کا صرف چالیس فیصد ہی دکھا رہا تھا باقی ساٹھ فیصد کے بارے میں دنیا ابھی جانتی ہی نہیں تھی۔

مگر امریگو اور دوسرے مہم جوؤں کو اسی چالیس فیصد دنیا سے غرض تھی۔ امریگو کامیاب واپس آیا اور گائی نوٹو نے خوش ہو کر اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ امریگو نے قبل از وقت ہی مہم جوئی کی تیاری شروع کر دی تھی وہ دیکھ رہا تھا کہ کولمبس کیا کیا لے کر گیا تھا۔ خوش قسمتی سے جس تاجر نے کولمبس کے سفر کے لیے سامان مہیا کیا تھا اس سے امریگو کی دوستی ہو گئی اور اس سے امریگو کو پتا چلا کہ کولمبس کیا لے کر گیا تھا اور اگلے سفر میں اس نے سامان میں کیا تبدیلی کی تھی۔ امریگو نے اسی لحاظ سے تیاری شروع کر دی۔ اس نے ذہن میں رکھا تھا کہ بڑے اور کم جہازوں کی بجائے چھوٹے اور زیادہ جہاز لے جانا مناسب تھا۔ کیونکہ بڑے جہاز سست رفتار ہوتے ہیں اور ایک جہاز کے نقصان کا مطلب تھا زیادہ نقصان۔ جب کہ چھوٹے جہاز تیز رفتار ہوتے ہیں اور ایک جہاز کا نقصان کم ہوتا تھا کیونکہ اس میں سامان اور آدمی کم ہوتے تھے۔

امریگو نے گائی نوٹو کی مدد سے جہازوں کے حصول کی کوشش شروع کر دی۔ گائی نوٹو بھی اس کی مدد کر رہا تھا کیونکہ وہ اس کی مہم کا حامی تھا۔ اس کے لیے رقم کا زیادہ حصہ بھی اسی نے مہیا کیا تھا۔ اس کے باوجود امریگو کو اپنی ساری جمع پونجی اس سفر کے لیے لگانی پڑی تھی اور پھر اس نے قرض بھی لیا تھا جو اسے خاصی بھاری شرح سود پر ملا۔ کیونکہ کولمبس کے کامیاب سفروں کے باوجود مغرب کی طرف سمندر میں جانا بہت خطرناک تصور کیا جاتا تھا۔ امریگو کے سفر میں سرمایہ لگانے والے سرمایہ داروں کا خیال تھا کہ اس کی واپسی کا امکان بہت کم تھا اس لیے انہوں نے شرح سود بہت زیادہ رکھی تھی۔ تقریباً اسی سوچ کے تحت امریگو نے بھاری سود مان لیا کہ اگر وہ واپس آیا تو یقیناً اس قابل ہوگا کہ قرض سود کے ساتھ ادا کر سکے دوسری صورت میں اسے ادائیگی کی فکر نہیں رہے گی۔

ان ہی دنوں گائی نوٹو اچانک بیمار ہوا اور وفات پا گیا۔ وہ یورپی طاعون کی وبا کا شکار ہوا تھا اور اب امریگو کو اس کی مدد حاصل نہیں رہی تھی۔ گائی نوٹو کی وفات امریگو کے لیے بڑا دھچکا تھی مگر اس کی خوش قسمتی کہ گائی نوٹو وفات سے پہلے حکومت کو بارہ بہترین بحری جہازوں کی تیاری کے لیے رقم فراہم کر چکا تھا۔ یہ معاہدہ اس کی وفات کے بعد بھی برقرار رہا اور حکومت نے یہ بارہ بحری جہاز تیار کر کے امریگو کے حوالے کر دیے۔ اگر حکومت گائی نوٹو کے مرنے کے بعد اس سے کیا جانے والا معاہدہ منسوخ کر دیتی تو امریگو پھر مغرب کے سفر پر نہیں جا سکتا تھا۔ اگر وہ پھر سے انتظام کرتا تب بھی اتنی دیر ضرور ہو جاتی کہ کوئی دوسرا مہم جو شمالی امریکا کے ساحلوں تک جا پہنچتا اور اس دریافت کا سہرا امریگو کے سر نہ بندھتا۔ اس انتظام کے لیے امریگو ساری عمر گائی نوٹو کا احسان مند رہا اور اس نے اپنی کئی دستاویزات میں اس کا ذکر کیا اور اسے خراج تحسین پیش کیا۔ امریگو نے اپنی پہلی مہم میں مرکزی بحری جہاز کو گائی نوٹو سے منسوب کیا تھا۔

بحری جہازوں کے حصول کے بعد دوسرا مرحلہ عملے اور سامان رسد کی فراہمی تھی۔ عملے کا حصول زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ جیسا کہ کولمبس کو اولین سفر میں ہوا تھا اور حکومت جب عام ملاحوں کو ترغیب دینے میں ناکام رہی تو سزائے موت اور عمر قید کی سزا پانے والے قیدیوں کو سزا میں معافی کا لالچ دے کر اس سفر پر روانہ کیا گیا تھا۔ مگر جب کولمبس کامیاب لوٹا اور اس کے ساتھ واپس آنے والے ملاحوں نے شراب خانوں کے توسط سے نئی دنیا اور اس کی دولت کی کہانیاں پھیلانا شروع کیں تو بہت سے لوگ اس نئی دنیا تک جانے کے لیے بے تاب ہو گئے تھے۔ اس لیے

امریکو کو مطلوب سے کہیں زیادہ افراد مل گئے اور اسے ان میں سے چھانٹی کرنا پڑی تھی۔ ان کی تنخواہوں کا معاملہ بھی واپسی سے مشروط تھا۔ اب سامان رسد رہ گیا تھا جو اسے خریدنا تھا اور وہ کولمبس سے زیادہ سامان رسد لے جانا چاہ رہا تھا تاکہ اسے صرف رسد کی کمی کی وجہ سے واپس نہ آنا پڑے۔

امریکو کے پاس نقد رقم کی کمی تھی اور دربار کی طرف سے اسے پہلے ہی صاف انکار کر دیا گیا تھا کہ وہ مالی مدد کی توقع نہ رکھے۔ البتہ دربار کی طرف سے ایک معاہدہ ضرور ہوا تھا جس کے تحت امریکو اور اس کے ساتھی جو علاقہ دریافت کریں گے اور وہاں سے جو حاصل کریں گے وہ ان کی ملکیت شمار ہوگا۔ البتہ یہاں شاہ فرڈی نینڈ نے وہ غلطی نہیں دہرائی جو اس نے کولمبس سے معاہدے میں کی تھی کہ وہ جو علاقہ دریافت کرے گا اس کا گورنر وہی ہوگا۔ امریکو کو بتا دیا گیا کہ نیا دریافت شدہ علاقہ اسپین کی ملکیت سمجھا جائے گا اور وہ وہاں کوئی کالونی بسانے کا اختیار بھی نہیں رکھے گا۔ اسے بہر صورت واپس اسپین آنا ہوگا۔ امریکو نے یہ تمام شرائط تسلیم کر لیں۔ کالونی بسانا اور حکومت حاصل کرنا بھی اس کا مطمع نظر نہیں رہا تھا۔ اس معاملے میں وہ خالص مہم جو تھا جو نئی دنیائیں دریافت کرنا چاہتا تھا۔

تمام کامیابیوں کے باوجود سامان رسد کے لیے رقم کا حصول اس کے لیے سب سے بڑا اور کڑا مرحلہ بن گیا تھا۔ گائی نوٹو اس کا اصل سہارا تھا اور وہ اب نہیں رہا تھا۔ یہاں کسی فرد سے اس کے ایسے تعلقات نہیں تھے کہ وہ اسے بڑی رقم دیتا۔ ایسے میں اسے لورنزو ڈی میڈیسی یاد آیا اور اس نے اس کے اسپین کے دفتر کے توسط سے رابطہ کیا۔ امریکو نے اسے خط لکھا اور اس سے مالی مدد کی درخواست کی تاکہ وہ نئی دنیا تک جا سکے۔ امریکو کو خاصی حد تک اُمید تھی کہ لورنزو اس کی درخواست مسترد نہیں کرے گا۔ مگر لورنزو کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ اس نے بہت سخت لہجے میں انکار کرتے ہوئے امریکو اور کولمبس جیسے لوگوں کو اٹلی کا غدار قرار دیا تھا جو اسپینیوں کی غلامی کر رہے تھے اور ان کے لیے کام کر رہے تھے۔ لورنزو نے آخر میں لکھا کہ وہ اس سے ایک لیرے کی توقع بھی نہ رکھے۔ اس جیسے غدار کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

یہ جواب امریکو کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اس کا ہم وطن اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے اسے یہ جواب دے گا۔ دوسری طرف اسپینی اس کی پوری مدد اور حمایت کر رہے تھے۔ انہیں یہ پروا نہیں تھی کہ وہ نسلاً اطالوی تھا۔ ایک زمانے میں جب رومن سلطنت عروج پر تھی تو اس نے سب سے زیادہ ظلم اسپین اور فرانس پر ڈھائے تھے۔ یہاں ایسے قتل عام کیے تھے جن میں ایک دن میں لاکھوں افراد کو قتل کیا گیا تھا۔ سیزر نے یہاں اپنی حکمرانی کے دوران لڑنے کے قابل تمام مقامی جوان مردوں کے دائیں ہاتھ کٹوا دیئے تھے تاکہ وہ رومنوں کے خلاف ہونے والی بغاوتوں میں حصہ نہ لے سکیں۔ ایک روایت کے مطابق اس ظلم کا شکار ہونے والوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس لیے اسپینی مسلمانوں کے بعد اگر کسی قوم سے سب سے زیادہ نفرت کر سکتے تھے تو وہ اطالوی تھے۔ اس کے باوجود وہ ہنرمند اطالویوں کو اپنے ہاں جگہ دے رہے تھے۔

امریکو نے شاید اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس کا اٹلی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اپنی باقی زندگی میں وہ کبھی اٹلی نہیں گیا۔ اس نے سرمائے کے حصول کے لیے ایک بار پھر کوششیں کیں اور کچھ اعلیٰ سرکاری حکام اور چرچ کے نمائندوں کی مدد حاصل کی۔ بالآخر اسے بہت کڑی شرائط پر رقم مل گئی۔ یہ مطلوبہ رقم سے کم تھی مگر اس سے کام چل سکتا تھا۔ اس نے فوری سامان رسد کا بندوبست کیا اور اس معاملے میں بھی وہ ادھار لینے سے نہیں چوکا۔ اس نے تاجروں کو یقین دلایا کہ اگر وہ واپس نہ آسکا تو ان کو حکومت ادائیگی کرے گی۔ امریکو کے پاس بارہ میں سے چار بحری جہاز عملے کے لیے تھے اور آٹھ سامان لے جانے کے لیے۔ اس کے چار بحری جہازوں کے نام تاریخ میں درج ہیں۔ مرکزی جہاز سان انٹیاگو (یہ گائی نوٹو سے منسوب تھا)۔ باقی تین بحری جہازوں کے نام ریپرتاگا، ویگز اور گرمنڈ تھے۔

یہ چاروں سائز میں تقریباً کولمبس کے اوّلین سفر کے جہازوں کے برابر تھے۔ امریکو کے ساتھ تقریباً ڈھائی سو افراد پر مشتمل تربیت یافتہ عملہ تھا۔ مئی 1497 میں یہ قافلہ آخری بار پرتگال کی بندرگاہ لزبن سے نکلا اور راس وردا سے ہوتا ہوا اوقیانوس میں داخل ہو گیا۔ تب کولمبس کو اپنے تیسرے سفر سے واپس آئے ہوئے دو سال ہو چکے تھے اور وہ اب آرام کر رہا تھا۔ امریکو کی اس پہلی مہم کی واپسی اکتوبر 1498 میں ہوئی تھی۔ اس نے سفر کو بہت تفصیلی بیان نہیں کیا تھا اس کی لاگ بک کے بہت سے صفحے خالی ہیں اور

اس کے عملے نے واپسی پر خاص کہانیاں بھی نہیں سنائی تھیں اس لیے ماہرین آج شک کرتے ہیں کہ امریگو نے پہلا سفر کیا بھی تھا یا نہیں۔ کیا وہ سمندر کے بیچ سے واپس آ گیا تھا؟ مگر اس نے جنوبی امریکا کے حالات اور ویسٹ انڈیز کے جزائر کی تفصیلی منظر کشی کی اور وہاں کے لوگوں اور ان کے رسم ورواج کے بارے میں بتایا تھا۔

اس نے خاص طور سے دو چیزوں کا ذکر کیا جن سے یورپ والے نا آشنا تھے۔ ایک ہاموک جو جالی دار کپڑے یا مچھلیاں پکڑنے کے جال جیسی چیز سے بنا ہوتا تھا اور اس کے دونوں سروں پر لکڑی پروکر اسے بستر کی شکل دی جاتی تھی اور پھر اسے رسیوں سے دو درختوں کے درمیان یوں باندھ دیا جاتا کہ ہوا میں معلق ایک بستر بن جاتا تھا۔ یہ خالص جنوبی امریکی لوگوں کی چیز تھی۔ اسی طرح اس نے سوئیٹ لاجز کا ذکر کیا۔ یہ بانس کے فریم سے بنی گول جھونپڑی ہوتی تھی جسے بڑے پتوں اور شاخوں سے ڈھانپ کر مکان بنایا جاتا تھا۔ اہل یورپ نے انہیں سوئیٹ لاجز کا نام اس لیے دیا کہ بے پناہ گرم موسم میں اور ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ان مکانوں میں بے پناہ پسینا آتا تھا۔ کولمبس اور اس کے ساتھیوں نے ان دو چیزوں کا ذکر نہیں کیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امریگو جنوبی امریکا تک پہنچا تھا۔ جسے اس وقت تک ویسٹ انڈیز ہی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ کولمبس اور اس کے ہمراہیوں کے خیال میں یہ انڈیا کا مغربی حصہ تھا۔

کولمبس کے تیسرے سفر کے بعد اس کی بسائی کالونیوں میں موجود مہم جو افراد جنوبی امریکا کے ساحل پر بہت آگے تک جا چکے تھے اور وہ شاید موجودہ برازیل کے ساحل پر بھی پہنچے تھے۔ مگر ان کی مہم جوئی کا مقصد سوائے لوٹ مار کے اور کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے اس ساحلوں کے مناسب نقشے بھی نہیں بنائے تھے۔ امریگو پہلا فرد تھا جس نے جنوبی امریکا کے ساحلوں اور کریبین جزائر کے اولین سائنٹیفک نقشے بنائے تھے۔ وہ جنوبی امریکا کے ملک ہنڈوراس پہنچنے والا پہلا یورپی شخص تھا۔ یہاں اس نے ایسے قبائل دیکھے جن کا رنگ سفید تھا اور ان کے نقوش خاصے حد تک اہل یورپ سے مشابہہ تھے۔ ان لوگوں نے امریگو اور اس کے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ ایک جزیرے کے رہنے والے تھے جو آج سے بہت عرصے پہلے آتش فشاں پھٹنے سے ڈوب گیا تھا اور ان میں سے کچھ جان بچا کر یہاں چلے آئے تھے۔ یہ لوگ بعد میں وہاں پہنچنے والے اسپینیوں کو نہیں ملے۔ ممکنہ طور پر یہ سب مارے گئے یا پرانی دنیا سے آنے والی بیماریوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

اس سفر سے پہلے امریگو اپنے پیالے نما نقشے کو درست کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے ایرک ریڈ کے سفر کا سنا ہوا تھا اور کوشش کر کے نورسوں کے بنائے ہوئے نقشے بھی حاصل کیے تھے۔ یہ نقشے بہت ناقص تھے اور ان میں گرین لینڈ کو ایک چھوٹا سا جزیرہ ظاہر کیا گیا تھا حالانکہ گرین لینڈ تقریباً پورے مغربی یورپ کے مساوی زمین رکھتا ہے۔ اس طرح نیو فاؤنڈ لینڈ کو وہ افریقا کا ایک حصہ سمجھ رہے تھے۔ جب کہ جغرافیائی لحاظ سے ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ افریقا شمال سے بہت نیچے ہے اور نیو فاؤنڈ لینڈ قطب شمالی کے بہت نزدیک ہے۔ اب یہ کینیڈا کا ایک حصہ ہے اور اس سے اوپر قطب شمالی تک صرف برف ملتی ہے۔ مگر سیکسن اقوام افریقا تک نہیں آئی تھیں اور صرف اس بارے میں سنا تھا۔ پھر وہ عصر حاضر کے تمام ہی علوم سے نا آشنا تھیں اس لیے یہ غلط فہمی قابل فہم ہے۔

جیسے جیسے امریگو کی معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ نقشہ درست کرتا جا رہا تھا اس کا یہ احساس قوی ہو رہا تھا کہ شمال میں ویسٹ انڈیز کے متوازی کوئی بہت بڑی سرزمین ہے اور وہ اس سرزمین تک پہنچنے کا خواہش مند تھا۔ مگر بدقسمتی سے اسپین کی حکومت کو اس سرزمین سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز ویسٹ انڈیز (جزائر اور جنوبی امریکا) تھا۔ اس لیے مجبوراً اسے بھی اپنی توجہ اسی طرف رکھنا پڑی تھی۔ اپنی پہلی کامیاب مہم کے بعد امریگو نے شاہ فرڈی ننڈ کی نظروں میں اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ خاص طور سے اس لیے بھی کہ اس نے کولمبس اور اس کے ساتھیوں کے برعکس لوٹ مار کی بجائے اس سفر کو خالص سائنسی تحقیق اور نقشے سازی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس نے نہ صرف جزائر اور ساحلوں کی درست ترین نقشہ کشی کی بلکہ اس نے سمندری روؤں اور ہواؤں کے سسٹم کا بھی بہترین خاکہ بنایا تھا۔

اس کی دی ہوئی معلومات کی بنا پر اسپینی بیڑوں کے اوقیانوس میں سفر بہت آسان ہو گیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ کب ہوائیں چلتی ہیں اور وہ بہت کم وقت میں اوقیانوس پار کر سکتے ہیں۔ کب ہوائیں رک جاتیں اور مہینوں تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس میں رسد اور انسانوں کا بہت زیادہ نقصان ہوتا تھا۔ اب وہ سفر کے لیے بہترین دنوں میں ہی سفر کرتے تھے۔ باقی دنوں میں وہ سفر کی تیاری کرتے

تھے۔ امریگو کو اپنی اگلی مہم کے لیے زیادہ انتظار اور انتظام نہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ اب وہ سرکاری سرپرستی میں جانے والی ایک مہم کا حصہ تھا۔ وہ اس مہم کا کمانڈر نہیں تھا بلکہ اس کا کمانڈر مشہور اسپینی جہاز راں الانسو ڈی اوجیڈا تھا۔ اسے ہوجیڈا بھی کہتے ہیں۔ یہ عرب نژاد اسپینی دو نسل پہلے مسلمان تھا اور اس کے دادا کو جبراً عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ الانسو کی اس مہم کا مقصد جنوبی امریکا کے آخری جنوبی سرے تک جا کر بحر ہند تک رسائی حاصل کرنا تھا۔

یہ خاصا بڑا بیڑہ تھا جس میں دو درجن سے زیادہ جہاز شامل تھے اور اس میں وہ دس ہزار اسپینی بھی تھے جنہیں کیوبا سے آگے جزائر میں آباد کیا جانا تھا۔ یہ اوّلین کالونی اور قلعے بناتے جہاں سے اسپینی برِ اعظم میں اپنی مہمات روانہ کرتے۔ ان دس ہزار اسپینیوں کو کیوبا سے آگے جزائر پر چھوڑتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ امریگو جب پہلی مہم میں کیوبا آیا تو صرف چند سو مقامی باشندے بچے تھے جو اب اسپینیوں کے غلام تھے اور ان سے کام لیا جاتا تھا مگر جب وہ دوسری بار آیا یہ چند سو لوگ بھی صفحۂ ہستی سے نابود ہو چکے تھے۔ اب پورے کیوبا بلکہ جزائر غرب الہند میں ایک بھی مقامی فرد باقی نہیں رہا تھا۔ اب یہاں اسپینی آباد کیے جا رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جلد یا بدیر دوسری یورپی اقوام بھی اس نئی دنیا کا رخ کریں گی اور وہ اس سے پہلے اس کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قابض ہو جانا چاہتے تھے۔ یہ بحری مہم بھی اسی پالیسی کا ایک حصہ تھی۔

تین ہفتے کے طویل سفر کے بعد وہ جنوبی امریکا کے ساحل تک پہنچے۔ یہ جگہ ممکنہ طور پر موجودہ گیانا ہے۔ مگر یہاں آکر الانسو نے اعلان کیا کہ وہ پہلے وسطی اور کسی قدر شمالی ساحلوں کی کھوج کرے گا۔ واضح رہے کہ اس وقت اسپینی میکسیکو کے ساحل تک نہیں پہنچے تھے۔ کیوبا سے محض سو کلومیٹرز دور فلوریڈا کی نکلی ہوئی دم کے آخری سرے تک نہیں گئے تھے حالانکہ درمیان میں جابجا جزائر تھے۔ شمالی امریکا میں وارد ہونے والے اوّلین انسان جب پہلے ہوئے فلوریڈا کے آخری حصے تک پہنچے تو پھر ان ہی جزائر سے ہوتے ہوئے وہ کیوبا اور غرب الہند کے باقی جزائر میں آباد ہوئے تھے۔ کولمبس کو سب سے پہلے اس پر توجہ دینی چاہیے تھی مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر وہ ایسا نہ کر سکا اور شمالی امریکا دریافت کرنے کا اعزاز حاصل کرتے کرتے رہ گیا۔ اپنے آخری سفر میں کولمبس میکسیکو تک پہنچ گیا تھا مگر وہ اسے ویسٹ انڈیز کا ایک حصہ سمجھا تھا۔ پھر الانسو بھی شمال کی طرف بڑھا مگر وہ بھی شمالی امریکا کے ساحل کو نہیں دیکھ سکا۔

شاید قدرت نے یہ اعزاز امریگو کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ مگر اس سے پہلے اس نے ایک اعزاز اور حاصل کیا۔ وہ الانسو سے جدا ہو کر ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھا اور اس نے دریائے ایمزان کا طاس تلاش کر لیا۔ اس لحاظ سے وہ اوّلین فرد ہو سکتا ہے جس نے برازیل کی سرزمین دیکھی ہو مگر ماہرین اس کا دریافت کنندہ امریگو کو تسلیم نہیں کرتے ہیں ان کے خیال میں برازیل اصل میں پرتگالیوں نے دریافت کیا۔ جیسے راس امید کا راستہ بھی ان کی دریافت تھی جس سے انڈیا تک رسائی حاصل کی گئی تھی۔ واسکوڈی گاما بحری راستے سے انڈیا پہنچنے والا اوّلین یورپی شخص تھا۔ اس سے پہلے بھی مختلف یورپی اقوام کے نمائندے یہاں آچکے تھے مگر وہ زمینی راستے سے آئے تھے۔ سمندر کے راستے آنے والا پہلا فرد پرتگالی مہم جو واسکوڈی گاما ہی تھا۔

اوّلین سفر کے دوران امریگو نے نقشہ سازی کا کام جاری رکھا تھا اور اس نے اس کا معیار بھی بنا لیا تھا۔ یہ وہی معیار ہے جو آج بھی بین الاقوامی نقشہ سازی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں میل، گز اور انچ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نے ڈگریز کا استعمال کیا اور اسے مزید ذیلی بلدوں میں تقسیم کیا۔ اگرچہ امریگو نے دنیا کا مکمل نقشہ نہیں بنایا کیونکہ بہت سے خطے اس وقت دریافت ہی نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی زمین کی درست پیمائشوں کا علم تھا۔ اگر اس تک مسلمان ریاضی دانوں اور ماہرین فلکیات کی تحقیق پہنچی ہوتی جنہوں نے زمین کا قطر اور عرض بالکل درست نکال لیا تھا تو شاید وہ اپنا پیالے نما نقشہ بالکل درست کر لیتا۔ اس کے باوجود اسے جدید نقشہ نویسی کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اس فن کو سائنٹیفک کیا تھا۔

امریگو کا یہ سفر تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اس دوران میں وہ دو بار ایمزان کے طاس تک گیا۔ اسے اس عظیم دریا نے بہت متاثر کیا تھا جس میں پانی کی مقدار یورپ میں بہنے والے تمام دریاؤں کی مشترک مقدار سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ یہاں امریگو نے ایسے جانور دیکھے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ جیسے اناکونڈا سانپ اور ایک اونٹ نما جانور لاما جو اس وقت شاید پورے جنوبی امریکا میں پایا جاتا تھا مگر شکار نے اس کی نسل کو اب

محدود کر دیا ہے۔ یہیں سب سے پہلے اہل یورپ نے ٹماٹر کا پودا دیکھا۔ پپیتے سے بھی وہ یہیں آشنا ہوئے۔ امریگو نے کوشش کی کہ یہاں سے کچھ پودے یا ان کے بیج لے جائے۔ واپسی میں اس نے ایک ندی سے بہہ کر آنے والے کچھ بھٹے بھی اٹھائے تھے اس سے پہلے یورپ والوں نے مکئی نہیں دیکھی تھی بلکہ باقی دنیا بھی اس سے ناآشنا تھی۔ ہنڈوراس میں اس نے مقامی قبائل کو ایک پتا نما چیز کو گول کر کے اور سلگا کر کش سے پیتے دیکھا۔ یہ تمباکو سے امریگو کا اولین تعارف تھا۔

جب امریگو اس سفر پر تھا تو اسپین میں لورنزو ڈی میڈیسی نے حکومت کو خط لکھا اور کہا کہ امریگو ویس پوسی اس سے فراڈ میں ملوث ہے اور وہ اسپین کی حکومت کو بھی دھوکا دے گا اس لیے واپسی پر اسے گرفتار کر کے اس سے لورنزو کی رقم واپس دلوائی جائے۔ مگر اسپین کی حکومت نے اس خط پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شاہ فرڈی نینڈ امریگو کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھا اور اس کے خیال میں اگر امریگو نے لورنزو ڈی میڈیسی سے کوئی فراڈ کیا تھا تو یہ معاملہ اس کی حکومت سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ سفر سے واپسی پر اس نے امریگو کا شاندار استقبال کیا اور اسے بے شمار اعزازات اور انعامات سے نوازا۔ یہی نہیں اس نے کچھ عرصے بعد امریگو کو اسپین کا چیف آف نیوی گیشن مقرر کیا اور اسے نیوی گیشن سے متعلق ایک درس گاہ بنانے اور اس میں اس علم کو سائنسی خطوط پر استوار کرنے کا کام سونپا۔ تاکہ آنے والے وقتوں میں اوقیانوس میں سفر آسان اور محفوظ ہو سکے۔ امریگو اس عزت افزائی اور قدر دانی سے بہت خوش ہوا تھا۔

دوسرے سفر میں جب امریگو دوسری بار امیزان کے دہانے تک گیا تو وہاں سے واپسی پر اس نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور ساحل کے ساتھ ساتھ واپس آنے کی بجائے اس نے اپنے بنائے نقشوں پر بھروسا کرتے ہوئے جنوبی اوقیانوس کی گہرائیوں میں قدم رکھا۔ اور براہ راست غرب الہند کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھی مخالف تھے مگر وہ امریگو کو روک نہیں سکے اور اس وقت تک ان کی جان پر بنی رہی جب تک وہ ٹرینیڈاڈ کے جزیرے تک نہیں پہنچ گئے۔ بعد میں انگریزوں کی عمل داری میں یہ جزیرہ تمباکو کی کاشت کے لیے مخصوص ہوا اور اس وجہ سے اسے ٹرینیڈاڈ اینڈ ٹوباگو کہا جانے لگا۔ امریگو نے اس کا جنوبی ساحل دریافت کیا اور یہاں اہل یورپ نے پہلی بار دریائے اورینو کو دیکھا اور پھر وہ گھوم کر اسپین کی کیوبا میں آباد کالونی ہسپانولیا سے ہوتے ہوئے 1500 کے وسط میں واپس اسپین پہنچ گئے۔

امریگو نئی دنیا تک جانا چاہتا تھا مگر ساتھ ہی وہ جنوبی امریکا اور جزائر غرب الہند کو ابھی تک انڈیا کا ایک حصہ ہی سمجھ رہا تھا۔ بعد میں اس نے اپنے خیال سے رجوع کیا تھا اور اسے الگ۔ برِاعظم قرار دیا تھا۔ اگرچہ اس کا پیالے میں نقشہ اشارے دے رہا تھا کہ انڈیا کو اس سے کہیں زیادہ فاصلے پر ہونا چاہیے جتنا کہ وہ تصور کر رہے تھے۔ اس کے باوجود امریگو نے اپنی کسی ابتدائی دستاویز یا خط میں جو اس نے دوسروں کو لکھے اس بات کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ وہ ویسٹ انڈیز کو انڈیا کا حصہ نہیں سمجھتا ہے۔ حد یہ کہ دوسرے سفر میں جب اس نے جنوبی امریکا کے مشرقی ساحل کا بہت سا حصہ دیکھا اور لازمی بات ہے اس نے صرف یہی نہیں دیکھا بلکہ وہاں لوگ اور ان کی طرز معاشرت بھی دیکھی ہوگی۔ جو اس انڈیا سے قطعی میل نہیں کھاتی تھی جس کا شہرہ پورے یورپ میں تھا۔ اس کے باوجود وہ کولمبس کے پھیلائے اسی کنفیوژن پر قائم رہا کہ وہ انڈیا کے مشرقی ساحلوں سے ہو کر آیا ہے۔

دوسرے سفر سے واپسی پر اس نے شاہ فرڈی نینڈ کو تفصیلی رپورٹ دی اور اسے بتایا کہ مشرقی انڈیا میں رہنے والے انسان کسی صورت اسپینی حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ بارود تو کیا دھات کے استعمال سے بھی ناواقف تھے۔ ان کے ہتھیار معمولی درجے کے اور چھوٹے تھے۔ یقیناً شاہ فرڈی نینڈ کی باچھیں یہ سن کر کھل اٹھی ہوں گی۔ اس نے امریگو کی تگ و تاز کو خوب سراہا لیکن اس کی درخواست ماننے سے انکار کر دیا کہ اسے اب شمال کی طرف جانے کی اجازت دی جائے۔ شاہ کے پیشِ نظر پہلے جزائر غرب الہند کے ساتھ لگنے والی برِاعظم کی زمینوں پر تسلط قائم کرنا تھا اور وہ کسی نئے خطے کی دریافت کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی دریافت کو چھپانا ممکن نہیں رہے گا اور دوسری یورپی طاقتیں اس طرف متوجہ ہوئیں تو اس کے لیے بیک وقت کئی جگہوں پر توجہ دینا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اب نئی دریافتیں نہ کی جائیں۔

پرتگال پہلے ہی اسپین کا حریف بن کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کی مہم جو جہاز راں نہ صرف راس امید پار کر کے بحر ہند کے راستے انڈیا تک ہو آئے تھے بلکہ انہوں نے برازیل اور اس سے آگے جنوبی امریکا کے مزید ساحل

دریافت کر لیے تھے۔ وہ برازیل کی زمین پر دعوے دار تھے۔ جب شاہ فرڈی نینڈ نے امریگو کو شمال کی طرف مہم لے جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا تو امریگو کے ذہن میں پہلی بار پرتگال کا خیال آیا۔ وہ مہم جو تھا اور اسے اصل میں مہم جوئی سے مطلب تھا۔ اب یہ کس کی مدد سے ہوتی ہے اس سے خاص غرض نہیں تھا۔ اس نے تجارت کے بہانے سے پرتگال کا سفر کیا اور وہاں شاہی دربار کے سامنے اپنا خیال پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی تجویز کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اسے ایک بیڑہ دے کر شمالی سفر پر روانہ کر دیا جائے۔

مگر یہاں اس کی تجویز پر کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ پرتگالیوں کی بھی توجہ جنوبی امریکا اور انڈیا تک جانے والے نو دریافت شدہ راستے پر تھی۔ اس لیے انہوں نے امریگو کی پیشکش پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ ایسا ہی تھا کہ بھوکے درندوں کے ایک غول کو ایک بڑا شکار مل گیا تھا اور فی الحال ان کی ساری توجہ اسے کھانے پر مرکوز تھی اور وہ اسے چھوڑ کر دوسرے شکار پر جانے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں دوسرے جانور زیادہ حصہ مار لیں اور انہیں واپسی پر کچھ نہ ملے۔ اس لیے اسپین اور پرتگال دونوں ہی دریافت شدہ جنوبی امریکا پر اپنے دانت تیز کر رہے تھے۔ کیوبا اور جزائر غرب الہند پر اسپین کا قبضہ مستحکم ہو گیا تھا اور اب پرتگالی جنوبی امریکا میں اپنا حصہ حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کی بحری مہمات کا بنیادی نقطہ یہی تھا۔ مجبوراً اسے ایک پرتگالی مہم کا حصہ بننا پڑا جو جنوبی امریکا جا رہی تھی۔ اس مہم کا سربراہ مشہور پرتگالی جہاز راں اور مہم جو گونسالو سیولہو تھا۔ امریگو اس مہم کا ایک حصہ تھا۔

وہ لزبن سے روانہ ہوئے اور راس وردا تک پہنچے تو وہاں اس کی ملاقات انڈیا سے لوٹ کر آنے والے پیڈرو الوارس کابرال سے ہوئی۔ پیڈرو نے اسے اس سفر کا جو احوال بتایا تو امریگو کا یہ خیال مزید پختہ ہو گیا کہ اس نے جس سرزمین (جنوبی امریکا) کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کیا تھا وہ اصل میں انڈیا کا مشرقی حصہ ہے اور پیڈرو اس کے کسی اور ساحل سے ہو کر آ رہا ہے۔ پیڈرو اور اس سے پہلے واسکوڈی گاما جنوبی انڈیا کے ساحلوں تک پہنچے تھے۔ یہ ساحل بھی مشرقی تھے اور ممکنہ طور پر موجودہ مدراس کا کوئی مقام تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ امریگو کس طرح اسے انڈیا کا مغربی حصہ سمجھ رہا تھا۔ یہ معمولی غلط فہمی نہیں تھا اور امریگو جیسے ماہر نقشہ نویس سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر دونوں ہی مشرقی ساحل تک پہنچے تھے تو مشرقی ساحل بیک وقت بحرِ اوقیانوس اور بحرِ ہند سے کیسے لگ سکتا ہے نیز دونوں کا رخ مشرق کی طرف کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ ایسی غلط فہمی تھی کہ اسکول کا بچہ بھی اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

تیسرے سفر میں وہ حسبِ معمول جزائر غرب الہند سے ہوتے ہوئے جنوبی امریکا کے ساحل تک پہنچے اور اس کے بعد آگے سفر شروع کیا۔ اس سفر میں امریگو نے خلیج ریو ڈی جنرو کا ذکر کیا اور دعویٰ کیا کہ اس کے جہاز اس خلیج تک پہنچ گئے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے ریو ڈی جنرو کی اس پہاڑی پلیٹو کا ذکر نہیں کیا جو اس شہر کی پہچان ہے اور شہر کے ہر حصے سے دکھائی دیتی ہے۔ بعد میں اس پلیٹو پر فرشتے کا دیوہیکل مجسمہ نصب کیا گیا جو آج اس شہر کی شناخت ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ برازیل کے ساحلی نقشے اسی دوران میں پرتگالی مہم گونسالو اور امریگو کی مہم کی واپسی کے بعد سے مرتب ہوئے مگر دونوں نے ہی پلیٹو کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے یہ ساری مہم ہی مشکوک ہو گئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ریو ڈی جنرو تک رسائی حاصل کر نہیں سکے۔ وہ اس سے پہلے کسی اور خلیج تک پہنچے اور اسے ریو ڈی جنرو کی خلیج سمجھ بیٹھے تھے۔ مگر اس سفر کے دوران پہلی بار امریگو کا خیال تبدیل ہوا کہ وہ انڈیا کی سرزمین پہنچا ہے۔

یورپی اور ایشیا ملاح ہمیشہ سے قطبی تارے سے مدد لیتے رہے ہیں۔ جو پورے شمال میں دکھائی دیتا ہے اور ہمیشہ ایک ہی مقام پر ہوتا ہے۔ اہلِ یورپ جانتے تھے انڈیا بھی شمالی نصف کرے میں ہے اور وہاں سے بھی قطبی ستارہ نظر آتا ہے۔ مگر جب امریگو برازیل کے ساحل کے پاس پہنچا تو اسے قطبی ستارہ نظر نہیں آیا جو لزبن سے چلتے ہوئے صاف دکھائی دے رہا تھا اور کیوبا تک نظر آتا رہا مگر جب انہوں خطِ استوا عبور کیا اور جنوبی نصف کرے میں قدم رکھا تو قطبی ستارہ نظر آنا بند ہو گیا۔ اس سے امریگو نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ جس زمین تک پہنچے ہیں وہ انڈیا نہیں ہے ورنہ قطبی ستارہ یہاں سے بھی نظر آتا۔ یہیں سے امریگو کا خیال بدلنا شروع ہوا۔ واپسی پر اس نے خطِ استوا کے بعد دوبارہ قطبی ستارے کو دیکھا۔ اس بار اسے یقین ہو گیا کہ وہ انڈیا سے نہیں آ رہا ہے۔

مگر اس نے یہ بات اپنے ہم سفروں سے نہیں کی بلکہ واپسی پر اس نے پرتگال سے لورنزو ڈی میڈیسی کو ایک خط لکھا۔ وہ جانتا تھا کہ میڈیسی نے اسپین کی حکومت کو اس کے

خلاف ایک خط لکھا ہے اور اسے فراڈ کا مرتکب قرار دیتے ہوئے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے باوجود امریگو نے اس سے رابطہ رکھا ہوا تھا اور ہر مہم سے واپسی پر اسے خط میں احوال لکھ کر بھیجتا تھا۔ اس خط میں اس نے پہلی بار اپنے خیال کا اظہار کیا کہ اس نے جو زمین دریافت کی ہے وہ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور وہ اس انڈیا اور ایشیا سے بالکل مختلف ہے جن کی وضاحت معروف تاریخ دان پٹولمی اور سیاح مارکو پولو نے کی تھی۔ امریگو نے لکھا اس کے خیال میں یہ افریقا اور ایشیا سے ہٹ کر ایک نئی سرزمین اور ایک نیا برِاعظم ہے۔ اب تک دنیا تین... برِاعظموں سے واقف تھی۔ امریگو کے خیال میں اس نے چوتھا برِاعظم دریافت کرلیا تھا۔ مگر پرتگال میں اس نے یہ دعویٰ عام نہیں کیا۔ البتہ یہ اسے بھی علم نہیں تھا کہ اس نے صرف چوتھا نہیں بلکہ پانچواں برِاعظم بھی دریافت کرلیا تھا۔

واپسی کے اگلے سال وہ چوتھی بار نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اس بار بھی اس کا سفر پرتگالیوں کے ساتھ تھا۔ عجیب بات تھی کہ اس نے دو اوّلین سفر اسپینیوں کے ہمراہ کیے اور یہ قطعاً اس کے اپنے سفر تھے مگر اس نے اس سے حاصل ہونے والی معلومات شاہ اسپین کے سپرد کیں دوسری طرف وہ تیسری اور چوتھی بار پرتگالیوں کے ہمراہ گیا اور وہ ان کی مہمات کا ایک حصہ تھا مگر اس نے ان مہمات سے حاصل ہونے والی معلومات کا معمولی حصہ ہی ان سے شیئر کیا تھا۔ پھر حریفوں کے لیے کام کرنے کے باوجود اس کے دربار اسپین سے تعلقات بحال رہے بلکہ اس کی قدر و منزلت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس کا چوتھا سفر کسی قدر ابہام کا شکار رہا ہے۔ اس کے پہلے سفر کی طرح اور ماہرین آثاریات شبہ کرتے ہیں کہ کیا وہ واقعی کسی جگہ گیا تھا۔ اس کی دستاویزات کے مطابق اس نے ایک بار پھر برازیل اور اس سے آگے کے ساحلوں کا سفر کیا تھا۔ مگر ایک ہی علاقے کے بار بار سفر کی تک سمجھ سے بالاتر تھی۔

کہا جاتا ہے جنوبی امریکا جاتے ہوئے اس نے کیوبا میں رک کر ایک الگ بحری جہاز لیا اور اس میں کیوبا کے گرد چکر کاٹتے ہوئے وہ موجودہ ہوانا کے مقام پر پہنچا اور یہاں سے اس نے پہلی بار وہ جزائر دیکھے جو ایک لڑی کی صورت میں شمالی امریکا کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت اسپینی کیوبا کے شمالی ساحلوں پر نہیں پہنچے تھے اور وہ اس کے جنوبی اور مغربی ساحلوں تک محدود تھے۔ امریگو نے اپنے اس سفر کو خفیہ رکھا اور پرتگال واپسی پر کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ وہ حسبِ معمول سوا یا ڈیڑھ سال سفر پر رہا۔ مئی 1503 میں روانہ ہوا اور جون 1504 یا اس کے دو مہینے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس مہم کے دوران اس کے خفیہ سفر میں اس کے ساتھ اسپینی ملاح تھے اور اس نے جو جہاز حاصل کیا تھا وہ کرائے کا تھا جسے اس نے واپسی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے پرتگالیوں کو اس کے سفر اور اس سے حاصل ہونے والی معلومات کی بھنک بھی نہیں پڑی تھی۔

چوتھے سفر سے واپسی پر اس نے ایک بار پھر لورنزو ڈی میڈیسی کو خط لکھا اور اسے بتایا کہ اس نے ایک نئے اور بہت بڑے برِاعظم کے اشارے دیکھے ہیں۔ وہ کوشش کر رہا ہے کہ اس طرف اپنی مہم لے کر جائے تاکہ اس کی دریافت کا سہرا اس کے سر بندھے۔ اس نے یہ واضح نہیں کیا کہ اس نے جس زمین کے اشارے دیکھے تھے وہ کون سی تھی۔ مگر اس نے میڈیسی کو شمال کی طرف اس زمین کے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ جب کہ اس وقت تک یورپ سے کوئی مہم شمال کی طرف نہیں تھی۔ جہاز راں اس طرف کے سمندر سے ناواقف تھے اور کولمبس جس نے پہلی بار سارا گوسا کے سمندر میں سفر کیا تھا اس کے طوفانی مزاج اور عجیب و غریب مظاہر دیکھے تھے۔ (واضح رہے کہ برمودا ٹرائی اینگل اسی علاقے میں ہے اور کولمبس نے یہاں عجیب و غریب روشنیاں اور دیوقامت سمندری عفریت دیکھے تھے۔ اس نے اڑن طشتریوں جیسی چیزوں کا ذکر بھی کیا تھا۔ جن سے روشنیاں نکل رہی تھیں اور وہ پلک جھپکنے میں ایک افق سے دوسرے افق تک جا پہنچی تھیں۔ اس نے پُراسرار سفید پانی کا ذکر بھی کیا)۔

کولمبس کے اس سفر کے بعد اسپینی شمال کے سمندر میں سفر سے گریز کرنے لگے تھے اور وہ کیوبا کے نچلے حصے کی طرف جاتے تھے جو سارا گوسا کے سمندر سے دور واقع ہے۔ پھر شمالی سمندر اسپینیوں میں آسیب زدہ مشہور ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسپینی کبھی اس طرف نہیں گئے۔ انہوں نے سارا وسطی اور جنوبی امریکا چھان مارا مگر اپنی پہلی کالونی سے محض سو کلومیٹرز دور فلوریڈا تک کبھی نہیں پہنچ سکے۔ پرتگال کی بحری تاریخ امریگو کے دعویٰ کردہ اس سفر کے بارے میں قطعی خاموش ہے۔ ان ہی سالوں میں کپتان گونسالو کے ماتحت ایک بیڑہ جنوبی امریکا ضرور گیا تھا۔ مگر اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ امریگو بھی اس سفر میں شامل تھا یا نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امریگو نے اس بارے میں کوئی مستند دستاویز نہیں

چھوڑی۔ سوائے ان خطوط کے جو اس نے میڈیسی اور اپنے ایک اطالوی دوست سوڈرینی پیرو کو لکھے تھے۔ اس شخص بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امریگو کا بچپن کا دوست تھا۔ ان کے خطوط میں اس نے نئی دنیا کی دریافت کا ذکر کیا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ امریگو کے یہ خطوط جو اس نے میڈیسی اور دوسرے دوستوں کو لکھے تھے اس کی موت کے خاصے عرصے بعد منظر عام پر آئے اور اس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ شمالی امریکا کی دریافت کو امریگو سے منسوب کیا جانے لگا تھا اور کولمبس کے حامی اس پر چراغ پا تھے۔ اسپین کی حکومت نے امریگو کو نہ صرف اسپین کی شہریت عطا کی بلکہ اسے شاہ فرڈی ننیڈ دوم کی طرف سے میجر پائلٹ کا عہدہ ملا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسپین کی جہاز رانی کا مکمل شعبہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اس کا انتقال اپنی جاگیر پر ہی ہوا تھا۔ یہ جاگیر اسپین کے علاقے سیولی میں واقع ہے۔ پرتگال کے لیے مہماتی خدمات انجام دینے کے باوجود آخر کار وہ اسپین واپس آیا تو دربار کی طرف سے اس پر نوازشات کی بارش کر دی گئی۔ جب کہ اسی دربار نے کولمبس کا سب کچھ ضبط کر کے اسے قید خانے ڈال دیا تھا۔

اسپینی حکومت کی طرف سے اسے متعدد سائنسی تحقیق کے اداروں کا سربراہ مقرر کیا۔ اس کے بنائے ہوئے نقشے اسپین کی حکومت نے اپنے قبضے میں رکھے تھے اور یہ نقشے کسی دوسرے ملک یا اس کے شہری کو دینے کی ممانعت تھی کیونکہ ان نقشوں میں جنوبی امریکا اور جزائر غرب الہند تک پہنچنے کے آسان راستے واضح کیے گئے تھے۔ سیولی میں قیام کے دوران امریگو نے نیوی گیشن کا ایک اسکول قائم کیا اور وہ نئے نیوی گیٹرز کی تربیت کرنے لگا اور بعد میں یہی نیوی گیٹر اسپین کی فوج کو جنوبی امریکا تک لے گئے تھے۔ مسلسل ایک عشرے تک مہم جوئی نے اسے تھکا دیا تھا اور اس نے اسی وجہ سے پرتگال سے اسپین کے لیے واپسی اختیار کی تھی۔ پچاس سال کی عمر زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ مگر تیسرے سفر کے دوران امریگو شدید بیمار رہا اور ایک موقع پر اس کے ہمراہیوں کو اس کی موت کا یقین ہو چلا تھا مگر معجزانہ طور پر وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ البتہ اس بیماری نے اس کی صحت پر شدید اثرات مرتب کیے تھے۔

چوتھے سفر کے بعد اس نے ایک طرح سے مہم جوئی سے ریٹائرمنٹ لے لی اور اپنے حاصل کردہ علم کو اگلے لوگوں میں منتقل کرنے لگا۔ اسپین آنے کے بعد اس نے دو نوٹ لکھے تھے ایک کا عنوان تھا۔ منڈوس نووس (نئی دنیا) یہ ان اٹالین الفاظ کا لاطینی ترجمہ ہے جو اس نے اپنے نوٹ پر لکھے۔ اس میں اس نے جنوبی امریکا کو نئی دنیا قرار دیا مگر یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ اسے ایک الگ برِّ اعظم سمجھتا ہے جیسا کہ اس نے لورنزو کو لکھے گئے خطوط میں کہا۔ اگلے نوٹ کا نام خاصا طویل ہے۔ (امریگو ویس پوچی کے نئی دنیا کی طرف چار مہمات کے بارے میں خیالات اور سوالات)۔ اس میں امریگو نے اپنی مہمات کا نچوڑ پیش کیا ہے مگر اس میں بھی اس نے نہ تو شمالی امریکا کا ذکر کیا اور نہ ہی اس نے ویسٹ انڈیز کو برِّ اعظم قرار دیا۔ ماہرین حیران ہیں کہ اس نے اپنی اہم ترین دریافتوں کا ذکر ان دستاویز میں کیوں نہیں کیا۔ خطوط میں ان کا ذکر اپنی قیمتی دریافتوں کو دریا برد کرنے کے مترادف تھا۔

غالباً امریگو ویس پوچی سمجھ گیا تھا کہ پرتگال اور اسپین کی حکومتوں کا مقصد نئی سرزمین پر قبضہ کر کے اس کے خزانوں کو حاصل کرنا ہے۔ انہیں اس دریافت کے سائنسی پہلو سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ فرڈی ننیڈ نے اپنی ساری زندگی میں جو واحد تعلیمی ادارہ قائم کیا اور شاہی خزانے سے اس کے لیے ادائیگی کی وہ نیوی گیٹر اسکول تھا کیونکہ یہاں سے تربیت اور تعلیم حاصل کرنے والے ملاح ہی اسپین کی فوج کو جنوبی امریکا کے دور دراز علاقوں تک لے جاتے۔ اسی طرح پرتگالیوں کو بھی ان دریافتوں سے فوری فائدہ اٹھانے کی لگی ہوئی تھی اور شاید اسی وجہ سے امریگو نے ان لالچی اقوام کو اس نئے برِّ اعظم کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا جو اس نے کیوبا کے شمال مغرب میں دیکھا یا محسوس کیا تھا۔

اسے خطرہ ہوگا کہ یہ دونوں قومیں وہاں بھی قتل و غارت گری کریں گی۔ امریگو ان چار سفروں کے دوران دیکھ چکا تھا کہ ان برِّ اعظم کے مقامی افراد کے ساتھ انہوں نے کیا کیا تھا۔ اس نے سوڈرینی پیرو کو جو خطوط لکھے ان میں اس نے اسپینیوں اور پرتگالی اقوام کی سفاکی کا ذکر بھی کیا جو انہوں نے مقامی قبائل کے ساتھ روا رکھی تھی۔ ان کا بے دریغ قتل عام کیا اور ان کو جان بوجھ کر وہ وبائی بیماریاں لگائیں جن سے وہ نا آشنا تھے اور وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پورے پورے قبائل دنیا سے مٹ گئے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شمال میں موجود سرزمین پر اگر ایسے معصوم قبائل

آباد ہیں تو ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ مگر یہ امریگو کی خوش فہمی تھی۔ شمالی امریکا پہنچنے والی اولین اقوام ڈچ اور انگریز تھے۔ ان کے ساتھ جرمن اور مغربی یورپ کی دوسری اقوام بھی تھیں۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے مگر مقامی ریڈ انڈین قبائل کے خلاف سب نے اتحاد کرلیا اور ان کو مسلسل مارتے ہوئے ان کی نسل تقریباً ختم ہی کردی۔ جو بچے ان کو ان کی زمینوں سے بے دخل کردیا۔ اس کے مقابلے میں جنوبی امریکا کی بہت سی مقامی نسلیں برقرار ہیں اور آج وہ اپنی زمینوں کے مالک ہیں۔

امریگو کو علم نہیں تھا کہ اس کے یہ خطوط اٹلی اور دوسرے یورپی ممالک میں منظر عام پر آچکے تھے۔ یہ 1503 میں پہلی بار پرنٹ ہوئے یعنی جب امریگو اپنے آخری سفر پر تھا۔ لازمی بات ہے یہ خطوط الرنزو ڈی میڈیکی یا سوڈرینی کے پاس سے نکلے تھے۔ 1507 میں دوسری بار پرنٹ ہوئے اور لاتعداد یورپی ممالک میں تقسیم ہوئے۔ اس بار بھی امریگو کو علم نہیں ہوا کیونکہ یہ خطوط اس کی زندگی میں اسپین یا پرتگال نہیں پہنچے تھے۔ یہ زیادہ تر جرمنی اور وسطی یورپ میں تقسیم ہو رہے تھے۔ اٹلی میں بھی ان کا کچھ حصہ پہنچا تھا۔ اصل میں باقی یورپ ابھی چھاپے خانے سے لاعلم تھا اور یہ چیز جرمنوں کے پاس تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان ہی خطوط کی بنیاد پر ایک جرمن ویلڈ ریسی مولر نے امریگو پر ایک کتاب شائع کی۔

کتاب کا نام لاطینی میں ''کوائیو رامریکیا ویس پوسی''

جرمن زبان سے لاطینی میں ترجمہ ہونے پر امریگو کا لفظ امریکیا ہو گیا اور بعد میں اسی لفظ سے امریکا نکلا۔ یہ لفظ اس سارے خطے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا جو نئی دنیا کے طور پر دریافت ہوئے تھے۔ اس کے لفظی معنی تھے۔ ''امریگو ویس پوسی کے چار سفر''۔ حیرت انگیز طور پر اس کتاب میں امریگو کے بنائے ہوئے جو نقشے شامل کیے گئے ان میں وسطی امریکا کے نقشے میں فلوریڈا کا اندرونی ساحل واضح تھا جو بے آف میکسیکو میں لگتا ہے۔ آخر امریگو کو اس بارے میں کیسے پتا چلا جب کہ وہ وہاں گیا ہی نہیں تھا۔ کسی دوسرے جہاز راں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ کوئی اسے انڈیا سے ہٹ کر کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ حیرت انگیز بات ہے کہ امریگو کے پہلے نما نقشے میں فلوریڈا کا یہ ساحل موجود تھا۔ یہ اس نے کہاں سے لیا اور سب سے اہم بات کہ اس نے اپنی دریافتوں کو منظم انداز میں دستاویز کیوں نہیں کیا؟ اگر وہ

انہیں اسپین اور پرتگال سے چھپانا چاہ رہا تھا تب بھی اسے کم سے کم تحریری صورت میں تو لانا چاہیے تھا۔

امریگو کو اپنی وفات تک ان خطوط اور مارٹن کی کتاب کے بارے میں علم نہیں ہوا تھا۔ البتہ اس کے تین خاص خطوط جو اس نے میڈیکی کو لکھے تھے وہ شائع ہونے سے رہ گئے تھے۔ یہ غائب ہو جانے والے خطوط اٹھارویں صدی میں دریافت ہوئے اور جب یہ منظر عام پر آئے تب امریگو اور کولمبس کا تنازعہ شدت سے ابھر کر سامنے آیا۔ عجیب بات تھی کہ برطانیہ، فرانس اور جرمنی تینوں کولمبس کے طرفدار تھے اور اسے ہی امریکا کا دریافت کنندہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے امریگو کی دریافت پر شمالی امریکا کا رخ کیا تھا۔ اس کے برعکس اسپین اور اٹلی امریگو کے حامی تھے۔ جب کہ امریگو نے ان سے اپنی دریافتوں کو چھپایا تھا۔

ان تینوں خطوط میں جو اس نے دوسرے سفر کے دوران، پھر تیسرے سفر کے آغاز میں راس وردہ سے اور آخری اسی سفر سے واپسی پر لزبن سے لکھا تھا۔ کولمبس کے حامی ماہرین کے خیال میں یہ خطوط امریگو ویس پوسی نے نہیں لکھے بلکہ ان خطوط کو اس کے دوسرے خطوط کی معلومات کی بنیاد پر دیگر افراد نے لکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ منظم جعلسازی تھی۔ مگر یہ جعلسازی کس نے کی اور کب کی اس کا کوئی جواب موجود نہیں ہے۔ یہ خطوط پھر وسیع پیمانے پر شائع ہو کر تقسیم ہوئے تھے۔ سولہویں صدی میں شائع ہونے والے مارٹن کی کتاب نے بے شمار جہاز رانوں اور مہم جوؤں کو شمالی امریکا کی طرف جانے پر اکسایا تھا۔

مارٹن ویلڈ ریسی مولر کی کتاب سے متاثر ہو کر ایک ڈچ نقشے میں نئی دنیا کو امریکس کے نام سے پکارا گیا۔ امریگو ویس پوسی کا نام لاطینی میں امیریکس ویس پوسیکس بنتا ہے اور یہیں سے اس پورے۔ برِ اعظم کو پہلے امریکس اور بعد میں صرف امریکا کہا جانے لگا۔ جدید جغرافیائی تقسیم اور سائنسی تحقیق کے بعد۔ برِ اعظموں کو ان کی پلیٹوں کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا تو یہ پورا خطہ شمالی اور جنوبی امریکا کہلانے لگا۔ لفظ امریکا بھی مارٹن ویلڈ ریسی مولر نے اخذ کیا جب اس نے بعد میں اپنی کتاب کے نئے ایڈیشنوں میں یہ لفظ استعمال کیا مگر یہ مروج خاصا بعد میں جا کر ہوا۔ سترھویں صدی کے آخر تک جب کہ شمالی امریکا دریافت ہو کر آباد بھی ہو گیا تھا تب بھی اسے نئی دنیا اور ویسٹ انڈیز ہی کہا جاتا تھا۔ حد یہ کہ اٹھارویں صدی تک جب سب واضح ہو گیا تھا

تب بھی جنوبی امریکا کو ویسٹ انڈیز پکارا جاتا تھا۔

بعد میں ویسٹ انڈیز کا نام صرف چند مخصوص ممالک کے لیے رہ گیا اور اس کی وجہ بھی دوسری تھی کہ انگریزوں نے انڈیا سے مزدور لاکر اس خطے میں آباد کیے تھے۔ ان میں سے بہت سے ملکوں میں اکثریتی آبادی ہندو ہے جو انڈیا سے لائے گئے تھے اور باقی ممالک میں سیاہ فام ہیں جو افریقا سے لائے گئے۔ یہاں اب مقامی نسل کا ایک فرد بھی موجود نہیں ہے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں جاکر موجودہ امریکا امریکا کہلانے لگا جب اس نے برٹش راج سے آزادی حاصل کی اور اپنا نام یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا رکھا۔ جدید برِاعظمی تقسیم کے بعد شمالی اور جنوبی امریکا الگ الگ برِاعظم قرار پائے۔ شمالی امریکا میں کینیڈا، میکسیکو اور امریکا شامل ہیں جب کہ جنوبی امریکا میں تیرہ ممالک خاص مین لینڈ پر ہیں جب کہ کریبین اور آس پاس کے جزائر کی چھوٹی مملکتیں بھی اصل میں اسی کا حصہ شمار ہوتی ہیں۔ جیسے کیوبا، جمیکا، ڈومینن ری پبلک اور ٹرینیڈاڈ اینڈ ٹوباگو ہیں۔

موجودہ اور آنے والے تنازعات سے بے خبر امریگو اسپین میں اپنے آخری دنوں میں بہت سے اہم معاملات نمٹا رہا تھا اور ان میں سے ایک اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ اٹلی سے نکلنے کے بعد اس کی زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سرے سے عورت کے بغیر رہا تھا کیونکہ اس وقت اسپین اور پرتگال دونوں ممالک میں مسٹریس رکھنے کا رواج تھا۔ البتہ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ چوتھے سفر سے واپسی اور اسپین لوٹنے کے بعد اس نے ایک خاتون ماریا سیریزو سے شادی کی۔ اس خاتون کا پس منظر اور قومیت نامعلوم ہے۔ اسے اسپینی اور اطالوی قرار دیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ امریگو کی طرح اٹلی سے ہجرت کرکے اسپین میں آباد ہونے والی ایک اطالوی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی قومیت سے قطع نظر امریگو آخر دم تک اس کے ساتھ رہا۔

میریا نے بعد میں اس کی بیوہ کی حیثیت سے شاہی اعزازات کے ساتھ اس کی پنشن بھی تاعمر وصول کی جو دس ہزار مرویڈس سالانہ بنتی تھی یہ سب سے بڑا اسپینی سکہ تھا جو اس وقت رائج تھا اور اس کی مالیت آج کے سترہ ڈالرز کے برابر بنتی ہے۔ اس کا مطلب ہے امریگو بیش قیمت تنخواہ حاصل کررہا تھا۔ کیونکہ اس کی پنشن اس کی تنخواہ کے برابر تھی۔ 1512 کے گزرتے سرما میں امریگو کی طبیعت خراب ہوئی۔ مگر وہ اپنی سرکاری ذمے داریاں ادا کرتا رہا۔ بہار کی آمد کے ساتھ ہی اس کی بیماری شدت اختیار کرگئی۔ اسے سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی۔ اس لیے اسے سمندر سے دور ایک بلند پہاڑی ولا منتقل کردیا گیا۔ مگر اس کا آخری وقت آگیا تھا۔ 22 مئی 1512 کے دن امریگو نے چھپن برس کی عمر میں آخری سانس لی اور دنیا سے رخصت ہوگیا یہ جانے اور سوچے بغیر کہ اس کا نام جلد ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا اور شاید قیامت تک باقی رہے گا۔

جیسے اس کی زندگی غیر متوقع رہی اور صورت حال کبھی واضح نہیں ہوتی تھی اس طرح اس کی موت بھی غیر متوقع تھی۔ مرنے سے پہلے وہ خاصا صحت مند اور روایتی اطالوی جسامت کا مالک تھا۔ پھر مرنے کے بعد اس کی تدفین کا معاملہ بھی پُراسرار حیثیت اختیار کرگیا۔ اس نے اطالوی شہریت اسی وقت ترک کردی تھی جب وہ اٹلی سے نکلا اور دوبارہ کبھی اٹلی نہیں گیا۔ پھر جب وہ ساری یورپی دنیا میں ایک معروف جہاز راں بن گیا تھا تب اس نے اسپین کی شہریت اختیار کی اور مرتے دم تک یہیں مقیم رہا۔ اس نے مرنے سے پہلے ایسی کوئی تحریری وصیت نہیں کی کہ اسے کہاں دفن کیا جائے۔ اگر اس نے کوئی زبانی ہدایت کی تھی تو یہ بھی کبھی منظرعام پر نہیں آئی۔ مگر اس کی لاش اسپین سے اٹلی فلورنس لائی گئی اور اس کی تدفین اس کے آبائی قبرستان میں کی گئی۔

یہ عقدہ آج بھی لاینحل ہے کہ آخر امریگو کو اسپین سے اٹلی لاکر کیوں دفن کیا گیا؟ کیا یہ اس کی آخری خواہش تھی۔ عمر کے آخری وقت میں اس پر وطن یا خاندان کی محبت غالب آگئی اور اس نے اپنی سرزمین اور اپنے آباؤ اجداد کے درمیان دفن ہونا پسند کیا۔ کیا اسپین کی حکومت نے کولمبس کی طرح اس سے بھی آنکھیں پھیرلیں جب تک وہ زندہ رہا اور ان کے کام آتا رہا تو اسے سرآنکھوں پر بٹھایا جاتا رہا اور جب وہ مرگیا تو اسے دفن ہونے کے لیے دو گز زمین دینے سے بھی انکار کردیا۔ دیکھا جائے تو اس کا کام اتنا بڑا نہیں تھا مگر وہ کولمبس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش قسمت ضرور رہا جب اسے زندگی میں ستائش، دولت اور عہدے سب ملے۔ مرنے کے بعد اسے اپنی زمین کی مٹی ملی اور آج اس کی قبر ساری دنیا کے علم میں ہے جب کہ کولمبس کا حتمی مدفن کسی کے علم میں نہیں ہے۔

کمپیوٹر کا سفر

حسن رزاقی

کمپیوٹر آج ہر گھر کی ضرورت بن گیا ہے۔ کوئی اسے معلومات کے حصول کے لیے استعمال کررہا ہے تو کوئی اسے بطور ریکارڈ پلیئر، کوئی اس پر گیم کھیلتا ہے تو کوئی اسے معاشرتی ویب سائٹ پر گپ شپ لگانے کے لیے۔ اس عجوبہ مشین کی ابتدا کیسے ہوئی اس پر ایک سیر حاصل تحریر۔

کمپیوٹر کی ایجاد کن حالات میں اور کیسے ہوئی

''یہ کیسے کام کرے گا؟'' میں نے اپنی میز پر رکھے ہوئے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی فیصل الاج سے پوچھا۔

نوکری شروع کیے ہوئے مجھے ابھی صرف چار پانچ دن ہی ہوئے تھے۔ اب تک مجھے کرنے کے لیے کوئی خاص کام دیا نہیں گیا تھا۔ بے کار بیٹھے رہنے سے طبیعت اکتا گئی تھی۔ میری میز پر دو خالی ٹریز کے علاوہ ایک عدد کمپیوٹر بھی دھرا ہوا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں اس پر ہاتھ صاف

کرسکتا تھا مگر مجھے اس کو استعمال کا طریقہ نہیں معلوم تھا۔ میرے برابر والی میز فیصل الااج کی تھی۔ میں نے سوچا فیصل سے مدد لی جائے۔ فیصل کو خود بھی کمپیوٹر کے استعمال کرنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ اس نے صرف ایک کمپیوٹر کورس میں حصہ لیا تھا جس کا دورانیہ صرف دو دن کا تھا۔ اس کے نتیجے میں فیصل کو کمپیوٹر سے متعلق کچھ بنیادی معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔

آج تقریباً ہر پڑھے لکھے گھرانے میں کم از کم ایک کمپیوٹر ضرور ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں کمپیوٹر کے استعمال کرنے والے موجود ہیں اور ہر کوئی بل گیٹس کے نام سے واقف ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے پاس بھی بل گیٹس کی طرح سے دولت کا انبار جمع ہو جائے لیکن بہت کم لوگ ہوں گے جو اس شخص کے نام سے واقف ہوں گے جو ''بابائے کمپیوٹر'' کہلاتا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد کے پیچھے ایک لمبا سفر ہے۔ اس سفر سے واقفیت بھی بہت کم لوگوں کو ہے۔ کمپیوٹر کا بیج انیسویں صدی کے اوائل میں ہی بویا جا چکا تھا مگر اس کے درخت کو پھل دینے میں ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔ اس دوران حساب کتاب کی دنیا کو دوسرے ذرائع سے اپنی ضروریات کو پورا کرنا پڑا۔ یہ ذرائع کیا تھے اس کی جانکاری بھی بہت کم لوگوں کو ہے۔ اس مضمون کا مقصد کمپیوٹر کے اس سفر سے متعلق بنیادی معلومات فراہم کرنا ہے۔

سفر میں اگر کوئی ساتھی مل جائے تو سفر کا مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس آسانی کے پیش نظر میں نے کمپیوٹر کو تنہا سفر نہیں کرنے دیا ہے بلکہ اس میں اپنا ذاتی سفر بھی شامل کر دیا ہے۔ اس زعم اور خوش فہمی میں نہیں کہ ''نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں۔'' بلکہ اس بات کے مدنظر کہ یہ ہم سفری کمپیوٹر کی خشک سال داستان میں کچھ نمی پیدا کر دے گی۔ کیونکہ شاعر سے معذرت کے ساتھ ''ذرا نم ہو تو یہ قصہ بڑا دلچسپ ہے ساقی''

لیکن اس مضمون میں کمپیوٹر کی چند ایک خشک تکنیکی اصطلاحات کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ اگر کریلے سے کڑواہٹ کو مکمل طور پر نکال دیا جائے تو وہ کریلا نہیں رہتا میٹھا کدو بن جاتا ہے۔ آیئے اس سفر کا آغاز کریں۔

''معلوم نہیں۔'' فیصل نے جواب دیا۔ ''اس کو آن کر کے، ڈبلیو آئی این (WIN) انٹر کرو شاید کام بن جائے۔''

کام واقعی بن گیا۔ کمپیوٹر کی اسکرین پر روشنی نے اپنا جلوہ دکھایا لیکن صرف اس کے جلوے سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اب اس کے آگے کیا کیا جائے؟ اس مشکل کا حال بھی فیصل کے پاس موجود تھا۔

''اس کے آگے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا ہوں۔'' فیصل نے ہاتھ پیر ڈال دیے۔ ''ہاں مگر تم کو کسی بھی کتابوں کی دکان پر ایسی کتابیں مل جائیں گی جن کی مدد سے تم کمپیوٹر کو استعمال کرنے کا طریقہ سیکھ سکتے ہو۔''

بازار میں واقعی ایسی کتابیں موجود تھیں جو کمپیوٹر کے متعلق تھیں اور ایسے لوگوں کے لیے لکھی گئی تھیں جو انتہائی اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیت رکھتے ہوں۔ میرا ذہن ان اعلیٰ صلاحیتوں پر پورا پورا اترتا تھا۔ میں نے بازار جا کر وہ کتابیں خرید لیں۔ ان کے نام تھے ونڈوز فار ڈمیز (Dummies) وغیرہ وغیرہ۔ شہر میں اس وقت مجھ سے بڑا ڈمی شاید ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔

کمپیوٹر کے متعلق ایک مقولہ مشہور ہے۔ ''یہ وہ مشین ہے جو انجینئروں نے انجینئروں کے استعمال کے لیے بنائی تھی۔'' انجینئرنگ کی دنیا میں ہر وقت حساب کتاب یعنی کیلکولیشن کی ضرورت رہتی ہے۔ اس حساب کتاب سے ہمارے ملک کے وہ انجینئر مستثنیٰ ہیں جن کو حکومتی اداروں میں نوکری مل جاتی ہے۔ ان انجینئروں کا حساب کتاب کا دورانیہ صرف کالج کے ایام تک محدود ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کسی بھی سرکاری محکمے میں بطور انجینئر کے لگ جانے کے بعد حساب کتاب کی دنیا سے ان کا ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اب ان کی زندگی میں صرف دو چیزوں کی اہمیت رہ جاتی ہے۔ دستخط کی اور رشوت کی۔

سبق پھر پڑھ دستخط کا رشوت کا خیانت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام ایکزیکٹو انجینئر کا

لیکن یہاں پر ذکر صرف ان کم نصیب انجینئروں کا ہے جن کو قسمت کی دیوی سرکاری محکموں میں نوکری نہیں دلواتی ہے۔ ان انجینئر کو ہمہ وقت حساب کتاب کا سامنا رہتا ہے۔ خاص طور سے ان انجینئروں کو کہ جن کا تعلق تحقیق اور تعلیم سے ہوتا ہے۔ اکثر یہ حساب کتاب اکتا دینے والے اور طویل ہوتے ہیں اور اس میں غلطیوں کا امکان بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس مشکل کا ازالہ اس طرح سے کیا جا سکتا تھا کہ یہ کام انسانوں کی بجائے مشینوں کے سپرد کر دیا جائے۔

مشینوں کو حساب کتاب کے لیے استعمال کرنے کا

خیال سب سے پہلے برطانیہ کے مشہور سائنس دان چارلس بباڑ (Charles Babbage) کو آیا۔ ان کا نام بباڑ اور بیج دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں نمبروں کا حساب کتاب چند مخصوص لوگ کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو کمپیوٹر کہا جاتا تھا۔ ان کو کمپیوٹر اس لحاظ سے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ اپنے ہاتھ سے نمبروں کو کمپیوٹ کرتے تھے یعنی حساب کتاب کرتے تھے۔ ان کے حساب کتاب کے نمبر ٹیبل میں اکثر بہت زیادہ غلطیاں ہوتی تھیں۔ اس وقت کے مشہور اور نامور برطانوی سائنس دان چارلس بباڑ نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے چاہا کہ یہ حساب کتاب انسانوں کی بجائے مشینوں سے لیا جائے تاکہ غلطیوں کا امکان کم ہو اور وقت کی بچت بھی ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چارلس نے ایک مکینکل مشین کا تخیل پیش کیا۔ اس مشین کا نام "ڈفرنس انجن" (Difference Engine) رکھا گیا لیکن اس مشین کا کام مکمل نہیں ہوسکا۔ اس نامکمل مشین کے بعض حصے آج بھی برطانیہ میں آکسفورڈ کے سائنس میوزیم میں موجود ہیں۔

پہلے نامکمل ڈفرنس انجن کے بعد چارلس بباڑ نے ڈفرنس انجن نمبر دو کا ڈیزائن بنایا لیکن اس وقت یہ دوسرا انجن بھی مکمل نہیں کیا جاسکا مگر حال ہی میں یعنی 1991ء میں اس انجن کو مکمل کیا گیا اور اب یہ ڈفرنس انجن نمبر دو لندن کے سائنس میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔

ڈفرنس انجن میں کامیابی حاصل نہ کرنے کے بعد چارلس بباڑ نے ایک مختلف تخیل کے تحت ایک دوسری نوعیت کے انجن کا ڈیزائن بنانا چاہا۔ اس انجن کا نام اینالیٹکل انجن (Analytical engine) رکھا گیا۔ اینالیٹکل انجن میں پنچ کارڈ (Punch card) کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ کارڈ پنچ کارڈ اس لیے کہلائے کہ ان میں چھوٹے چھوٹے سوراخ داغے جاتے تھے یا پنچ (Punch) کیے جاتے تھے جن کی مدد سے اس مشین کے لیے مطلوبہ پروگرام تیار کیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کے ذریعے اس مشین کو چلا کر مطلوبہ حساب کتاب کیا جاسکتا تھا۔ اس مشین میں چارلس بباڑ کو اور بھی ریاضی کے کئی طرح کے فنکشن مثلاً سیکوئنشل کنٹرول (Sequential Control) برانچنگ اور لوپنگ (Branching and looping) استعمال کرنے کا خیال تھا جو کمپیوٹنگ کے لیے استعمال کیے جاتے۔

ایک خاتون جن کا نام ایڈا لولیس (Ada lovelace) تھا انہوں نے چارلس بباڑ سے ان کے اینالیٹکل انجن کے بارے میں تفصیلی خط و کتابت کی اور اس انجن میں استعمال کی خاطر ایک ایلگورتھم (Algorithm) تیار کیا۔ یہ ایلگورتھم برنولیز نمبر (Bernoullis number) کے ضمن میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طرح سے یہ خاتون ایک طرح..... سے سب سے پہلی کمپیوٹر پروگرامر کہلائی جاسکتی ہیں۔

1842ء میں رائل ایسٹرونامکل سوسائٹی (Royal astronomical society) نے چارلس بباڑ کو ریاضی اور ایسٹرانومی کے ٹیبل کے حساب کتاب کے لیے مکینکل انجن بنانے پر سونے کا تحفہ عطا کیا۔ آج کے دور کے کمپیوٹر کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ چارلس بباڑ بابائے کمپیوٹر تھے۔

بنیاد تو پڑ چکی تھی لیکن تخیل نے ابھی حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا۔ حساب کتاب کی دنیا کمپیوٹر کی ایجاد کی امید پر سانس روک کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس کو چلتے رہنا تھا۔ یہ وقت کی ضرورت تھی اس ضرورت کو مکینکل کیلکولیٹر (Mechanical calculater) کے ذریعے پورا کیا گیا۔ گو کہ بلائیز پاسکل (Blaise pascal) 1642ء میں ہی مکینکل کیلکولیٹر ایجاد کر چکے تھے اس کا پہلا قابل استعمال ماڈل جو کہ "تھامس اریتھومومیٹر" (Thomas Arithomometer) کے نام سے مشہور ہوا دو صدیوں کے بعد یعنی 1851ء میں معرض وجود میں آئی۔

مکینکل کیلکولیٹر ضرب تقسیم کی حد تک تو ٹھیک تھے لیکن انجینئرنگ میں جس قسم کے حساب کتاب سے واسطہ پڑتا ہے اس کے لیے قطعی طور پر کافی تھے۔ اس قسم کے حساب کتاب کے لیے سلائڈ رول (Slide rule) وجود میں آیا۔

سلائڈ رول تقریباً ایک فٹ لمبی اور ڈیڑھ دو ڈھائی انچ چوڑی رولر ہوتی ہے جو تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس کے اوپر اور نیچے کے حصے جڑے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بیچ والا حصہ پھلایا سرکایا جاسکتا ہے۔ ان تینوں حصوں پر مختلف اعداد درج ہوتے ہیں سرکائے جانے والے حصے اور ایک کرسر کی مدد سے سلائڈ رول پر ہر طرح کا حساب کتاب کیا جاسکتا ہے۔

سلائڈ رول کی افادیت مسلم ہے۔ اس کے استعمال کے بغیر انجینئرنگ کالج میں گزارا نہیں ہوسکتا لیکن سلائڈ رول کے دن رات کے اس استعمال کے نتیجہ میں ایک جزوی نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کا استعمال کرنے والا بنیادی اصولوں (First principles) سے حساب کتاب کرنا بھول جاتا ہے اسی طرح جس طرح گھوڑے کو دیکھ کر میاں لنگڑے ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی عدد کا اسکوئر روٹ نکالنا پانچویں چھٹی جماعت میں ہی سکھا دیا جاتا ہے مگر سلائڈ رول پر ایک دو سال اسکوئر روٹ نکالنے کے بعد ہاتھ سے اسکوئر روٹ نکالنا یکسر بھولا جا چکا ہوتا ہے۔

آج کے دور میں سلائڈ رول داستان پارینہ بن چکا ہے۔ اب اس کا شمار میوزیم میں رکھے جانے والے نوادرات میں بجا طور پر کیا جاسکتا ہے۔ سلائڈ رول کو پہلے تو الیکٹرونک کیلکولیٹر نے بے گھر کیا پھر اس کے بعد کمپیوٹر نے۔

کمپیوٹر سے میرا پہلا ذاتی واسطہ برمنگھم یونیورسٹی کی ایم ایس سی کی پڑھائی کے دوران پڑا۔ کمپیوٹر کا زمانہ آچکا تھا۔ اس سے فرار ممکن نہ تھا۔ دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ میرا واسطہ کمپیوٹر پروگرامنگ لینگویج فورٹرین (Computer progamming language fortran) سے پڑ چکا تھا۔ یہ کمپیوٹر کے استعمال کا اوّل اوّل کا دور تھا۔ اپنے کام کے لیے کمپیوٹر پروگرام خود ہی لکھنے پڑتے تھے۔ یہ کام مشکل تو نہ تھا مگر اس میں وقت کا بہت زیادہ ضیاع تھا۔ سب سے پہلے یہ پروگرام ایک خانہ دار شیٹ پروگرام شیٹ (Program sheet) پر لکھا جاتا پھر یہ پروگرام کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ میں جمع کروائے جاتے جہاں پر ان کو پنچ کارڈ پر منتقل کیا جاتا۔ دوسرے دن یہ پنچ کارڈ کمپیوٹر آپریٹر کو دیے جاتے جو اس کا ڈرائی رن (Dry run) کرتا جس میں کمپیوٹر اگر پروگرام میں کوئی غلطی ہوتو اس کی نشاندہی کرتا۔ غلطیاں درست کرنے کے بعد یہ دوبارہ کارڈ پنچ کی کارروائی سے گزرتے اس کے بعد آپ کے پروگرام کا مطلوبہ نتیجہ سامنے آتا۔ ایک چھوٹے سے پروگرام کے لیے بھی تین سے چار دن نکل جاتے۔

انگریز کی نگاہ میں وقت کی پابندی نہ کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ میں اس جرم کا مرتکب ہوچکا تھا شکر کا مقام تھا کہ وقت کے قتل عمد کے لیے انگریز نے پھانسی کی سزا نہیں رکھی تھی۔

شماریات Statisties کی کلاس تھی آج اس کا وقت صبح آٹھ بجے تھا۔ ہماری یونیورسٹی میں ایک سے زیادہ ہوسٹل تھے ان میں سے ایک اسی سال بنا تھا وہ یونیورسٹی سے باہر اجبیسٹن روڈ (Edgbastaon road) پر گرفن کلوز (Griffin close) میں واقع تھا۔ میرا قیام اسی ہوسٹل میں تھا۔ یونیورسٹی آنے جانے کے لیے بس استعمال کرنی پڑتی تھی گو کہ فاصلہ بہت زیادہ نہ تھا۔ آج بس دیر سے آئی جس کی وجہ سے میں کلاس میں پانچ منٹ تاخیر سے پہنچا۔ ہماری کلاس کے لیکچرر مسٹر جوناتھن تھے ان کا تعلق شماریات کے شعبے سے تھا وہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں ہفتہ میں تین دن آتے تھے مگر شاید ان کو ہمارے ڈیپارٹمنٹ سے زیادہ محبت تھی اس کا اظہار کرنے کی خاطر انہوں نے ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی سیکریٹری کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

جس دن ان کی شادی ہونی تھی اسی دن بارہ بجے ان کو ہماری کلاس لینی تھی۔

صبح کے وقت وہ دونوں چرچ سے فارغ ہوچکے تھے مگر ٹھیک بارہ بجے مسٹر جوناتھن ہماری کلاس لینے کے لیے موجود تھے۔ جو شخص اپنی شادی کے دن بھی وقت کی اس قدر پابندی کرسکتا ہو اس کی کلاس میں پانچ منٹ دیر سے جانا کسی بھی صورت میں معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بڑی مشکل سے گلوخلاصی ہوئی۔ معاملہ اس بات پر طے پایا کہ میں اسٹینڈرڈ ڈیویشن (Standard deviation) کی فالتو دس (10) مشقیں حل کرکے ان کے جواب اگلی کلاس میں مسٹر جوناتھن کے حضور پیش کروں گا۔ اس کام کے لیے مجھے شماریات کی لیبارٹری کو استعمال کرنا تھا۔

شماریات کی لیبارٹری دوسری منزل پر ایک وسیع کمرے میں بنائی گئی تھی۔ لیبارٹری میں داخل ہوں تو الٹے ہاتھ پر ایک پلیٹ فارم کے اوپر استاد کی میز کرسی تھی جس کے پیچھے بھاری بھر کم بلیک بورڈ تھا جو ہرے رنگ کا تھا۔ یہ ہرا بلیک بورڈ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ جب ایک حصہ لکھائی سے بھر جاتا تو اس حصے کو کھینچ کر اوپر دھکیل دیا جاتا اور اوپر والا حصہ نیچے آجاتا۔ استاد کی میز کے سامنے بیس پچیس میز کرسیاں طالب علموں کے لیے تھیں جن میں سے ہر ایک میز پر ایک مکینکل کیلکولیٹر رکھا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی مشین تھی تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبی اور ایک فٹ اونچی جس میں اوپر کی طرف ہندسے اندراج کرنے کی جگہ بنی ہوئی تھی اور دائیں

ہاتھ کی طرف ایک گھمانے والا ہینڈل لگا ہوا تھا۔ جن ہندسوں کو تقسیم کرنا ہوتا تھا ان کا اندراج کرنے کے بعد ہینڈل کو گھمانا ہوتا تھا۔ مطلوبہ چکر گھمانے کے بعد مشین میں لگی ہوئی گھنٹی میں سے ٹن کی آواز آتی۔ جس چکر پر یہ ٹن کی آواز آتی اس سے ہینڈل کو ایک چکر واپس گھمانا ہوتا تھا۔ اس واپس گھمائے ہوئے چکر پر آپ کے تقسیم کیے ہوئے نمبر کا جواب موجود ہوتا۔

ضرب کرنے کا طریقہ تھوڑا مختلف تھا۔ ضرب کرنے والے نمبر کا اندراج مشین میں کرنے کے بعد آپ جتنے چکر ہینڈل کو گھماتے اتنی ہی دفعہ کے نمبر سے اندراج کیا ہوا نمبر ضرب ہو جاتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اگر آپ کو کسی نمبر کو بارہ ہزار سے ضرب دینا ہو تو آپ ہینڈل کو بارہ ہزار مرتبہ گھما کر اپنا مطلوبہ نتیجہ حاصل کریں اور اس کے بعد کسی پہلوان کے پاس جا کر اپنے دکھتے ہوئے بازو کی مالش کروائیں۔ اس کا ایک سادہ سا طریقہ تھا۔ مطلوبہ نمبر کا اندراج کرنے کے بعد آپ کرسر کو دس ہزار والے کھانچے پر لا کر ہینڈل کو ایک دفعہ گھمائیں پھر ایک ہزار والے کھانچے پر کرسر کو لا کر دو دفعہ ہینڈل کو گھمائیں اس طرح صرف تین دفعہ ہینڈل کے گھمانے سے منتخب کیا ہوا نمبر بارہ ہزار سے ضرب پا جائے گا۔ پہلوان سے بازو کی مالش کروانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں بھی پہلوان سے اپنے بازو کی مالش کروائے بغیر ہی لیبارٹری میں رکھے ہوئے مکینکل کیلکولیٹر کی مدد سے اسٹینڈرڈ ڈیویشن کی فالتو مشقیں حل کر چکا تھا۔ اگلی کلاس میں، میں یہ مشقیں مسٹر جوناتھن کی خدمت میں پیش کر کے اپنے تاخیر سے کلاس میں آنے کے گناہ کو معاف کروا چکا تھا۔ بہرحال یونیورسٹی نے مجھے کمپیوٹر کے ساتھ ہی ساتھ مکینکل کیلکولیٹر سے بھی روشناس کروا دیا تھا۔

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر میں نوکری شروع کر چکا تھا۔ اب کمپیوٹر رکھنا ایک فیشن بن چکا تھا۔ اپنے آپ کو مہذب لوگوں میں شمار کروانے کے لیے ضروری ہو چکا تھا کہ میں بھی اس فیشن کی پیروی کروں۔ میں ایک عدد کمپیوٹر کا مالک بن چکا تھا۔ اس وقت تک وہی پرانا مقولہ کارفرما تھا۔ ”کمپیوٹر وہ مشین ہے جو انجینئروں نے انجینئروں کے استعمال کے لیے ایجاد کیا تھا۔“ یہ کمپیوٹر ڈوس (Dos) کے نظام پر کام کرتے تھے جس کا استعمال عام آدمی کے لیے پیچیدہ تھا۔ اتنا پیچیدہ تھا کہ چند دن استعمال کرنے کے بعد میں نے اس کمپیوٹر کو پیک کر کے اسٹور میں رکھ دیا جہاں وہ آج بھی رکھا ہوا ہے پھر وقت کا دھارا مجھے کویت لے آیا۔ میں ونڈوز فار ڈمیز کی کتاب خرید چکا تھا۔

”ونڈوز“ کا چرچا میں ایک عرصہ سے سن رہا تھا لیکن مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ونڈوز ہے کیا بلا؟ ڈمیز کی کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ونڈوز کمپیوٹر کا نظام عمل یعنی آپریٹنگ سسٹم ہے بالکل اسی طرح کہ جس طرح سے ڈوس میرے جدہ والے کمپیوٹر کا آپریٹنگ سسٹم (Operating system) تھا لیکن ان دونوں سسٹم کے استعمال میں زمین، آسمان کا فرق تھا۔ ڈوس جس کا سہرا بھی مائیکرو سافٹ کے سر ہے، والا کمپیوٹر میں نے پیک کر کے اس لیے رکھ دیا تھا کہ باوجود ایک انجینئر ہونے کے اس کے استعمال کی پیچیدگی نے مجھے اس کے استعمال سے باز رکھا تھا لیکن مائیکرو سافٹ نے اس راز کو پا لیا تھا کہ کمپیوٹر کا استعمال صرف اسی وقت مقبول عام ہو سکتا ہے کہ جب اس کے استعمال کا طریقہ دوستانہ ہو یعنی ”یوزر فرینڈلی“ (User frindly) جہاں تک فرینڈلی کا تعلق ہے تو اس کو بھلا ہمارے سیاست دانوں سے زیادہ اور کون جانے

گا۔ ہماری ہر آنے والی حکومت اس بات کا ادراک رکھتی ہے کہ عوام کا پیسا لوٹنے کے لیے اپوزیشن کا فرینڈلی ہونا شرط اوّل ہے۔

کمپیوٹر کو یوزر فرینڈرلی بنانے کے لیے مائیکروسافٹ نے ونڈوز آپریٹنگ سسٹم تخلیق کیا جس میں گوئی (Gui) کا استعمال کیا گیا تھا GUI مخفف ہے ''گریفکل یوزر انٹرفیس'' (Graphical user interface) کا اس میں تصویروں یا آئی کون (Icon) کا استعمال ہوتا ہے۔

خیال رہے کہ آئی کون بلھے شاہ کے کی جا نان میں کون کا انگریزی ترجمہ نہیں ہے لیکن انسان صرف اپنے زعم اور زور بازو سے آئی کون تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ آئی کون کے گوہر مقصود تک پہنچنے کے لیے انسان کو اپنے گھٹنے ٹیک کر اپنے دیرینہ دشمن کو دوست بنانا پڑتا ہے۔

جب دوستی اور دوستانہ ماحول کی بات ہو تو کہا جاتا ہے کہ برادران سنگ لیلی سے بڑھ کر انسان کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ مجھے خود بھی اس انسان دوست جانور کی انسانوں سے بے پایاں محبت کا ایک ذاتی تجربہ ہو چکا تھا۔ انسان کے اس گہرے دوست نے جب وفور محبت سے بے قابو ہو کر میری پنڈلی میں اپنے نوکیلے چمکدار دانتوں کے دوستانہ نشانات چھوڑے تھے تو مجھے ایک دوسری انسان دوست ہستی سے، سنا ہے، جس کی زندگی کا واحد مقصد اور دکھی انسانیت کی خدمت کرکے ان کی جیبوں کی فالتو دولت اور پیسوں کا بوجھ ہلکا کرنا ہے، رجوع کرنا پڑا تھا۔

بدقسمتی سے آئی کون کو رام کرنے کے لیے برادران سنگ لیلی کے پاس کوئی حربہ نہیں تھا۔ اس مسئلے کا حل صرف انسان کے اس پرانے دشمن کے پاس تھا جس دشمن کا قلع قمع کرنا انسان کی دیرینہ خواہش رہی ہے۔ جب انسان نے سنگ لیلی کی طرح سے دم دبا کر اپنے اس دشمن سے یہ مدعا بیان کیا تو اس انسان دشمن نے پہلے تو اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا پھر ایک ادائے بے نیازی سے اس شرط پر اپنے تعاون کا یقین دلایا کہ سب سے پہلے تو انسان اپنے اس دشمن کے لیے وافر مقدار میں چیز کا بندوبست کرے گا پھر اس کے بعد چوہے دان کے بنانے اور رکھنے کو قانونی طور پر کالعدم قرار دے دے گا انسان اور چوہے کی دوستی مستحکم ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چوہے کے درجات بھی بلند ہو چکے تھے۔ اب اس کو کوئی حقارت سے چوہا نہیں کہتا تھا سب اس کو عزت کے ساتھ ''ماؤس'' کہہ کر بلانے لگے۔

ماؤس سے دوستی کے بعد انسان کو یہ سہولت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ جب چاہے لارڈ ماؤس کے کان دبا کر ان کو اپنے مطلوبہ آئی کون پر لے جا کر کلک کر کے اپنا مطلوبہ مقصد حاصل کر لے۔

لارڈ ماؤس کی مدد سے استعمال کیے جانے والے اس نظام عمل کو ونڈوز کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں ہر نئی چیز ایک نئی کھڑکی یعنی ونڈو کی شکل میں کھلتی یا نمودار ہوتی ہے۔

استعمال کے دوستانہ بنانے کے ساتھ ساتھ تین اہم پروگرام بھی بنائے گئے۔ ٹائپنگ کے لیے ایم ایس ورڈ (MS word) حساب کتاب کے لیے ایکسل (Excel) اور ڈیٹا میں (Deta base) کے لیے ایکسس (Access) ان پروگراموں کی مدد سے جو کام یونیورسٹی میں تین دن میں ہوتا تھا اب چند لمحوں میں ہو جاتا ہے۔

اب تک کمپیوٹر کا استعمال صرف دفتروں تک محدود تھا۔ کمپیوٹر بھی انسانوں کی طرح دفتر کے ماحول میں کام کرتے کرتے اکتا جاتا تھا۔ اس کو بھی گھر یاد آتا تھا۔ ''ہوم سویٹ ہوم'' پرسنل کمپیوٹر، ہوم کمپیوٹر کا دور شروع ہو چکا تھا۔

جب IBM نے پرسنل کمپیوٹر کی مارکیٹ میں قدم رکھا تو اس نے ایک ''یک سطری'' اشتہار نکالا (ibm "IBM" is gatting personal) اشتہارات پر اتر آیا ہے۔

کمپیوٹر گھر میں داخل تو مل گیا مگر یہ ہر ایک کا چہیتا نہ تھا۔ یہ مسئلہ اس وقت حل ہو گیا جب انٹرنیٹ اور ای میل کا استعمال شروع ہوا اور ہر گھر میں ہر فرد نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اب گھر کے ہر فرد کو اس کی ضرورت تھی۔

آج کمپیوٹر وہ مشین نہیں رہا جس کو انجینئروں نے انجینئر کے لیے بنایا تھا بلکہ اب یہ ایک ایسی آسانی ہے کہ جس کو ایک راکٹ سائنسدان سے لے کر ایک خاتون خانہ تک یکساں سہولت اور اعتماد کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔

آج کمپیوٹر حساب کتاب کے لیے کم اور مواصلات اور دوستانہ و معاشرتی رابطہ (Soc a Interoction) کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے اس سنگم سے جس سہولت نے جنم لیا ہے وہ سہولت اب گھر کے ہر فرد کی ضرورت بن چکی ہے۔

اب میاں بیوی ایک دوسرے کے بغیر تو زندہ رہ سکتے ہیں لیکن کمپیوٹر کے بغیر نہیں۔

سلطنت انکا

طارق عزیز خان

انکا تہذیب کئی صدی قبل پیوند زمین ہو گئی مگر کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ تحقیق کار، ماہرینِ آثار قدیمہ مسلسل انکشافات کررہے ہیں کہ اِنکا ایک نہایت ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ اس تہذیب پر سرگزشت میں کئی تحریریں شائع ہو چکی ہیں مگر اس سلطنت پر مختصر اور جامع تحریر پہلی بار پیش کی جارہی ہے۔

اِنکا تہذیب پر ایک دلچسپ تحریر جو پُراسرار طور پر مٹ گئی
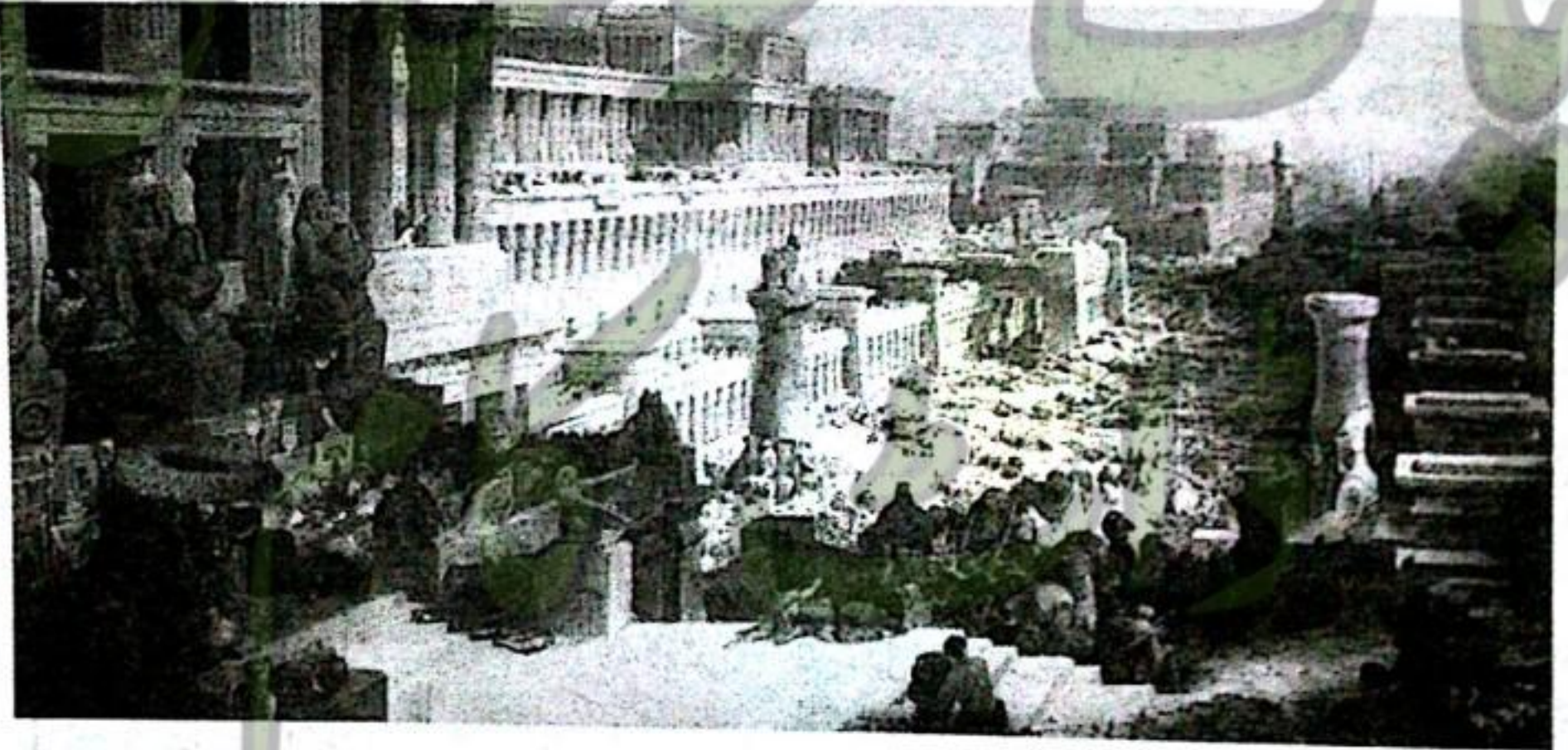
اکتوبر 1492ء میں امریکا کی دریافت نے تاریخ عالم پر اس قدر بھرپور اثرات مرتب کیے کہ خود کولمبس کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ امریکا کی دریافت کے بعد استعماریت اور سیاحت کے جس دور کا آغاز ہوا وہ تاریخ کا اہم موڑ تھا۔ بحر اوقیانوس کے پارنئی سرزمین کی دریافت سے اس وقت کی دو بڑی یورپی طاقتوں پرتگال اور اسپین کے مابین چپقلش عروج پر پہنچ گئی اور بلاآخر یہی چپقلش دنیا کی تقسیم کے معاہدے کا باعث بنی۔ 5 ستمبر 1494ء کو اسپین کے شہر ٹورڈی سیلاس میں

پرتگال اور اسپین نے دنیا کی تقسیم کے معاہدے (Treaty of Tordesillas) پر باقاعدہ دستخط کیے، جس کے مطابق بحراوقیانوس کے مغرب میں واقع علاقوں کو اسپین جبکہ افریقا سمیت مشرقی دنیا کو پرتگال کی ملکیت تسلیم کرلیا گیا۔ اس معاہدے کے بعد 1498ء سے 1504ء کے دوران ہسپانویوں نے کولمبس کی قیادت میں شمالی و جنوبی امریکا میں تین اہم مہمات سر کیں۔ ان مہمات نے یہ واضح کردیا کہ بحراوقیانوس کے پار ایک نہیں بلکہ شمال سے جنوب کی طرف دو بڑے براعظم واقع تھے۔

سمندر پار مواقعوں سے بھرپور وسیع و عریض علاقوں کی موجودگی نے یورپین مہم جوؤں میں جیسے بجلیاں بھردیں۔ یہ یورپ خاص کر اسپین میں مہم جوئی اور جہازرانی کے عروج کا زمانہ تھا۔ نئے نئے مواقعوں کی تلاش اور راتوں رات امیر بننے کے جنون میں مبتلا مہم جوؤں، بیروزگار نوجوانوں اور تاجروں کے قافلے اسپین کا رخ کررہے تھے۔ اُن میں ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ سرکاری سرپرستی میں یا پھر کسی بھی نجی مہم سے وابستہ ہوکر نئی سرزمین روانہ ہوجائیں۔ اسپین کی جنوبی بندرگاہ سویلی مستقبل کے مہم جوؤں کا پہلا پڑاؤ تھی جہاں سے ہر روز درجنوں بحری جہاز مغربی سمندر کی چھان بین کے لیے روانہ ہوتے۔ آنکھوں میں سہانے سپنے سجائے نوجوان بحری جہازوں کے گرد منڈلاتے ہوئے اپنے کسرتی جسموں کی نمائش کرتے نہ تھکتے، وہ ملاحوں کو متاثر کرنے کا کوئی موقع کھونا نہیں چاہتے تھے۔ فرانسسکو پیزارو (Francisco Pizarro) بھی ایک ایسا ہی نوجوان تھا۔ وہ 1490ء میں سویلی آیا تو اس کی عمر صرف 16 سال تھی۔ وہ تعلیم حاصل نہ کرسکا تھا، یہی وجہ تھی اس نے اگلے دو سال سویلی کی بندرگاہ میں بحری جہازوں پر سامان ڈھونے کا کام کیا۔ 1492ء میں پیزارو نے کولمبس کی پہلی مہم میں شامل ہونے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ بدقسمتی سے اگلے کئی سالوں تک وہ بحراوقیانوس کے پار جانے والی کسی بھی مہم کا حصہ نہ بن سکا، تاہم بندرگاہ میں مسلسل کام کی وجہ سے وہ تجربہ کار ملاحوں کی نظر میں آچکا تھا۔

16ویں صدی کی شروعات پیزارو کے لیے نئی خوشیاں لے کر آئی۔ اسے سویلی سے شمالی افریقا کے درمیان سامان ڈھونے والے ایک بحری جہاز پر سپاہی کی نوکری مل گئی۔ محض چند ماہ کے دوران ہی پیزارو نے سپاہیوں کے درمیان اپنی الگ شناخت بنالی۔ وہ ایک ماہر نشانے باز اور جری سپاہی کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ اسے اپنی صلاحیتیں منوانے کے لیے ایک کے بعد ایک موقع ملتا چلا گیا، یہاں تک کہ 13 فروری 1502ء میں اسے ہسپانی اولا کے نئے گورنر نکولس ڈی اوانڈو کی مہم سے وابستہ ہوکر بحراوقیانوس پار کرنے کا پہلا موقع ملا۔ 30 بحری جہازوں اور 2500 ملاحوں کے ساتھ جزائر غرب الہند روانہ ہونے والی یہ اس وقت تک کی سب سے بڑی ہسپانوی مہم تھی۔ مارچ کے آخری عشرے میں یہ مہم ہسپانی اولا کے جزیرے پر لنگرانداز ہوئی۔ پیزارو کے لیے یہاں کام کی کمی نہیں تھی۔ اس نے اگلے سات سال بطور ملاح قرب و جوار کے جزائر کی دریافت میں حصہ لیا۔ 1509ء میں پیزارو نے ایلانسو ڈی اوجیڈا کی قیادت میں کولمبیا کے شمالی ساحلوں کو دریافت کیا۔ وہ 1510ء کے آخر میں واسکو نیز ڈی بالبوا کے ساتھ وابستہ ہوکر پانامہ چلا آیا۔ اس نے مارچ 1511ء میں بالبوا کو پانامہ کا گورنر منتخب کروانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ پیزارو نے بالبوا کی قیادت میں 27 ستمبر 1513ء کے دن خاکنائے پانامہ کو پار کرکے بحرالکاہل کو دریافت کیا۔ جولائی 1514ء میں پیڈراریاس ڈاویلا پانامہ کا نیا گورنر بن کر سانٹا ماریا پہنچا۔ بالبوا کے نئی انتظامیہ کے ساتھ اختلافات پیدا ہوگئے، جس کے نتیجے میں اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

بدلتے سیاسی حالات میں پیزارو نے گورنر کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس نے 1519ء میں ڈاویلا کی قیادت میں موجودہ پانامہ سٹی کو دریافت کیا جہاں اس زمانے میں ماہی گیروں کی ایک بستی آباد تھی۔ ڈاویلا نے پانامہ سٹی میں ہسپانوی کالونی کی بنیاد رکھی اور پیزارو کو شہر کا پہلا میئر مقرر کردیا۔ پانامہ سٹی میں قیام کے دوران پیزارو کو 1522ء میں ہسپانوی مہم جو، پاسکوئل ڈی آنڈاگویا کے توسط سے پیرو میں واقع انکا سلطنت کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئیں۔

یہاں بتانا ضروری ہے کہ فرانسسکو پیزارو مشہور ہسپانوی مہم جو ہرنان کورٹس کا فرسٹ کزن تھا۔ ہرنان کورٹس وہ شخص ہے جس نے 1519ء سے 1521ء کے دوران وسطی میکسیکو میں قائم سلطنت آف ایزٹک کو فتح کیا۔ اس نے میکسیکو کو نیو اسپین کا نام دیا اور میکسیکو سٹی کی بنیاد رکھی۔ اس وقت تک کورٹس کے کارناموں کی خبریں پھیل چکی تھیں۔ پیزارو اپنے کزن کا مداح تھا اور اسی کی طرح نمایاں کارنامہ سرانجام دینے کی فکر میں تھا۔ اس نے 1524ء میں مہم کے لیے وسائل جمع کرنے کی غرض سے اپنے ہم وطن رومن کیتھولک پادری

ہرنانڈو ڈی لوکوئے اور مہم جو، ڈیاگو ڈی الماگرو کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کیا اور پیرو جانے کے لیے پر تولنے لگا۔

جنوبی امریکا کے شمال مغربی حصے میں واقع پیرو کا کل زمینی رقبہ 12 لاکھ 85 ہزار 2 سو 16 مربع کلومیٹر اور موجودہ (2011) آبادی تین کروڑ کے قریب ہے۔ پیرو کے شمال میں کولمبیا اور ایکویڈور، جنوب میں چلی، مشرق میں برازیل، جنوب مشرق میں بولیویا اور مغرب میں بحرالکاہل واقع ہے۔ پیرو کے تیس فیصد شمالی زرخیز میدانوں کو چھوڑ کر پورا ملک انڈیز کے سلسلہ کوہ پر مشتمل پہاڑی علاقہ ہے۔ ملک کا دارالحکومت اور سب سے بڑی بندرگاہ لیما اس کے وسطی حصے میں واقع ہے۔

یورپین کی آمد کے وقت ایکویڈور، پیرو، بولیویا اور شمالی چلی کے وسیع علاقوں پر مشتمل انکا سلطنت قائم تھی، جس کی بنیاد 15 ویں صدی عیسوی کے دوران ''کوئے چوا'' لوگوں نے رکھی تھی۔ اپنے دور عروج پر یہ سلطنت پیرو، ایکویڈور اور بولیویا کے 9 لاکھ 6 ہزار 5 سو مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل تھی، جس کے طول و عرض میں 60 لاکھ افراد آباد تھے۔ مقامی لوگ توہم پرست تھے اور بادشاہ کو سورج دیوتا کا اوتار مانتے تھے۔ وہ زراعت، ماہی گیری اور تجارت سے واقف تھے جبکہ سلطنت کی دفاع کے لیے لوہے اور نوکیلے پتھروں سے بنے ہتھیاروں سے لیس تربیت یافتہ فوج بھی موجود تھی۔

فرانسسکو پیزارو کی ہدایت پر ڈیاگو ڈی الماگرو نے 13 ستمبر 1524ء کو دو بحری جہازوں کے ساتھ پیرو تک رسائی کی مہم کا آغاز کیا۔ تاہم وہ کولمبیا کے ساحلوں سے آگے نہ جاسکا اور پانامہ واپس چلا آیا۔ پیزارو نے اگست 1526ء میں دو بحری جہازوں اور 160 ملاحوں کے ساتھ دوسری مہم کا آغاز کیا۔ وہ جنوب کی طرف سفر کرتا ہوا کولمبیا پہنچا۔ جہاں اس نے اپنے بھائی بارتولومی کو انکا سلطنت کی فوجی طاقت کا اندازہ لگانے کے لیے پیرو روانہ کیا۔ بارتولومی نے 1526ء کی خزاں میں کولمبیا کے جنوب میں واقع ایکویڈور کے موجودہ علاقے کو دریافت کیا۔ اس نے وہاں سے کچھ سونا جمع کیا اور انکا سلطنت سے متعلق نئی معلومات کے ساتھ کولمبیا چلا آیا۔ پیزارو نے اپنے بھائی سے مشاورت کے بعد فی الحال پیرو جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور واپس پانامہ پہنچ گیا۔

جنوری 1527ء میں پانامہ کے لیے نئے ہسپانوی گورنر پیڈرو ڈی لاس ریوس کی تقرری عمل میں آئی جس نے پیرو کی فتح کے منصوبے کو روک دیا۔ نئی صورت حال میں پیزارو نے مارچ 1528ء میں اسپین پہنچ کر ہسپانوی بادشاہ چارلس

اوّل (1516ء سے 1556ء) سے ملاقات کی۔ اس نے بادشاہ سے انکا سلطنت کو فتح کرنے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے پیزارو کی تجویز منظور کرلی۔ اس نے نہ صرف پیزارو کی مالی معاونت کی بلکہ اسے پیرو کا پہلا ہسپانوی گورنر مقرر کرنے کا اعلان بھی کیا۔ پیزارو نئے عزم کے ساتھ جنوری 1530ء میں پانامہ واپس پہنچا جہاں اس نے پیرو کی مہم کو آخری شکل دی۔

فرانسسکو پیزارو کی قیادت میں دو بحری جہازوں نے 27 دسمبر 1530ء کو پیرو تک رسائی کا سفر شروع کیا۔ اس کے عملے میں 160 یورپین اور 40 مقامی سپاہی تھے۔ جن میں اس کے دو سگے بھائیوں گونزالو پیزارو اور ہرنانڈو پیزارو کے ساتھ اس کا شراکت دار ڈیاگو ڈی الماگرو نمایاں تھا۔ ہسپانوی بحری جہازوں نے بحرالکاہل میں کولمبیا اور ایکویڈور کے ساحلوں کے ساتھ سفر جاری رکھا۔ انھوں نے خط استواء پار کیا اور جنوری 1531ء کے آخر میں شمالی پیرو میں واقع ٹم بس (Tumbes) کی بندرگاہ میں لنگر گرائے۔ پیزارو نے بطور پہلے یورپین پیرو کی سرزمین پر قدم رکھا اور اسے اسپین کا علاقہ قرار دیا۔

ٹم بس میں یورپین کا واسطہ مقامی پونیان قبائل سے پڑا۔ پیزارو اپنے بیڑے کے ساتھ ٹم بس میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ اس دوران پانامہ سے آنے والے مہم جو ہرنانڈو ڈی سوٹو اور اس کے سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے۔ پیزارو نے اگلے دو سال کے دوران قرب و جوار کے علاقے کو فتح کیا اور اپنی فوج کی تنظیم نو کی۔ اس نے جولائی 1532ء میں 106 پیدل سپاہیوں، 62 گھڑسواروں، 40 افریقی غلاموں اور 100 کے قریب مقامی راہنماؤں کے ساتھ پیرو کی مرکزی سرزمین پر پیدل مہم کا آغاز کیا۔ ہسپانوی قافلے نے کورڈی لیرا اوکی ڈینٹل کے خشک اور سنگلاخ پہاڑی سلسلے میں جنوب کی طرف سفر جاری رکھا۔ پیزارو کا مختصر سا دستہ اکتوبر کے دوران شمالی پیرو میں واقع انکا سلطنت کے اہم شہر کاجا مارکا (Cajamarca) میں داخل ہوا، جہاں انکا سلطنت کا شہنشاہ آٹا ہوالپا (Atahualpa) اپنی 80 ہزار فوج کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ شہنشاہ کے معززین نے پیزارو کے عزائم جانچنے کے لیے اس کے ساتھ تفصیلی مذاکرات کیے۔ چالاک پیزارو نے خود کو انکا سلطنت کا دوست ظاہر کیا اور اعلان کیا کہ وہ پیرو کی چند روزہ سیاحت کے بعد پانامہ واپس چلا جائے گا۔ اس نے مقامیوں کو اعتماد میں لینے کے لیے انہیں تحفے تحائف پیش کیے اور شہنشاہ کے لیے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا۔

مقامی معززین، پیزارو کے فدویانہ رویے سے متاثر ہوئے اور انہوں نے شہنشاہ کی طرف سے اسے شہر میں ہونے والے ایک جشن میں شرکت کی دعوت پیش کی۔ فرانسسکو پیزارو اپنی ہتھیار بند فوج کے ساتھ 16 نومبر 1532ء کو مقررہ مقام پر پہنچا جہاں شہنشاہ، اس کے پانچ سو مسلح سپاہی اور بیس ہزار کے قریب عام شہری اس کے منتظر تھے۔ شہنشاہ نے پیزارو کی سرخ و سپید رنگت کی وجہ سے اسے ''سورج کا بیٹا'' قرار دیا۔ اس کے اشارہ کرتے ہی وہاں موجود ہزاروں مقامی افراد پیزارو کے آگے سجدے میں گر گئے۔ خود شہنشاہ نے بھی رکوع میں جھک کر پیزارو کو تعظیم دی اور اسے سونے کی خالص اینٹیں بطور نذر پیش کیں۔ مقامیوں کا رویہ دوستانہ تھا۔ وہ یورپین کے آگے بچھے جا رہے تھے کہ فرانسسکو پیزارو کے تیور بدل گئے۔ اس کے اشارہ کرتے ہی ہسپانوی سپاہی حرکت میں آگئے۔ انہوں نے اچانک کارروائی کرتے ہوئے شہنشاہ آٹا ہوالپا کو گرفتار کرلیا اور اس کے قریب کھڑے درجنوں معززین کو فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہسپانوی توپوں سے پے در پے داغے گئے کئی گولوں کے بعد عام لوگوں کے مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ محض آدھے گھنٹے پر محیط یہ ساری کارروائی اتنی منظم اور اچانک تھی کہ مقامیوں کو لڑنے کا کوئی موقع نہ ملا اور وہ یورپین کی آتشی طاقت کے سامنے بے بس ہوگئے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس لڑائی میں چند ہسپانوی سپاہی معمولی زخمی ہوئے جبکہ ان کے مقابلے میں ایک ہزار سے زیادہ مقامی ہلاک ہوگئے۔

شہنشاہ کی گرفتاری کے بعد فرانسسکو پیزارو نے دسمبر 1532ء میں پیرو کے پہلے ہسپانوی گورنر کے طور پر حلف اٹھایا۔ اس نے شہنشاہ سے رہائی کے بدلے سونے اور چاندی سے بھرے دو بڑے کمروں کا مطالبہ کیا۔ ہسپانویوں کی توقع کے برخلاف اس مطالبے کو فوری طور پر پورا کردیا گیا۔ سونے اور چاندی کی اینٹوں سے لبالب بھرے کمروں کو دیکھ کر ہسپانویوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ایک اندازے کے مطابق پیزارو کو پیش کیے گئے تاوان کی موجودہ (2015) مالیت 150 ملین ڈالر کے برابر تھی۔ پیزارو نے سونے چاندی کو محفوظ کیا اور اپنے وعدے سے پھر گیا۔ اس نے اگلے چند ماہ تک ٹال مٹول سے کام لینے کے بعد 29 اگست 1533ء کے دن شہنشاہ آٹا ہوالپا کو سزائے موت دے دی۔

جولائی 2015ء کے پاکیزہ کے خوش کن انداز

پاکیزہ

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

نگہت سیما کے ناول **اعتبار وفا** کی انکشافات سے پُر نئی قسط

قیصرہ حیات کا نیا سلسلے وار ناول ..... **آخری امید** بالکل ایک اچھوتے اور پُر اثر بیان کے ساتھ

زندگی خاک نہ تھی ..... **شیریں حیدر** کا نیا منی ناول

متاعِ دل میں **نبیلہ ابر راجا** نے نمایاں کیے کچھ انوکھے رنگ

عبادات و معاملات کی اصل روح سے آگاہ کرتی **سارہ ملک** کی بے حد دلنشیں تحریر

خشیت الٰہی

پر **اختر شجاعت**

کا ایک پُر فکر مضمون

اس کے علاوہ پڑھیے **فرحین اظفر** ، **نگہت اعظمی** ، **سحرش رانی**، **بشریٰ گوندل**، **سویرا فلک**، **ریحانہ حسن**، **نور عین** و دیگر مایہ ناز رائٹرز کی پُر لطف کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ معلومات اور تفریح سے پُر مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

پیزارو نے 1534ء کے وسط میں جنوبی پیرو میں واقع انکا سلطنت کے دارالحکومت کزکو (Cuzco) اور 18 جنوری 1535ء کو پیرو کے موجودہ دارالحکومت لیما کو دریافت کیا۔ اس نے لیما شہر میں فوجی چھاؤنی کی بنیاد رکھی اور وہاں اپنا محل تعمیر کروایا۔ لیما شہر پر پیزارو اور اس کے بھائیوں کا عمل دخل الماگرو اور اس کے حمایتوں کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔ دراصل الماگرو یہ سمجھتا تھا کہ پیزارو نے اسے مال غنیمت میں سے اس کا جائز حصہ نہیں دیا۔ اس نے پیزارو کے انتظامی اختیارات میں دخل اندازی شروع کردی۔ پیزارو نے الماگرو سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسے 1535ء میں جنوبی پیرو اور شمالی چلی پر مشتمل نیوٹولیڈو (New Toledo) کا گورنر مقرر کیا۔

الماگرو اپنے وفاداروں کے ساتھ نیوٹولیڈو پہنچا۔ اس نے اپنی فوج کی تنظیم نو کی اور 1536ء میں انکا سلطنت کے دارالحکومت کزکو، کی ملکیت کا دعویٰ کیا جسے پیزارو نے مسترد کردیا۔ الماگرو کی حمایت سے اس کے سپاہیوں نے پیزارو کی ملکیت والے علاقے میں کارروائیاں شروع کردیں۔ الماگرو نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے پیزارو کو پیرو کا گورنر تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ 1537ء کے دوران پیرو کا وسطی اور جنوبی علاقہ ہسپانویوں کے درمیان ہونے والی خانہ جنگی کا شکار رہا۔ 1538ء کے موسم گرما میں پیزارو کے بھائیوں اور الماگرو کے حامیوں کے درمیان جنگ لاس سالی ناس (Las Salinas) لڑی گئی۔ اس جنگ میں الماگرو کی ہلاکت ہوگئی جس کے بعد اس کے بچے کھچے ساتھی الماگرو کے بیٹے الماگرو دوئم کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

خانہ جنگی سے فرصت ملتے ہی فرانسسکو پیزارو نے پیرو کے اندرونی علاقوں کی دریافت کے لیے مہمات ترتیب دیں۔ ان مہمات کے نتیجے میں 1538ء کی خزاں میں پیزارو کے بھائی ہرنانڈو پیزارو نے بولیویا جبکہ ہسپانوی مہم جو، پیڈرو ڈی والڈیویا (Pedro de Valdivia) نے 1540ء میں چلی (Chile) میں فتوحات کا آغاز کیا۔ (یادرہے کہ چلی کی دریافت کا سہرا فرڈی ننیڈ میگلن کے سرجاتا ہے جس نے مغرب کی طرف سے ایشیا تک رسائی کی مہم کے دوران (1519ء سے 1522ء) دسمبر 1520ء میں چلی کی سرزمین پر قدم رکھا تھا) ..... بولیویا اور چلی میں مہمات کی روانگی کے بعد پیزارو نے 1540ء کے آخر میں اپنے بھائی گونزالو پیزارو کو پیرو کے شمال میں واقع ایکویڈور کا پہلا گورنر مقرر کیا۔ انکا سلطنت سمیت پیرو کے قرب وجوار میں واقع علاقوں پر گرفت قائم کرلینے کے بعد پیزارو ایک خودمختار حاکم کے طور پر لیما میں شاندار اور پرتعیش زندگی گزار رہا تھا۔ شائد الماگرو دوئم کو اسی پل کا انتظار تھا۔ وہ اپنے 20 جاں نثاروں کے ساتھ بھیس بدل کر لیما میں داخل ہوا اور اس نے 26 جون 1541ء کو اچانک حملہ کرکے فرانسسکو پیزارو کو قتل کردیا۔ پیزارو کے قتل کے بعد الماگرو دوئم پیرو کے اقتدار پر قابض ہوگیا اور معززین شہر نے اسے پیرو کا دوسرا ہسپانوی گورنر تسلیم کرلیا۔

فرانسسکو پیزارو ایک بہادر، مستقل مزاج اور ہوشیار شخص تھا۔ اس کی طبیعت مذہب کی طرف مائل تھی۔ روایت ہے کہ الماگرو دوئم کے حملے میں مرتے وقت اس نے اپنے خون سے زمین پر صلیب کا نشان بنایا اور اس کے ہونٹوں پر آخری لفظ ''یسوع'' تھا۔ تاہم اس کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ ناقابل بیان حد تک لالچی، ظالم اور سازشی ذہن کا مالک تھا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ تاریخ کے تمام ہسپانوی فاتحین سے کہیں زیادہ درندہ صفت اور سفاک تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ پیزارو کی شخصیت کے یہی اوصاف اس کی سلطنت کے زوال کا باعث بنے۔ تاہم عسکری شجاعت اور دریافتوں کے حوالے سے تاریخ میں پیزارو کا نام نمایاں ترین مہم جوؤں میں ہے۔ اس نے پانامہ سے پیرو تک رسائی کی مہم کے دوران کل 5 ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا جبکہ اس نے پیرو کے طول وعرض میں 12 ہزار کلومیٹر طویل پیدل مہمات سرانجام دیں۔

اس کا چھ ملین افراد پر مشتمل سلطنت کو صرف 200 افراد کے بل بوتے پر فتح کرلینا، تاریخ کا سب سے حیران کن واقعہ ہے۔ پیزارو کی مہمات کے نتیجے میں سلطنت انکا سمیت ایکویڈور، پیرو اور شمالی چلی کے 20 لاکھ مربع کلومیٹر علاقے کی دریافت ممکن ہوئی۔ انکا سلطنت کی فتح نے جنوبی امریکا کی مغربی ساحلی پٹی پر ہسپانوی کنٹرول قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ہسپانوی اگلے تین سو سال تک بلاشرکت غیرے پورے علاقے پر قابض رہے۔ یہاں تک کہ 18 ستمبر 1810ء کو چلی، 28 جولائی 1821ء کو پیرو، 24 مئی 1822ء کو ایکویڈور اور 6 اگست 1825ء کو بولیویا نے اسپین سے آزادی حاصل کرلی۔

تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالمِ رنگ و بو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرئہ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرئہ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر

خدا کا شکر ہے کہ 2014ء میں، میں نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اس میں کامیاب ہو گیا۔ سرگزشت کے قارئین یہ جانتے ہیں کہ میں نے پہلی جنوری سے لے کر اکتیس دسمبر تک روزانہ کی تاریخ لکھی تھی۔ یعنی پہلی جنوری کو کیا ہوا اور دوسری جنوری کو کیا ہوا۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس سلسلے کو پسند کیا گیا کیوں کہ چند صفحات میں کسی بھی مہینے کی مکمل تاریخ سامنے آجاتی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اسے ریکارڈ کے طور پر بھی

محفوظ کرلیا ہے۔

اب 2015ء میرے سامنے ہے۔ بہت سوچتا رہا کہ اس سال کے لیے کیا کیا جائے۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ انسانی ارتقاء کی داستان تحریر کی جائے۔ یعنی کائنات کے وجود سے لے کر ہر صدی کا حال۔ حالانکہ یہ بہت مشکل کام ہے لیکن اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ پوری کائنات اور انسانی نشوونما اور اس کی ترقی ایک ریکارڈ کی طرح ہمارے سامنے آجائے گی۔ اس کے علاوہ ایک اور سوال میرے ذہن میں آتا تھا کہ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں یعنی کسی ایک خاص ملک کی تاریخ تو اس ملک کی تاریخ ہمارے سامنے آتی ہے۔ جیسے مہاراجا اشوک کا دور۔ اب یہ نہیں معلوم کہ مہاراجا اشوک کے دور میں اٹلی میں کیا تھا، حکمران کون تھا۔ برازیل میں کس کی حکومت تھی وغیرہ۔

اسی طرح جب ہم اسلامی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر خلفائے راشدین تک صرف عرب ہی کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نہیں پتا چلتا کہ چین اور جاپان میں اس وقت کیا ہو رہا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ جب ہم اس دور کے چین اور جاپان کو دیکھنا چاہیں تو وہاں کے حالات معلوم ہو جائیں لیکن مربوط حالت میں یہ ایک ساتھ نظر نہیں آتے۔ سو میں نے اپنے طور پر اس قسم کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہوسکتا ہے میں اس مشکل موضوع کے ساتھ پورا انصاف نہ کر پاؤں لیکن میری اس کوشش کی داد ضرور دے دیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور نے اس قسم کی کوئی تاریخ مرتب کی ہو۔ لیکن وہ کم از کم میری نگاہوں سے نہیں گزری۔ میں سمجھتا ہوں کہ سرگزشت کے میں پڑھنے والوں کے لیے یہ بھی ایک تحفہ ہوگا۔ آئیں اب جائزہ لیتے ہیں کہ دنیا میں کیا کیا ہوتا رہا۔

انسان ہمیشہ سے اپنے بارے میں سوچتا آیا ہے۔ انسانی تاریخ کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں بے شمار سوالات رہے ہیں۔ انسان ان سوالوں کے جوابات تلاش کرتا رہا ہے۔ بہت حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ پھر بھی بہت سے سوالوں کے جواب نہیں مل پائے ہیں۔

ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ہماری ابتدا کیا تھی؟ یہ زمین کیسی تھی؟ یہاں کون رہتا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ مختلف قسم کے آثار دیکھ کر صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے لیکن حتمی تاریخ کا علم وہاں سے شروع ہوتا ہے جب انسان نے لکھنا سیکھا۔

ہماری زمین پر انسان سے پہلے دوسری مخلوقات تھیں۔ طرح طرح کے جانور، پودے، جرثومے وغیرہ۔ انسان تو بہت بعد میں آیا ہے لیکن عقل میں سب سے آگے نکل گیا۔ اس نے اپنی عقل کے ذریعے قدرت کی طاقتوں کو اسیر کیا۔ اپنے لیے گھر بنائے اور ایک معاشرہ تشکیل دیا۔

اب سوال یہ بھی ہے کہ انسانوں، جانوروں اور پودوں وغیرہ سے پہلے کیا تھا۔

یہ بہت دل چسپ اور پُراسرار سوال ہے۔ زمین کی ارتقا کا یہ سفر ہی ہمارے اس مضمون کا موضوع ہے۔ ہماری یہ زمین شعلہ بار مادے کا بہت بڑا گولہ تھا۔ اتنا بڑا گولہ کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ گولہ وسیع وعریض خلا میں گھومتا پھرتا تھا۔ یہ سمجھ لیں کہ فضا کے سمندر میں دھوئیں کے بادل کی طرح اڑتا جا رہا تھا۔ پھر وہ ہوا جس کو دنیا نے بگ بینگ کا نام دیا ہے۔ یعنی بہت بڑا دھماکا۔ اتنا شدید کہ اس دھماکے سے یہ گولہ کائنات میں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گیا اور ہر ٹکڑا آگ کا دہکتا ہوا انگارا تھا۔

زمین، سورج، ستارے، سیارے سب اس گولے کے ٹکڑے ہیں۔ جو اپنے خالق کے حکم سے اپنے اپنے محور پر گردش کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں ہیں۔ بلکہ دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ یعنی یہ کائنات پھیلتی جا رہی ہے۔ اس میں ابھی بھی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون۔

اب ہم کائنات کے دیگر سیاروں اور ستاروں کو چھوڑ کر زمین کی طرف آتے ہیں۔

ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ ایسی آگ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آگ زمین کو جھلسا رہی تھی۔ زمین تڑخ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی اور جب زمین کی اوپری سطح پوری طرح جل چکی تو اس پر چٹانیں نمودار ہوگئیں۔ پہاڑ بنے اور سب کچھ اپنی اپنی جگہ قائم ہوگیا۔

لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ سطح برسوں میں جا کر ٹھنڈی ہوئی ہوگی۔ نہیں اس کو ٹھنڈا ہونے میں ہزاروں سال لگ گئے تھے۔ اب یہ ہو چکا تو خدا کے حکم سے بادل نمودار ہوئے اور بارشیں ہونے لگیں۔ موسلا دھار بارشیں کہ ایسی بارشوں کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ بارشیں بھی سینکڑوں برسوں تک

مسلسل ہوتی رہی تھیں۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ ان ہی بارشوں نے بڑے بڑے سمندر اور دریا تخلیق کر دیے لیکن اب تک سب کچھ جامد و ساکت تھا۔ ایک بے پناہ خاموشی جس میں بادلوں کی گرج کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس دور میں پودے اور جنگلات بھی پیدا ہونے لگے۔ (بارشوں کی وجہ سے) لیکن ابھی تک کسی متحرک چیز کا کوئی وجود نہیں تھا۔

پھر ایک حیرت انگیز معجزہ رونما ہوا۔ بے جان دنیا نے ایک جاندار ذرّے کو جنم دیا۔ یہ جاندار ذرہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا تھا۔ ہزاروں سال تک یہ ذرہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہا۔ اس عرصے میں آہستہ آہستہ پانی کے ناموافق حالات سے مانوس ہوتا چلا گیا اور زندگی کی مشکلات پر قابو پانے لگا۔

یہ تو تھا کائنات کا پہلا عہد۔

اس عہد میں خدا نے کائنات کو تخلیق کیا۔ پہاڑ، سمندر اور دریا بنائے۔ پھر ایک ذرہ سمندر کی سطح پر تیرتا ہوا اپنی زندگی کا ثبوت دینے لگا۔

اس کے بعد شروع ہوتا ہے دوسرا عہد۔ اس عہد میں اس ذرے نے توانائی حاصل کی۔ اس میں اپنے آپ کو برقرار رکھنے کی قوت پیدا ہوتی چلی گئی۔

کچھ ذرات جرثومے کی شکل میں پانی سے باہر آ گئے اور پودوں کی شکل اختیار کرتے چلے گئے۔ یہ عہد بھی ہزاروں برسوں پر محیط ہے۔ اب زمین پر گھنے جنگلات تھے اور یہ زمین ایک Shape اختیار کر چکی تھی۔

ہر طرف سخت چٹانیں اور جنگلات۔ ماہرین کے خیال میں جو چٹانیں آج سے پچاس کروڑ سال پہلے کی بنی ہوئی ہیں ان میں حیوانی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے (اندازہ کریں کہ ہماری زمین کتنی قدیم ہے) ساٹھ کروڑ سال سے چھتیس کروڑ سال پہلے کے دور کی چٹانوں پر بھی زندگی کے آثار نہیں تھے لیکن اس دور میں جوہڑوں اور جھیلوں کے پانیوں پر کائی جمنے لگی تھی اور دلدلوں میں ننھے ننھے کیڑے نمودار ہونے لگے تھے۔

یہ کیڑے ان ذرات کے علاوہ تھے جو سمندر میں تیرتے پھر رہے تھے۔ یعنی دلدلوں میں لعابی مچھلیوں کے بننے کا عمل شروع ہو چکا تھا اور اس طرح زندگی وجود میں آنے لگی تھی۔

پھر زمین پر باقاعدہ حیات کا آغاز ہونے لگتا ہے۔

یہ وہ دور ہے جو زمانہ قبل از تاریخ کہلاتا ہے۔ آئیں اب مرحلہ وار تھوڑا تھوڑا جائزہ لیتے ہوئے وہاں تک آتے ہیں جہاں سے باقاعدہ انسانی تمدن کا آغاز ہوتا ہے۔

4000 ملین برس پہلے پہلی زندگی وجود میں آئی۔ جس کو ماہرین نے Biogenasis کا نام دیا ہے۔

3900 ملین برس پہلے۔ خدا نے زمین پر آکسیجن پیدا کی اور خلیات پیدا ہوئے۔

2500 ملین برس پہلے۔ کچھ ایسے جاندار پیدا ہوئے جو آکسیجن استعمال کر سکتے تھے۔ ان آکسیجن استعمال کرنے والے جانداروں نے غیر آکسیجن جانداروں کو فنا کر دیا۔

2100 ملین برس پہلے۔ کچھ پیچیدہ خلیات پیدا ہو گئے۔ جن کو Eukaryotes کا نام دیا گیا۔

1200 ملین برس پہلے۔ افزائش نسل کا سفر اور تیز ہو گیا۔

900 ملین برس پہلے ایک اور جاندار جو ابتدائی دور کے جانداروں میں اب تک سب سے بہتر تھے۔

600 ملین برس پہلے۔ اسفنج نما جاندار اور جو اب تک کے تمام جانداروں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔

580 ملین برس پہلے جانداروں نے حرکات شروع کر دیں۔ یعنی ان میں Movement ہونے لگی۔ ان میں اعصابی اور عضلاتی نشو و نما ہونے لگے۔

550 ملین برس پہلے۔ چپٹی جونکیں وجود میں آئیں۔ ان میں اعصاب اور عضلات زیادہ ترقی یافتہ شکل میں تھے۔ (اس سلسلے میں ان ماہرین کو خراج تحسین پیش کرنا چاہیے جن کی برسوں کی محنت کے بعد ہم آج اس زمین اور اس کائنات کے حوالے سے بہت کچھ جاننے کے قابل ہو چکے ہیں)

اس عہد میں ایسی جونکیں سامنے آئیں جن میں دماغ کا سراغ ملا۔

540 ملین سال پہلے۔ جونکوں کی مختلف اشکال۔ چپٹی جونکوں سے زیادہ ترقی یافتہ۔

530 ملین سال پہلے۔ اب جو جرثومہ یا جاندار سامنے آیا ماہرین نے اسے Pikaia کا نام دیا ہے۔ اس جرثومے کی آنکھیں بن چکی ہیں اور اس کے دانت بھی ہیں۔

505 ملین سال پہلے۔ Vertabrates ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ بغیر جبڑوں والی مچھلیاں ہیں۔

480 ملین سال پہلے۔ اب جو مچھلیاں سامنے آئی ہیں ان میں جبڑے بن چکے ہیں۔

اس کے بعد سلطنتیں وجود میں آتی ہیں۔

ہم کائنات اور انسانی تاریخ میں سفر کرتے ہوئے Homo تک آ چکے ہیں۔

یہ عہد ڈھائی ملین سال سے لے کر بارہ قبل از تاریخ تک کا ہے۔

اس دور میں انسان اپنے پورے فارم اور انسانی خدوخال میں سامنے آ گیا تھا۔ پہلے مکمل انسان کی کچھ نشانیاں افریقا کے کچھ علاقوں میں پائی گئی ہیں۔

انسان اگرچہ سب سے بعد میں آیا ہے لیکن اس میں سب سے زیادہ عقل ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے۔

اب اس کے دو بڑے دشمن ہیں۔ سخت ترین موسم اور بھوک۔

موسم کی سختی نرمی سے نمٹنے کے لیے وہ غاروں میں پناہ لیتا ہے۔ اپنا ٹھکانا بناتا ہے اور بھوک مٹانے کے لیے جانوروں کا شکار کرتا ہے۔

اس عہد کو ماہرین نے Palio lethic عہد قرار دیا ہے۔

انسان کی مکمل تاریخ کے بارے میں ہمیں معلومات اس زمانے سے ملنی شروع ہوتی ہیں جب انسان نے لکھنا سیکھا۔ تحریر وجود میں آگئی۔ اس لیے ان ابتدائی ادوار کے بارے میں مختلف آثار سے اندازہ لگایا گیا ہے۔ یہی وہ دور ہے جب انسان نے پتھروں سے کام لینا شروع کیا۔

ہم اس عہد کو پتھروں کا عہد کہتے ہیں۔ یہ عہد بھی پہلے مراحل میں سامنے آیا۔ جب انسان نے پتھروں سے پہلی بار کام لیا تو وہ اس عہد کی ابتدا تھی۔

ماہرین نے اس عہد کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

1۔ ابتدائی یا پتھر کا پہلا عہد۔
2۔ وسطی یا پتھر کا دوسرا عہد۔
3۔ آخری عہد۔

برفانی عہد کے بعد آج سے پانچ لاکھ سال پہلے سے لے کر تین لاکھ سال پہلے تک کا عہد ایک ایسا عہد تھا جب انسانی معاشرہ پروان چڑھ رہا تھا۔

ہم نے اپنے اس مضمون کی بنیاد اگرچہ ان دنوں سے رکھی ہے جب دنیا میں تہذیبیں وجود میں آئیں اور باقاعدہ حکومتیں قائم ہوئیں اس کے ساتھ ہی آپ کو متوازی تاریخ بھی پڑھنے کو ملے گی۔ یعنی سلطنتیں قائم ہونے کے بعد دنیا کے کس خطے کی کیا پوزیشن تھی۔

لیکن فی الحال وہ مرحلہ ہے جب سرحدیں قائم نہیں ہوئی تھیں اور انسان پوری زمین پر پھیلا ہوا اپنی تکمیل کے مراحل سے گزر رہا تھا۔

اس دور کے قدیم ترین انسان کی موجودگی کے آثار راولپنڈی ڈویژن میں موجود وادی سون کے گردونواح میں پائے گئے ہیں۔

اس وادی سون میں رہنے والے قدیم ترین انسان بعض پودوں کی جڑیں (خودرو) اور پودوں کے دوسرے حصے خوراک کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس زمانے میں کاشت کاری کا تصور نہیں تھا۔

وادی سون کے انسان گوشت خور نہیں تھے۔ اس بات کا پتا ان کے دانتوں اور جبڑوں سے لگا ہے۔ ان کی ساخت یہ بتاتی ہے کہ وہ گوشت خور نہیں ہوتے تھے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں شکار کے لیے جانور آسانی سے نہ ملتے ہوں۔

پتھروں کے اوزار بنانے کی تحریک شاید اس محرومی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ جانور ان کے سامنے آ کر نکل جاتے ہوں گے اور وہ کچھ نہیں کر پاتے ہوں گے۔

پھر انہوں نے پتھروں کے اوزار بنانے شروع کر دیے۔ اس دور کے انسان چھوٹے چھوٹے جانوروں، پرندوں اور مچھلیوں کا شکار کرتے ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ہتھیار پتھر کے ٹکڑوں کے بنے ہوئے ہیں۔ نسلِ انسانی کے اس دنیا پر موجود ہونے کے جو قدیم ترین آثار ملے ہیں وہ یہ چقماق پتھروں کے نوکیلے اوزار ہیں۔ مختلف شکلوں کے یہ اوزار پتھروں کو گھس کر بنائے گئے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انسان کی ابتدائی نسل نے جب زندگی کا سفر شروع کیا اور اس کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو وہ اپنے ابتدائی مسکن سے باہر نکل کر روئے زمین پر چاروں طرف پھیلنے لگا۔

انسان نے جب سفر اختیار کیا تو انہیں طرح طرح کے مناظر دیکھنے کو ملے۔ دریا، سمندر، پہاڑ، جانور وغیرہ اور وہ اپنے علم میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

پودوں وغیرہ سے چونکہ اس کی ضروریات پوری نہیں ہورہی تھیں۔ اس لیے اس نے پتھروں کے ٹکڑوں سے شکار کرنا شروع کر دیا (اور اس طرح گوشت خور ہوتا چلا گیا)۔

اب پتھروں کے ان تینوں ادوار کا جائزہ لے لیں۔

پتھر کا پہلا دور:۔

ماہرین نے دریائے بیاس کی وادی سے پتھر کے ابتدائی دور کے ہتھیار اور آلات دریافت کیے ہیں یہ ہتھیار اور آلات بڑے بڑے پتھروں کو توڑ کر اور کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ جب شروع شروع میں اناج کے خودرو پودوں کے بارے میں انسان کو معلوم ہوا اور اس نے گندم کا پہلا دانہ کھایا تو پھر اس کی کاشت کی طرف اس کی توجہ ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ دیگر پودوں کی طرح خود رو گندم پودے اور گھانس کو جب مویشیوں کے سامنے چارے کے طور پر ڈالا جاتا تو اس کے کچھ بیج زمین پر پڑے رہ جاتے اور برسات کے دنوں میں وہی بیج جب پودوں کی شکل میں اگ آئے تو انسان کو علم ہوا کہ پودے اس طرح اگائے جاتے ہیں۔

پھر اس نے اپنے طور پر بیجوں سے پودے اگانے سیکھ لیے۔

گندم کے پہلے پودے کے ساتھ انسانی معاشرت شروع ہوئی۔ وہ پہلے خانہ بدوش تھا لیکن پودوں کی حفاظت کے لیے اسے ایک جگہ رہنا پڑا۔

لہٰذا رہنے کے لیے اس نے جھونپڑے اور گھر بنائے۔ اناج کو سنبھالنے کے لیے اسے بڑے برتنوں کی ضرورت ہوئی جو ابتدا میں اس نے جانوروں کی کھالوں اور مٹی کچی کوٹھیوں سے پوری کی۔

کچھ زمانے گزرنے کے بعد اس نے مٹی کے برتنوں کو آگ میں پکانا سیکھ لیا (انسان کی ترقی میں آگ کی دریافت کا بھی بہت بڑا حصہ ہے بلکہ آگ کی دریافت تہذیب کی بنیاد ہے)۔

گندم اور آگ کی دریافت نے انسانی ترقی کی رفتار بہت تیز کر دی۔ پھر اس نے پتھروں سے نئے اوزار بنانے شروع کر دیے۔

نوکیلے اوزاروں کے عہد میں پتھروں کا پہلا باقاعدہ دور شروع ہوتا ہے۔

اب انسان اپنی ضرورت کے مطابق پتھر کے نئے نئے اوزار بنانے لگا تھا، جن میں زمین کھودنے کے پھل اور فصل کاٹنے کی درانتیاں بھی شامل ہیں۔

(قدیم انسان کی یہ نشانیاں دریافت ہوئی ہیں۔ جو عجائب گھروں میں محفوظ ہیں)۔

زراعت کی غرض سے زمین کھودنے کے لیے جو اوزار استعمال کیے جاتے تھے وہ گھسے جاتے تھے۔ اس سے پتھر کو گھس کر نوکدار اوزار بنانے کا خیال آگیا جو شکاری دور کے انسانوں میں نایاب تھا۔

گھر بنانے کی ضرورت نے انسانوں کو لکڑی کا جائزہ لینے کی طرف مائل کیا اور وہ پتھر کے تیشے بنا کر نجاری کی صنعت کو فروغ دینے لگے۔

جن علاقوں میں پتھر آسانی سے مل جاتے تھے وہاں انہوں نے گھر بنانے کے لیے پتھر کی گھسی ہوئی سلیں استعمال کیں اور میدانی علاقوں میں وہ مٹی کی سلوں سے کام لینے لگے۔ جو پہلے پہل سانچے کی کچی اینٹوں کی شکل میں منتقل ہوگئیں اور ان اینٹوں نے بھٹے میں پکائی ہوئی پختہ اینٹوں کی شکل اختیار کر لی (یہ حرفت آج تک چلی آرہی ہے)۔

اس دور کے انسان کا دماغ اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق عمل کرتا چلا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گندم کی فصل کاٹ کر سال بھر کا ذخیرہ کر لینے کے لیے اس کے پاس بہت فرصت تھی۔ جیسے وہ تمدن کی تعمیر پر لگانے لگا۔

مختلف قسم کے حرفت کاروں کی جماعت اس زمانے میں سامنے آئی۔ درختوں کی شاخوں سے ٹوکرے بنانے کے بعد وہ چٹائیاں تیار کرنے لگے۔

چٹائیاں بنانے کی فنی مہارت نے اس کو درختوں کی چھال کے ریشوں سے کپڑا بنانے کی طرف مائل کر دیا۔ (یہ وہ دور تھا جس میں شکاری انسانوں کی ٹولیاں جانوروں کی تلاش میں پھرتی تھیں۔ شکاری انسانوں کو زیادہ ساز و سامان کی ضرورت نہیں تھی)۔

تاریخ انسانی میں تین ادوار گزرے ہیں (یعنی موجودہ انسان سے پہلے اور تہذیب کی آمد تک) ماہرین نے ان اوزاروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی پتھر کا عہد، کانسی کا عہد اور لوہے کا عہد۔ ان ادوار کے بھی کئی حصے کیے گئے ہیں۔

اس دور کا انسان پتھر سے بہت اچھے اچھے ہتھیار اور اوزار بنانا سیکھ چکا ہے۔ آگ کے استعمال کا طریقہ بھی آ گیا ہے۔

برتنوں کو پکانے کے کام میں انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ماہرین نے کھدائی کر کے جو برتن دریافت کیے ہیں وہ رنگین بھی ہیں اور منقش بھی۔

چونکہ انسان نے کاشت کاری شروع کر دی ہے۔ اس لیے شکار کا پیشہ محض تفریحی رہ گیا ہے۔ وہ جانوروں کو سدھانے، مانوس بنانے اور ان کے ریوڑ پالنے میں مصروف ہو گیا ہے۔

برف کے طوفان کے گزر جانے کے بعد انسان نے ان علاقوں کی طرف سفر شرع کر دیا۔ جہاں وہ آسانی سے زندگی گزار سکے۔ وہ افریقا، یورپ اور ایشیا کے نسبتاً گرم علاقوں کی طرف آ گیا ہے۔ اب وہ خدا کی زمین پر پھیلتا جا رہا ہے۔

اس دور کے آثار ہندوستان اور پاکستان تک ملے ہیں۔

انسان ہانڈیاں، پیالے، مٹکے، ٹونٹی دار لوٹے اور کئی اقسام کے برتن استعمال کرنے لگا ہے۔ بعض مقامات کی کھدائی سے پتھر کی چکیاں بھی ملی ہیں جو اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اس دور کا انسان گندم کو پیس کر استعمال کرنا سیکھ چکا تھا۔

برتن بنانے کے علاوہ غاروں کے اندر دیواروں پر تصویریں بنانا اور منظر کشی کرنا بھی اس نے سیکھ لیا تھا۔

دنیا کے بہت سے ممالک میں اس قسم کے غاروں کے نشان ملے ہیں۔

پاکستان میں بھی ایسے ایک غار کے نشان ملے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ غار مردان کے نزدیک وادی سنگاڑ میں ہیں۔ اس وادی سے تقریباً ستر ہزار سال قدیمی پتھر کے ادوار اور ہتھیار بھی ملے ہیں۔

اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ انسان جہاں جھونپڑوں اور کچے گھروں میں رہتا تھا وہاں اس نے غاروں میں بھی اپنی رہائش رکھی ہوئی تھی۔

اس دور میں سمندروں، دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے بستیاں آباد ہو چکی تھیں۔ انسان خشکی کے شکار کے ساتھ ساتھ پانی کے شکار پر بھی گزارا کرنے لگا تھا۔

اس دور میں ایک عظیم ہجرت یا نقل مکانی ہوئی تھی۔

اس دور میں کچھ قبائل دوسروں سے کٹ کر زندگی گزار رہے تھے اور اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ انسانوں سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے پتھر کے ابتدائی دور کے انسانوں کی زندگی گزار رہے تھے (افریقا اور آسٹریلیا کے دور دراز کچھ خطوں میں آج بھی بہت سے قبائل اس قسم کی زندگی گزار رہے ہیں)۔

جسم کو ڈھانپنے اور جھونپڑے بنا کر رہنے کی عادت بہت سے علاقوں میں عام ہو چکی تھی اور مٹی کے برتن بنانے، مکان تعمیر کرنے، لکڑی کو کاٹ کر اور چھیل کر استعمال میں لانے، پتھر سے نئی سے نئی چیز گڑنے، سوتی اور اون کاتنے، سن کے ریشوں سے رسے بنانے، کپڑے بننے، جانور پالنے اور ان سے غذا کے لیے دودھ حاصل کرنے اور زمین پر محنت کر کے فصل اگانے کے طریقے عام ہو چکے تھے۔

پتھر کا آخری عہد:۔

پتھر کے اس دور میں انسان نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ وہ پختہ اینٹوں کے مکانات اور پتھر کی سلوں کی عمارتیں تعمیر کرنے لگے تھے۔ زراعت میں بھی اس نے بہت آگاہی حاصل کر لی تھی۔

اس طرح کے آثار دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح پاکستان میں بھی ملے ہیں۔

بلوچستان کے درہ بولان سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر مہرگڑھ کے مقام سے اس عہد کے آثار پائے گئے ہیں۔

یہ چھ ہزار سال قبل مسیح یا اس سے بھی پہلے کے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ یہاں پر لوگ اس طرح کے گھر بنا کر رہا کرتے جن میں بہت سے کمرے ہوتے تھے۔

اس دور میں عورتوں کے لیے پتھروں کے زیورات بھی بننے لگے تھے۔ جن میں ہار، چوڑیاں اور گجرے ہوا کرتے۔

عام پتھروں کے علاوہ فیروزے، مونگے اور گھونگوں کا استعمال بھی کیا جاتا۔ ایک قبر سے دو بڑے موتی ایسے ملے ہیں جو پانچ سے سات ہزار سال پہلے کے ہیں۔

ان میں سے ماہرین کی تحقیق کے مطابق ایک موتی ایسا ہے جو افغانستان کے شمالی حصے میں پایا جاتا ہے اور اس کا موجودہ نام لاپس لزولی ہے۔

شاید اس زمانے میں کئی قسم کے مذہب کا تصور بھی انسان کے ذہن میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ برتنوں پہ دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنانے لگا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی انسانی معاشرت میسوپوٹامیہ کی تھی۔

اس کے بعد مصریوں کی معاشرت دریائے نیل کے کنارے پیدا ہوئی۔

اس کے بعد دریائے سندھ کے کنارے ہڑپہ کی تہذیب۔

ہمارے صوبہ سرحد کے شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے 25 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قدیم شہر کھدائی میں دریافت ہوا ہے۔

اس کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ شہر تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح میں موجود تھا۔ اس قدیم شہر کے آثار دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ یہ ایک قلعہ بند شہر تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پتھروں کے آخری عہد میں انسان نے ایک ساتھ رہنے اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اوزاروں کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

دھاتوں کا عہد:۔

پتھروں کے عہد کے بعد انسانی تاریخ کا ایک اہم ترین دور شروع ہوتا ہے اور وہ ہے دھاتوں کا عہد۔

اب ہم دھاتوں کے عہد کو دیکھیں گے کہ اس دور میں انسان نے ترقی کی کتنی منزلیں طے کی تھیں دو ہزار سال قبل مسیح سے ایک ہزار سال قبل مسیح تک کے دور میں دھاتوں کا استعمال عام ہو گیا تھا۔ تانبے اور سونے کو کانوں سے نکال کر زیورات یا دیگر چیزوں میں استعمال کرنے اور رکھنے کا رواج تین ہزار قبل مسیح یا اس سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔

تانبا اور سونا دونوں نرم دھاتیں ہیں۔

اس دور میں تانبے میں دس فی صد قلعی ملا کر ایسی سخت دھات بنانے کا گر ہاتھ آ گیا تھا جس سے تیز دھار والے اوزار بنائے جانے لگے تھے۔

ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ آگ کی دریافت اور دھاتوں کے استعمال نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

اب انسان گروپ کی شکل میں رہنے لگا تھا۔ اگرچہ کوئی باقاعدہ حکومت سامنے نہیں آئی تھی لیکن ہجرتیں ہو رہی تھیں۔

انسان پناہ اور خوراک کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر رہا تھا۔

تانبے، کانسی، سونے اور لوہے وغیرہ کا استعمال ہونے لگا تھا۔

اب ایک باقاعدہ تہذیب وجود میں آتی ہے۔ ایک مکمل معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ جسے میسوپوٹامیہ کا نام دیا گیا۔

یہ عہد ہے 5500 ق س کا۔

ہم چونکہ متوازی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ اس لیے تاریخ کو ہم اس عہد سے شروع کرتے ہیں۔ آپ نے اب تک کائنات کے وجود سے لے کر انسان کے وجود تک کو ایک نظر دیکھ لیا ہے۔ پتھروں کے عہد سے دھاتوں کے عہد تک آ گئے ہیں۔

اب شروع ہوتا ہے انسانی تہذیب اور حکومتوں کی تاریخ یعنی ایک ہی وقت میں زمین کے مختلف علاقوں میں کیا ہو رہا تھا۔

ہمارا اصل موضوع بھی یہی ہے۔

اور انشاء اللہ اگلی قسط میں ہم میسوپوٹامیہ کی تہذیب کے بارے میں بات کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اس عہد میں

مصر میں کیا تھا۔

افریقا میں کیا ہو رہا تھا۔

ہندوستان کی کیا صورت حال تھی۔

چین اور جاپان کن مراحل سے گزر رہے تھے۔

میرا خیال ہے یہ سلسلہ نہ صرف تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں بلکہ عام لوگوں کے لیے بھی انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہو گا۔

پرندے

شیراز خان

خداوند قدوس نے جانداروں کی لاتعداد اقسام کو خلق کیا۔ پتھر کے اندر سانس لیتے وجود کو بھی پیدا کیا۔ پاتال کی گہرائی ہو یا ہوا کی اونچائی ہر جگہ کوئی نہ کوئی جاندار نظر آتا ہے۔ یہ سب مل کر خالقِ کائنات کی بڑائی بزمان خموشی بیان کرتے ہیں۔ ہوا میں محو پرواز پرندے اقسام کے لحاظ سے کئی لاکھ اقسام میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ خود میں عجوبہ، صنعت گری میں کمال کے یہ پرندے ان پر کچھ لکھنا آسان نہیں۔ یہ سرگزشت کا خاصا ہے کہ وہ مشکل امور پر ہی تحریر سامنے لاتا ہے۔ پرندوں پر لکھی گئی یہ تحریر خود اپنی مثال آپ ہے۔

ہوا میں پرواز کرنے والے جاندار پر سیر حاصل تحریر

پرندے کتنے خوب صورت ہوتے ہیں۔ رنگ برنگے، مدھر مدھر آوازیں نکالتے۔ میٹھی میٹھی بولیاں بولتے ہوئے۔ یہ پرندے قدرت کا حسین شاہکار ہوتے ہیں۔

پوری دنیا میں پرندوں کو خوب صورتی اور پیار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ انہیں گھروں میں پالا جاتا ہے ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پرندوں پر کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ فلمیں بنائی گئی ہیں۔ خاص طور پر بچوں کے خوب صورت گیت ننھے منے پرندوں کے تذکروں سے بھرے ہوئے

ہوتے ہیں۔

انگریزی اردو بلکہ دنیا کی ہر زبان کی شاعری میں پرندوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ان سے روایات منسوب ہیں۔ یہ خوش قسمتی اور بدقسمتی کی علامات سمجھے جاتے ہیں۔

منڈیروں پر جب کاگا (کوا) بولتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاید کوئی مہمان آنے والا ہے۔ فاختہ پوری دنیا میں امن کی علامت کے طور پر مشہور ہے۔ اُلو کو منحوس سمجھتے ہیں۔ عقاب کو دلیری اور بخت کی علامت کہا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

چلیں مضمون کو آگے بڑھانے سے پہلے پرندوں کے حوالے سے چند اشعار سن لیں۔

یہ اشارہ ہے آفاتِ ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

......

چکور خوش ہے کہ بچوں کو آگیا اڑنا
اداس بھی ہے کہ دن آگئے جدائی کے

......

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

کہاں تک سناؤں پوری اردو شاعری میں پرندوں کے حوالے سے آپ کو بے شمار اشعار مل جائیں گے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پرندے ہماری زندگی میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ پرندے زندگی اور خوب صورتی کی علامت ہیں۔

کچھ پرندے ایسے بھی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں موجود ہے۔ آپ بھی ان پرندوں اور ان کے حوالے سے جو واقعات ہیں ان کے بارے میں یقیناً جانتے ہیں۔

آئیں کچھ ایسے پرندوں کے واقعات دہراتے ہیں۔ اس کے بعد پرندوں کو روایتی تناظر میں دیکھتے ہیں۔

ابابیل

ہماری تاریخ میں ایک واقعہ اصحاب الفیل کے نام سے بہت مشہور ہے۔ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے ایک ماہ پچیس روز پہلے پیش آیا تھا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

”یمن میں وہاں کے بادشاہ زونواس جو قدیم حمیر کا آخری بادشاہ تھا۔ یہودی ہوگیا تھا۔ یہودی ہونے کے بعد اس نے نجران کے عیسائیوں پر بے پناہ ستم ڈھانا شروع کردیا۔ اس نے خندق کھدوا کر اس میں آگ بھڑکائی اور پچیس پچیس عیسائیوں کو پکڑ پکڑ اس میں ڈالنے لگا۔ اس واقعے کا ذکر ایک سورہ میں ہے

ان عیسائیوں میں سے کچھ قیصرِ روم کے پاس جلی ہوئی انجیل لے کر فریاد کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ بادشاہ عیسائی تھا۔ اس نے نجاشی شاہ حبش کو مدد کرنے کو لکھا۔ شاہ حبش بھی عیسائی تھا۔ نجاشی نے ابرہا کو ایک لشکر دے کر یمن کی طرف روانہ کیا۔ ابرہا نے زونواس اور اس کی سلطنت کو تباہ کردیا اور خود یمن کا بادشاہ بن گیا۔ ابرہا بڑا بدذات، کمینہ خصلت اور عیاش انسان تھا۔ اس نے کعبہ کی رونق کم کرنے کے لیے اپنے پایہ سلطنت میں ایک گرجا گھر بنوایا اور اس کو خوب سجادیا۔ اور عرب کے لوگوں کو حج کعبہ سے روکنے لگا اور حکم دیا کہ اس کے بنائے ہوئے گرجا کا حج کیا کریں۔

اس کے تشدد کے باوجود لوگوں نے اس کی بات نہیں مانی۔ اس وجہ سے اسے مکہ اور کعبہ سے عداوت ہوگئی۔ اس دوران میں اس نے ایک نیا شگوفہ کھلایا۔ گرجا کے جاروب کش نے پورے گرجا میں ایک رات گندگی پھیلا دی۔ وہ جاروب کش مکہ کا رہنے والا تھا۔ ابرہا مکہ والوں پر اور بھی غضب ناک ہوگیا اور اتفاقاً یہ کہ ایک بار اس گرجے میں آگ بھی لگ گئی۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آگ لگانے والے بھی مکہ کے باسی تھے۔ اب تو ابرہا کو اور غصہ آیا اس نے ایک لشکر لے کر مکہ پر چڑھائی کردی۔ اس لشکر میں بہت سے ہاتھی تھے۔ ان میں ایک خاص ہاتھی محمود نام کا تھا۔

جب اس کا لشکر مکے سے چار کوس کے فاصلے پر آکر رکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے سوا تمام اہلِ مکہ فرار ہوگئے۔

عبدالمطلب کعبہ کے متولی تھے۔ عبدالمطلب ابرہا کے پاس گئے۔ ابرہا نے پوچھا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میرے چند اونٹ تمہارے سپاہیوں نے پکڑ لیے ہیں وہ دلادیں۔“

ابرہا نے حیرت سے کہا۔ ”تم کو اپنے اونٹوں کی فکر ہے اور کعبہ کی فکر نہیں ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ''اونٹ میرے تھے۔ اس لیے مجھے ان کی فکر ہے۔ کعبہ اللہ کا ہے وہی اس کی فکر کرے گا۔''

بہر حال ابرہا نے اپنا لشکر آگے بڑھایا۔ ہاتھیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آگے بڑھیں۔ مگر ہاتھی آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگے۔ فیل بان ہاتھیوں کو مارتے تھے لیکن وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔

اسی حالت میں شہر جدہ کی طرف سے سفید اور سیاہ پرندے نمودار ہوئے (قرآن نے ان ہی پرندوں کو ابابیل کہا ہے)۔

قرآن کہتا ہے۔ ''ہم نے ان پرندوں کے غول کے غول بھیجے۔ جو ان پر کنکر یعنی پتھریاں پھینک رہے تھے۔''

ان کنکریوں نے ابرہا کے لشکر کو بھوسے کی طرح کر دیا۔

یہ تو ہوا ہماری تاریخ میں ابابیل کا ذکر۔ اب ہماری تاریخ میں ایک اور پرندہ بھی ہے اور وہ ہے ہد ہد۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے حوالے سے ہد ہد بھی بہت مشہور ہے۔ یہ ہد ہد وہ ہے جس نے حضرت سلیمانؑ کو ملکہ سبا بلقیس کی خبر دی تھی۔

یہ تو وہ پرندے ہوئے جن کا تذکرہ ہماری کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ دنیا کے بہت سے مذاہب اور کلچر میں ایسے روایتی پرندے بھی موجود ہیں جن کا ذکر دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔

Achiyalabopa

(اچیالابوپا)

ایک قوم ہوا کرتی تھی بیلو بیلو۔ اس قوم کے لوگ اس پرندے کو خدا کا درجہ دیتے تھے۔ اس کے مجسمے بنا کر اس کی پرستش کرتے۔ ممکن تھا کہ ان میں سے کسی نے بھی ان پرندوں کو نہیں دیکھا ہوگا کیوں کہ یہ روایتی پرندہ تھا۔ ان کی روایت کے مطابق وہ بہت غیر معمولی طور پر لمبا چوڑا پرندہ تھا۔ اس کے پر دھنک کے رنگوں کے تھے۔ جب وہ پرواز کیا کرتا تو مشرق سے لے کر مغرب تک دھنک کے رنگ بکھر جاتے تھے۔ اس کے پر خنجر کی طرح تیز دھار کے ہوتے تھے۔ اس لیے جب اس قوم پر دشمنوں نے حملہ کیا اور انہوں نے مدد کے لیے اپنے اس دیوتا پرندے کو پکارا تو وہ فوراً مدد کو آ گیا اور اپنے خنجر جیسے پروں سے دشمنوں کا صفایا کر دیا۔

Aello (آئی لو)

قدیم یونانی تاریخ ہمیں ایک کہانی سناتی ہے۔ یہ کہانی دو بہنوں کی ہے۔ یہ دونوں بہنیں بہت خوب صورت تھیں اور بہت خباثت سے بھی بھری ہوئی تھیں۔ یہ دونوں ایک ویران علاقے کے ایک ویران مکان میں رہا کرتیں اور جب کوئی مسافر اس علاقے سے گزرتا تھا تو اسے اپنے حسن کے جال میں پھانس کر اپنے مکان میں لے آتیں اور اس کو قتل کر کے اس کے ٹکڑے کر کے کھا جاتیں۔

جب ان کی شکایت دیوتاؤں کے پاس پہنچی تو دیوتاؤں نے ان دونوں بہنوں کو سزا کے طور پر پرندہ بنا دیا۔ اس دن سے آج تک یہ دونوں بہنیں اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہیں اور روتی رہتی ہیں۔ ان کے اور بھی کئی نام ہیں جیسے Aallopus , Aellope وغیرہ۔

Aethon

یہ پرندہ بھی یونانی تاریخ کی روایت کا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جلتا ہوا پرندہ تھا یعنی اس کے پروں میں ہر وقت آگ لگی رہتی اور جب یہ اڑتا ہوا کسی جنگل کی طرف سے گزرتا تھا تو اس جنگل میں آگ لگ جاتی۔ کسی مکان کی چھت پر بیٹھ جاتا تو وہ مکان جل کر خاک ہو جاتا تھا۔ مشہور رزمیہ نظم اوڈیسی میں بھی اس پرندے کا ذکر ہے۔

Devil Bird

(ڈیول برڈ)

سری لنکا میں ایک جنگل ہے اولاسہ۔ روایت ہے کہ یہ پُراسرار پرندہ اس جنگل میں پایا جاتا ہے۔ اس جنگل کے

اطراف میں رہنے والوں کے لیے وہ پرندہ خوف کی علامت ہے۔

اس کی آواز ایسی ہے جیسے ہزاروں روحیں مل کر فریاد کر رہی ہوں (یہ سب روایات ہیں) اور جس گاؤں میں رات کے وقت اس پرندے کی آواز سنائی دے جائے اس گاؤں میں دوسرے دن کوئی نہ کوئی موت یا کوئی حادثہ ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ بے چارے اس لیے اس پرندے سے خوف زدہ رہے ہیں۔ 2001ء میں کچھ لوگوں نے اس پرندے کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔

عقاب

بہت مشہور پرندہ۔ اس کی بے شمار اقسام ہیں اور کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر قسم دوسری قسم سے ملتی ہوئی ہو۔ یہ الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں۔

افریقا اور یوروشیا میں 60 سے زائد اقسام کے عقاب پائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس امریکا اور کینیڈا میں ابھی تک دو یا تین اقسام کا پتا چل سکا ہے۔

ہماری روایت اور ثقافت میں اس پرندے کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اس کی تیز نگاہ اس کا جھپٹنا، اس کی پُروقار اور بارعب اڑان اس کی اونچی پرواز۔ یہ سب اس بات کی تحریک دیتی ہیں کہ ایک مسلمان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

بچوں کے نام پرندے کے نام پر شاہین رکھے جاتے ہیں۔

ہُما

یہ بھی ایک مشہور پرندہ۔ مشہور اس لحاظ سے کہ اس کے تذکرے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کو بھی آج تک کسی نے نہ دیکھا۔

ہُما فارسی کا لفظ ہے۔ اسے جنت کا پرندہ بھی سمجھا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ پرندہ روشن مستقبل کی علامت ہے۔ روایت کے مطابق جس کے سر پر بیٹھ جائے اسے بادشاہ بنا دیتا ہے۔

محاوروں تک میں استعمال ہوتا ہے۔ ’’اس کے سر پر ہما بیٹھ گئی ہے۔‘‘

لڑکیوں کے نام اس کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔

اس کی کئی خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔ جیسے یہ ہر دم پرواز کرتا رہتا ہے۔ زمین پر کبھی نہیں اترتا اور جب اس کی موت آتی ہے تو آگ میں جل کر بھسم ہو کر دوبارہ جنم لے لیتا ہے۔

مسلمان صوفیوں کے ہاں بھی ہُما کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت فرید الدین عطارؒ کی شاندار تصنیف ’’پرندوں کی مجلس شوریٰ‘‘ میں اس پرندے کا ذکر ہے۔

ترکی شاعری اور سندھ کے لٹریچر میں بھی ہُما کا ذکر موجود ہے۔ خضر نامہ میں سکھوں کے گرو گوبند سنگھ نے اپنے ایک خط میں اورنگزیب کو ہُما کا خطاب دیا تھا۔ مشہور رائٹر J.L.Bogras نے اپنی کتاب The Alph میں اس پرندے کا ذکر کیا ہے۔

جاریتا

ہندوؤں کی ایک روایتی مادہ پرندہ بھارت میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ روایت کے مطابق جاریتا بہت خوب صورت تھا۔ جب پرواز کرتا تو لوگ اسے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ ایک مہاتما تھے ان کا دل اس پرندے پر آ گیا۔ انہوں نے فوراً ایک نر جاریتا کا روپ اختیار کر کے بے چاری جاریتا کو پھانس کر اس سے شادی کر لی جس سے چار بچے بھی پیدا ہوئے۔ جن کے نام روایت میں کچھ یوں ہیں۔ ’’چاری تاری، ساریں، ریکتا، ڈرونا وغیرہ۔ بچوں کی پیدائش کے بعد مہاتما نے بے چاری جاریتا کو چھوڑ دیا اور دوبارہ انسان بن گئے۔ اب وہ جاریتا ان کے بچوں کو لے کر انہیں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔

ہامارو ایت کے مطابق ان مہاتما کا نام ’’منڈا پالا‘‘ تھا۔ اب آپ فوراً ہی اندازہ لگالیں کہ بعض کلچر میں کیسی کیسی بے سروپا کہانیاں ہوا کرتی ہیں۔

بجلی کا پرندہ

افریقی قبائل اس پرندے کے وجود پر یقین رکھتے

ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق یہ بہت خطرناک پرندہ ہے۔ یہی پرندہ بجلی چمکاتا اور بادلوں میں گرج پیدا کر کے بارش برساتا ہے۔ اس کا ایک اور روپ بھی ہے۔ یہ کبھی کبھی عورت کے بھیس میں آ کر کسی مرد کا خون بھی چوس لیتا ہے۔

بارش کا پرندہ

(Rain Bird)

امریکی قبائل کا پرندہ۔ یہ پرندہ بارش اور خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

مور

مشہور پرندہ جس کے پروں کی خوب صورتی اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ پاکستان میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کا رقص مشہور ہے۔ ہندوؤں کے یہاں اس پرندے کو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ بے شمار مذہبی کتابوں میں اس پرندے کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مور کی تخلیق وشنو کے بدن سے ہوئی تھی اور کرشن مہاراج اسی لیے پروں کا تاج پہن کر رقص کیا کرتے تھے۔

عشق کا پرندہ

یہ بہت خوب صورت روایتی پرندہ ہے۔ روایت ہے کہ یہ پرندہ روزانہ ایک عورت کے گھر آیا کرتا تھا۔ عورت بہت خوب صورت تھی۔ پرندہ اس کو دیکھا کرتا اس کے گرد چکر لگاتا رہتا۔ یہ سب دیکھ کر عورت کا شوہر اس پرندے کو ختم کرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اس نے پرندے کو پکڑنے کے لیے جال لگایا۔ پرندہ اس میں الجھ کر زخمی ہو گیا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح فرار ہو گیا۔

عورت کو بہت دکھ ہوا۔ وہ بھی اس پرندے کے پیچھے دوڑ پڑی۔ ایک جنگل میں وہ پرندہ زخمی حالت میں مل گیا۔ عورت نے اس کی بہت خدمت کی۔ وہ پرندہ دراصل ایک شہزادہ تھا جس کو کسی ظالم جادوگر نے پرندہ بنا دیا تھا۔ عورت نے اپنے شوہر کو چھوڑ کر اس پرندہ شہزادے سے شادی کر لی۔

Phonix

اس کو فارسی میں ققنس کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک روایتی پرندہ ہے جو اپنی لگائی ہوئی آگ میں جل کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اس کا تصور ایران اور عرب کے علاوہ ہندوستان میں بھی ہے۔

ان کے علاوہ اگر چمگادڑ کو بھی پرندہ سمجھ لیں تو اس سے بھی کئی کہانیاں وابستہ ہیں۔ جیسے وہ خون چوس جاتی ہے۔ ویمپائر قسم کی کئی فلمیں اس موضوع پر بن چکی ہیں۔

Sea gull

سی گل..... یہ پرندہ ساحلوں کے آس پاس رہتا ہے اور بھٹکے ہوئے ملاح اس کو دیکھ کر ساحل نزدیک کے ہونے کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

اور اب ایک ایسا پرندہ جو ایک طرف تو عقل مندی اور دانش کی علامت ہے تو دوسری طرف بے وقوفی کی علامت ہے۔ ایک جانب تو اسے منحوس سمجھا جاتا ہے اور دوسری جانب بے انتہا مقدس بھی ہے اور وہ پرندہ ہے الو۔

آئیں دیکھتے ہیں کہ مختلف ممالک اور تہذیب میں اس پرندے کی کیا اہمیت ہے۔

ایوی سینیا

یہاں یہ پرندہ بہت مقدس تسلیم کیا جاتا ہے۔

افغانستان کی روایت کے مطابق الو کے پاس پہلے

پر نہیں ہوتے تھے لیکن اسے آگ جلانے کا ہنر آتا تھا۔ اُلو نے انسان کو آگ جلانے کا طریقہ بتا دیا۔ اس کے عوض انسان نے اس کو پر دے دیے۔

افریقا کا ایک قبیلہ ہے بنتو۔ یہ لوگ اُلو کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔

افریقا ہی کی ایک روایت ہے کہ کوئی بچہ اگر اُلو کو دیکھ لے تو اسی وقت بیمار پڑ جاتا ہے اور افریقا ہی میں اُلو کو چڑیلوں اور جادوگروں کا پیغامبر سمجھا جاتا ہے۔

الجیریا والوں کا ماننا ہے کہ اگر کسی عورت سے اس کے راز اگلوانے ہوں تو جس وقت وہ سو رہی ہو اس کے ہاتھ پر اُلو کی آنکھ رکھ دو وہ سب کچھ بتا دے گی۔

عرب والوں کا کہنا ہے کہ جب کسی کا قتل ہوتا ہے تو اُلو اس کی قبر پر اس وقت تک روتا رہتا ہے جب تک اس کا انتقام نہ لے لیا جائے۔

آسٹریلیا کی روایت ہے کہ مرنے والی عورت کی روح چمگادڑ میں اور مرد کی روح اُلو میں چلی جاتی ہے۔

بہت سی قدیم تہذیبیں اُلو کو بہت مقدس سمجھا کرتی تھیں۔

بیلجیئم میں اُلو کے حوالے سے ایک کہانی دہرائی جاتی ہے کہ اُلو پہلے بے ٹھکانا ہوتے تھے۔ انہوں نے ایک پادری سے درخواست کی کہ انہیں گرجا میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ پادری نے اس شرط پر اجازت دے دی کہ اُلو چوہوں کا صفایا کر دیں گے۔

برما والے کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں پرندوں کے درمیان ایک بہت زبردست جنگ ہوئی تھی اس جنگ میں اُلو منہ کے بل گر پڑا تھا۔ اس لیے اس کا چہرہ چپٹا ہو گیا۔

چین میں اُلو کو توانائی اور دانش مندی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

فرانس والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی حاملہ عورت کسی اُلو کی آواز سن لے تو اس کے یہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے برعکس جرمن میں یہ خیال ہے کہ اگر بچے کی پیدائش کے وقت ہونے والی ماں کے کانوں میں اگر اُلو کی آواز چلی جائے تو وہ بچہ زندگی بھر پریشان رہتا ہے۔

ہندوستان میں تو اُلوؤں کے حوالے سے طرح طرح کی روایات ہیں۔

اُلو کا گوشت، اُلو کا خون، اُلو کے پنجے سب کے سب جادو میں کام آتے ہیں (یعنی سفلی عمل میں) ہمارے یہاں بھی اس قسم کی روایات چل پڑی ہیں۔

بابا قسم کے حضرات اُلو کے خون اور گوشت سے عملیات کیا کرتے ہیں۔ کراچی میں ایسی دکانیں ہیں جہاں اُلو کا گوشت اور خون وغیرہ ملتا ہے۔

ہندوستان میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی اُلو کا گوشت کھا لے تو وہ اندھیرے میں بھی دیکھنے لگتا ہے۔

انڈونیشیا میں اُلو عقل اور دانش کی علامت ہے۔ (یعنی ہمارے یہاں اگر کسی کو بے وقوف کہنا ہو تو اسے اُلو کہہ دیا جاتا ہے۔ جب کہ انڈونیشیا میں کسی کو عقل مندی کی مثال دینی ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ کسی اُلو کی طرح عقل مند ہے)۔

اسلام میں اس کا گوشت کھانا ممنوع ہے۔

ہمارے یہاں اسے نحوست کی علامت کے طور پر لیتے ہیں۔

ہر شاخ پر اُلو بیٹھا ہے
انجام گلستاں کیا ہو گا

(جب کہ ہمارے مذہب میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے کہ کوئی پرندہ منحوس ہو سب قدرت کے تخلیق کردہ ہیں)

آئرلینڈ میں کہا جاتا ہے کہ اگر گھر میں اُلو داخل ہو جائے تو فوراً مار دو۔ ورنہ وہ اپنے ساتھ گھر کی خوش قسمتی بھی لے جائے گا۔

دیکھ لیں پرندوں کے حوالے سے کیسی کیسی روایات اور کہانیاں پائی جاتی ہیں۔

کبوتروں کو دیکھ لیں۔ ہمارے یہاں ان کی کیسی قدر کی جاتی ہے۔ اس بے ضرر سے پرندے کو پرندوں کا موتی کہا جاتا ہے بلکہ بہت سے علاقوں میں تو کبوتروں کو سید صاحب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

اس قسم کی بے شمار روایات اور توہمات پرندوں سے منسوب ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پرندے قدرت کا انمول شاہکار ہیں۔ زمین کی خوب صورتی ہیں سجاوٹ ہیں۔ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔

جولائی

سلیم الحق فاروقی

عیسوی سن کے اہم واقعات میں سے بہت سے واقعات ہر مہینے کے خاص تہوار وغیرہ وغیرہ پر 2014ء میں آپ نے پڑھا، 2015ء میں عیسوی سن کے انہی مہینوں کی اہم شخصیات و واقعات کو ایک نئے انداز سے ماہ بعد ماہ پیش کیا جارہا ہے۔ عیسوی سن کے مہینے جولائی جو تپتی دوپہروں، آگ برساتے آسمان کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ اس مہینے سے جڑی شخصیات پر ایک معلومات بھری تحریر، داستان دلپذیر۔

معلومات کے شائقین کی مدارات جولائی کے شذرات

محترمہ فاطمہ جناح

یوں تو سمجھا جاتا ہے کہ محاورات میں نظر آنے والے کردار ہوتے تو تجربات کا نچوڑ ہیں لیکن عمومی زندگی میں بہت کم ہی نظر آتے ہیں۔ کجا کہ دو محاورات کی دو عملی تصاویر کسی ایک ہی شخصیت میں نظر آجائیں۔ مثلاً ایک تو یہ کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ ہر عورت میں خواہ وہ ماں ہو، بہن ہو، بیوی ہو، بیٹی ہو یا اس کا کوئی بھی روپ ہو اس میں فطری طور پر ایک ممتا پوشیدہ ہوتی ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح ان چند غیر معمولی شخصیات میں سے ہیں جن میں یہ دونوں صفات بھرپور پائی جاتی تھیں۔ 30 جولائی 1893ء کو کراچی میں پیدا ہونے والی قائد اعظم کی یہ بہن ان سے تقریباً ساڑھے سترہ سال چھوٹی تھیں، شاید عمر کے اتنے فرق کی وجہ سے ہی وہ قائد اعظم کی بے حد چہیتی بھی تھیں۔

محترمہ فاطمہ جناح نے ابتدائی تعلیم باندرہ کے کانونٹ اسکول میں حاصل کی۔ پھر تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے انہوں نے تقریباً 20 سال کی عمر میں دانتوں کے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی اور 1923ء میں کلینک کھول کر باقاعدہ پریکٹس شروع کردی۔ لیکن جب 1929ء میں قائدِ اعظم کی اہلیہ رتی جناح کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنے بھائی کی قومی مصروفیات کے مدِنظر ان سے تعاون کی خاطر اپنی پریکٹس کو خیرآباد کہہ کر اپنے بھائی کے ساتھ رہ کر ہی گھریلو معاملات سنبھالنے کو ترجیح دی۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد جب قائدِ اعظم کا انتقال ہوا تو محترمہ فاطمہ جناح پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور وہ کافی مضمحل اور پژمردہ ہوگئیں لیکن ایسے حالات میں بھی اپنے قومی فرائض سے آنکھیں بند نہ کیں اور اپنی ذمہ داریاں

بھرپور انداز میں ادا کرتی رہیں۔ اسی وجہ سے جب 1949ء میں ان کے نام سے موسوم فاطمہ جناح میڈیکل کالج برائے خواتین لاہور کا افتتاح گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کیا تو وہ خواجہ صاحب کے ہمراہ اس موقع پر موجود تھیں۔ ان کو قائدِ اعظم کے بعد والے برسرِ اقتدار افراد کے طرزِ حکمرانی پر کافی تحفظات بھی تھے، اور وہ وقتاً فوقتاً مختلف انداز میں اس کا اظہار بھی کرتی رہتی تھیں۔

1958ء میں جب ایوب خان نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو محترمہ نے اس کو پسند نہیں کیا۔ اسی لیے جب 1964ء میں ایوب خان نے ملک میں انتخابات کا اعلان کیا تو وہ حزبِ اختلاف اور قوم کی واحد اُمید بن کر سامنے آئیں اور پھر انہوں نے ایوب خان کے مخالفین کی واحد متفقہ امیدوار کے طور پر انتخاب لڑنے کی ہامی بھری۔ ان کے اس فیصلے نے قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور پوری قوم ایک طرف اور ایوب خان ایک طرف تھے۔ لیکن جب 2 جنوری 1965ء کو ملک بھر میں بنیادی جمہوری نظام کے تحت انتخابات منعقد ہوئے تو اس انتخابی نظام کے طریقہ کار کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ایوب خان دوبارہ منتخب ہوگئے۔ محترمہ فاطمہ جناح کی اس شکست نے خود ان کو اور تمام دردمند دل والے افراد کو اداس کر دیا۔

قائدِ اعظم پر ان کی کتاب ''میرا بھائی'' (My Brother) ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا 9 جولائی 1967ء کو کراچی میں انتقال ہوا اور وہ قائدِ اعظم کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔ ان کی وفات کے بعد کافی عرصے تک حکومت پاکستان نے انہیں وہ اہمیت نہیں دی جس کی وہ حقدار تھیں لیکن پھر 2003ء میں اس وقت کے وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے، جو محترمہ فاطمہ جناح سے کافی عقیدت رکھتے ہیں، اُن کو اہمیت دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے 2003ء کو محترمہ فاطمہ جناح کا سال قرار دیا اور اس سال قوم کو محترمہ فاطمہ جناح کے بارے میں بھرپور آگہی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔

میجر طفیل شہید

پاکستان کی عسکری شجاعت کی تاریخ میں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز حاصل کرنے والے دوسرے جری فرد میجر طفیل شہید ہیں۔ وہ 22 جولائی 1914ء کو مشرقی پنجاب کے شہر ہوشیار پور میں پیدا ہوئے اور 1943ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ جب 1947ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو وہ میجر کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ اس وقت وہ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ پاکستان منتقل ہوگئے اور پاک فوج میں اپنی خدمات شروع کر دیں۔

جون 1958ء میں ان کو مشرقی پاکستان کے علاقے لکشمی پور میں ایسٹ پاکستان رائفلز میں متعین کر دیا گیا۔ اس علاقے میں بھارتی اسمگلرز کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ فوجی کمان کی جانب سے میجر طفیل شہید کو ہدایت کی گئی کہ اسمگلرز کی ان سرگرمیوں کی بھرپور بیخ کنی کی جائے۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی خاطر فوری طور پر منصوبہ تیار کیا اور اپنے سینیئرز سے مشورے کے بعد اس پر عمل کرنے کا پروگرام بنایا اور اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کی خاطر 7 اگست 1958ء کو دشمن پر حملے کا آغاز کیا۔ یہ حملہ خاموشی سے دشمن کے سر پر پہنچ کر صرف پندرہ گز کے فاصلے سے کیا گیا تھا۔ اس موقع پر وہ خود حملہ کرنے والی پارٹی میں سب سے آگے موجود تھے۔ ان کے حملے کے بعد جب دشمن نے جوابی فائرنگ کی تو وہ گولیوں کی ابتدائی بوچھاڑ کی زد میں آکر زخمی ہوگئے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور ایک دستی بم پھینک کر دشمن کی آگ اگلتی مشین گن کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

حالانکہ اس حملے کے کمانڈر میجر طفیل شدید زخمی ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود لڑائی اتنی سخت تھی کہ نوبت دست بدست جنگ تک جا پہنچی جس میں دشمن کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اور وہ لاشوں کے علاوہ اپنے سپاہی بطور جنگی قیدی بھی چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہوگیا۔ پھر اسی رات میجر طفیل نے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ صدر پاکستان نے ان کی جرأت و بہادری کے اعتراف کے طور پر

5 نومبر 1959ء کو انہیں بہادری کا سب سے بڑا عسکری اعزاز ''نشانِ حیدر'' عطا کیا۔

کیپٹن سرور شہید

پاکستان کی عسکری شجاعت کی تاریخ میں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز ''نشانِ حیدر'' حاصل کرنے والے سب سے پہلے جری فرد کیپٹن سرور شہید ہیں۔ ان کی داستانِ حیات کچھ یوں ہے کہ 10 نومبر 1910ء کو موضع سنگھوری، ضلع گوجر خان میں پیدا ہونے والے راجا سرور نے 1927ء میں فیصل آباد سے میٹرک پاس کیا۔ 1929ء میں پاک فوج میں بطور سپاہی شمولیت اختیار کی۔ اس دوران محنت کرتے رہے اور مختلف امتحانات پاس کرتے ہوئے 1944ء میں سیکنڈ لیفٹیننٹ اور پھر 1945ء میں کیپٹن کے عہدے تک پہنچے۔ اس کے بعد برما کے محاذ پر اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر ان کو تمغے سے بھی نوازا گیا۔ پھر وہ قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان چلے آئے اور یہاں بھی فوج میں اپنی خدمات جاری رکھیں۔

پاک فوج نے ان کو کشمیر میں اُڑی کے محاذ پر روانہ کر دیا۔ اس وقت اُڑی کے محاذ پر صورتِ حال کچھ اس طرح کی تھی کہ دشمن نے ایک اونچے پہاڑی مقام پر اپنا مورچہ قائم کر رکھا تھا جس کی وجہ سے پاک فوج کو نقل و حرکت میں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بالآخر اعلیٰ فوجی کمان نے فیصلہ کیا کہ دشمن سے اس مورچے کو خالی کروایا جائے۔ اس فیصلے پر عملدرآمد کے لیے جو دستہ تشکیل دیا گیا اس کی کمان کیپٹن راجا سرور شہید کو سونپ دی گئی۔

27 جولائی 1948ء کو کیپٹن سرور شہید کی بٹالین نے کارروائی کا آغاز کیا۔ اگرچہ ان کا دستہ جغرافیائی طور پر کمزور پوزیشن میں تھا مگر جذبہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ حملہ شروع ہوا اور گھمسان کا رن پڑا، دشمن نے کافی دیر تک مزاحمت کی۔ کیپٹن سرور شہید دشمن کی گولیوں سے زخمی ہونے کے باوجود اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کی چوکی کی طرف بڑھتے رہے یہاں تک کہ دشمن سے صرف 20 فٹ کی دوری پر انہوں نے آخری ہلہ بولا، اس موقع پر دشمن کی ایک گولی ان کے سینے پر سیدھی دل کے مقام پر پیوست ہو گئی، جواں کی دلی آرزو یعنی شہادت کا پیغام بن گئی۔

ان کی شجاعت و بہادری کے اعتراف میں انہیں 27 اکتوبر 1959ء کو بہادری کا اعلیٰ ترین اعزاز نشانِ حیدر عطا کیا گیا۔

کیپٹن کرنل شیر خان

یکم جنوری 1970ء کو صوابی کے نواحی گاؤں ''نوا کلی'' میں پیدا ہونے والا بچہ اپنے دادا کا لاڈلا تھا۔ اس کے دادا ایک سابق فوجی سپاہی تھے اور دوسری جنگِ عظیم میں حصہ لے چکے تھے۔ اپنی فوجی خدمات کے دوران دادا اپنے ایک افسر کرنل شیر خان کی بہادری اور دلیری سے بہت متاثر تھے۔ اُسی بہادر فوجی افسر کے نام پر دادا نے اپنے پوتے کا نام بھی کرنل شیر خان رکھ دیا۔ یوں فوج اس بچے کی گھٹی میں پڑ گئی۔

1987ء میں کرنل شیر خان نے پاک فضائیہ میں بطور ائرمین شمولیت اختیار کی لیکن ساتھ ہی محنت اور تعلیم پر بھرپور توجہ دیتے ہوئے 1992ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول تک رسائی حاصل کر لی اور 1994ء میں یہاں سے گریجویشن کے بعد بری فوج میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہوئے اور پھر جلد ہی کیپٹن کے عہدے پر فائز ہوئے۔
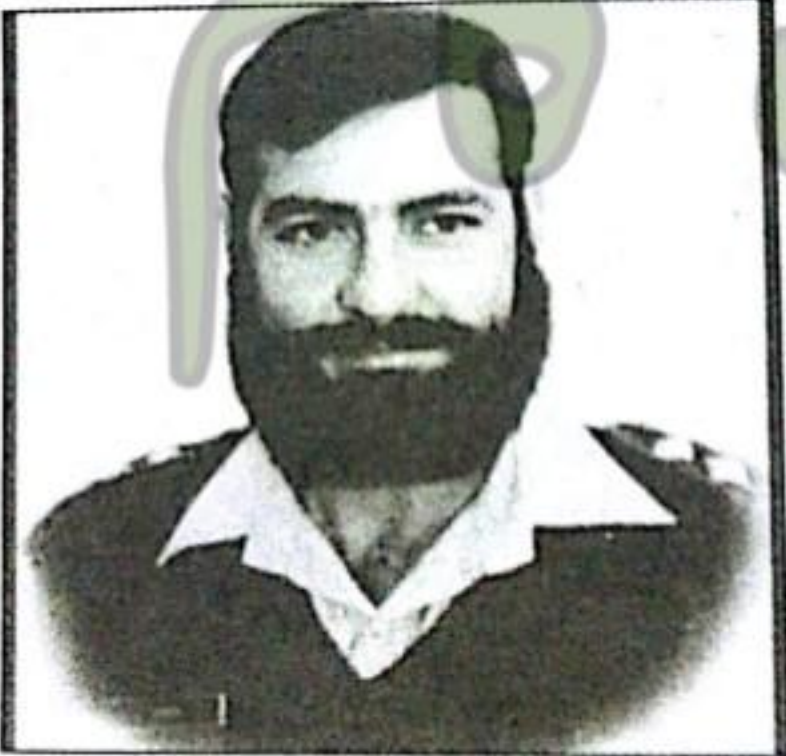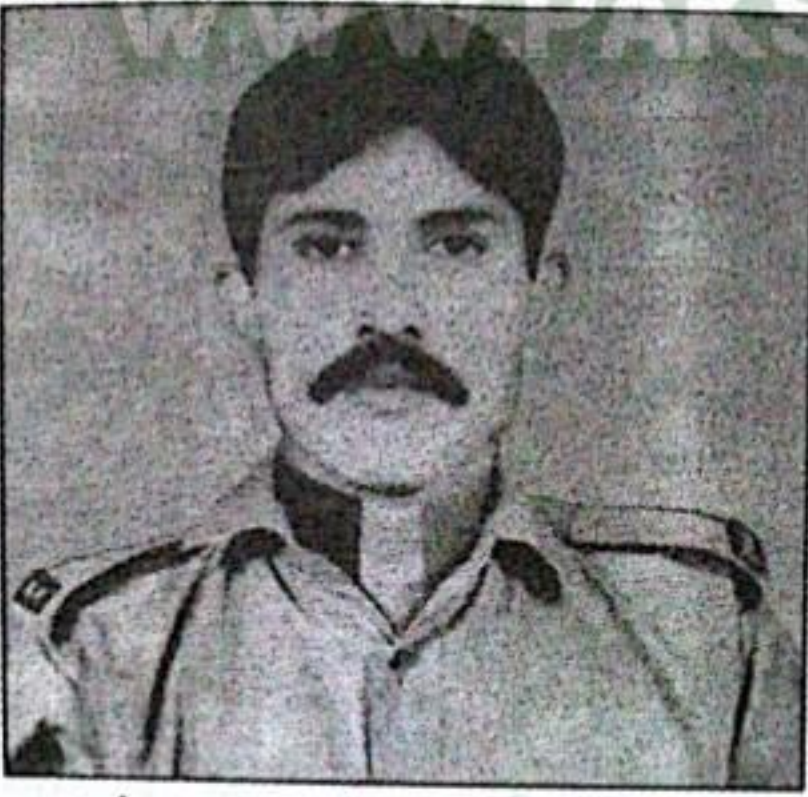
1999ء میں جبکہ ان کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں پاک فوج کی طرف سے ان کو کارگل کے دفاع کے لیے منتخب کیا گیا۔ 28 جون 1999ء کو دشمن نے دراس سیکٹر میں بھرپور حملہ کیا تو کیپٹن کرنل شیر خان اپنے کمانڈر میجر عاصم کے ہمراہ دفاعِ وطن پر کمربستہ ہوگئے۔ وہ 5 جولائی 1999ء کو اپنے محض 24 ساتھیوں کے ہمراہ جنگ کرتے ہوئے دشمن کے علاقے میں گھس گئے اور اتنی بہادری سے لڑے کہ خود تو جام شہادت نوش کیا ہی لیکن دشمن کے 300 سے زائد فوجیوں کو ملکِ عدم روانہ کردینے میں کامیاب رہے، جبکہ دوسری طرف پاک فوج کے صرف 9 فوجی شہید ہوئے۔ اسی معرکے کے دوران آپ لاپتا ہوگئے اور 7 جولائی کو دشمن کی طرف سے ان کی بے مثال بہادری کی تعریف کے ساتھ ان کا جسدِ خاکی پاک فوج کے حوالے کردیا گیا۔ یوں 7 جولائی 1999ء آپ کا یومِ شہادت قرار پایا۔

ان کو ان کی بہادری کے اعتراف کے طور پر 13 اگست 1999ء کو شجاعت و بہادری کے سب سے بڑے عسکری ایوارڈ ''نشانِ حیدر'' سے نوازا گیا۔

حوالدار لالک جان

معرکہ کارگل کی پاکستانی تاریخ میں یوں تو بہت اہمیت ہے لیکن اس کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس معرکے میں دو فوجی اہلکاروں کو بہادری کے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز ''نشانِ حیدر'' سے نوازا گیا۔ ان میں سے ایک تو کیپٹن کرنل شیر خان تھے اور دوسرے ہیرو ناردرن لائٹ انفنٹری کے حوالدار لالک جان تھے۔ اسی معرکہ کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ حوالدار لالک جان کی وجہ سے ہی ناردرن لائٹ انفنٹری کو بھی اب تک کا واحد نشانِ حیدر ملا ہے۔

وہ 15 فروری 1968ء کو شمالی علاقہ جات کے قصبے ہندور میں پیدا ہوئے۔ وہ میٹرک کرتے ہی پاک فوج سے منسلک ہوگئے۔ جون 1999ء میں جب معرکہ کارگل اپنے عروج پر تھا تو پاکستان نے ٹائیگر ہلز نامی چوٹی پر قبضہ کرلیا اور دشمن اس کو چھڑوانے کی بھرپور کوشش کررہا تھا، اس موقع پر حوالدار لالک جان یہاں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اُس چوٹی کی پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ اگر دشمن اس پر دوبارہ قابض ہوجاتا تو اس کی شکست فتح میں بدل جانے کے قوی امکانات تھے۔ یکم جولائی 1999ء کو دشمن کی ایک پوری بٹالین نے اس وقت یہاں حملہ کیا جب یہاں حوالدار لالک جان اپنے صرف 11 ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھے۔ انہوں نے پوری بہادری سے دشمن کا حملہ روکے رکھا۔ حتیٰ کہ 6 جولائی کو دشمن کی 18 بٹالین نے پھر ایک بھرپور حملہ کیا اور ناردرن لائٹ انفنٹری کے اِن ہی 11 جوانوں نے پھر دشمن کی راہ روکی۔ یہاں تک کہ ان 11 میں سے 7 جوان شہید ہوگئے اور حوالدار لالک جان شدید زخمی ہونے کے باوجود اپنے صرف 4 ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کی راہ میں چٹان کی طرح ڈٹے رہے، حتیٰ کہ پاک فوج کی کمک آن پہنچی، اس کے باجود حوالدار لالک جان پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے، یہاں تک کہ دشمن کی فوج کا مکمل صفایا ہوگیا اور پھر اسی معرکے کے دوران 7 جولائی کو حوالدار لالک جان لاپتا ہوگئے۔

حوالدار لالک جان کی اس بہادری کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے 13 اگست 1999ء کو ان کو جرأت و بہادری کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز ''نشانِ حیدر'' عطا کیا۔ ان کو نشانِ حیدر عطا کرنے کے اعلان کے بھی تقریباً ایک ماہ بعد 15 ستمبر 1999ء کو گولیوں سے چھلنی ان کا جسدِ خاکی جنگی علاقے سے ملا جس کو پورے اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔

ابنِ صفی

اردو ادب میں جاسوسی ناول نگاری کی ابتداء کا سہرا اگر ابنِ صفی کے سر باندھا جائے تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ انہوں نے اپنا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' 1952ء میں الٰہ آباد سے شائع کیا اور اس کے فوراً بعد اگست 1952ء میں وہ

پاکستان آ گئے۔ پاکستان آ کر انہوں نے عمران سیریز کے ناولوں کی ابتداء کی اور اس سلسلے کا پہلا ناول اکتوبر 1955ء میں کراچی سے اور دسمبر 1955ء میں الہٰ آباد سے شائع کیا۔ عمران سیریز کے سلسلے میں انہوں نے 120 ناول تحریر کیے اور اس سلسلے کا آخری ناول 11 اکتوبر 1980ء کو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ 1960ء سے 1963ء کے دوران ناسازیٔ طبع کی باعث وہ کوئی ناول تحریر نہ کر سکے اور اس دوران جاسوسی ناولوں کا ایک سیلاب سا امڈ آیا۔ لیکن جب انہوں نے صحت یابی کے بعد 1963ء میں اپنا ناول ''ڈیڑھ متوالے'' شائع کیا تو عوام نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا ناشر کو ایک ہی ہفتے میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کرنا پڑا جو اردو ادب کی کتابوں میں ایک ریکارڈ بھی ہے۔
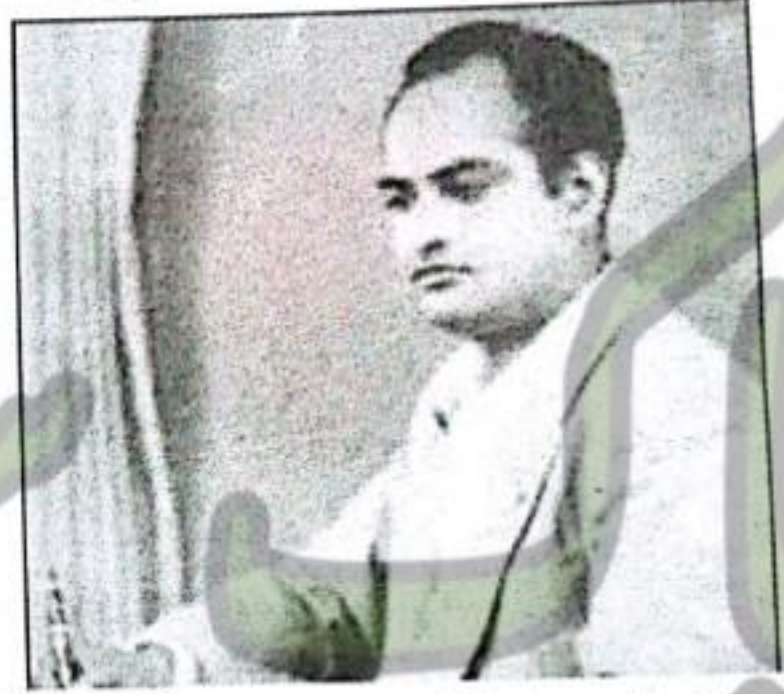
ابنِ صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا، وہ اسرار ناروی تخلص کرتے تھے۔ 1948ء میں انہوں نے ''طغرل فرغان'' کے قلمی نام سے مزاحیہ مضامین بھی لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔

ابن صفی 26 جولائی 1980ء کو کراچی میں وفات پا گئے۔ ان کی تاریخ پیدائش کا معاملہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اکثر مقامات اور خصوصاً ان کے لوحِ مزار پر ان کی تاریخِ پیدائش بھی 1928ء ہی کی 26 جولائی تحریر ہے۔ گویا ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات ایک ہی ہے لیکن یہ تاریخ کسی غلط فہمی...کا نتیجہ ہے۔ اُن کا لوحِ مزار کس نے تحریر کروایا؟ اس کا علم کسی کو نہیں، حتیٰ کہ ان کے فرزند احمد صفی صاحب بھی لاعلم ہیں۔ جبکہ ابنِ صفی پر تحقیق کے معاملے میں صحیح معنوں میں اتھارٹی جناب راشد اشرف اور مشہور محقق جناب عقیل عباس جعفری صاحب بھی 26 جولائی کی تاریخ تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں کیونکہ اس سلسلے میں خود ابنِ صفی کی ایک تحریر ملتی ہے ''یہ اپریل 1928ء کی بات ہے جمعۃ المبارک کے دن شام کے جھٹپٹے کا وقت تھا جب میں نے پہلی بار اپنے رونے کی آواز سنی'' اس جملے سے کوئی تاریخ تو واضح نہیں ہوتی کیونکہ 1926ء میں پانچ جمعے تھے، وہ ان میں سے کس تاریخ کو پیدا ہوئے ہوں گے؟ لیکن ان سے 26 جولائی کی تاریخ کی نفی بھی ہو جاتی ہے۔ انٹرنیٹ پر موجود ان کے شناختی کارڈ کا عکس بھی صرف اسی حصے کا ہے جس پر ان کی تصویر تو ہے مگر دیگر کوائف والا حصہ بھی موجود نہیں ہے، اور احمد صفی صاحب کے مطابق اب وہ اصل شناختی کارڈ بھی کہیں گم ہو چکا ہے۔

سید اقبال عظیم

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ
جبیں افسردہ افسردہ، قدم لغزیدہ لغزیدہ
چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانبِ طیبہ
نظر شرمندہ شرمندہ، بدن لرزیدہ لرزیدہ
بصارت کھو گئی لیکن بصیرت تو سلامت ہے
مدینہ ہم نے دیکھا مگر نادیدہ نادیدہ

اس معرکۃ الآراء نعت کے خالق سید اقبال عظیم یوپی کے مردم خیز خطے میرٹھ میں 8 جولائی 1913ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویشن اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ان کے دادا سید فضل عظیم فضل، نانا ادیب میرٹھی اور والد سید مقبول عظیم عرش اپنے عہد کے معروف شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے شاعری میں وصی لکھنوی اور وحشت کلکتوی سے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ کے بڑے بھائی سید وقار عظیم بھی معروف ماہرِ تعلیم اور نقاد

تھے، گویا ہمہ خانہ آفتاب ہست والا معاملہ تھا۔
انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد ڈھاکا میں قیام کیا جہاں وہ متعدد کالجوں کے علاوہ ڈھاکا یونیورسٹی سے بھی متعلق رہے۔ اس دوران انہوں نے متعدد تحقیقی کتب بھی تالیف کیں جن میں ''بنگال میں اردو، سات ستارے اور مشرق'' سرِ فہرست ہیں۔ ان کی شاعری کے مجموعوں میں مضراب، لب کشا، تابِ قوسین، ماحصل، نادیدہ اور چراغِ آخرِ شب'' شامل ہیں۔
عمر کے آخری حصے میں ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور اسی دوران ان کی کہی ہوئی مذکورہ بالا نعت روح کی گہرائیوں سے نکلی۔ ان کی ایک اور معرکۃ الآراء غزل کے دو اشعار بھی ملاحظہ کیجیے

دیوار کا یہ عذر سنا جائے گا کب تک
دیوار اگر ہے تو گرا کیوں نہیں دیتے
چہروں پہ جو ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں نقابیں
ان لوگوں کو محفل سے اٹھا کیوں نہیں دیتے

دلاور فگار

کیا دیکھوگے حالِ دلِ برباد کہ تم نے
کرفیو میں میرے شہر کا منظر نہیں دیکھا
جاں دینے کو پہنچے تھے کبھی تیری گلی میں
بھاگے تو کسی نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا

غزل کا یہ اچھوتا اور ظریفانہ انداز سوائے دلاور فگارِ کے اور کس کا ہو سکتا ہے؟ وہ بنیادی طور پر تو سنجیدہ غزل کے شاعر تھے اور اس سلسلے میں ان کا ایک مجموعہ کلام ''حادثے''
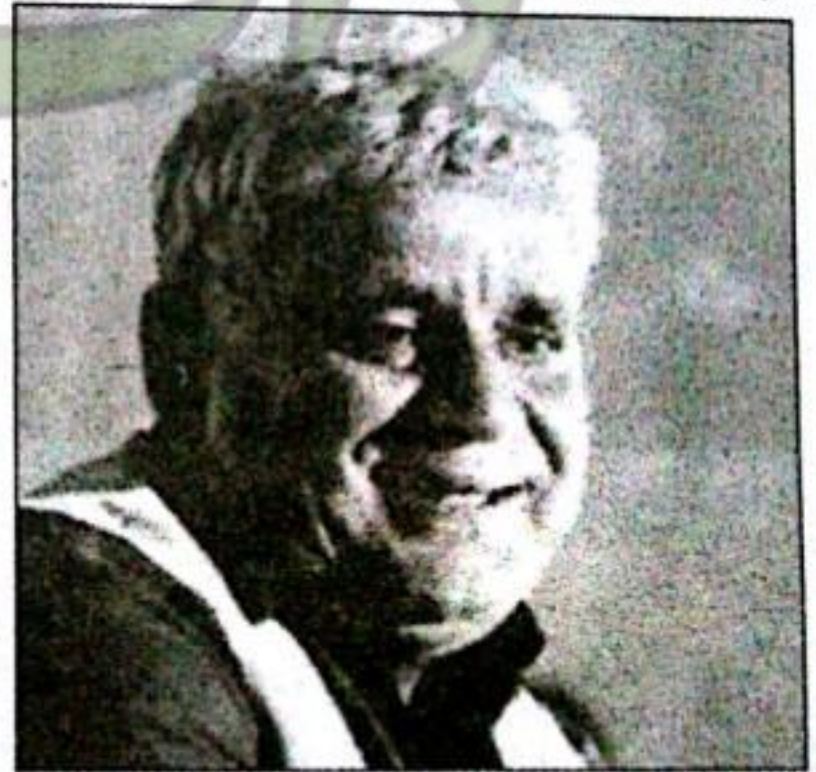
کے عنوان سے شائع بھی ہوا۔ لیکن ان کو اصل شہرت مزاحیہ شاعری میں ملی۔ ان کا مزاحیہ شاعری کی طرف آنے کا واقعہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ وہ خود تو سنجیدہ غزل کہتے تھے لیکن اپنے ایک دوست کو مزاحیہ نظمیں لکھ کر دیتے تھے اور وہ دوست اس کو مشاعروں میں سنا کر خوب داد سمیٹتے۔ جب دلاور فگار کے دیگر احباب کو اس حقیقت کا علم ہوا تو انہوں نے دلاور فگار پر زور دینا شروع کیا کہ وہ اپنی مزاحیہ نظمیں خود پڑھا کریں، یوں وہ مزاحیہ شاعری کی طرف آگئے۔
وہ 8 جولائی 1929ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے اور طویل عرصے تک ہندوستان میں ہی شاعری میں نام کمایا بعد میں 1968ء میں پاکستان آگئے اور یہاں ان کو بے انتہا پذیرائی ملی۔ ان کی مزاحیہ شاعری کے مجموعوں میں انگلیاں فگار اپنی، ستم ظریفیاں، آداب عرض، شامتِ اعمال، سنچری، خدا جھوٹ نہ بلوائے، چراغِ خنداں اور کہا سنا معاف کیجیے'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے سابق امریکی صدر جمی کارٹر کی کتاب کا ترجمہ ''خوب تر کہاں'' کے نام سے بھی کیا۔
وہ 21 جنوری 1998ء کو کراچی میں انتقال کر گئے اور یہیں آسودۂ خاک ہیں۔ معاشرے کی برائیوں پر طنز سے بھرپور ان کا یہ قطعہ آج بھی ضرب المثل کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے

حاکمِ رشوت ستاں فکرِ گرفتاری نہ کر
کر رہائی کی کوئی آساں صورت، چھوٹ جا
میں بتاؤں تجھ کو، تدبیرِ رہائی مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چھوٹ جا

قدرت اللہ شہاب

اردو ادب کے دلدادہ افراد میں سے کون ہوگا جس نے قدرت اللہ شہاب کا نام نہ سنا ہو اور ''شہاب نامہ'' نہ پڑھا ہو یا ان کی کتاب ''ماں جی'' کو دل پر محسوس نہ کیا ہو؟ ان کی دیگر کتب ''یا خدا، نفسانے اور سرخ فیتہ'' بھی کسی طور کم شاہکار نہیں ہیں۔ منفرد اندازِ تحریر والے انشاء پرداز اور ادیب قدرت اللہ شہاب 26 فروری 1917ء کو گلگت میں پیدا ہوئے، 1941ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی اور ادبیات میں ایم اے کرنے کے بعد انڈین سول سروس میں شامل ہوگئے۔
ابتدائی طور پر بنگال، بہار اور اڑیسہ میں خدمات انجام دیں بعد از قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو مستقلاً جائے سکونت بنایا اور یہاں مختلف انتظامی عہدوں پر خدمات سر انجام دیتے رہے جن میں سیکریٹری جنرل حکومتِ

آزاد کشمیر، ڈپٹی کمشنر جھنگ، ڈائریکٹر انڈسٹریز حکومتِ پنجاب، سیکریٹری وزارتِ اطلاعات، گورنر جنرل اسکندر مرزا اور صدر ایوب خان کے پرائیویٹ سیکریٹری، سیکریٹری تعلیم اور ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر کی خدمات انجام دیں۔

صدر ایوب کے دور میں وہ سرکاری عہدوں سے مستعفی ہو کر اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو چلے گئے اور مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیلی کارروائیوں کا جائزہ لینے کے لیے ان علاقوں کا خفیہ دورہ بھی کیا۔ ان ہی کی سفارشات پر مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل کی خواہش کے برعکس طالب علموں کے لیے یونیسکو کا مرتب کردہ نصاب نافذ ہوا جو مسلم دنیا کے لیے ان کی ایک اہم خدمت ہے۔

چونکہ وہ خود بھی ایک اچھے ادیب تھے اسی لیے ادب اور ادیبوں سے قربت بھی رکھتے تھے۔ اسی قربت اور اپنی سرکاری حیثیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے سرکاری سرپرستی میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام کا ڈول ڈالا جس سے پاکستان میں ادب اور ادیبوں کی سرکاری سرپرستی اور اعتراف کی ابتداء ہوئی اور یوں مختلف اوقات میں متعدد ادیبوں اور ان کی تخلیقات کو سرکاری انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

وہ 24 جولائی 1986ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے اور وہیں آسودۂ خاک ہیں۔

ذوالفقار علی بخاری

پاکستان میں اگر کسی کو بابائے براڈ کاسٹنگ کہا جاسکتا ہے، صداکاری کا بادشاہ مانا جاسکتا ہے، اداکاری اور ہدایت کاری کا چیمپئن مانا ہو تو بلاشبہ ذوالفقار علی بخاری کے علاوہ دوسرا کوئی نام ذہن میں آ ہی نہیں سکتا ہے۔

وہ 1904ء میں پشاور میں پیدا ہوئے، ان کے والد اسد اللہ شاہ بخاری ایک صاحبِ دیوان نعت گو شاعر تھے، گھر میں ان کو اپنے والد کے علاوہ بڑے بھائی احمد شاہ بخاری پطرس کی علمی صحبت ملی، پھر حسرت موہانی، علامہ اقبالؒ، یاس یگانہ چنگیزی، نواب سائل دہلوی اور وحشت کلکتوی جیسے نامور اساتذہ کی شعری و ادبی صحبت میسر رہی۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ان میں بھی ادبی ذوق کوٹ کوٹ کے نہ بھرا ہو۔

ان کو بچپن سے ہی اسٹیج ڈراموں میں کام کرنے کا شوق تھا چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ شملہ میں امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' میں شہزادہ سلیم کا کردار بھی ادا کیا اور وہ خود ہی اس ڈرامے کے ہدایتکار بھی تھے۔ جب 1936ء میں آل انڈیا ریڈیو قائم ہوا تو یہ اس سے ایسا منسلک ہوئے کہ ریڈیو اور ذوالفقار علی بخاری ایک ہی ادارے کے دو نام بن کر رہ گئے۔ انہوں نے 1940ء میں بی بی سی لندن سے اردو نشریات کا آغاز کیا اور پھر واپس ہندوستان میں آکر کلکتہ اور بمبئی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ جب 1967ء میں کراچی میں ٹی وی اسٹیشن قائم ہوا تو یہ اس کے پہلے جنرل مینیجر مقرر ہوئے۔

وہ بمبئی ریڈیو میں بمبئے خان اور ریڈیو پاکستان میں جمعہ خان بن کر صداکاری کے جوہر بھی دکھاتے رہے۔ مرثیہ خوانی اور شعر خوانی ... میں بھی ان کا اپنا ایک منفرد انداز تھا۔ وہ اردو، پشتو، پنجابی، بنگالی، برمی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت کی وجہ سے ماہر ہفت زبان بھی

کہلاتے تھے۔ انہوں نے مختلف راگوں اور راگنیوں پر ایک کتاب ''راگ دریا'' کے علاوہ اپنی آپ بیتی ''سرگذشت'' کے نام سے یادگار چھوڑی۔ وہ 12 جولائی 1975ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

علن فقیر

اگر کبھی راہ چلتے، کسی ریستوران میں کچھ کھاتے پیتے، یا گھر کے اندر ریڈیو، ٹی وی یا ٹیپ ریکارڈر سے کسی لوک فنکار کی آواز میں یہ الفاظ کان میں پڑیں

اتنے بڑے جیون ساگر میں

تونے ہمیں پاکستان دیا

ہواللہ، ہواللہ

تو یقیناً آپ کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس میں کھو سے جائیں گے۔ آپ اس آواز کو پہچاننے میں قطعی دیر نہیں لگائیں گے کیوں کہ سندھی لہجے کی یہ میٹھی آواز جس معروف فنکار کی ہوگی اس کا اصل نام تو علی بخش سندھی تھا لیکن زمانہ اس کو لوک گلوکار علن فقیر کے نام سے پہچانتا ہے۔

سندھی گائیکی کی صنف ''وائی'' میں مہارت رکھنے والے علن فقیر ضلع دادو کے قصبے مانجھن میں 1932ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ اپنے والد ''دھمالی فقیر''، جو خود بھی ایک عمدہ شہنائی نواز تھے، کی نگرانی میں لوک گیت اور صوفیانہ کلام گانے میں مہارت حاصل کی۔ علن فقیر ایک لمبے عرصے تک ریڈیو اور ٹی وی پر اپنے مخصوص انداز میں گا کر لوگوں کے دلوں میں راج کرتے رہے۔ ان کا ایک اور نغمہ جو انہوں نے محمد علی شہکی کی سنگت میں بھی گایا وہ بھی اکثر لوگ گنگناتے تھے، اور وہ تھا

اللہ ہی اللہ کر بھیا

اللہ ہی سے ڈر بھیا

ان کو حکومتِ پاکستان نے 1987ء میں تمغۂ حسنِ کارکردگی اور 1999ء میں پی ٹی وی نے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ عطا کیا۔ وہ 4 جولائی 2000ء کو تقریباً 68 سال کی عمر میں انتقال کر گئے اور جام شورو یونیورسٹی کالونی میں اپنی ہی رہائشگاہ کے احاطے میں مدفون ہیں۔

عالم لوہار

پنجابی زبان کی طرزِ گائیکی ''جگنی'' کے حوالے سے دنیا بھر میں مقبول گلوکار ''عالم لوہار'' یکم مارچ 1928ء کو ضلع گجرات کے موضع ''آچھ'' میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن میں خاصے خوش الحان بھی تھے جس کی وجہ سے ان کے والد ان کو قاری بنانا چاہتے تھے لیکن ان کا اپنا دل زیادہ تر لوک گلوکاری میں ہی لگتا تھا، اسی لیے وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک تھیٹریکل کمپنی سے وابستہ ہوگئے، اور کم عمری میں ہی مقبول ہوگئے۔ خاندانی طور پر لوہار ہوتے اور لوک گلوکاری کے شوق کی باعث ''چمٹا'' اور ''جگنی'' ان کی پہچان بن گئے تھے۔

صوفیانہ کلام کے علاوہ لوک گیت، ماہیے، بولیاں، نعتیہ کلام اور سیف الملوک کے علاوہ واجاں ماریاں، مرزا صاحباں، ہیر رانجھا، پرن بھگت اور شاہنامۂ کربلا سمیت لاتعداد گیتوں نے انہیں پاکستان ہی نہیں دنیا بھر میں مقبول کیے رکھا۔

سابق صدر پاکستان ایوب خان ان کے بہت بڑے مداح تھے اور اکثر ان کی گائیکی سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے عالم لوہار کو ''شیرِ پنجاب'' کا خطاب بھی دیا۔ صرف صدر پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی دیگر معروف

شخصیات بھی ان کے متوالوں میں شامل تھیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی ان کو خصوصی دعوت پر بھارت مدعو کیا اور وہاں ان کو اپنے فن کے مظاہرے کا موقع دے کر نہ صرف خود لطف اندوز ہوئے بلکہ ہزاروں بھارتی شہریوں کو بھی ان کی گلوکاری سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی دیا۔ ان کے علاوہ ملکۂ برطانیہ نے بھی اپنی تاج پوشی کی 25ویں سالگرہ کے موقع پر ان کو اپنے محل میں مدعو کر کے ان کے فن سے محظوظ ہوئیں۔ اس موقع پر عالم لوہار نے ملکہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک مخصوص گانا بھی گایا جس کے بول تھے:

ملکہ تیری سلور جوبلی گھر گھر مناندے نیں
گورے کالے مل کے سارے
گیت خوشی کے دے گاندے نیں

وہ 3 جولائی 1979ء کو مانگا منڈی کے پاس ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے اور ان کو ان کے آبائی قصبے میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنی ثقافتی میراث اپنے ہونہار بیٹے عارف لوہار کو بھی منتقل کی اور آج عارف لوہار اپنے آپ کو اپنے والد کا سچا جانشین ثابت کرتے ہوئے دنیا بھر کے ثقافتی میدان میں پاکستان کا نام روشن کر رہا ہے۔

محمد عالم چنا

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ نے 981ء میں پہلی مرتبہ یہ تسلیم کیا کہ دنیا کا سب سے طویل القامت شخص ایک پاکستانی ہے اور گنیز بک نے یہ بھی بتایا کہ اس کا قد 8 فٹ اور 2.5 انچ ہے، اور اس کا نام محمد عالم چنا ہے۔ لیکن پھر 1985ء میں گنیز بک نے ہی اعلان کیا کہ عالم چنا دنیا کے سب سے طویل القامت فرد نہیں ہیں کیونکہ ان کا اصل قد 8 فٹ اور 2.5 انچ نہیں بلکہ 7 فٹ اور 9.1 انچ ہے اور دنیا میں دو مزید افراد موزمبیق کے جبرائیل مونجانے اور لیبیا کے سلیمان علی نشنش ان کی نسبت زیادہ طویل قامت ہیں۔ ان دونوں افراد کے قد 8 فٹ اور 0.4 انچ ہے۔ یوں عالم چنا اپنا طویل القامتی کا یہ عالمی اعزاز کھو بیٹھے۔ اس کے بعد 1990ء میں ایک بار پھر عالم چنا کو یہ اعزاز دوبارہ مل گیا کیونکہ باقی دونوں افراد کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔
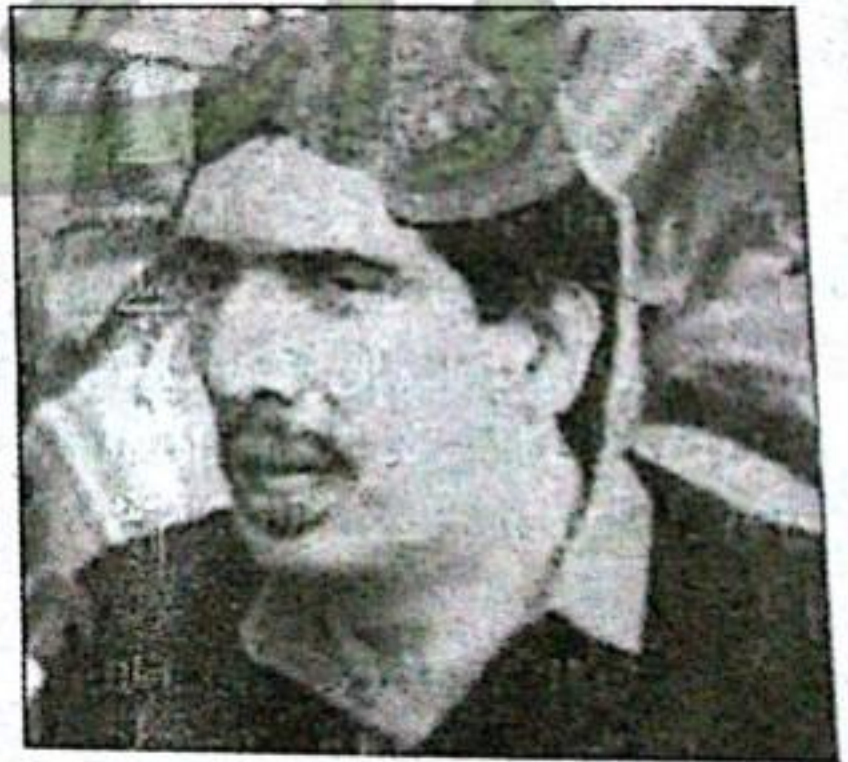
عالم چنا 1956ء میں سندھ کے تاریخی اور لعل شہباز قلندر کے شہر ”سیہون“ کے گاؤں ”بچل چنا“ میں پیدا ہوئے۔ وہ درگاہ لعل شہباز قلندر کے مجاور ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ حکومتِ پاکستان نے بھی عالم چنا کی سرپرستی کرنی شروع کر دی۔ ان کو پی ٹی وی میں ملازمت دینے کے علاوہ دنیا بھر میں ان کے ثقافتی دوروں کی بھی سرپرستی کی۔ یوں وہ دنیا بھر میں عملاً پاکستان کے ثقافتی سفیر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ انہوں نے دنیا بھر کے 100 سے زائد ممالک کا دورہ کیا۔ ان مواقع میں دنیا کے اکثر ممالک نے ان کو اپنے ملک کی شہریت دینے کی بھی پیشکش کی لیکن عالم چنا نے ملک سے محبت میں ان پیشکشوں کو قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ انہیں دنیا بھر سے 300 سے زائد ایوارڈز اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

1998ء میں گردوں کے عارضے کی باعث حکومت نے ان کو علاج کی غرض سے امریکا بھیجا لیکن مرض میں خرابی کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور 2 جولائی 1998ء کو نیویارک کے ایک اسپتال میں انتقال کر گئے۔ ان کی میت پاکستان لا کر لعل شہباز قلندر کے مزار کے احاطے میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

سر آغا خان سوم

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتداء میں مسلمان شدت کے ساتھ برطانوی حکومت اور اس کی کارروائیوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کر رہے تھے۔ اس دوران مختلف مسلمان رہنما مسلمانوں کو مناسب راستہ دکھا رہے تھے۔ ایسے میں 1907ء میں برصغیر کے چند معروف رہنماؤں کا ایک اجلاس ڈھاکا میں منعقد ہوا، اس اجلاس کی صدارت نواب آف ڈھاکا نواب سر سلیم اللہ خان نے کی۔ کافی غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد ان رہنماؤں نے برِ

صغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ اس جماعت کا نام ''آل انڈیا مسلم لیگ'' رکھا۔ مسلمانوں کی اس پہلی علیحدہ جماعت کے لیے ضروری تھا کہ اس کی قیادت ایسی شخصیت کو سونپی جائے جو نہ صرف مسلمانوں میں مقبول ہو بلکہ برطانوی حکمرانوں سے بھی اس کے تعلقات خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ باقی دنیا کے مسائل کا بخوبی ادراک رکھتا ہو۔ ایسے میں نظر جا کر ٹھہری سر سلطان محمد شاہ آغا خان سوم پر اور ان کو آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا سربراہ منتخب کیا گیا، اور وہ اگلے پانچ سال اس حیثیت میں مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے۔

سر سلطان محمد شاہ آغا خان سوم اسماعیلی فرقے کے 48ویں امام تھے۔ وہ 2 نومبر 1877ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی عمر سے ہی سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ خاص طور پر تعلیم کے میدان میں ان کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ انہوں نے 200 سے زائد تعلیمی ادارے قائم کیے، اور بڑے شہروں کے ساتھ دور افتادہ مقامات کو بھی یکساں توجہ دی، ان کی دلچسپی کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انہوں نے پہلا اسکول ایک دور افتادہ قصبے ''گوادر'' میں قائم کیا۔ انہوں نے صرف اسکول قائم کرنے پر ہی توجہ نہیں دی بلکہ اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے جو بھی تعلیمی ادارہ قائم ہوتا اس کی بھی سرپرستی سے چنداں گریز نہ کرتے۔ انہوں نے سر سید احمد خان کے علی گڑھ کالج کی بھی بھرپور معاونت کرتے ہوئے اس کے لیے فنڈ جمع کرنے کی ذمہ داری نہ صرف قبول کی بلکہ بھرپور انداز میں نبھائی بھی۔ ساتھ ہی علی گڑھ کالج کے لیے تعلیم وظائف بھی جاری کیے جن میں بیرونِ ملک حصول علم کے وظائف بھی شامل تھے۔

انہوں نے صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں مسلمانوں کا مقدمہ لڑا۔ 1930ء کی لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں اتنے بھرپور انداز میں برِصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کی کہ علامہ اقبالؒ نے ان کو اس خدمت پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ''ہم نے کانفرنس کے روبرو مطالبات سر آغا خان کی سربراہی میں پیش کیے، جنہیں ہم سب دل سے سراہتے ہیں، اور برصغیر کے مسلمان ان سے محبت کرتے ہیں۔'' سر آغا خان کی بین الاقوامی رہنما کی حیثیت سے پہچان کا سب سے بڑا ثبوت یہ بھی تھا کہ ان کو تخفیفِ اسلحہ کی بین الاقوامی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کے لیے چنا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اقوام متحدہ کی طرز پر قائم ہونے والی پہلی بین الاقوامی تنظیم ''انجمنِ اقوام (لیگ آف نیشنز)'' کا پہلا سربراہ بھی مقرر کیا گیا۔

ان کے رفاہی اور سماجی کاموں میں زیادہ اہمیت تعلیم اور طب کی طرف رہی۔ ان کے شروع کیے گئے تعلیمی اور طبی کام آج بھی بھرپور انداز میں جاری ہیں۔ آغا خان فاؤنڈیشن کے تحت قائم شدہ تعلیمی اداروں میں آج بھی ہزاروں طلبہ و طالبات ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک حاصل کر رہے ہیں، اسی فاؤنڈیشن کے تحت قائم میڈیکل یونیورسٹی سے سینکڑوں طلبہ و طالبات ڈاکٹر بن کر مریضوں کی شفایابی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اسی فاؤنڈیشن کے تحت قائم طبی اداروں سے روزانہ ہزاروں مریض استفادہ بھی حاصل کر رہے ہیں۔

سر سلطان محمد شاہ آغا خان سوم کا 11 جولائی 1957ء کو انتقال ہوا اور ان کو انہی کی وصیت کے مطابق مصر کے شہر اسوان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں انسانیت اور خصوصاً مسلمانوں کی خدمت کے لیے آغا خان فاؤنڈیشن کی صورت میں جو چراغ جلایا تھا وہ آج بھی پوری آب و تاب سے روشنی بکھیر رہا ہے۔

ساغر صدیقی

قیام پاکستان کے فوراً بعد مملکت پاکستان کے جو سیاسی حالات تھے وہ ہماری سیاسی تاریخ کا کریہہ ترین حصہ ہے۔ اسی دور میں نہرو نے پاکستان پر یہ پھبتی کسی تھی کہ میں اتنی جلدی جلدی دھوتی نہیں بدلتا ہوں جتنی جلدی پاکستان میں حکومت بدل جاتی ہے۔ ایسے ہی ماحول میں جب اکتوبر

1958ء میں جنرل ایوب خان مارشل لاء لگا کر برسرِ اقتدار آئے تو قوم کی ایک اکثریت نے کچھ دیر کو سکون کا سانس لیا۔ ایسے ہی ماحول میں معروف شاعر جناب ساغر صدیقی نے ایک نظم کہی جس کا ایک مصرع یہ تھا۔

کیا ہے صبر جو ہم نے
ہمیں ایوب ملا

یہ نظم ایوب خان کی نظر سے گذری (یا گذاری گئی) تو ان کو حسبِ توقع بہت پسند آئی۔ اس کے بعد جب وہ لاہور آئے تو اس نظم کے خالق سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مقامی انتظامیہ سب کام چھوڑ چھاڑ ساغر صدیقی کو ڈھونڈنے میں مصروف ہوگئی لیکن اس مجذوب صفت درویش کا کوئی ٹھور ٹھکانہ ہوتا تو ملتا۔ بالآخر پولیس کے چند کارندوں کو وہ ایک پنواڑی کی دکان پر نظر آگئے۔ پولیس کے ان اہلکاروں نے جب ساغر سے صدرِ پاکستان کی ملاقات کی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے ان سے اپنے ہمراہ چلنے کی درخواست کی تو ساغر نے صاف انکار کر دیا۔ ادھر سے جتنا اصرار بڑھتا اِدھر سے اتنا ہی انکار میں سختی آتی چلی گئی۔ پولیس والوں کو مصیبت پڑگئی کہ کیسے لے جایا جائے، اگر صدرِ مملکت نے مہمان کی حیثیت سے نہ بلایا ہوتا تو پھر ان جیسے پھٹے حال مجذوب صفت کو لے کر جانے کے تو کئی ٹوٹکے پولیس والوں کے پاس ہوتے ہیں لیکن یہاں تو پر جلتے تھے۔ جب اصرار و انکار طویل تر ہوتا گیا اور پنواڑی کی دکان پر تماشائیوں کا ٹھٹھ لگ گیا تو ساغر نے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ ”ارے صاحب گورنر ہاؤس جا کر میں کیا کروں گا، وہ مجھے کیا دے دیں گے، دو چار سو روپے؟ فقیروں کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے“ یہ کہتے ہوئے ساغر نے پنواڑی سے سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ لیا اور کسی سے قلم لیا اور اس پر یہ شعر تحریر کر کے سرکاری اہلکاروں کو دے دیا اور کہا کہ جا کر یہ اپنے صدر صاحب کو دے دینا، وہ سمجھ جائیں گے:

ہم سمجھتے ہیں ذوقِ سلطانی
یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے

(ساغر صدیقی، بقلم خود)

معروف شاعر ساغر صدیقی 1928ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے، ان کا اصل نام محمد اختر تھا۔ اوائل عمری سے ہی شعر و شاعری سے شغف پیدا ہوا، پہلے ناصر حجازی تخلص کرتے تھے پھر ساغر صدیقی کا نام اختیار کیا۔ 1944ء میں ایک مشاعرے میں پہلی بار ان کو یہ کہہ کر متعارف کروایا گیا کہ ”یہ بچہ بھی شعر کہتا ہے“ اور جب ساغر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو فی الحقیقت پورا مشاعرہ ہی لوٹ لیا۔ انہوں نے کوئی زیادہ نصابی تعلیم حاصل نہیں کی تھی نتیجہ یہ کہ محنت مزدوری ہی کرتے رہے۔ وہ امرتسر کے ایک دکاندار کے پاس لکڑی کی کنگھیاں بنایا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان چلے آئے اور یہاں اپنی شاعری کی باعث ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ وہ غزل کے علاوہ نغمہ نگاری میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کے تحریر کردہ متعدد نغمات کئی فلموں کے لیے کامیابی کی ضمانت سمجھے گئے۔ یہاں ساغر کے عروج کا دور شروع ہوا۔ جریدے نہ صرف ساغر کی شاعری سے مزین ہونے کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے بلکہ رسائل تو خود ساغر کی اپنی زیرِ ادارت شائع ہوتے تھے۔ لیکن پھر حالات نے پلٹا کھایا۔

ساغر کو کچھ پریشانیوں نے آن گھیرا۔ ایک روز اسی پریشانی کے عالم میں ایک ادبی جریدے کے دفتر میں بیٹھے تھے، اظہارِ ہمدردی کے طور پر ان کے ایک ”دوست“ نے ان کو ایک نشہ آور انجیکشن لگا دیا۔ ساغر نے وقتی طور پر تو پریشانی سے نجات حاصل کر لی لیکن اس نطفۂ خراب نے ایک اور ساغر کو جنم دیا۔ اب ساغر بھنگ، چرس اور شراب سمیت ہر قسم کی منشیات کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں پھٹے حالوں فٹ پاتھوں اور قبرستانوں میں گذارا کرنے لگے۔ سڑکوں پر گھومتے پھرتے جہاں کوئی جاننے والا مل گیا اس سے ایک چونی مانگ لی، شام تک یہ چونیاں اتنی جمع ہو جاتیں کہ اپنا نشہ پورا کر لیتے۔ جہاں کہیں شاعری کی آمد ہوگئی کسی سگریٹ کے پیکٹ پر اشعار لکھ لیے۔ ان کی اس حالت کا یار لوگوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کئی فلم سازوں نے چونی کے بدلے اپنی فلموں کے لیے نغمات حاصل کر لیے، لوگوں نے ان کے دیوان بلا معاوضہ شائع کر کے دام کھرے کیے، بلکہ یہاں تک مشہور ہے کہ کئی معروف شعراء نے اسی چونی کے بدلے حاصل کردہ اشعار اور غزلوں کو اپنے نام سے شائع کر کے خوب داد سمیٹی۔

نشے کی اس عادت نے ساغر کی حالت اتنی خراب کردی کہ 1974ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تو ساغر نے اس کا علاج بھی منشیات میں ڈھونڈنے کی کوشش کی، حالت اتنی خراب ہوئی کہ پہلے ایک ہاتھ ناکارہ ہوگیا اور پھر منہ سے خون بھی جاری ہوگیا۔ آخر کار 19 جولائی 1974ء کو ان کی نعش ایک سڑک کے کنارے لاوارث حالت میں پائی گئی، جس کو ان کے احباب نے لاہور میں قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک کردیا۔ ان کے لوحِ مزار پر ان ہی کا یہ شعر کندہ ہے

وہاں اب تک سنا ہے سونے والے چونک اٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گزر آئے

ساغر کے مجموعہ کلام میں وحشت میکدہ، لوحِ جنوں، شبِ آگہی، شیشۂ دل، غمِ بہار، مقتل گلی اور زہرِ آرزو شامل ہیں۔ ساغر کا یہ شعر تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگیا ہے:

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطاں سے کوئی بھول ہوئی ہے

قتیل شفائی

حالات کے قدموں میں قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

ان مشہور اشعار کے خالق معروف شاعر قتیل شفائی ہیں۔ وہ یوں تو شاعری کی تمام ہی اصناف میں شعر کہتے تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت غزل گوئی اور نغمہ نگاری میں پائی۔ انہوں نے سب سے پہلے 1948ء میں پاکستان میں بننے والی فلم ''تیری یاد'' سے اپنی نغمہ نگاری کا آغاز کیا اور پھر یہ سفر اتنا چلا کہ 200 سے زائد فلموں کے لیے 900 سے زائد نغمات تحریر کیے۔ وہ واحد پاکستانی نغمہ نگار ہیں جن کے نغمات سے صرف پاکستانی فلمیں ہی نہیں بلکہ ہندوستانی فلموں کو بھی سجایا گیا۔

قتیل شفائی کا اصلی نام اورنگزیب خان تھا، وہ 24 دسمبر 1919ء کو ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ ہری پور سے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد وہ راولپنڈی منتقل ہوگئے، انہوں نے یہاں اپنی مشقِ سخن جاری رکھی اور شاعری میں اصلاح اور رہنمائی کی خاطر حکیم محمد یحییٰ شفائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اپنے انہی استاد کی مناسبت سے شفائی کو اپنے نام کا حصہ بنالیا، یوں قتیل کا تخلص اور شفائی کا لاحقہ مل کر ان کا معروف نام قتیل شفائی بنا۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد کچھ عرصہ لاہور میں بھی مقیم رہے اور یہاں احمد ندیم قاسمی کی قربت نے ان کے علمی اور ادبی ذوق کو جلاء بخشی۔

انہوں نے نغمہ نگاری کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا کے دیگر شعبوں میں بھی دلچسپی لی اور فلم سازی بھی کرنے لگے۔ انہوں نے اردو کے علاوہ علاقائی زبانوں میں بھی فلمیں بنائیں جن میں پشتو فلم ''عجب خان آفریدی'' اور ہندکو فلم ''قصہ خوانی'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک اردو فلم ''اک لڑکی میرے گاؤں کی'' بھی بنانا شروع کی لیکن یہ فلم مکمل نہ ہوسکی۔

فلمی صنعت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادبی میدان میں بھی اپنی بھرپور توجہ مرکوز رکھی اور اکثر بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے جہاں ان کی بھرپور پذیرائی ہوتی۔ ان کے شعری مجموعوں میں ہریالی، گجر، جل ترنگ، روزن، گھنگھرو، پرچم، ابابیل، پھوار، جھومر، مطربہ، چھتنار، پیراہن، برگد، آموختہ، گفتگو، آوازوں کے سائے اور سمندر میں سیڑھی شامل ہیں۔ ان کی آپ بیتی ''گھنگھرو ٹوٹ گئے'' کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

وہ لاہور میں 11 جولائی 2001ء کو انتقال کرگئے اور علامہ اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کو حکومت پاکستان نے صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا۔ اس کے علاوہ ان کو آدم جی ادبی ایوارڈ، امیر خسرو ایوارڈ اور نقوش ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ان پر ایم اے کے مقالات کے علاوہ پی ایچ ڈی کے سلسلے میں تحقیقی کام بھی ہوا۔ ان کی شاعری میں معاشرے سے ناانصافیوں سے بغاوت کے سلسلے میں یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے:

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

پرفیکٹ حسینہ

انور فرھاد

پاکستان کی فلمی دنیا نے بہت سے باکمال ہنرمند، اداکار و گلوکار سامنے لائے۔ خداداد صلاحیتوں کی حامل یہ شخصیات اپنے دور کی پہچان کہلائے۔ انہی معروف اداکاروں میں سے ایک اداکارہ کی سوانح زیست جس کا ہر انگ بدلتا تھا۔ وہ لاجواب اداکاری کرتی تھی مگر قسمت کی خوبی کہ وہ آخر وقت تک سپر اسٹار کے پائیدان پر پہنچ نہ سکی۔

اپنے دور کی ایک معروف اداکارہ کی حالات زندگی

سید صاحب کے ساتھ میں داداجی کے کمرے میں داخل ہوا تو ان کے ریڈیو سے بڑی پیاری آواز آرہی تھی۔

''الف سے اچھی گاف سے گڑیا جیم سے جاپانی۔'' داداجی بڑی محویت سے گانا سن رہے تھے۔ ہم نے اشارے سے سلام کیا تو اشارے سے ہی بولے۔

''بیٹھو۔''

ہم خاموش بیٹھے رہے۔ جب گانا ختم ہوگیا تو ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ ''اچھے گانوں کا تو میں دیوانہ ہوں اس

کے سیدھے سادے بول اور سماعت میں رس گھولنے والی موسیقی نے آج بھی اتنے دنوں کے بعد اس کی تروتازگی میں کوئی کمی آنے نہیں دی۔‘‘

’’جی ہاں، جس فلم کا یہ گانا ہے وہ 1971ء میں ریلیز ہوئی تھی یعنی آج سے 44 سال پہلے۔‘‘ میں نے ان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

’’تم ٹھہرے پاکستان کے پرانے فلمی صحافی، یقیناً تمہیں اس فلم کا نام بھی معلوم ہوگا؟‘‘ سید صاحب بولے۔

’’اس فلم کا نام تھا ’’خاموش نگاہیں‘‘ اور یہ گانا اپنے وقت کے نامور کامیڈین منور ظریف پر جاپان کے شہر ٹوکیو میں عکس بند ہوا تھا۔ اس فلم کے ہیرو وحید مراد اور ہیروئن روزینہ تھیں۔ وحید مراد اور روزینہ دونوں کا تعلق کراچی فلم انڈسٹری سے تھا مگر دونوں لاہور میں بننے والی فلموں میں بھی کام کرتے تھے۔‘‘

’’ٹھہرو......ٹھہرو۔‘‘ سید صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے بھی مجھے روکا۔ ’’پہلے یہ بتاؤ کیا کراچی میں بھی کبھی کوئی فلم انڈسٹری تھی؟‘‘

دادا جی نے قہقہہ لگایا۔ ’’اس بے خبرے کو یہ بھی معلوم نہیں اب تم ہی اس کی معلومات میں اضافہ کرو۔‘‘

’’دادا جی یہ بے چارے تو فلم اور فلم والوں کے بارے میں جاننے اور باخبر ہونے کو گناہ سمجھتے تھے جبکہ آج کی نئی نسل کو بھی اس بات کا علم نہیں کہ کبھی کراچی میں بھی ایک فعال فلم انڈسٹری ہوا کرتی تھی۔ سید صاحب، یہاں جو فلمی صنعت موجود تھی اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستانی فلموں کے چمکتے دمکتے سورج چاند ستارے زیادہ تر کراچی فلم انڈسٹری ہی کی دریافت تھے۔ وحید مراد، محمد علی، زیبا، شمیم آرا، نیر سلطانہ، لہری، ساقی، جاوید شیخ، ابراہیم نفیس، ہدایت کار پرویز ملک، اقبال اختر، رفیق رضوی، قمر زیدی، سید کمال، اقبال یوسف، فضل احمد کریم فضلی، ایس ایم یوسف، اداکارہ آسیہ، اداکار کمال ایرانی، آزاد اور روزینہ۔ اور بھی بہت سے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ کراچی کی فلموں سے شہرت حاصل کرنے کے بعد لاہور والوں کی توجہ کا مرکز بنے۔‘‘

اس سے پہلے کہ خالد علی سید کچھ بولتے، دادا جی بول پڑے۔ ’’تم نے جو اداکارہ روزینہ کا نام لیا ہے، تو یہ بتاؤ یہ محترمہ آج کل کہاں ہیں، کیا کررہی ہیں اپنے دور کی تو یہ بڑی پُرکشش اور باصلاحیت اداکارہ تھیں۔ ہر طرح کے کردار بڑی آسانی سے کرلیتی تھیں۔‘‘

’’دادا جی! اب وہ عمر کے اس اسٹیج میں ہیں جہاں زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اب وہ محض گھریلو خاتون بن کر رہ گئی ہیں۔ فلم انڈسٹری کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں کہ یہاں نئے ابھرتے ہوئے ستاروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ انگریز تو اولڈ از گولڈ سمجھتے ہیں مگر برصغیر میں اولڈ کو بولڈ کرکے پویلین بھیج دیتے ہیں۔ روزینہ قریشی آج کل ماضی کی خوشگوار یادوں کے سہارے اسی کراچی شہر میں گمنام زندگی گزار رہی ہیں۔‘‘

’’ماضی کی یادیں واقعی بڑی خوشگوار ہیں۔‘‘ دادا جی نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ’’ہم نے بھی روزینہ کا وہ دور دیکھا ہے جب فلمساز و ہدایت کار کسی نہ کسی عنوان سے اسے اپنی فلم میں کاسٹ کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ بڑی تروتازہ اور شگفتہ جسم و جان کی مالک تھی۔ اسکرین پر جب وہ نمودار ہوتی تو تماشائیوں کی نگاہوں سے ان کے دل میں اتر جاتی تھی۔ اس پر اس کی جاندار اداکاری، وہ گاؤں کی گوری کے روپ میں ہو یا شہر کی الٹرا ماڈرن گرل کے کردار میں۔ اپنے ہر کردار میں وہ اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا اس طرح مظاہرہ کرتی تھی کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ ایک اچھے پرفارمر کی یہی خوبی ہوتی ہے۔‘‘

’’میں اسے اپنی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہوں گا کہ میں نے روزینہ جی کو ان کے عروج کے دور میں اسکرین پر نہیں دیکھا۔‘‘ سید صاحب اظہار افسوس کرتے ہوئے بولے۔ ’’یار ان کے بارے میں کچھ بتایئے نا؟‘‘ انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دادا جی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولے۔ ’’بتادو میاں...... بتادو یہ اپنے کیے کی سزا اب اگر مجھے یا تمہیں دینا چاہتے ہیں تو ان کی یہ آرزو بھی پوری کردو۔‘‘

دادا جی کے اس تبصرے پر سید صاحب ذرا جھینپے پھر ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد میں نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کردیا۔

’’روزینہ نے اپنے پوری فلمی کیریئر میں 91 فلموں میں کام کیا۔ جن میں اردو فلموں کی تعداد 59 ہے، پنجابی کی 31 ہے جبکہ پشتو فلم صرف ایک ہے۔ 1963ء میں ہدایت کار بٹ کاشر نے اپنی فلم ’’ہمیں بھی جینے دو‘‘ میں پہلی بار

روزینہ کو متعارف کروایا۔ یہ ایک مختصر سا کردار تھا اور مہمان اداکارہ کے طور پر کام کیا تھا۔ یہ فلم کراچی میں بنی تھی۔ بطور ہیروئن روزینہ کی پہلی فلم ''چوری چھپے'' تھی جبکہ آخری ریلیز ہونے والی فلم ''ہم ایک ہیں'' تھی جس کے ہدایت کار سید نور تھے۔ 21 ستمبر 1950ء کو کراچی میں پیدا ہونے والی اس اداکارہ کا بنیادی طور پر تعلق ایک عیسائی گھرانے سے تھا۔ اس کا پیدائشی نام آئی وی سنتھیا تھا۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ رفعت قریشی سے شادی کے بعد روزینہ عائشہ قریشی کہلائیں۔ شادی سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا اور انہیں اسلامی نام عائشہ دیا گیا۔ نام کے ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب وہ فلموں میں آئیں تو ان کا فلمی نام روزینہ رکھا گیا۔ یہ نام ایک فلمی صحافی کا تجویز کیا ہوا ہے۔ یہ اس دور کے نامور فلم جرنلسٹ یو کملانی تھے جو گجراتی اخبار ملت سے وابستہ تھے۔ ہدایت کار لقمان کی فلم افسانہ میں روزینہ نے پہلی بار ریپ کا کردار ادا کیا تھا۔ اس اداکارہ کی پہلی پنجابی فلم ''پردیسی'' تھی جس کے ہدایت کار ریاض احمد راجو تھے۔ ''جاپانی گڈیا'' میں روزینہ جاپانی گڈی کے روپ میں پیش کی گئیں۔ اس فلم کا شمار روزینہ کی بہترین پنجابی فلموں میں ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس فلم کے ہدایت کار جمیل اختر تھے جو 1972ء میں ریلیز ہوئی جبکہ اس ہدایت کار نے اس کہانی پر اردو فلم اسی لوکیشن میں ''خاموش نگاہیں'' کے نام سے 1971ء میں بنائی تھی۔ یہ اردو فلم بوجوہ کامیاب نہیں ہوئی مگر پنجابی فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ ہدایت کار اسلم ڈار کی پنجابی فلم ''شیرا'' میں روزینہ کا ایک ڈائیلاگ ''اوئے میں ٹوٹے کردیواں گی'' تماشائیوں میں بہت مقبول ہوا۔ روزینہ نے اپنے ابتدائی فلمی کیریئر میں کئی بڑے اور یادگار کمرشل بھی کیے۔ ''سنگدل'' کی امیرزادی، انسانیت سے محبت کرنے والی سلمٰی کا کردار روزینہ کے فلمی کیریئر کا پہلا یادگار کردار تھا۔ ہدایت کار اقبال اختر کی گھریلو اور معاشرتی فلم ''دوسری ماں'' میں روزینہ نے پہلی بار ٹائٹل رول کیا تھا۔ وحید مراد کی ہدایت میں بننے والی فلم ''اشارہ'' میں روزینہ کو معاون اداکارہ کا نگار ایوارڈ ملا۔''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ ذرا دیر تک سید صاحب میرے مزید بولنے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب میں نے کچھ نہیں کہا تو خود بول پڑے۔ ''بس اتنا ہی...... اور کچھ نہیں؟''

''اور کیا بتاؤں؟ اس کے بارے میں تو ساری باتیں بتادیں۔''

''یہ تو وہی بات ہوئی کہ اخبار کی ساری سرخیاں پڑھ کر کوئی کہے لو جی آپ کو سارا اخبار سنادیا۔''

میں نے انہیں جواب دینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دادا جی بول پڑے۔ ''میں بھی خالد علی کی بات سے اتفاق کروں گا کہ تم نے ساری سرخیاں سنا کر پورا اخبار پڑھ کر سنانے کا تاثر دیا ہے۔ ارے میاں! یہ تو ہمیں بہلانے پھسلانے والی بات ہوئی۔ روزینہ کے بارے میں تم نے جو موٹی موٹی باتیں بتائی ہیں، ان سے تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس اداکارہ نے بڑی بھرپور فلمی زندگی گزاری ہے۔ میرے پاس اس سے متعلق کوئی مواد موجود نہیں اس لیے مجھے بھی اس کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم نہیں۔ اس لیے میں یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ آج تمہاری زبانی اس کی مکمل کہانی سننے کو ملے گی۔''

''بات دراصل یہ ہے......'' کہہ کر میں خاموش ہوگیا اور سوچنے لگا کہ کہوں یا نہ کہوں؟

''سوچنے کیا لگے بتادو میاں؟'' دادا جی نے ٹوکا۔ ''کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تب بھی ہم برا نہیں منائیں گے۔''

''دادا جی! میں روزینہ کے بارے میں گھر سے کوئی ہوم ورک کر کے تو نہیں آیا تھا۔ اس کی فلم ''خاموش نگاہیں'' کا گانا سن کر اس کا ذکر آیا تو سید صاحب کی فرمائش پر روزینہ کی جو خاص اور اہم باتیں مجھے یاد تھیں بتادیں۔ اب آپ لوگ تفصیل کی فرمائش کررہے ہیں تو اس کے لیے مجھے وقت دیجیے۔''

''ٹھیک ہے، اگلی ملاقات تک ہم انتظار کریں گے۔'' سید صاحب جھٹ بول پڑے۔

''تمہاری یہ ہوم ورک والی بات مجھے بہت پسند آئی۔'' دادا جی بولے۔ ''تم نے بڑی دیانت داری سے بتادیا کہ تم کسی تیاری کے ساتھ نہیں آئے تھے جو کچھ تمہیں یاد تھا بتادیا۔ اب آؤ گے تو تیار ہوکر آؤ گے۔''

اگلی بار واقعی میں تیار ہوکر آیا تھا۔ چائے وائے پینے کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا تو میں نے کہنا شروع کیا۔

''روزینہ اس دور کی اداکارہ تھی جب پاکستان میں سالانہ سو سے زیادہ فلمیں بنا کرتی تھیں۔ بظاہر یہ بڑی اچھی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ

فلمیں بنانے والوں میں ایک بڑی تعداد نان ٹیکنیکل افراد کی تھی جس کے نتیجے میں زیادہ فلمیں باکس آفس پر ناکام ہو جاتی تھیں۔ جس کا سب سے بڑا خمیازہ ان میں کام کرنے والوں کو بھگتنا پڑتا تھا۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی‘‘ کے مصداق ہر وہ شخص فلم بنانے لگا تھا جو فلم سازی کی بنیادی باتوں سے بھی آگاہ نہ تھا کیونکہ ان دنوں بھارتی فلموں کی نمائش پر پابندی عاید تھی اس لیے سینما گھروں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دھڑا دھڑ فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ جن میں سے وہی فلمیں دیکھی پسند کی جاتی اور کامیاب ہوتی تھیں جو اچھے اور تربیت یافتہ فلم میکرز بناتے تھے۔ فلمسازی آرٹ ہے، سائنس ہے اور پڑھے لکھے، تربیت یافتہ لوگوں کا کام ہے۔ اس دور میں اگرچہ آج کی طرح جدید ٹیکنالوجی کا استعمال نہیں ہوتا تھا پھر بھی فلمسازی کے فن سے واقف لوگ اپنے طور پر اچھی فلمیں بنالیتے تھے۔

روزینہ جس کا ذکر کرنے ہم بیٹھے ہیں، وہ غریب بھی اس دور کے نان ٹیکنیکل فلم والوں کے ہاتھوں بہت متاثر ہوئی۔ وہ تو اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ اللہ کا اس پر خاص کرم تھا کہ قدرت کی طرف سے اسے ایک بے حد پُرکشش پیکر کا عطیہ نصیب ہوا تھا جبکہ اداکارانہ صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھی ۔ ناکام فلموں کا حصہ ہونے کے باوجود وہ دوسرے آرٹسٹوں کی طرح گمنامی کے اندھیرے میں گم ہونے کی بجائے اپنے گلیمر اور فنی صلاحیتوں کی وجہ سے دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی فلموں میں کاسٹ کی جاتی رہی۔ شاید اسے ایسے کسی سرپرست کی رہنمائی حاصل نہیں تھی جو اسے سمجھاتا اور گائیڈ کرتا کہ فلمیں سوچ سمجھ کر اور فلم اور ہدایت کار کے بارے میں اچھی طرح اندازہ لگانے کے بعد سائن کرو۔ ایسا نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر فلم میں ہر طرح کا کردار کرتی رہی۔ فلمساز و ہدایت کار محض اس کے گلیمر اور ٹیلنٹ کو دیکھ کر اسے سائن کرتے اور جو کردار چاہتے کرواتے۔ کبھی ہیرو یا ہیروئن کی بہن کا، کبھی نوکرانی کا، کبھی ہیروئن کی سہیلی کا، کبھی سائڈ ہیروئن کا کبھی ریپ کا رول کرواتے۔ ایسے سائڈ رولز کرنے میں اس کا بہت وقت ضائع ہوا۔ اگر وہ احتیاط کے ساتھ فلمیں سائن کرتی تو بہت جلد ایک بڑی ہیروئن کے طور پر اپنے آپ کو منوالیتی۔ ابتدائی دور میں اسے جن فلموں میں ہیروئن کا کردار ملا افسوس کہ وہ بھی فلمساز و ہدایت کار کی غلط منصوبہ بندی اور ناقص کارکردگی کی بنا پر ناکام فلمیں ثابت ہوئیں۔ ایسی فلموں میں ’’چوری چھپے‘‘، ’’استادوں کا استاد‘‘، ’’نقوش‘‘، ’’السلام علیکم‘‘، ’’کردار‘‘ اور ’’لوان یورپ‘‘ قابلِ ذکر ہیں۔‘‘

’’ان فلموں کی ناکامی کی وجہ؟‘‘ سید صاحب نے مجھے ٹوکا۔

’’میں نے عرض کیا نا کہ غلط منصوبہ بندی اور ناقص کارکردگی۔ ’’چوری چھپے‘‘ میں روزینہ کے مقابلے سیٹھی کو ہیرو کے کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ جو بے حد غلط انتخاب تھا۔ سیٹھی کسی بھی طرح روزینہ کے جوڑ کا اداکار نہیں تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ کسی بھی طرح ہیرو کے قابل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی کوئی بھی فلم کامیاب نہیں ہوئی اور وہ جلد ہی فلم انڈسٹری سے فیڈ آؤٹ ہوگیا۔ اسی طرح ’’استادوں کے استاد‘‘ میں بھی زبردست مس کاسٹنگ ہوئی۔ اس فلم میں روزینہ کے مقابل مزاحیہ اداکار نرالا کو ہیرو کے روپ میں پیش کیا گیا۔ بطور ہیرو نرالا کی یہ پہلی اور آخری فلم تھی ۔ ’’نقوش‘‘ کا بھی کچھ ایسا ہی قصہ ہے۔ ایک نئے اداکار نہال نے اس فلم میں روزینہ کے ہیرو کا کردار کیا تھا۔ یہ نہال کی ذاتی پروڈکشن تھی۔ اس لیے اسے اختیار تھا کہ وہ اپنی فلم کا ہیرو خود بنے۔ اس شوق کے ہاتھوں نہ صرف فلم کا بیڑہ غرق ہوا بلکہ وہ خود کہیں کا نہیں رہا۔ ’’السلام علیکم‘‘ میں نئے تو یلے اداکار و ہدایت کار فیروز کی کمزور ہدایت کاری اور ناقص اداکاری کی وجہ سے ناکام ترین فلم ثابت ہوئی۔ وہ خود بھی ڈوبا اور ایک اچھی اداکارہ کی ساکھ کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ ’’پیار کی جیت‘‘ بھی ناقص اسکرپٹ غیر معیاری پروڈکشن اور نئے ہیرو عابد کی بے جان اداکاری کی وجہ سے اس فلم کی ہار ثابت ہوئی ’’کردار‘‘ بھی ایک ناکام ترین فلم تھی۔ اس فلم میں بھی ایک نئے اداکار اختر عزیز کو روزینہ کا ہیرو بنا کر روزینہ اور فلم دونوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ ’’لوان یورپ‘‘ رنگین فلم تھی ۔ پیرس اور یورپ کے دیگر خوب صورت مقامات پر اس کی شوٹنگ کی گئی۔ کمال کو اس فلم میں روزینہ کے ہیرو کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس جاسوسی کہانی کو دلچسپ اور قابلِ قبول بنانے میں اس کے تخلیق کار بری طرح ناکام رہے۔‘‘

’’تو کیا......‘‘ سید صاحب ایک بار پھر بولے۔

’’روزینہ کی تمام ہی فلمیں غلط لوگوں کی وجہ سے ناکام ثابت ہوئیں؟‘‘

’’نہیں سید صاحب، ایسی بات نہیں۔‘‘ میں نے

Wife carrying race

کون کہتا ہے کہ بیویاں بوجھ ہوتی ہیں؟ آپ ذرا فن لینڈ کے ان کھلاڑیوں کو دیکھیں بے چارے اپنی پشت پر اپنی بیویوں کو سوار کر کے میلوں کی دوڑ لگاتے ہیں جب کہ راستے میں پانی کے گڑھے ہوتے ہیں۔ اونچے ٹیلے ہوتے ہیں۔ ریت ہوتی ہے لیکن ان کو دوڑنا پڑتا ہے۔ اس کھیل کی شرائط کچھ یوں ہیں:

1۔ بیوی کی عمر سترہ برس سے کم نہ ہو۔

2۔ وہ 49 کے جی سے زیادہ نہ ہو۔

3۔ راستے میں دم لینے کے لیے بیوی کو اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

4۔ اور انعام کیا ملتا ہے صرف ایک موبائل فون۔

ہے نا کمال۔

Worm charming game

بہت آسان سا گیم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کو اس سے گھن آتی ہو لیکن کھیلنے والے تو کھیلتے ہی رہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر کھلاڑی کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا مخصوص کر دیا جاتا ہے کہ اب یہاں سے جتنے کینچوے پکڑ سکتے ہو پکڑ لو۔ سب سے زیادہ کینچوے پکڑنے والے کو فاتح قرار دیا جاتا ہے۔

تو آپ نے دیکھ لیا کہ اس دنیا میں کیسے کیسے کھیل ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے یہاں نہ کھیلے جاتے ہوں۔ انسان نے اپنے آپ کو بہلانے کے لیے کیسے کیسے تماشے ایجاد کر رکھے ہیں۔

☆☆☆

کہا۔ ''جن فلموں کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً ساری ہی کراچی میں بنائی گئی تھیں اور اناڑی کھلاڑیوں کے ہاتھوں کامیابیوں سے محروم رہیں مگر جن فلموں کو اچھے، پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ فلم میکرز نے بنایا وہ فلمیں بھی کامیاب ہوئیں اور بطور ہیروئن روزینہ کو بھی عزت اور شہرت ملی۔ روزینہ کی بطور ہیروئن کامیاب فلموں میں چاند سورج، سزا، غرناطہ، بیٹی بیٹا، سوغات، پردیسی، گڈی گڈا، بشیرا، سوہنا بابل، ٹھاہ، دکھ، سجنا دے، ہیں جبکہ سائڈ ہیروئن کے طور پر بھی روزینہ کی کئی فلمیں پسند کی گئیں۔ جن میں میرے بچے میری آنکھیں، احسان، سنگدل، اشارہ، دوسری ماں، سمندر، جیسے جانتے نہیں، تم ہی ہو محبوب میرے، بہاریں پھر بھی آئیں گی، ہنی مون، جلتے سورج کے نیچے، دو تیرا نالاں دے، اج شملہ جٹ دا، بجن دشمن، انسان اور گدھا، غیرت دا نشان، خون دا بدلہ خون، رنگی، دھرتی لہو، سنگدلی، امیر تے غریب اور بدلہ یار دا قابلِ ذکر فلمیں ہیں۔''

''تمہارا یہ تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔'' دادا جی بولے۔ ''روزینہ اگر احتیاط سے کام لیتی اور اتنی فراخدلی کے ساتھ ہر طرح کے کردار ادا نہ کرتی، سلیکٹڈ اور منتخب کرداروں کی فلمیں سائن کرتی تو صف اوّل کی ہیروئنوں میں شمار کی جاتی۔ اس کی مجبوری شاید یہ تھی کہ بقول تمہارے اسے گائڈ کرنے والا کوئی نہ تھا۔''

''جی ہاں، اس کی اس مجبوری کی وجہ سے فلم والوں نے جی بھر کر اس کا مس یوز کیا۔ اسے بالکل نئے ہیروز کے ساتھ پیش کرنا اس کے ساتھ کھلی دشمنی تھی۔ عام طور پر اچھی اداکارائیں نئے ہیروز کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ روزینہ اور رانی ہی دو ایسی اداکارائیں تھیں جنہوں نے بالکل کورے آرٹسٹوں کے ساتھ کام کرنے سے انکار نہیں کیا۔ رانی کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ بہت دنوں تک اس کی فلمیں ناکام ہوتی رہیں اور اس پر منحوس اداکارہ کا لیبل تک لگا دیا گیا۔ اس بات کا کریڈٹ تو ہدایت کار حسن طارق کو جاتا ہے کہ انہوں نے رانی کو اس دلدل سے نکالا اور بڑے اور مستند ہیروز کے ساتھ کاسٹ کرنا شروع کیا جس کے بعد رانی کامیاب ہیروئنز میں شمار کی جانے لگی۔ افسوس کہ روزینہ کو ایسا سپورٹ اور سہارا نہیں ملا اور وہ آخری فلم تک فلم والوں کی پسند کے کرداروں پر کام کرتی رہی۔''

''ان تمام باتوں کے باوجود۔'' سید صاحب نے کہا۔ ''روزینہ نے ایک طویل اننگ کھیلی آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ تھی؟''

''آپ نے شاید توجہ سے میری بات نہیں سنی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں بتا چکا ہوں کہ اس پر قدرت مہربان تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا حسن اور جوانی دی تھی کہ اس کی فلموں کی ناکامی کے باوجود تماشائیوں نے اسے مسترد نہیں کیا۔ اس کے حسن وشباب اور اچھی اور متاثر کن اداکاری نے اس کی پسندیدگی کے گراف کو ہمیشہ اونچا ہی رکھا ورنہ ہمارے ہاں ریت تو یہی ہے کہ فلم فلاپ تو اس میں کام کرنے والے بھی فلاپ۔''

''روزینہ جی نے شاید فلم سازوں کے ہر طرح کی آفر کو اس لیے قبول کیا کہ وہ فلاپ فلموں کی اداکارہ تھیں۔''

''ہاں سید صاحب! شاید روزینہ کے پیش نظر یہ بات بھی ہو۔ اس نے یہ سوچ کر کسی کی آفر کو ریجکٹ نہیں کیا کہ انکار کر دے گی تو دوسرے آرٹسٹوں کی طرح اسے بھی گھر بیٹھنا پڑے گا۔ بے کاری سے بہتر عجز وانکساری ہے۔ جو کچھ مل رہا ہے اسے رب کا احسان سمجھ کر قبول کر لو۔ شاید اللہ کو اس کی یہ ادا پسند آئی کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی عنوان سے فلم والوں کی ضرورت بنی رہی۔''

''روزینہ کراچی میں پیدا ہونے والی لڑکی تھی۔ عیسائی گھرانے سے اس کا تعلق تھا مگر آفرین ہے اس پر کہ اس نے لاہور کے پنجابی فلمسازوں اور ہدایت کاروں کو بھی متاثر کیا اور اس بات پر مجبور کیا کہ وہ پنجابی فلموں میں بھی اسے کاسٹ کریں۔''

''جی ہاں، دادا جی! اس لحاظ سے بھی روزینہ خوش قسمت تھی کہ جب اردو فلموں کا زور ٹوٹا اور پنجابی فلمیں کامیاب ہونا شروع ہوئیں تو کراچی کی اس اردو اسپیکنگ اداکارہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس کے گلیمر اور ٹیلنٹ کی وجہ سے اسے ہیروئن، سائڈ ہیروئن اور میچور کرداروں کے لیے کاسٹ کیا گیا اور روزینہ نے بھی مایوس نہیں کیا۔ پنجابی فلموں کی روایتی مٹیار کا رول ہو یا ماڈرن شہری لڑکی کا۔ ہر رنگ اور ہر روپ میں اپنی پرفارمنس سے تماشائیوں کو متاثر کیا۔ دادا جی! یہ اسی دور کی بات ہے کہ کئی اردو فلمیں ناکام ہو گئیں مگر وہی فلم جب پنجابی زبان میں بنائی گئی تو اس نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ ایسی فلموں میں ''خاموش نگاہیں'' جو اردو میں تھی اس کے فلاپ ہونے کے بعد اس کہانی پر پنجابی فلم ''جاپانی گڈی'' بنائی گئی تو اس نے ریکارڈ

کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح دلجیت مرزا کی اردو فلم ''برسات میں'' سپر فلاپ ثابت ہوئی مگر جب اسی کہانی پر اس نے پنجابی فلم ''ٹھاہ'' بنائی تو سپر ہٹ ثابت ہوئی۔'' جاپانی گڈی'' کی طرح ''ٹھاہ'' کی ہیروئن بھی روزینہ تھی جبکہ اس کے مقابل لالہ سدھیر ہیرو تھے۔''

''ہاں یہ درست ہے کہ پاکستانی فلمی صنعت ایسے دور سے بھی گزری ہے جب اردو فلموں کی مقبولیت ختم ہو کر رہ گئی اور کبھی ایسا وقت بھی آیا جب پنجابی فلموں کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔'' دادا جی کے اس تبصرے پر میں نے کہا۔

''دادا جی! ہر بات کی وجہ ہوتی ہے۔ جب جب اردو فلمیں بنانے والوں نے اپنی فلموں کے معیار پر توجہ دینا چھوڑ دی کمزور اسکرپٹ اور ناقص ڈائریکشن سے پھس پھسی فلمیں بنانا شروع کر دیں، تماشائیوں کی دلچسپی ایسی فلموں سے ختم ہو گئی۔ ایسے میں اچھی اور معیاری پنجابی فلمیں پیش کی گئیں تو ان کی کامیابی یقینی تھی۔ بالکل اسی طرح جب پنجابی فلمیں بنانے والوں نے گجر برانڈ فلمیں بنانا شروع کر دیں جو مار دھاڑ اور عریانی اور فحاشی سے بھرپور تھیں تو تماشائیوں نے انہیں بھی مسترد کر دیا اور صاف ستھری اردو فلموں کی پذیرائی شروع کر دی۔''

''بات روزینہ جی کی ہو رہی تھی۔'' سید صاحب نے ٹوکا۔'' یہ بتایئے، انہیں پنجابی فلموں میں کام کرنے میں دشواری تو پیش آتی ہو گی؟''

''جب ہدایت کار ریاض احمد راجو نے پہلی بار اپنی پنجابی فلم ''پردیسی'' میں کام کرنے کی آفر دی تو روزینہ نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ انہیں پنجابی بولنا نہیں آتی۔ ریاض احمد راجو نے جواب دیا نہیں آتی ہے تو آجائے گی۔''

''مگر کیسے؟''

''روزینہ جی! جب ہم لوگ سات سمندر پار کی زبانیں سیکھ لیتے ہیں، بولنا اور لکھنا پڑھنا شروع کر دیتے ہیں تو پنجابی تو اپنے گھر کی، اپنے ملک کی بولی ہے۔ ذرا سی کوشش سے ذرا سی محنت سے آجائے گی۔''

اور واقعی ایسا ہی ہوا، روزینہ باشعور تھی، پڑھی لکھی تھی خداداد صلاحیتوں سے مالا مال تھی۔ پہلی فلم میں اسے تھوڑی مشکل پیش آئی مگر جلد ہی وہ رواں ہو گئی اور پھر فراٹے کے ساتھ پنجابیوں کی طرح پنجابی مکالمے بولنے لگی۔

''ابھی آپ نے روزینہ کو پڑھی لکھا کہا تھا۔'' سید صاحب نے مجھ سے کہا۔'' تو کیا وہ واقعی پڑھی تھی؟''

Jam Durrak جام درک

اٹھارہویں صدی کا بلوچی شاعر۔ ڈومبی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ میر نصیر خان اعظم والئی قلات (1750ء تا 1795ء) کا ملک الشعرا تھا۔ اس نے نہ صرف عوامی کہانیوں کو منظوم کیا بلکہ بلوچی شاعری میں تغزل کو معراج تک پہنچایا۔ اس کی زبان، تشبیہات اور استعارات خالصتاً بلوچی ہیں۔ اس نے عرب اور ایران کی رومانی داستانوں، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کو بلوچی نظم میں ایسے لکھا کہ یہ کردار بلوچی معلوم ہونے لگے۔ اس کی مشہور ترین نظمیں بھمبور کی پریاں اور غسل کرتی عورتیں ہیں۔

مرسلہ: نازش نیاز۔ کراچی

''بہت اچھا سوال کیا ہے سید نے۔'' دادا جی بولے۔'' کیونکہ کراچی کی بہت سی اداکارائیں تو اس بازار سے فلم انڈسٹری میں آئی تھیں جہاں لکھنے پڑھنے کو اہمیت نہیں دی جاتی۔''

دادا جی کے منہ سے اپنے بارے میں تعریفی کلمات سن کر سید صاحب کے چہرے پر ایک چمک سی آگئی تھی۔ میں نے انہی کو مخاطب کر کے کہا۔'' سید صاحب روزینہ واقعی پڑھی لکھی تھی۔ اس نے کراچی کے سینٹ جوزف اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا اور پھر سینٹ جوزف کالج سے انٹر بھی کیا تھا۔ اس زمانے میں اتنی تعلیم بھی بہت تھی چونکہ اس کا تعلق عیسائی گھرانے سے تھا اس لیے گھر پر وہ لوگ انگریزی بولتے تھے اس پر سونے پر سہاگا کے مصداق، انگلش میڈیم اسکول کی تعلیم نے اس کی علمی صلاحیت کو اور جلا بخشی۔ وہ اپنے دور میں واحد فلمی اداکارہ تھی جسے ملک سے باہر بننے والی فلموں میں سب سے زیادہ کاسٹ کیا گیا کیونکہ وہ فراٹے کے ساتھ انگریزی بولتی تھی اور بیرونِ ملک فلم یونٹ کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہوتی تھی۔''

''روزینہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اور بھی کسی فرد نے فلموں میں کام کیا؟''

''روزینہ کی ایک کزن راحیلہ ہوا کرتی تھی جو کراچی کی فلموں میں ڈانس ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس نے چند فلموں میں بطور رقاصہ اداکاری بھی کی۔ وہ کراچی اسٹیج کی منجھی ہوئی رقاصہ شمار کی جاتی تھی۔ روزینہ نے اپنی

اس کزن سے رقص کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ راحیلہ کے علاوہ روزینہ کی بیٹی صائمہ قریشی نے بھی ایک فلم میں کام کیا۔ یہ سید نور کی فلم ''ہم ایک ہیں'' تھی جس میں صائمہ قریشی نے سیکنڈ ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا جبکہ روزینہ اس فلم میں مہمان اداکارہ تھی۔ یہ فلم روزینہ کی آخری فلم تھی جو اس دور کی ناکام ترین فلم تھی۔ بعد میں صائمہ قریشی نے ٹی وی ڈراموں میں کام کر کے خاصی شہرت حاصل کی۔''

سید صاحب نے کچھ شرماتے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کہتے ہیں کہ روزینہ اپنے دور کی بڑی خوب صورت اور پرشباب ادکارہ تھی پھر تو اسے اکثر بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا؟''

''جی ہاں، اس طرح کے لوگوں کے ساتھ اس طرح تو ہوتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ریاض شاہد کی فلم ''غرناطہ'' کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران جو پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور سوات میں کی جارہی تھی۔ آؤٹ ڈور شوٹنگز کے دوران عام طور پر اس علاقے کے لوگ پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ لوگ پہنچ گئے۔ ان میں سے کچھ نے روزینہ کے حسن و شباب کو دیکھا تو خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ ہزار نہیں لاکھوں جان سے اس پر فریفتہ ہوگئے۔ یہ قبائلی اور جنگجو قسم کے لوگ تھے اور ان کا عشق بھی اسی نوعیت کا تھا۔ وہ سوات کے اس ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں غرناطہ کا یونٹ ٹھہرا ہوا تھا۔ انہوں نے روزینہ کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ ریاض شاہد نے پولیس کی مدد سے بڑی مشکلوں سے ان جنگجو قبائلی عاشقوں سے جان چھڑائی مگر انہوں نے دھمکی دی۔ ''ہم پھر آئیں گے اور اپنی جان جگر کو اغوا کر کے لے جائیں گے۔''

''ریاض شاہد نے راتوں رات یونٹ کو لے کر کراچی کوچ کیا اور متبادل لوکیشن کے طور پر ایبٹ آباد کی حسین وادیوں میں باقی عکس بندی مکمل کی۔''

''فلمی اداکاراؤں کے ساتھ اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔'' دادا جی نے خوشگوار موڈ میں کہا۔ ''اپنے دور کی نامور گلوکارہ و اداکارہ ثریا پر تو ایک صاحب ایسے عاشق ہوئے کہ اس کے گھر کے سامنے مستقل ڈیرا ڈال دیا کہ جب تک ثریا مجھ سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوگی میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' وہ ذرا رک کر بولے۔ ''جبکہ ہمارے لاہور میں ایک صاحب نور جہاں کے پیار میں اس قدر دیوانے ہوئے کہ رات کی تاریکی میں اس کے کوٹھے میں کمند ڈال دیا مگر ان کی قسمت خراب تھی کہ منزل مقصود تک پہنچنے میں ابھی دو چار ہاتھ کا فاصلہ تھا کہ کمند ٹوٹ گئی اور موصوف دھڑام سے نیچے آگرے اور اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھے۔''

''روزینہ بے چاری کو تو۔'' میں نے دادا جی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''باہر کے لوگوں کے علاوہ ساتھی اداکاروں سے بھی جان چھڑانا مشکل ہوجاتا تھا۔ اس سلسلے میں اداکار شاہد خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ فطرتاً بڑا عاشق مزاج واقع ہوا تھا۔ ایک فلم ''اللہ میری توبہ'' میں اسے روزینہ کے مقابل ہیرو کاسٹ کیا گیا تو وہ روزینہ کے حسن و شباب پر اس طرح فریفتہ ہوا کہ اس غریب کو شاہد سے جان چھڑانا مشکل ہوگیا۔''

ابھی میں رکا ہی تھا کہ سید صاحب بول پڑے۔ ''یہ جو آپ ابھی نور جہاں کے کوٹھے پر ایک عاشق کے کمند ڈالنے کی بات کر رہے تھے کہیں اسی کے بارے میں تو علامہ اقبال نے یہ شعر نہیں کہا تھا

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

دادا جی نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور اپنے پیروں پر ہاتھ مار کر بولے۔ ''اے الو کی دم فاختہ! علامہ صاحب نے آسمان کے ستاروں کی بات کی ہے، فلمی ستاروں کی نہیں۔''

''جبکہ وہ تو ......'' میں نے ان کی بات آگے بڑھائی۔ ''اس واقعہ سے بہت پہلے جنت آشیانی ہو چکے تھے۔''

دادا جی بولے۔ ''ستاروں پر کمند ڈالنے کا مطلب ہے انہونی کو ہونی کرنا۔ کوئی کارنامہ سرانجام دینا۔''

سید صاحب کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے مگر بعد میں مجھ سے بولے۔ ''میں نے یہ بات محفل کو زعفران بنانے کی نیت سے کی تھی کیونکہ سنجیدہ گفتگو سے ماحول بڑا گمبھیر ہوگیا تھا۔ میں ایسا بھی چغد نہیں کہ ایسی احمقانہ بات کروں۔''

اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے واقعی جان بوجھ کر ایسی بے وقوفانہ بات کہی تھی یا...... جب قہقہوں کا طوفان رکا تو میں نے سنجیدہ گفتگو کا دوبارہ آغاز کیا۔

''ابھی ریاض شاہد کی تاریخی فلم ''غرناطہ'' کے حوالے سے بات ہو رہی تھی۔ تو اسی فلم کے حوالے سے ایک یادگار واقعہ کی یاد آگئی جو آپ لوگوں کو بھی سنانا چاہوں گا۔ ہوا یوں کہ اس فلم کی تکمیل کے دوران پنڈی جاتے ہوئے روزینہ

کی کار کو حادثہ پیش آ گیا۔ انہیں فوری طور پر پنڈی کے ایک اسپتال میں داخل کیا گیا پھر یہاں سے انہیں بذریعہ ہوائی جہاز لاہور لا کر ایک اسپتال میں ایڈمٹ کیا گیا تو پتا چلا کہ ان کی ایک ہڈی میں فریکچر ہو گیا ہے جس کے علاج کے لیے روزینہ کو تین ماہ تک اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ اس دوران وحید مراد اور ان کے والد نثار مراد نے روزینہ کی بے حد دیکھ بھال کی۔ کہتے ہیں کہ دکھ اور تکلیف کے وقت ہی پتا چلتا ہے کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے۔ روزینہ جو اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور وحید مراد اور ان کے والد نثار مراد اس دنیا میں موجود نہیں اس کے باوجود آج بھی ان دونوں کے اس احسان کو نہیں بھولیں۔ جب بھی انہیں اس حادثے کی یاد آتی ہے ان کے دل سے ان محسنوں کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔

''بظاہر یہ چھوٹا سا واقعہ ہے۔'' دادا جی بولے۔ ''مگر اس سے پتا چلتا ہے کہ فلم والوں میں بھی اچھے اور نیک لوگ موجود تھے اور اب بھی ہیں۔''

''دادا جی! آپ نے اچھے اور نیک دل فلم والوں کی نشاندہی کی ہے تو۔'' میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی حادثے کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی یادگار ہے۔ روزینہ حادثے کا شکار ہو کر تین مہینوں کے لیے بستر سے جا لگیں تو ایک فلم ''افشاں'' جس کے لیے روزینہ کو ہیروئن سائن کیا گیا تھا۔ اس کے فلم ساز کو تشویش لاحق ہوئی کہ اتنی دیر تک وہ کیسے انتظار کریں گے لہٰذا انہوں نے اداکارہ شبنم سے رابطہ کیا اور کہا ہم تمہیں روزینہ کی جگہ کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ شبنم سیدھے اسپتال پہنچ گئیں اور روزینہ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا......

''بولو اب میں کیا کروں؟'' شبنم نے کہا۔ ''تم اجازت دو گی تو فلم میں کام کروں گی۔''

''ضرور کرو میری طرف سے اجازت ہے۔ یہ تو تمہارا بڑا پن ہے کہ تم مجھ سے اجازت لینے آ گئیں۔''

''ہاں اس واقعے سے بھی ان دونوں اداکاراؤں کے بلند اخلاق اور کردار کا پتا چلتا ہے۔'' دادا جی نے کہا پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ ''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ''غرناطہ'' کی شوٹنگ کے دوران روزینہ اور صابرہ سلطانہ دوپٹا... بدل بہن بن گئی تھیں۔ تمہاری انفارمیشن کیا کہتی ہے؟ کیا یہ خبر درست ہے؟''

''ہاں دادا جی، غرناطہ کی شوٹنگز کے دوران جو واقعات پیش آتے تھے وہ اس دور کے اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوتے تھے۔ صابرہ سلطانہ اور روزینہ کی دوپٹا بدل بہنیں بننے کا قصہ بھی اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ یہ واقعہ 21 ستمبر کو ہوا تھا جو اتفاق سے دونوں کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ صابرہ سلطانہ نے اس فلم میں روزینہ کی عیسائی والدہ کا کردار ادا کیا تھا جبکہ جمیل اس فلم کا ہیرو تھا۔ واضح رہے کہ جمیل ہمایوں مرزا کی فلم ''سزا'' میں بھی روزینہ کے مقابل ہیرو کے روپ میں پیش ہو چکا تھا مگر ''سزا'' کی طرح ''غرناطہ'' میں بھی اس نے اپنی اداکاری سے کسی کو متاثر نہیں کیا۔''

''جس کے بعد......'' دادا جی جھٹ بول پڑے۔ ''وہ فلموں سے ایسا بددل ہوا کہ یہاں سے بھاگ کر انڈیا چلا گیا اور حیدرآباد دکن میں رہائش اختیار کی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں جنہوں نے بولی ووڈ کی فلموں میں کام کیا اور زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ ان میں سے ایک فرح تھی اور دوسری تبو۔ فرح تو شادی کر کے گھر بیٹھ گئی جبکہ تبو اب بھی فلموں سے وابستہ ہے۔ اس کی حالیہ ریلیز فلم ''حیدر'' ہے جس میں اس نے میچور رول ادا کیا ہے۔'' دادا جی نے ذرا رک کر اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''وہ جو کسی نے کہا ہے اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند تو کچھ ایسی ہی بات جمیل کے ساتھ پیش آئی۔ وہ خود تو فلموں میں اداکاری کر کے کامیاب نہ ہو سکا مگر اس کی دونوں بیٹیوں نے ممبئی کی فلمی دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔''

سید صاحب کی بیگم گرما گرم چائے لے کر آ گئی تھیں۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے گفتگو کا سلسلہ رک گیا۔ چائے پی کر جب ہم تازہ دم ہو گئے تو دادا جی بولے۔ ''میاں! تم نے روزینہ کے ہر طرح کے کردار کرنے پر تنقید تو کی ہے دو چار ایسی فلموں کے بارے میں تو بتاؤ۔''

میں نے ذرا ذہن پر زور دیا پھر کہا۔ ''دادا جی! جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ روزینہ نے فلمیں سائن کرتے وقت احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اس کی وجہ کوئی بھی ہو، اس سے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچا۔ ورنہ اس جیسی صلاحیت کی حامل اداکارہ بہت ترقی کرتی۔ بہت بڑی اداکارہ بن جاتی۔ اسے گویا مفت کا مال سمجھ کر ہر فلم والا اپنی فلم کا حصہ بناتا رہا۔ جس خانے میں چاہتا فٹ کر دیتا۔ ایک فلم میں اس سے اس دور میں آئیٹم سانگ کروایا گیا جب آج کی طرح آئیٹم سانگ کا رواج نہیں تھا۔ محض اس لیے کہ ان دنوں

نمبر شمار	بطور ہیروئن	نمبر شمار	بطور سائڈ ہیروئن
1	چوری چھپے	1	میرے بچے میری آنکھیں
2	نقوش	2	احسان
3	بیٹی بیٹا	3	سنگدل
4	منزل دور نہیں	4	دوسری ماں
5	السلام علیکم	5	سمندر
6	پیار کی جیت	6	اشارہ
7	سزا	7	آسرا
8	لوان یورپ	8	چپکے جانتے نہیں
9	چاند سورج	9	تم ہی ہو محبوب مرے
10	سوغات	10	بہاریں پھر بھی آئیں گی
11	پردیسی (پنجابی)	11	ہنی مون
12	رم جھم	12	مسٹر چار سو بیس
13	خاموش نگاہیں	13	جلتے سورج کے نیچے
14	غرناطہ	14	دو پتر اناراں دے (پنجابی)
15	مجرم کون	15	اچا شملہ جٹ دا (پنجابی)
16	دولت اور دنیا	16	آؤ پیار کریں
17	وارث	17	سجن دشمن (پنجابی)
18	سر دھڑ دی بازی (پنجابی)	18	انسان اور گدھا
19	ٹھاہ (پنجابی)	19	غیرت دا نشان (پنجابی)
20	ہیرا (پنجابی)	20	خون دا بدلہ خون (پنجابی)
21	بشیرا (پنجابی)	21	رنگی
22	پروفیسر	22	ڈاکو تے بدمعاش (پنجابی)
23	سادھو اور شیطان	23	انتقام دی آگ (پنجابی)
24	اللہ میری توبہ	24	دھرتی لہو سنگدی (پنجابی)
25	اسے دیکھا اسے چاہا	25	بدلہ یار دا (پنجابی)

اس کا شباب آنکھوں کو خیرہ اور دل کو بے قابو کرنے والا تھا۔ اس کے بول تھے

شعلہ ہوں شباب کا، جام ہوں شراب کا

"یہ فلم تھی اسلم ڈار کی "زرق خان" اسلم ڈار کی دور بین نگاہوں نے روزینہ کو ایک آئیٹم سانگ کے لیے منتخب کر کے اس فلم کی کامیابی کو یقینی بنایا جبکہ اس طرح کا کردار ادا کر کے روزینہ نے اپنی ساکھ کو بری طرح مجروح کیا۔ اسی طرح اقبال یوسف کے چھوٹے بھائی نعیم یوسف کی ہدایت کاری میں بننے والی فلم "قیامت" میں بھی اسے ہرگز کام نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہ اپنے والد ایس ایم یوسف اور بھائی اقبال یوسف کے برخلاف بالکل اناڑی ڈائریکٹر تھا۔ اس فلم میں روزینہ کو ایک حرافہ عورت (نائیکہ) کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کردار میں اس کے حسن و شباب کو زیادہ سے زیادہ ایکسپوز کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے باوجود یہ فلم اپنی ناقص ترین ہدایت کاری کے سبب سپر فلاپ فلم ثابت ہوئی۔"

"میں سمجھ گیا۔" دادا جی بولے۔ "روزینہ نے اور بھی بہت سی فلمیں آنکھیں بند کر کے سائن کی ہوں گی۔ جس سے اسے وقتی طور پر تو کچھ مالی فائدہ ہو گیا ہوگا مگر اس طرح وہ صف اوّل کی اداکارہ بننے کی راہ میں خود ہی حائل رہی۔ بڑی اداکارہ بننے کے لیے کبھی کبھی بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ جو کریکٹر آفر کی جاتی ہے اسے دیکھنا پڑتا ہے جو ڈائریکٹ فلم ڈائریکٹ کرنے والا ہے، اس کے بارے میں بھی سوچنا پڑتا ہے کہ وہ فلم کی کامیابی میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ بعض اداکارائیں تو اس قدر محتاط ہوتی ہیں کہ وہ کسی طرح کا سمجھوتا نہیں کرتیں۔ زیبا نے ایک فلم میں ایسا کردار ادا کیا تھا جس میں نوجوانی سے لے کر پختہ عمر کی عورت کا رول اسے کرنا تھا، ہدایت کار نے جب میچور رول کرنے کے لیے اس کے بالوں میں تھوڑی سفیدی دکھانی چاہی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔"

"میں تو ایک آدھ لٹ بھی سفید نہیں کراؤں گی۔"

"مگر یہ تو فلم کی ڈیمانڈ ہے۔"

"ہوگی، لیکن میری نہیں ہے۔ آپ میرے سیاہ بالوں کے ساتھ ہی شوٹنگ کروانا چاہتے ہیں تو کروائیں ورنہ میں گھر جاتی ہوں۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔" میں نے ان کی تائید کی۔ "اس سلسلے میں وہ بڑی پکی تھیں۔ اسی وجہ سے

انہوں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی کہ ڈھلتی ہوئی عمر میں انہیں دوسری اداکاراؤں کی طرح مجبور رول نہ کرنا پڑے، اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی بہترین مثال ندیم کی ہے۔ جب ''چکوری'' کی بلاک بسٹرڈ کامیابی کے بعد لاہور والوں نے انہیں اپنی فلموں میں پیش کرنا شروع کیا تو انہوں نے ایک دم اپنا معاوضہ ستر ہزار کر دیا جبکہ ان دنوں محمد علی 55 ہزار اور وحید مراد 50 ہزار معاوضہ لیتے تھے جس کے بعد انہوں نے بھی اپنے معاوضے بڑھا دیے۔''

''روزینہ کی باتیں ہو رہی تھیں کہ انہوں نے اپنی بد احتیاطی کی وجہ سے اپنی ساکھ کو نقصان پہنچایا۔'' خالد علی سید نے ہماری توجہ ایک بار پھر روزینہ کی طرف مبذول کروائی۔ ''مگر آپ نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے کئی بڑی بڑی فلموں میں بڑے بڑے ہیروز کے ساتھ ہیروئن کے کردار بھی ادا کیے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا تو ان کو یہ بڑی بڑی فلمیں کیوں ملیں؟''

''تمہارے دوست نے تو بڑا جینوئین سوال پوچھ لیا ہے۔'' دادا جی بول پڑے۔ ''ایک عام انسان اسی طرح سوچتا ہے۔''

''بات دراصل یہ ہے جو میں پہلے بھی کہتا رہا ہوں کہ روزینہ کو دو خوبیاں قدرت کی طرف سے ملی تھیں۔ ایک پُرشباب حسن اور دوسری اس کی خداداد فنی صلاحیت۔ کچھ فلم میکرز نے تو محض اس کے حسن اور اس کی جوانی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جبکہ کچھ نے اس کی صلاحیتوں کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان کے لیے اس کا حسن و شباب پلس پوائنٹ تھا۔ ایسے ہی فلم والوں نے اسے ہیروئن یا سائڈ ہیروئن کے طور پر کاسٹ کیا۔ اس کوشش میں وہ بھی کامیاب ہوئے اور روزینہ بھی۔ ایسی فلموں میں جاپانی گڈی، بشیرا، ٹھاہ، غرناطہ، چاند سورج، سوغات، ہیرا، وارث، سنگدل، اشارہ، جیسے جانتے نہیں، تم ہی ہو محبوب میرے، ہنی مون، جلتے سورج کے نیچے، انسان اور گدھا، عشق حبیب اور دوسری ماں وغیرہ اس کی بطور ہیروئن اور سائڈ ہیروئن کامیاب فلمیں ہیں جن میں اس نے یوسف خان، سلطان راہی، سدھیر، وحید مراد، ندیم، کمال، اعجاز، اقبال حسن جیسے بڑے اور مستند ہیروز کے ساتھ اداکاری کی۔ اب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ تمام تر بد احتیاطی کے باوجود روزینہ کے حصے میں کچھ اچھی اور کامیاب فلمیں کیوں آئیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا

26	سکندرا (پنجابی)	26	امیرتے غریب (پنجابی)
27	سوہنا بابل (پنجابی)	27	عشق حبیب
28	استاد	28	آزادی یا موت
29	مرداں ہتھ میدان (پنجابی)	29	ناخدا
30	دو دشمن	30	الف لیلہٰ
31	بابل ڈاٹو (پنجابی)	31	انیلا
32	جاپانی گڈی (پنجابی)	32	قسم اس وقت کی
		33	کردار
		34	نجمہ
		35	عظمت
		36	دکھ سجنادے (پنجابی)
		37	خبردار
		38	بڈھا شیر (پنجابی)
		39	عاشق لوگ سودائی (پنجابی)
	بطور ریپ		
1	افسانہ		بطور مہمان اداکارہ
2	سوہنی مہینوال (پنجابی)	1	ہمیں بھی جینے دو
	بطور ثانوی اداکارہ	2	نشان (پنجابی)
1	ارمان	3	قاتل (پنجابی)
2	اکیلے نہ جانا	4	زرق خان
3	درد دل		
4	بے قصور		بطور اولڈ اداکارہ
5	جاسوس	1	شیشے کا گھر
6	مشرق مغرب	2	قیامت
7	بدگمان		
8	غیرت دی موت (پنجابی)		
9	بدگمان (پشتو)		

...کہ اس سلسلے میں روزینہ کی کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں اس کا سارا کریڈٹ ان دور بین نگاہوں والے فلم میکرز کو جاتا ہے کہ جنہوں نے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر اسے کاسٹ کیا اور اپنی فلموں کی کامیابیوں کو یقینی بنایا۔''

''یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے۔'' میرے خاموش ہونے کے بعد سید صاحب بولے۔'' ایک اداکارہ جو عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئی، جس کی مادری زبان انگریزی ہے، جو اردو تو بول سکتی ہے مگر علاقائی زبانوں سے بالکل ناواقف ہے، وہ پنجابی فلموں جاپانی گڈی، بشیرہ، ٹھاہ اور وارث وغیرہ میں اس قدر کامیاب کیونکر ہوگئی؟''

''فلم کی کامیابی کسی ایک فرد کی مرہون منت نہیں ہوتی۔ پوری ایک ٹیم ہوتی ہے جن کی مدد سے فلم مکمل کی جاتی ہے۔ ہاں اس ٹیم کا کپتان ڈائریکٹر جس قدر سوجھ بوجھ کا حامل ہوتا ہے جتنا پڑھا لکھا، تربیت یافتہ اور باشعور ہوتا ہے اتنا ہی اپنی ٹیم سے بہتر کام لیتا ہے۔ اپنی ٹیم کے انتخاب میں بھی اس کی دور بینی اور وژن بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اب اسی بات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ روزینہ کے بارے میں یہ جانتے ہوئے کہ وہ پنجابی نژاد نہیں ہے اردو فلموں میں اداکاری کرتی رہی ہے اسے جاپانی گڈی، بشیرا، ٹھاہ کے ہدایت کاروں نے اس یقین کے ساتھ عالیہ، آسیہ اور فردوس وغیرہ پر ترجیح دی اور اس سے حسب منشا ایسی اداکاری کروائی کہ روزینہ ان فلموں میں انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ثابت ہوئی۔''

''ایک بات اور بھی ہے۔'' دادا جی بولے۔'' فلم کی کامیابی میں زبان کا اتنا عمل دخل نہیں ہوتا جتنا اس کی دیگر خوبیوں کا ہوتا ہے۔ فلم اگر اچھی ہوگی تو چاہے جس زبان میں بھی بنائی جائے گی کامیاب ہوگی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جو زبان جتنی زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اس میں بننے والی فلم کے دیکھنے والے اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔''

روزینہ سے متعلق تقریباً ساری ہی باتوں کا ذکر ہو چکا تھا۔ سید صاحب بھی خاصے مطمئن نظر آرہے تھے کہ میں نے دادا جی کو چھیڑا۔'' دادا جی آپ تو گانوں کے بڑے رسیا ہیں۔ روزینہ کی فلموں کے کچھ گانے یاد ہوں تو ان کی نشاندہی بھی کیجیے؟''

''ہاں کچھ گانے یاد ہیں مگر اس حوالے سے کہ وہ روزینہ ہی پر فلم بند ہوئے تھے۔'' ذرا توقف کے بعد بولے۔'' روزینہ کے دور میں، میں فلمیں دیکھا کرتا تھا اب ریڈیو پر وہ گانے سنتا ہوں تو روزینہ کا سراپا نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔'' ذرا رک کر انہوں نے ذہن پر زور دیا پھر کہنا شروع کیا۔ ایک گانا تھا'' تیرا نام میرا نام ساتھ ساتھ ہوگا سیاں کچھ عرصے کے بعد'' یہ فلم جیسے جانتے نہیں کا گیت ہے جسے مالا نے گایا تھا۔ اسی طرح احمد رشدی اور ناہید نیازی کی آوازوں میں بڑا پیارا گانا تھا۔'' رات چلی ہے جھوم کے۔'' ساتھی اداکار وحید مراد تھے اور فلم تھی ''جوش'' جس میں پہلی بار پانچ ہیروز اور پانچ ہیروئنز کا تجربہ کیا گیا تھا۔ ایک گیت تھا'' میرے جوڑے میں گیندے کا پھول، بول میں تجھے کیسے دیکھوں؟'' یہ فلم سزا کا گانا تھا اور مالا نے گایا تھا۔ ''دولت اور دنیا'' کے لیے نور جہاں کا گایا ہوا نغمہ جو روزینہ پر پکچرائز ہوا'' کس نام سے پکاروں کیا نام ہے تمہارا'' اسی فلم کا دوسرا گانا جسے نور جہاں نے گایا اور روزینہ اور وحید مراد پر عکس بند ہوا'' حسیں فضا کا تقاضا ہے مجھ سے پیار کرو'' ایک اور نغمہ'' میرے محبوب مرے پیار کے قابل ہے تو'' فلم ہے'' مجرم کون؟'' گانے والی ہیں نور جہاں۔ روزینہ پر پکچرائز ہونے والا گیت'' ہو جنم جنم تیرا مرا ساتھ رہے گا'' آواز رونا لیلیٰ کی فلم'' پروفیسر'' '' میں نے ایک آشیاں بنایا تھا'' نور جہاں کے گائے ہوئے اس نغمے پر بھی روزینہ نے بڑی جاندار اداکاری کی تھی۔ فلم تھی'' رم جھم'' ...... ''انسان اور گدھا'' فلم کا نام گانے والی نور جہاں گیت کے بول'' تو ہے میرا پیار تجھے میں کیسے سمجھاؤں''۔ پنجابی فلم ٹھاہ کا بڑا مشہور نغمہ'' تیرے ملنے نوں آئی کنے چاہ کر کے، آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے'' آواز نور جہاں کی۔ نور جہاں ہی کا گایا ہوا پنجابی فلم'' بشیرا'' کا گیت'' پہلے اکھ لڑ دی فیر دل مل دے'' اور بھی بڑے اچھے اور پیارے پنجابی نغمے روزینہ پر پکچرائز ہوئے ہیں مگر اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ ہاں روزینہ کی ایک پنجابی فلم کا گانا بہت مشہور ہوا مگر یہ روزینہ پر عکسبند نہیں ہوا ہے۔ گیت کے بول ہیں'' سانوں نہر والی پل تے بلا کے ماہی کتھے رہ گیا'' یہ فلم'' لاڈو'' کا سدا بہار گیت ہے جو اداکارہ فردوس پر عکس بند ہوا تھا۔ روزینہ نے اس میں ایک مختصر کردار ادا کیا تھا مگر بڑا پُراثر تھا۔ چھوٹا کردار ہو یا بڑا۔ اصل بات اس کے ادا کرنے والے کی صلاحیت پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روزینہ اپنے دور کی بہت بڑی پرفارمر تھی۔ اگر اسے مس یوز نہ کیا جاتا تو اس دور کی بہت بڑی اداکارہ ہوتی۔
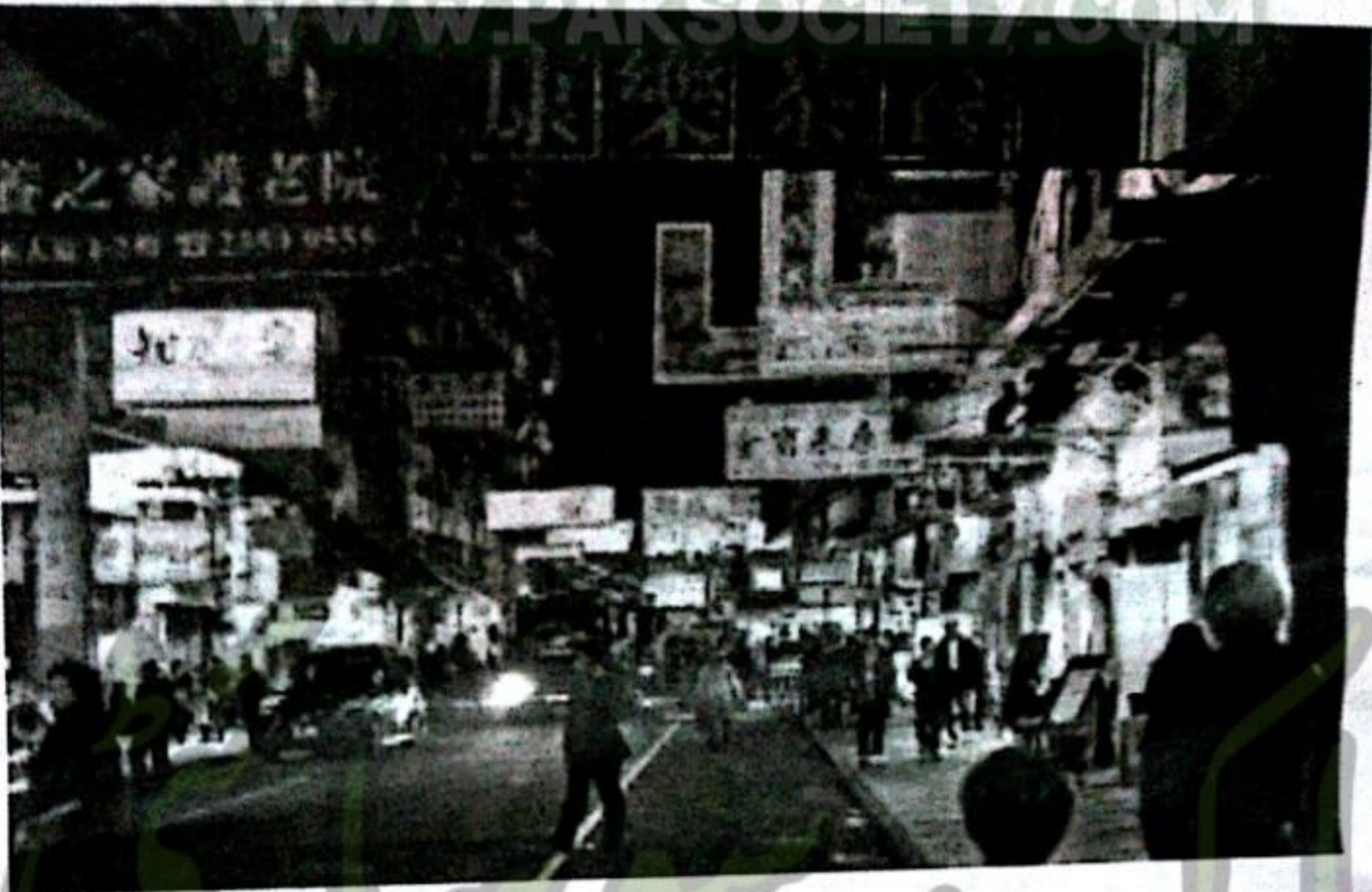
ہانگ کانگ

الطاف شیخ/مترجم: ابراھیم جمالی۔

سفر نامہ نگار الطاف شیخ سرگزشت کے قارئین کے لیے نئے نہیں ہیں۔ بہت سے طویل سفر نامے انہی صفحات میں پیش کیے جاچکے ہیں مگر اس بار ایک مختصر سا سفر نامہ بطور خاص مصنف نے بھیجا ہے۔ اس سفر کہانی کی خوبی یہ ہے کہ آخری سطر تک قاری مسحور رہتا ہے۔ ایک عمدہ سفر نامے کے تمام لوازمات اس مختصر تحریر میں آپ کو نظر آئیں گے۔

سفر نامہ پڑھنے والوں کے لیے اس ماہ کا تحفہ

میں پہلی مرتبہ جس بحری جہاز میں ہانگ کانگ پہنچا۔ اس کا وہاں صرف ایک دن ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔ ہانگ کانگ ٹیکس فری پورٹ تھا۔ اس لیے وہاں سے ہمیں اپنے جہاز کے لیے تین ہفتے کا ایندھن اور عملے کے لیے راشن پانی لینا تھا۔ ہمیں اگلے ہی دن ہانگ کانگ سے روانہ ہوکر پسیفک سمندر کراس کر کے لاس اینجلس جانا تھا۔ ہم ایک مہینا قبل کراچی سے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں ملائیشیا کی بندرگاہ پینانگ میں دس دن رکنا پڑا تھا۔ وہاں

سے ہم نے امریکا کے لیے آٹھ ہزار ٹن مچھلی اٹھائی تھی۔ ہمارا جہاز ریفریجیٹڈ کارگو جہاز تھا۔ ہم اس پر جنرل کارگو کے علاوہ مچھلی، جھینگے اور ذبح شدہ بکروں کا گوشت بھی لے جاسکتے تھے۔ ہمارے جہاز کے گوداموں کا ٹمپریچر منفی 30 تک رکھا جاسکتا تھا۔ یاد رہے یہ درجۂ حرارت گھروں میں موجود ڈیپ فریزر سے تین گنا زیادہ ہے۔ ان میں زیادہ سے زیادہ منفی دس ڈگری تک ہوتا ہے۔

ہانگ کانگ جانے کا سن کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں اپنے لیے بھی خریداری کرنا تھی۔ ان دنوں میں سنگاپور، کولمبو، عدن سے بھی کم قیمت پر چیزیں ہانگ کانگ میں ملتی تھیں۔ ہم سب خوش ہوگئے کیوں کہ عملے کے ہر فرد کو تنخواہ مل چکی تھی حالانکہ میں جونیئر پوسٹ پر تھا، تنخواہ بھی کم تھی لیکن اس کے باوجود ان دنوں ہانگ کانگ میں بے حد سستائی تھی اور ہمارے روپے کی قدر بھی خاصی مضبوط تھی۔ اس لیے خریداری کرنے کی ٹھان لی۔

جیسے ہی ہمارے جہاز نے ہانگ کانگ کی بندرگاہ میں لنگر گرایے اور ہمیں Shore leave (ساحل پر جانے کی اجازت) ملی ہم نے بلا تاخیر جہاز چھوڑ دیا۔ میں نے بھی دوسروں کے ساتھ شاپنگ کی۔ قمیص، جیکٹ، گھڑیاں، ٹرانسسٹر ریڈیو، کتابیں غرضیکہ بہت خریداری کی لیکن ہماری جیب میں موجود رقم ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ اس دور میں کمپیوٹر تو کجا دی سی آر بھی ایجاد نہیں ہوا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک چیز خرید کر رقم ٹھکانے لگائی جاتی۔ جہاز پر مفت کھانا ملتا تھا لیکن اس کے باوجود ہانگ کانگ کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ بہر حال مہینے کی تنخواہ سے چند ڈالر بچا کر میں جہاز پر پہنچا کیونکہ شام کو جہاز لنگر اٹھانے والا تھا۔ جہاز پر پہنچتے ہی خریدا ہوا سامان کیبن کے ایک گوشے میں پٹخا اور لمبی تان کر سو گیا کیونکہ دن کی چھٹی ہونے کی وجہ سے رات کو جہاز چلانے کی ڈیوٹی کرنی تھی۔

شام سات بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہی بندرگاہ کا ماحول تھا۔ ہر چیز پہلے کی حالت میں موجود تھی۔ جہاز کے روانہ ہونے والی خاموشی تھی نہ ماحول میں ڈپریشن کا عالم تھا جو اکثر بندرگاہ سے روانہ ہونے کے وقت درپیش ہوتا ہے۔ میں کیبن سے نکل کر ڈنر کے لیے ڈائننگ سیلون میں آ گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہمارے جہاز کی Sailing کینسل ہوگئی ہے۔

''اس کا مطلب ہے صبح سویرے روانہ ہوں گے۔ آپ کی واچ (ڈیوٹی) میں۔'' میں نے اپنے امیڈیٹ باس سیکنڈ انجینئر سے پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ اندھا مانگے ایک آنکھ۔'' انہوں نے آنکھ مارتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ''لیکن یہاں دونوں مل رہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ہانگ کانگ میں گزارا ہوا ایک دن بھی پورے سفر کی تکان اتار دیتا ہے۔ اب آپ پورا ایک ہفتہ ہانگ کانگ میں رہ کر آرام کریں، گھومیں پھریں، شاپنگ اور سیر کریں۔'' مجھے خاموش پا کر انہوں نے اس کا سبب بتایا۔

''کارگو کی ٹرانسشپمنٹ ہو رہی ہے۔ ہمارے جہاز کا سامان دوسرے جہاز میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ اب وہی جہاز لاس اینجلس جائے گا۔ دوسرے جہاز میں کارگو منتقل کرنے میں کم از کم ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ ہمارے جہاز کے لیے حکم آیا ہے کہ ہمیں سیدھے جاپان پہنچنا ہے کیونکہ ہمارے جہاز کی ڈرائی ڈاکنگ کے لیے جگہ مل گئی ہے۔''

دراصل ہمارے جہاز کی ڈرائی ڈاکنگ یعنی جہاز کو خشک گودی میں کھڑا کر کے اس کی بیرونی صفائی اور مرمت Due تھی لیکن زیادہ رش کے سبب ہمیں اپنے جہاز کی باری آنے کا یقین نہیں تھا۔ اب جیسے ہی جاپان کی گودی سے یقین دہانی کروائی گئی تو ہمیں اپنا طے شدہ پروگرام کینسل کرنا پڑا۔ ہانگ کانگ جیسی بندرگاہ پر رہنے کی خوشی کس جہازی کو نہ ہوگی؟ جہاں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا ہے لیکن ایسے میلے میں خالی جیب کیا لطف آسکتا ہے۔ میرے پاس جو رقم موجود تھی میں اسے نصف دن ہی میں ٹھکانے لگا آیا تھا۔ بہر حال اب بھی میری جیب میں اتنی رقم ضرور تھی کہ بس میں سفر کر کے کہیں جاسکوں۔ ایسی بندرگاہ میں ہوتے ہوئے اپنے آپ کو جہاز کے کیبن تک محدود رکھنا کتنی بڑی ٹریجڈی ہے۔ میں اپنے ذہن کو اس بات کے لیے تیار رکھتا تھا لیکن اس دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ جہاز پر ہرگز نہیں رہنا ہے۔ پیدل ہی سہی، ہانگ کانگ اور کولون کی سیر ضرور کی جائے گی۔ جہاز سے ہر صورت دور رہنا تھا۔ اسی میں ہم جونیئرز کی عافیت ہے کہ ڈیوٹی ختم ہوتے ہی کنارے کا رخ کیا جائے۔ دوسری صورت میں کام کی زیادتی کے سبب ہر سینئر انجینئر کسی نہ کسی کام سے لگا دیتا ہے کہ ''یار تم کنارے پر نہیں جا رہے تو فلاں مشینری کی اوور ہالنگ کردو۔ فلاں پمپ کو

ذرا ٹھیک کردو...... بوائلر کو چیک کرلو۔" وغیرہ وغیرہ۔

ایسی بیگار سے بہتر ہے کہ ہانگ کانگ جیسی خوب صورت بندرگاہ کی کسی بینچ پر بیٹھا جائے یا کسی پارک میں وقت گزارا جائے۔

بہرحال اس مشکل حالت میں بھی میرے لیے گویا ایک قسم کی بہتری سامنے آئی تھی۔ عام طور پر ہم جہاز والے لوگ بندرگاہ میں صرف دکانوں اور شاپنگ سینٹرز پر جا کر رقم اور وقت خرچ کرنے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اب میں ناشتا کر کے لنچ کے لیے دو سینڈوچ پیک کروا کر جہاز سے روانہ ہونے لگا۔ جاپان کی طرح ہانگ کانگ کے نلکوں کا پانی بھی ہائی جنک سمجھا جاتا ہے۔ بسوں کے کرایے جتنی رقم میرے پاس موجود تھی لیکن میرے لیے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا۔ کیپٹن احمد حسین مخدوم کے کہنے کے مطابق اپنی گیارہ نمبر بس یا بقول کیپٹن عالم شیخ کے، گوڈا گاڑی استعمال کرتا تھا یعنی اپنی دو ٹانگوں سے کام لیتا تھا۔ کیپٹن مخدوم بھی میرے ساتھ اسی جہاز پر تھے۔ وہ میری طرح جونیئر پوسٹ پر یعنی تھرڈ آفیسر تھے۔ دو تین دن کے بعد ان کے اور پھر دوسرے جونیئر ساتھیوں کے بھی پیسے ختم ہو گئے پھر وہ بھی ہمارے پیدل گروپ میں شامل ہو گئے۔

مجھے غربت سے یہ فائدہ ہوا کہ میں اس بندرگاہ کے قدرتی نظاروں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ گلیوں اور راستوں پر چلنے لگا۔ لائبریریوں اور میوزم جاتا رہا۔ مجھے جب بھی موقع ملتا مقامی لوگوں سے باتیں کرتا۔ اس دوران میں کئی سندھیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ مجھے ان سے مطالعے کے لیے سندھی رسالے حاصل ہوئے۔ انہی لوگوں سے مجھے کے سٹیل نامی ایک سندھی بزنس مین کا معلوم ہوا جو انڈین نامی رسالہ نکالتے تھے۔ وہ اپنے رسالے میں ہانگ کانگ میں مقیم سندھیوں کے بارے میں لکھتے تھے۔

کسینل داس کیول رام موٹوانی (کے سیتل) ونڈہام اسٹریٹ پر رہتے تھے اور وہ جگہ بندرگاہ کے قریب تھی۔ میں اگلے ہی دن شام کو ان سے ملنے چلا گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ ہانگ کانگ کے معروف بزنس مین ہیں۔ ان کی مصروفیات کا بھی احساس تھا۔ ان کے سامنے میری کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ میں ایک نوجوان ٹورسٹ، حال ہی میں میرے کالم ایک سندھی اخبار میں چھپنا شروع ہوئے تھے اور فی الحال میری صرف تین ہی کتابیں شائع ہو سکی تھیں لیکن سیتل سے مل کر مجھے خوشی اور حیرت ہوئی کہ وہ ایک ایسے سیٹھ تھے جن کا کاروبار دنیا بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ علم، ادب و ثقافت سے دلی شغف رکھتے تھے۔ اپنے رسالے کا ایڈیٹر ہونے کے علاوہ اکنامکس اور فائنانس پر مضمون لکھتے تھے جو بیوپاری قسم کے لوگوں کے لیے گائڈ کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے مرتب کی ہوئی انٹرنیشنل بزنس ڈائریکٹریز کو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں سندھی فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کو ہانگ کانگ مدعو کر کے محافل منعقد کرنے کا شوق تھا۔

"جب انہیں معلوم ہوا کہ میں حیدرآباد، سندھ سے آیا ہوں اور مجھے لکھنے پڑھنے کا بھی شوق ہے تو بہت خوشی کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنے رسالے کی کاپیوں کے علاوہ مجھے دوسرے بھی کئی رسالے دیے پھر انہوں نے مجھے کھانے کی دعوت دی...... میرا مطلب ہے انہوں نے خلوص دل سے دعوت دی تھی۔ بقول لوک رام دودیجا کے، شکارپوری بھائی بندوں والی دعوت نہیں کہ کھانا بھی تیار ہے اور آخری بس کا وقت بھی ہو گیا ہے۔"

بہرحال میرے لفافے میں سینڈوچ میرے لیے کافی تھے۔ جہاز پر بوریت دور کرنے کے لیے ان کے دیے ہوئے رسالے میرے لیے اہم تھے۔

"کل پینشولا ہوٹل میں سندھی فنکاروں کی محفل ہے۔" سیتل نے کہا۔ "آپ پانچ بجے یہاں آجائیں پھر ساتھ چلیں گے۔"

سیتل کے ساتھ نہ صرف اس محفل میں بلکہ بعد میں جب بھی ہانگ کانگ جانا ہوتا میں اکثر ان کے ساتھ سندھی اور ایشیائی لوگوں کے جلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتا رہا۔ اس طرح ہانگ کانگ کو ہر پہلو سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ سیتل سے آج تک میری علیک سلیک جاری ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا کہ ان دنوں میں میری جیب خالی تھی اور میں جہاز کا بڑا افسر ہونے کی بجائے جونیئر تھا۔ اسی کے طفیل سیتل جیسے مہربان سے میری ملاقات ہو گئی۔

گزشتہ چالیس برس کے دوران میں کئی ملکوں میں گیا اور کئی ملکوں میں رہنے کا موقع ملا لیکن ہانگ کانگ کے سیتل وہ شخصیت ہیں جن کی نہ صرف دنیا کے مختلف ملکوں میں رہنے والے سندھی بلکہ گجراتی اور مراٹھی تاجر بھی تعریف کرتے ہیں۔ وہ ہر ایک کا بھلا چاہنے والے اور سب کی مدد کرنے والے انسان ہیں۔ اس قدر امیر اور معروف بزنس مین

ہونے کے باوجود نیاز مندی اور انکساری کا مجسمہ ہیں۔ دنیا کے کئی ملکوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات سے ان کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ملکہ الزبتھ کی جانب سے انہیں جسٹس آف پیس کا خطاب مل چکا ہے۔ ہانگ کانگ کے بزنس اور اکانومی کو ترقی دینے اور دیگر خدمات کے عوض انہیں برونز باہونیا اسٹار (BBS) ایوارڈ دیا گیا ہے۔

☆☆☆

اس وقت میری عمر تقریباً چھبیس برس تھی یعنی یہ چوالیس برس پہلے کی بات ہے۔ ہانگ کانگ شمال کی سمت میں خاصی بلندی پر واقع ہے۔ اس لیے وہاں کراچی، کولمبو اور کوالالمپور جیسی گرمی نہیں پڑتی۔ بھری دوپہر میں بھی سیر وتفریح کا اپنا ہی ایک لطف تھا اور جہاز کے انجن روم میں بھی فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ ان ایام میں ماضی کی ڈیوٹی فری بندرگاہ اور شاپنگ کرنے والوں کی جنت کولمبو اور عدن سوشلزم کے چکر میں تباہ ہو چکے تھے۔ کراچی میں خورد و نوش کی اشیا خاصی سستی تھیں۔ البتہ ولایتی چیزیں مثلاً ٹرانسسٹر ریڈیو، گھڑیاں، کپڑا اور کیمرا وغیرہ مہنگی تھیں۔ ان دنوں ولایت میں عموماً ایسی چیزوں کی خریداری کی جاتی تھی جو امریکا، انگلینڈ اور جاپان میں تیار ہوتی تھیں اور اپنے ملک میں بھی بہت مہنگی تھیں۔ بس یورپ کی اطراف میں، ایٹلانٹک سمندر میں واحد جزیرہ لاس پاماس تھا جو ڈیوٹی فری ہونے کے سبب خاصی کشش رکھتا تھا۔ ہم اپنی ضرورت کے مطابق مشروبات، کیڈبری چاکلیٹ، شیونگ بلیڈ، عطر اور شیمپو وغیرہ وہیں سے خریدتے تھے اس کے علاوہ مشرق بعید میں سنگاپور تھا۔ جہاں آج کی طرح فلک بوس عمارتوں کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ ہر گلی میں دکانیں اور ان کے اوپر مالکان کے گھر ہوتے تھے۔ انہیں شاپ ہاؤس کہا جاتا ہے۔ وہ دکان ولایتی سامان سے بھرے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ملائشیا، تھائی لینڈ، انڈیا اور عرب ملکوں کے ٹورسٹ ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز چلانے والے بھی سنگاپور سے شاپنگ کرتے تھے۔

مذکورہ دونوں بندرگاہوں سے کہیں زیادہ سستی اور زیادہ ورائٹی کی حامل ہانگ کانگ بندرگاہ تھی۔ ہماری کمپنی کے جہاز چین، جاپان اور کوریا کی بندرگاہوں کی طرف جاتے ہوئے ضرورت نہ ہونے کے باوجود ایک دو دن ہانگ کانگ میں ضرور ٹھہرتے تھے کیونکہ ہماری جہاز راں کمپنی کا ریجنل آفس ہانگ کانگ میں تھا۔ ہم اپنے گھر سے لائے ہوئے روپے اور تنخواہ کی رقم ہانگ کانگ ہی میں خرچ کرتے تھے۔

ہانگ کانگ میں ٹیکسی اور ہوٹل کے اخراجات بھی خاصے کم تھے کیونکہ قریب ہی ملک چین تھا۔ جہاں سے سبزی اور پھل وغیرہ انتہائی کم قیمت میں سپلائی ہوتے تھے اس کے باوجود غربت بھی انتہا کی تھی۔ بے روزگاری بھی تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ ہانگ کانگ میں امن امان کی صورتِ حال انتہائی دگرگوں تھی۔ چوری اور لوٹ مار کے واقعات عام تھے۔ خاص طور پر رات کے وقت گویا چوروں اور لٹیروں کا راج ہوتا تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ سطریں ایک پاکستانی لکھ رہا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے ہانگ کانگ اور سنگاپور سے ہمارے شہر کراچی، حیدر آباد اور لاہور پُرامن اور پُرسکون تھے۔ ہمارے ہاں ولایتی چیزیں مہنگی ضرور تھیں لیکن لا اینڈ آرڈر کی پوزیشن، تعلیمی معیار، انڈسٹری اور ٹیکنالوجی حتیٰ کہ ایگری کلچر میں بھی ہم بہت آگے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان ملکوں سمیت جاپان اور یورپ تک ہم سے سامان منگواتے تھے۔ ہمارے ملک سے چاول اور دال کے بھرے ہوئے جہاز ولایت جاتے تھے۔ سوتی دھاگے اور کپڑوں کے تھانوں سے لدے ہوئے جہاز جاپان اور کوریا پہنچتے تھے۔ کھیلوں کا سامان، ڈبا پیک جھینگے بھر کر ہمارے جہاز مشرق بعید کے ملکوں اور امریکا جاتے تھے۔ کھیلوں کا سامان اور کپاس تو دنیا بھر میں جاتی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے ملک آگے نکل گئے اور ہم پیچھے بہت پیچھے رہ گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک کے سکے کی ساکھ بھی گرتی رہی۔ 1968ء میں جونیئر انجینئر کی حیثیت سے میری تنخواہ چار سو روپے ماہانہ تھی۔ ڈالر کی قیمت بھی بمشکل چار روپے تھی۔ چار روپے یعنی ایک ڈالر میں پانچ سو جاپانی ین مل جاتے تھے۔ ہانگ کانگ اور سنگاپور تو کیا جاپان جیسے ملک میں بھی ہم جیسے جونیئر انجینئر ٹیکسی میں سفر کرتے تھے۔ بعد میں ہمارے ملک کی کرنسی کمزور ہوتی چلی گئی۔ چیف انجینئر ہونے کے بعد ہماری تنخواہ کئی گناہ بڑھ گئی لیکن اس کے باوجود ٹیکسی میں سفر کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جاپانی ین اور جرمن مارک تو رہے ایک طرف، سنگاپور اور ہانگ کانگ کا سکہ بھی اس قدر مضبوط ہو گیا کہ ہم خود کو غریب سمجھنے لگے۔ ہمیں شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ ملک سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط ہو تو کم آمدنی سے بھی خوش حالی کے ساتھ گزارا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کبھی ہمارے

ملک کے حالات بھی بہتر ہوجائیں۔ امن امان قائم ہوجائے فی الحال یہ صورتِ حال ہے کہ غیر ملکی ٹورسٹ ہمارے ہاں آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ وہ اس بات سے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں کب کہاں بم پھٹ جائے یا ہنگاموں کے سبب ان کی واپسی کی فلائٹ کینسل ہوجائے۔

ہانگ کانگ میں ہر قسم کی آزادی تھی اور دوسری جانب ماؤزے تنگ کے خوف سے نہ صرف چین کے ٹھگ، نوسرباز اور پیشہ ور عورتیں بلکہ دنیا بھر کے جرائم پیشہ افراد نے بھی ہانگ کانگ کا رخ کیا۔ اس زمانے میں یہاں انگریز حکمران تھے۔ وہ اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال پر قابو پانے کی کوشش میں جت گئے۔ رفتہ رفتہ قانون اور قوائد و ضوابط میں سختی آتی چلی گئی پھر امن وامان اور انصاف کی صورتِ حال ایسی بہتر ہوگئی کہ تمام ٹھگ، نوسرباز اور چور بالکل سیدھے ہوگئے۔

دوسرے ملکوں کے امیر اور صنعت کار ہانگ کانگ کے بینکوں میں روپے جمع کرانے لگے۔ جگہ جگہ کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ہانگ کانگ جہاز رانی کا مرکز بن گیا۔

ادھر ہمارے ملک میں بینک اور جہازوں کو قومی ملکیت میں لینے کے سبب ہمارے ملک کے جہاز مالکوں نے بھی ہانگ کانگ میں آکر جہاز رانی کا آغاز کیا۔ حتیٰ کہ کوگل جیسے شخص نے بھی اپنے جہازوں کا آفس ہانگ کانگ میں قائم کیا جو ہمارے ملک کے وزیرِ تجارت تھے۔

ہانگ کانگ پر خوف کا ایک دور بھی گزرا۔ اس وقت یہ باتیں گردش کررہی تھیں کہ عنقریب ہانگ کانگ، چین کے قبضے میں چلا جائے گا۔ ظاہر ہے ہانگ کانگ جزیرہ اور کولون کا حصہ ہے ہی کتنا بڑا انگلینڈ کے جنگی جہاز برطانیہ سے روانہ ہوکر بھی ہانگ کانگ کو کیا تحفظ فراہم کرسکتے تھے۔ دراصل یہ سرزمین چین ہی کا حصہ تھا جسے انگریزوں نے زر اور زور کے بل بوتے پر اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ کئی دولت مند اور کاروباری لوگ خوف زدہ ہوگئے کہ اگر ہانگ کانگ، دوبارہ چین کے قبضے میں چلا گیا تو پھر کیا ہوگا؟ کیا ہانگ کانگ پر بھی چین والا کمیونسٹ نظام رائج ہوجائے گا۔ جس میں ہر ملکیت کو بہ حق سرکار ضبط کرلیا جائے گا۔ اس خوف سے کئی لوگ ہانگ کانگ چھوڑ کر انگلینڈ اور آسٹریلیا چلے گئے کیونکہ ان کے پاس برطانیہ کے پاسپورٹ تھے۔

برطانوی پاسپورٹ کے حامل افراد برٹش کہلاتے ہیں اور برطانوی قومیت کے حوالے سے وہ لوگ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا میں بھی رہ سکتے تھے حالانکہ وہ دلی طور پر ہانگ کانگ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ یہاں انہیں مشرقی ماحول اور کلچر مہیا تھا۔ دوسری جانب کینیڈا اور آسٹریلیا میں مقابلہ سخت تھا۔ اس کے ساتھ ہی انتہائی سرد موسم، جس کے وہ عادی نہ تھے لیکن وہ چین اور کیمونزم کے خوف سے ہانگ کانگ کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے۔

کئی لوگوں کا خیال تھا کہ چین کبھی بھی ہانگ کانگ کو واپس نہیں لے گا۔ انگریزوں کے ساتھ سوسالہ قانونی مدت پوری ہونے کے بعد بھی وہ یہی چاہے گا کہ ہانگ کانگ انگریزوں ہی کے حوالے رہے کیونکہ انہوں نے ہی ہانگ کانگ کو عروج عطا کیا تھا۔

اس دور میں دنیا کے کئی ملک چین سے خفا تھے حتیٰ کہ امریکا نے بھی تائیوان سے کاروباری تعلقات استوار رکھ کر چین پر پابندیاں عاید کردی تھیں۔ چین کی فیکٹریوں میں جوسامان تیار ہوتا تھا ظاہر ہے اس کی فروخت بھی لازمی تھی۔ اس طرح چین کو غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوسکتا تھا۔ اس سامان کی نکاسی ہانگ کانگ کے ذریعے ہوتی تھی۔ ہانگ کانگ کے تاجر چین سے سامان خرید کر اسے اپنے برانڈ نام کے ساتھ دنیا کو فروخت کرتے تھے گویا ہانگ کانگ، چین کے لیے مال ایکسپورٹ کرنے کا گیٹ وے تھا۔

ایک ہندو سندھی تاجر نے ہانگ کانگ نہ چھوڑنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا۔ جب میں نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا۔ ”سائیں! پہلی بات یہ کہ چین، ہانگ کانگ پر قبضے کی محض دھمکیاں دے رہا ہے۔ اسے گیدڑ بھبکیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے کیونکہ چین بہت بڑا ملک ہے۔ اسے زمین کی کمی کا سامنا نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہانگ کانگ کو حاصل کرنے کے بعد بھی چین جیسے بڑے ملک کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ ہانگ کانگ ہی کی وجہ سے چین کی اکانومی چل رہی ہے۔“

”اگر 1997ء میں سوسالہ معاہدہ مکمل ہونے پر انگریز خود ہی یہاں سے چلے جائیں پھر ظاہر ہے ہانگ کانگ، چین کے حوالے ہوجائے گا پھر چینی حکومت آپ کو سبز یا بلو رنگ کا محنت کشوں والا سوٹ پہنا کر یہی کہے گی کہ اٹھیے جناب کچھ جسمانی محنت مزدوری کیجیے ایک جگہ بیٹھ کر

صرف نوٹ گننے میں وقت ضائع نہ کریں۔'' میں نے اس بزنس مین سے کہا۔ جس کے باپ دادا برصغیر کی تقسیم سے بھی نصف صدی قبل بلخ، بخارا اور سیام، ملایا میں کاروبار کرتے رہے تھے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور بعد میں بھی جاپان کے ہکید واور او کیناوا جیسے جزیروں پر کامیاب بزنس برقرار رکھتے آئے تھے۔

''ہانگ کانگ بے شک چین کے حوالے ہوجائے۔'' انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ اپنے پورے ملک میں کیسا ہی قانون رائج رکھیں لیکن آپ دیکھئے گا کہ چینی، ہانگ کانگ کو اس طرز پر چلائیں گے جس طرز پر انگریز چلاتے رہے ہیں کیونکہ چینیوں کا فائدہ اسی میں ہے۔''

اس ہندو سندھی بزنس مین سے میری گفتگو 1980ء میں ہوئی تھی۔ اس کے سترہ برس بعد یعنی 1997ء میں انگریزوں نے ہانگ کانگ چینیوں کے حوالے کردیا۔ اب اس بات کو بھی کئی برس بیت چکے ہیں لیکن ہانگ کانگ اسی طرح چل رہا ہے جس کی تجزیاتی پیشگوئی پینتیس برس قبل سندھی ہندو تاجر نے کی تھی۔

☆☆☆

ہانگ کانگ جزیرہ چین کے بالکل جنوب میں واقع ہے۔ اس مقام پر دریائے پرل ڈیلٹا کی صورت میں جنوبی چینی سمندر میں گرتا ہے۔ چین کا شہر کینٹن بھی اسی سنگم پر واقع ہے۔ اسی لیے اس دریا کو دریائے کینٹن بھی کہا جاتا ہے۔ بہرحال پرل ریور یا کینٹن ریور انگریزی نام ہیں جو ہمیں اسکول کے اٹلس اور ہمارے نیوی گیشن کے نقشوں پر لکھا ہے جبکہ چینی عوام اس دریا کو ژوجیانگ کہتے ہیں۔ جس طرح انگریز ہمارے دریا کو انڈس ریور اور ہم دریائے سندھ کہتے ہیں۔

دریائے پرل چین کا تیسرے نمبر پر بڑا دریا ہے۔ چین کا سب سے بڑا دریا Yangtye river ہے جسے چینی لوگ چانگ جیانگ کہتے ہیں۔ چینی زبان میں دریا کو جیانگ کہا جاتا ہے۔ یہ دریا، مصر کے تاریخی دریائے نیل اور جنوبی امریکا کی امیزن ندی کے بعد تیسرے نمبر پر دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ اس کی لمبائی 6300 کلومیٹر ہے۔ یہ دریا مغرب سے مشرق کی جانب بہتا ہے اور چین کو دو حصوں شمالی چین اور جنوبی چین میں تقسیم کرتا ہے۔

چین کا دوسرے نمبر پر بڑا دریا Yellow river ہے جسے چینی لوگ ''ہیانگ ہی'' کہتے ہیں۔ یہ دنیا کا چھٹے نمبر پر بڑا دریا ہے۔ اس کی لمبائی 5460 کلومیٹر ہے۔ یلو ندی یا ہیانگ ہی چینی تہذیب کی گود کہلاتی ہے۔ اس ندی میں آنے والے سیلاب لوگوں اور مال مویشی کی تباہی کا سبب بنتے رہے ہیں۔ اس حوالے سے اس ندی کو غم چین بھی کہا جاتا ہے۔

دریائے سندھ کی طرح یہ ندی بھی چینی شاعری میں اکثر کیچڑ کے بہاؤ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ شاید اس کیچڑ کی وجہ سے اس کا نام Yellow پڑا۔ اس ندی کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے۔ یہ کبھی بھی صاف اور شفاف نظر نہیں آتی۔ شاید اسی لیے کسی ناممکن بات کے لیے چینی زبان کا محاورہ ہے۔ ''جب ہیانگ ہی میں صاف پانی بہے گا۔'' ایسا ہی ایک انگریزی کا محاورہ ہے When pigs fly (جب سور اڑیں گے) ہماری زبان میں بھی کہا جاتا ہے۔ ''جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا۔''

بہرحال ہم ہانگ کانگ کا ذکر کررہے تھے جو دریائے پرل کے سنگم پر واقع ہے۔ خشکی پر رہنے والے لوگوں کے حساب سے دریا کا ڈیلٹا، اس کا انتہائی سرا کہلاتا ہے یعنی جہاں دریا، سمندر میں جاکر اختتام پذیر ہوتا ہے لیکن ہم جہاز اور کشتی چلانے والوں کے لیے وہ دریا کا آغاز کہلاتا ہے۔ ہم اسی مقام سے دریا میں داخل ہوتے ہیں۔ دنیا کی کئی بندرگاہیں دریا میں واقع ہیں یعنی ہمیں سمندری سفر کرنے کے بعد کچھ فاصلہ دریا میں بھی طے کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح امریکی بندرگاہ نیو آرلینس تک پہنچنے کے لیے اٹلانٹک سمندر اور گلف آف میکسیکو کا سمندر عبور کرنے کے بعد مسی سپی کا ڈیلٹا تلاش کرنا پڑتا ہے پھر وہاں داخل ہونے اور مزید ایک سو میل سفر کرنے کے بعد ہم نیو آرلینس بندرگاہ پہنچتے ہیں۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھئے کہ سمندر کا سفر طے کرکے ہم دریا کے راستے کوٹڑی بندرگاہ پہنچتے ہوں یعنی پورٹ قاسم پہنچ کر جہاز کو دریائے سندھ میں داخل کرنا ہوتا تھا۔

اب یہ کام ناممکنات میں سے ہے کیونکہ اب دریائے سندھ میں اتنا پانی موجود نہیں ہے کہ بڑے بڑے جہاز اس میں چل سکیں۔ کوٹڑی بیراج اور سکھر کا پل بننے سے قبل انگریزوں کے بیڑے ملتان تک جاتے تھے۔ دریائے پرل کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ چین کا تیسرے نمبر پر بڑا دریا ہے۔ اس کی لمبائی 2200 کلومیٹر ہے۔ یاد رہے ہمارا دریائے

سندھ تبت کے مانسرور جھیل سے شروع ہو کر لداخ، گلگت، بلتستان سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ یہ دریا 3180 کلومیٹر طویل ہے۔

یہ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کا ذکر ہے۔ تب برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ انہوں نے ہندوستان کی کئی ریاستوں میں زمینداروں کو جبراً افیون کی کاشت پر آمادہ کیا۔ وہ افیون بھاری قیمت میں چینیوں کو فروخت کی جاتی تھی۔ اس طرح ایک طرف تو کثیر سرمایہ حاصل کیا جا رہا تھا دوسری جانب چینیوں کو نشے کا عادی بنایا جا رہا تھا۔ اس دور میں چین پر قنگ (Qing) گھرانے کی حکومت تھی۔ چینی حکمرانوں نے انگریزوں کو بہت سمجھایا، یہاں تک کہ انہوں نے انگلینڈ بھی درخواستیں ارسال کیں کہ ان پر یہ ظلم نہ کیا جائے لیکن انگریز طاقت کے نشے میں چور تھے۔ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ آخر کار چین نے انگریزوں سے افیون کی خریداری سے انکار کر دیا اور ان کے افیون سے بھرے جہازوں کو اپنی بندرگاہوں میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ جواب میں انگریزوں نے اس وقت کے جدید ہتھیاروں، یعنی بندوق، بم اور بارود کے ذریعے چین پر حملہ کر دیا۔

یہ 1839ء کی بات ہے۔ اس جنگ کو Opium war یعنی افیون کی لڑائی کہا جاتا ہے۔ چین انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور 1841ء میں انگریزوں نے ہانگ کانگ جزیرے پر زبردستی قبضہ کر لیا اور اسے اپنے ملک برطانیہ کا حصہ قرار دیا۔ بعد میں چینیوں کے ساتھ صلح نامہ بھی کیا گیا۔ تاریخ میں اس صلح نامے کو Treaty of nanking کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے 1842ء میں ہانگ کانگ جزیرے پر اپنا ایک شہر تعمیر کیا اور اس کا نام کوئنس ٹاؤن رکھا گیا۔ بعد میں یہ شہر وکٹوریا کہلانے لگا۔ بہر حال اس شہر کو انگلینڈ کی ملکہ وکٹوریا کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ ستر کی دہائی میں بھی ہانگ کانگ جزیرے کا یہ شہر حتیٰ کہ پورا جزیرہ وکٹوریا کہلاتا تھا کیونکہ جب ہم فیری میں سوار ہو کر سمندری حصہ عبور کر کے دوسری جانب یعنی چین کے علاقے کولون جاتے تھے تو واپسی پر یہی کہتے۔ وکٹوریا جا رہے ہیں یعنی ہانگ کانگ جزیرے پر جا رہے ہیں۔

اس زمانے میں جزیرے کا یہی وکٹوریا والا حصہ ڈاؤن ٹاؤن یعنی صدر کا علاقہ معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال اب تو ہانگ کانگ کا پورا جزیرہ خوب ترقی کر چکا ہے اب ہانگ کانگ میں صرف وکٹوریا پارک ہے، اس کے علاوہ وکٹوریا پیک (پہاڑی چوٹی) اور وکٹوریا ہاربر باقی رہے ہیں۔ ہانگ کانگ کی چند سڑکیں آج بھی وکٹوریا کے نام سے منسوب ہیں۔ یہاں یہ بھی لکھتا چلوں کہ ہانگ کانگ جزیرے کے اس علاقے وکٹوریا سٹی میں ٹرام سب سے پہلے 1890ء میں چلائی گئی۔ اس کے لیے سمندر کے کنارے کے قریب شرقاً غرباً چار میل پختہ سڑک تیار کی گئی۔ اس کے تیس برس بعد یعنی 1920ء میں بس سروس کا آغاز کیا گیا۔

انگریزوں نے ہانگ کانگ میں ٹرام سروس کا آغاز بمبئی، کلکتہ اور کراچی کے بعد کیا تھا۔ جہاں اب کلکتہ کے علاوہ ٹرام سروس ختم ہو چکی ہے لیکن ہانگ کانگ میں آج تک چل رہی ہے۔ اعلیٰ قسم کی بسوں اور ٹیکسیوں کے ساتھ ہانگ کانگ میں خوب صورت قسم کی ڈبل ڈیکر ٹرامیں بھی چلتی رہتی ہیں۔ دنیا کے جن تین شہروں میں آج بھی ڈبل ڈیکر ٹرامیں پابندی سے چلتی ہیں ہانگ کانگ ان میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ انگلینڈ کا شہر بلیک پول اور دوسرا مصر کا شہر اسکندریہ ہے۔

ہانگ کانگ میں ٹرام صرف وکٹوریا سٹی کے علاقے شاؤ کیئی وان سے کینڈی ٹاؤن تک چلتی ہے۔ ان ٹراموں کے ذریعے ہانگ کانگ جزیرے کے تقریباً ڈھائی لاکھ لوگ سفر کرتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ہانگ کانگ میں آغاز ہی سے ٹراموں کو بجلی کے ذریعے چلایا گیا۔

کراچی میں ٹرام سروس کا آغاز 1885ء میں ہوا۔ 1881ء میں کراچی کے میونسپل سیکریٹری اور انجینئر مسٹر جیمس اسٹریچن نے کراچی میں ٹرام چلانے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے ہی ٹرام کی پٹریاں بچھانے کے کام کا آغاز کیا۔ اس پراجیکٹ انجینئر کے چیف انجینئر کے طور پر سندھ، پنجاب اور دہلی ریلویز کے مسٹر جان برنٹن کو مقرر کیا گیا تھا۔

20 اپریل 1885ء کو کراچی کی پہلی مین لائن ٹرام کا افتتاح بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ یہ ٹرام سینٹ اینڈریو چرچ (جو عبداللہ ہارون روڈ اور شاہراہ لیاقت کے کراسنگ کے قریب واقع ہے) سے کیماڑی کے درمیان چلنے لگی۔ دوسری گڈس ٹرام میکلوڈ روڈ اور نیٹی جیٹی کے درمیان شروع کی گئی۔ ان ٹراموں کو تقریباً ایک سال تک بھاپ کے انجنوں کے ذریعے چلانے کے بعد انہیں گھوڑوں کے ذریعے کھینچا جاتا رہا۔ 1900ء میں لارنس روڈ (نشتر روڈ)

پر بھی ٹرام سروس شروع کی گئی۔ 1909ء میں گھوڑوں کے ذریعے چلائی جانے والی ٹراموں کو پیٹرول انجنوں پر منتقل کیا گیا۔ یہ ٹرامیں 18 میل فی گھنٹا کی رفتار سے چل سکتی تھیں۔ ہر ٹرام میں 46 پسنجر بیٹھ سکتے تھے۔

یہ ٹرامیں فریئر اسٹریٹ (داؤد پوتہ روڈ)، سولجر بازار، مینسفلڈ اسٹریٹ (سیدنا برہان الدین روڈ) اور چاکیواڑہ میں بھی چلتی تھیں۔ 1939ء میں ان ٹراموں کے انجن پیٹرول سے ڈیزل پر تبدیل کیے گئے۔

قیام پاکستان کے بعد ان ٹراموں کے اصل مالک ایسٹ انڈیا ٹرام ویز کمپنی نے اپنی تمام ٹرامیں محمدی ٹرام ویز کمپنی کو فروخت کردیں۔ اس کمپنی کے مالک شیخ محمد علی تھے۔ آخر کار یہ کمپنی 1975ء میں بند ہوگئی۔

1956ء میں میری عمر گیارہ برس تھی۔ اس وقت میں نے بھی ٹرام ڈپو (سعید منزل) سے بولٹن مارکیٹ تک اس ٹرام میں سفر کیا تھا۔ بیس منٹ کا وہ سفر آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ اس زمانے میں بندر روڈ خالی خالی سا تھا۔ ٹرام میں ہارن کی بجائے گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ ہم دوڑ کر ٹرام میں چڑھ گئے تھے۔ میں لکڑی کے بینچ پر بیٹھ کر دونوں طرف کی دکانوں اور عمارتوں کو حیرت سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ لمحات مجھے آج بھی یاد ہیں...... دل چاہتا تھا کہ یہ ٹرام اسی طرح چلتی رہے، چلتی رہے۔

میں آج بھی کسی ملک کی ٹرام میں سوار ہوتا ہوں تو مجھے کراچی کی ٹرام ضرور یاد آتی ہے۔

بہرحال انگریزوں نے جنوبی چینی سمندر میں اپنا اثر رسوخ قائم کرنے اور چینیوں کو جبراً افیون فروخت کرنے کے بہانے 1839ء میں ان کے ساتھ جنگ کی۔ بعد میں صلح کرنے کے لیے انگریزوں نے ہانگ کانگ جزیرہ اپنے نام لکھوالیا۔ اسے ”پہلی افیون والی لڑائی (First Opium War)“ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد انگریزوں نے 1860ء میں چینیوں کے ساتھ دوسری جنگ لڑی۔ اس میں بھی چینیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دوبارہ صلح نامہ ہوا جو تاریخ میں پیکنگ کونشن کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انگریزوں نے چینیوں سے ہانگ کانگ جزیرے کے اردگرد واقع چند علاقے اپنے قبضے میں لے لیے اور انہیں برطانیہ کا حصہ قرار دے دیا۔ ان علاقوں کے نام یہ ہیں۔ اسٹون کٹر آئی لینڈ، چینیوں کی سرزمین کا ایک حصہ جو کولون پینشولا کہلاتا ہے اسے حاصل کیا۔

جو لوگ ہانگ کانگ نہیں آئے ان کی آسانی کے لیے لکھتا چلوں کہ ہانگ کانگ ہمارے منوڑہ جزیرے کی طرح ہے۔ یہ بات دیگر ہے منوڑہ مختصر سا جزیرہ ہے جبکہ ہانگ کانگ اس سے خاصا بڑا ہے۔ اس طرح سمجھئے کہ وہ حیدرآباد ضلع بلکہ دادو ضلع کے برابر ہے اور دادو جیسا ہی پہاڑی علاقہ ہے۔ اسٹون کٹر جزیرہ، بابا بھٹ یا شمس پیر جزیرے کی طرح ہے جو منوڑہ کے قریب واقع ہے۔ کولون پینشولا کو یوں سمجھئے جیسے کیماڑی کا حصہ نیٹی جیٹی (ٹاور) تک پھیلا ہوا ہے جو پاکستان کی سرزمین کا حصہ ہے۔ کولون بھی اسی طرح چین کی سرزمین کا ایک حصہ ہے۔

1898ء میں ایک اور معاہدہ کے تحت انگریزوں نے لنتاؤ جزیرہ اور اس کے اردگرد دوسرے چھوٹے جزائر اور کولون سے متصل شمالی سمت کی زمین 99 برس کی لیز پر چینیوں سے حاصل کرلی۔ یعنی پہلے صرف کیماڑی والا حصہ ٹاور تک انگریزوں کے قبضے میں تھا بعد میں یہ پھیل کر گویا ملیر، لانڈھی تک وسیع ہوگیا۔ یہ تمام علاقے ہانگ کانگ کہلاتے ہیں یعنی ہانگ کانگ ایک آزاد ملک کا نام بھی ہے اور ایک جزیرے کا بھی۔

ہانگ کانگ میں ہانگ کانگ جزیرہ، لنتاؤ جزیرہ، کولون پینشولا اور دوسرے تقریباً 234 چھوٹے جزیرے شامل ہیں۔ لنتاؤ جزیرہ ہانگ کانگ جزیرے سے بھی بڑا ہے۔ اس کی اراضی 146 مربع کلومیٹر ہے یعنی ہانگ کانگ جزیرہ لنتاؤ جزیرے سے نصف جتنا ہے۔

انگریزوں کے قبضے سے پہلے سنگاپور اور پینانگ ویران جزیرے تھے۔ وہاں مچھیرے اور سمندری قزاق رہتے تھے۔ یہی حال لنتاؤ جزیرے کا تھا۔ سولہویں صدی کے آغاز سے یورپی جہاز راں لنتاؤ جزیرے اور اس کے قریبی جزیرے چیونگ چاؤ میں آتے رہتے تھے۔ 1510ء میں پرتگالیوں نے لنتاؤ جزیرے پر قبضہ کرلیا تھا لیکن پرتگالی کسی ایک جگہ ٹک کر نہ رہے۔ انہوں نے کسی ملک پر مستقل قبضہ نہیں کیا۔ وہ 1517ء میں لنتاؤ جزیرے سے بھی چلے گئے پھر بہت بعد میں انگریزوں نے اس جزیرے کو ٹریڈنگ پوسٹ کا درجہ دیا۔ ان کے جہاز انڈیا اور انگلینڈ سے سامان اٹھا کر یہاں پہنچتے تھے پھر وہ خفیہ طریقے سے قزاقوں اور افیون کے عادی چینیوں کے ذریعے اپنا سامان خاص طور پر افیون فروخت کے لیے چین بھیجتے تھے۔ ان دنوں میں انگریزوں کو قریبی جزیرہ ہانگ کانگ اپنی جغرافیائی پوزیشن

جالینوس Galen

(130ء۔ 200ء)

یونان کا طبیب اور فلسفی برگامہ (ایشیائے کوچک) میں پیدا ہوا۔ باپ ریاضی دان اور معمار تھا۔ سولہ برس کی عمر میں طب کا مطالعہ شروع کیا اور سمرنا، کورنتھ اور سکندریہ گیا۔ 158ء میں واپس آکر برگامہ کے بادشاہ کا شاہی طبیب مقرر ہوا۔ 163ء میں روم گیا اور شہنشاہ مارکس آری لیس کا شاہی طبیب ہو گیا لیکن چار سال بعد واپس برگامہ آگیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف طب منطق، صرف ونحو، اخلاقیات، فلسفہ اور ادب کے متنوع مضامین سے تعلق رکھتی ہیں۔ ارسطو اور افلاطون کی بعض کتابوں کی شرح بھی لکھی۔

مرسلہ: اکبر بروہی۔ لاڑکانہ

کے سبب بہت پسند آیا۔ انہوں نے گویا اندر ہی اندر یہ پلان بنا لیا تھا کہ آئندہ چل کر دھونس دھاندلی اور طاقت استعمال کر کے یہ جزیرہ ہر حال میں چینیوں سے حاصل کرنا ہے۔ آخر کار 1839 میں پہلی افیون کی لڑائی کے بعد وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوئے۔ ہانگ کانگ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

انگریز پہلے افیون فروخت کرنے جیسا غلط کام کرتے تھے بعد میں جب ہانگ کانگ ان کے قبضے میں آگیا تو وہاں انہوں نے انگلینڈ جیسا تعلیمی نظام اور دوسرے ادارے قائم کیے۔ لوگوں کو ہانگ کانگ آنے اور وہاں رہنے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ سنگاپور کی طرح یہ جزیرہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کرتا چلا گیا۔ امیر چینی اور انگریز یہاں آکر کارخانے قائم کرنے لگے۔ غریب چینی اور ایشیائی لوگ محنت، مزدوری اور روزگار کے لیے یہاں آنے لگے۔ سب کا روزگار چلنے لگا۔ امیر اور غریب کے بچے انگریزی تعلیم حاصل کر کے نہ صرف ہانگ کانگ بلکہ انگلینڈ میں بھی ملازمتیں حاصل کرنے لگے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران، دسمبر 1941ء میں جاپانی فوج نے ہانگ کانگ پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں اور کینیڈین نے سرنڈر کیا۔ جاپانیوں کے قبضے کے دوران یہاں کے عام لوگوں نے نہایت مشکل وقت گزارا۔ ایک طرف مہنگائی عروج کو پہنچ گئی تھی اور دوسری جانب خوراک کی قلت درپیش تھی۔ 1941ء سے 1945ء کے دوران بھوک، بیماری اور جاپانیوں کے مظالم کے ہاتھوں ہانگ کانگ کی نصف آبادی موت کا شکار ہو گئی۔ آخر کار جب جاپانی ہانگ کانگ سے واپس چلے گئے اور انگریزوں نے دوبارہ حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی تو انہیں ہانگ کانگ کے ہر ادارے میں افرادی قوت کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔

1949ء میں جیسے ہی چین میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو کئی چینی وہاں سے بھاگ کر ہانگ کانگ پہنچے۔ چینیوں کے ان قافلوں نے ہانگ کانگ میں افرادی کمی کو کسی حد تک پورا کر دیا۔ چین کے علاقوں بیکنگ، شنگھائی اور گیانگ ژہاؤ کے بینکوں اور کارپوریشنز نے بھی ہانگ کانگ کا رخ کیا۔ ہانگ کانگ میں تیزی سے فیکٹریاں اور کارخانے قائم ہونے لگے اور اس طرح یہاں ترقی کی راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں۔

1970ء تک گو کہ ہانگ کانگ بہت زیادہ امیر نہیں ہو سکا تھا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ہمارا ملک اس سے کہیں زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہانگ کانگ یورپ جیسا روپ اختیار کرتا چلا گیا۔ جہاں تعلیمی ادارے، بینک، جہاز راں کمپنیاں، ٹرانسپورٹ اور کمیونیکشن کے ادارے فعال اور معیاری ہوتے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی امن امان، انصاف، امپورٹ ایکسپورٹ، سفری سہولیات، رہائشی پراجیکٹ اور ہوٹلز پر بھی بھرپور توجہ دی گئی۔

آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ سن 2000ء میں یہاں کے لنٹاؤ جزیرے پر فائبر آپٹک لنک اراؤنڈ دی ورلڈ اور ایشیا پیسفک کیبل نیٹ ورک کی بنیاد رکھی گئی جو انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا کو رابطہ فراہم کرتا ہے۔

1948ء میں انگلینڈ اور چین کی حکومتوں کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ اس میں غور کیا گیا کہ 1997ء میں لیز کے 99 برس مکمل ہوں گے تو اس کے بعد کیا اقدامات اٹھائے جائیں گے؟ آخر کار دونوں حکومتوں کے درمیان Sino Britsh Joint Declaration کے تحت یہ طے ہوا کہ لیز کی مدت مکمل ہونے پر برطانیہ ہانگ کانگ کا قبضہ چین کو واپس کر دے گا لیکن ہانگ کانگ کا انتظامی نظام چلانے کے لیے خاص

طریقہ استعمال کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں یہ طے پایا کہ ہانگ کانگ میں کم از کم پچاس برس تک انگریزوں ہی کا قانون و قاعدہ نافذ ہوگا۔

1997ء کی نصف شب کو بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہانگ کانگ چینیوں کے حوالے کرنے کا Handing Over جشن منایا گیا۔ اسی سال ایشین معاشی کرائسس اور Avian انفلوئنزا کے سبب ہانگ کانگ کو زبردست معاشی دھچکا پہنچا۔ بڑی جدوجہد کے بعد ہانگ کانگ ان مسائل پر قابو پاسکا تھا کہ ایک دوسری مصیبت نے اس پر حملہ کردیا۔

2003ء میں سارس وبا پھیلنے سے ہانگ کانگ کی حالت انتہائی خراب ہوگئی۔ ٹورزم سے ہونے والی کثیر آمدنی یکایک بند ہوگئی۔ لوگ مجبوری کی حالت میں بھی ہانگ کانگ آنے سے کترانے لگے۔ ہانگ کانگ کے ہوٹلز، ریسٹورنٹس، رقص گاہیں اور مے خانے ویران ہوگئے۔ لوگ روزگار کے حوالے سے پریشان رہنے لگے۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اب ہانگ کانگ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکے گا لیکن بعد میں دنیا نے دیکھا کہ ہانگ کانگ ری کور کرنے لگا۔ آج ہانگ کانگ دوبارہ اکانومی اور کامرس میں دنیا کا مرکز بن چکا ہے۔

انگریزوں اور چینیوں کے معاہدے کے مطابق آج ہانگ کانگ ایک ملک دو سسٹم کے تحت چل رہا ہے۔ اسے چین کی جانب سے سوائے ڈیفنس اور فارن افیئر کے ہر طرح آزاد رکھا گیا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق کم از کم پچاس برس تک ہانگ کانگ کے شہریوں (پاسپورٹ رکھنے والو) کو ان کے حقوق اور آزاد زندگی گزارنے کی گارنٹی دی گئی ہے۔

آج ہانگ کانگ فنانس کے لحاظ سے دنیا کے سرفہرست ملکوں میں سے ایک ہے۔ اسے ایشیا کے فور ٹائیگرز میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے۔ باقی تین ٹائیگر یہ ہیں (1)۔ جاپان (2)۔ کوریا (3)۔ سنگاپور۔ اب ان میں ملائشیا پانچویں ٹائیگر کے طور پر شامل ہونے والا ہے۔

ہانگ کانگ کی اسٹاک ایکسچینج دنیا کے چھٹے نمبر پر بڑی اسٹاک مارکیٹ ہے۔ حالانکہ ہانگ کانگ چین کا ایک حصہ ہے لیکن اس کی اپنی کرنسی ہے جو ہانگ کانگ ڈالر کہلاتی ہے جبکہ چین میں یوان چلتا ہے۔ ہانگ کانگ ڈالر دنیا کے دس مضبوط ملکوں کے سکے میں سے ایک ہے۔

ہانگ کانگ ساٹھ کی دہائی میں ایک غریب ملک تھا حتیٰ کہ ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں بھی اس کی حالت میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اجرت خاصی کم تھی۔ ہم غیر ملکیوں کے لیے ٹیکسی، ہوٹلز اور کھانے پینے کی چیزیں نہایت سستی تھیں۔ ہمارے روپے کے سامنے ہانگ کانگ کا ڈالر سستا تھا اس لیے ہمیں ہانگ کانگ سے خریداری کرتے وقت کم قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ ہم اپنے لیے کمپلیٹ سوٹ ایک دن کا ارجنٹ آرڈر دے کر ہانگ کانگ سے سلواتے تھے۔ اس زمانے میں غربت کے سبب مقامی لوگوں کے لیے گویا ہر چیز مہنگی تھی۔ اب ہانگ کانگ اس قدر ترقی کرچکا ہے اور یہاں کے لوگ اتنے امیر ہوچکے ہیں کہ انہیں اپنے ملک میں کسی چیز کے لیے تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا کیونکہ ان کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا ہے جبکہ ہانگ کانگ میں رہنے والے ہم غیر ملکیوں کے لیے ہر چیز انتہائی مہنگی ہوچکی ہے۔

بین الاقوامی سروے کے مطابق ہانگ کانگ فارنرز کے لیے دنیا کا پانچویں نمبر پر مہنگا ترین شہر (ملک) ہے دیگر چار یہ ہیں۔ ٹوکیو، اوساکا، ماسکو اور سوئٹزرلینڈ کا شہر جنیوا۔

کاروباری سہولیات کے حوالے سے ہانگ کانگ دنیا کے تیسرے نمبر پر ہے یعنی ہانگ کانگ میں کوئی بھی غیر ملکی شخص کاروبار کرسکتا ہے۔ اسے اس سلسلے میں یہاں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی یعنی اسے ہانگ کانگ کے کسی بھی سرکاری آفس یا پرائیوٹ ادارے میں پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور ایسی سہولیات ہم جیسے ملکوں میں ناپید ہیں۔ اسی لیے غیر ملکی انویسٹر ہمارے یہاں اپنی رقم نہیں لگاتے۔ اس کے نتیجے میں ہم اس سے حاصل ہونے والی سہولیات سے محروم رہتے ہیں۔

ہانگ کانگ، سنگاپور اور ملائشیا جیسے ملکوں کی ترقی کا راز یہی ہے کہ انہوں نے بزنس مین کو امن امان اور ہر قسم کی سہولیت فراہم کی ہے۔ سرکاری دفاتر میں انہیں عزت اور احترام ملتا ہے۔

☆☆☆

ہانگ کانگ میں مقیم یہاں کے کاروبار پر چھائے ہوئے ہماری سرزمین سے تعلق رکھنے والے سوداگروں میں سے کسی کا احوال نہ لکھنا ناانصافی ہوگی۔ میں زیرِ نظر تحریر میں کم از کم ایسے دو تین افراد کا ذکر ضرور کروں گا تا کہ آج کے نوجوانوں کو ان کی محنت، ایڈونچر، جرأت اور دنیا پر چھانے کا

اندازہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ میں اپنے قارئین کی معلومات کے لیے سندھی ہندوؤں کے بارے میں وہ باتیں بھی تحریر کروں گا جو 45 برس مختلف ملکوں اور دور دراز کے جزیروں میں ان کے قریب رہ کر اور جہاز چلانے کی ملازمت کے دوران نوٹ کرتا رہا ہوں اور میں جو سمجھ سکا ہوں اسے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

دراصل ہمارے ہاں یہ کلچر عام ہے کہ ہم دوسروں کے عیوب کو نمایاں اور بیان کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں اور دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ دوسروں کی اچھائیوں اور مثبت باتوں کو Appreciate کر کے اس کے مطابق اپنی اصلاح کرنے یا خود کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ کلچر دیگر ملکوں اور قوموں میں بھی موجود ہے لیکن ہمارے ہاں کچھ زیادہ اور شدت سے رائج ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے ہاں قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تعریف کی جاتی ہے بالکل بجا اور درست ہے لیکن اس کے ساتھ ہی گاندھی اور نہرو کو نہایت حقیر اور کم تر بیان کیا جاتا ہے ہمیں بھی بچپن ہی سے یہی بتایا گیا ہے بعد میں جب ہم نے جہاز کی ملازمت اختیار کی اور دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تو اپنے دماغ میں قائم رائے کو رد ہوتا ہوا دیکھ کر شاک محسوس ہوا۔

یورپ کے ایک ملک میں زیر تعلیم بیروت کے ایک مسلمان نوجوان کے سامنے جب میں نے اسی رائے کا اظہار کیا تو وہ مجھے اس طرح گھورنے لگا جیسے میں کسی پاگل خانے سے نکل کر آیا ہوں۔

''آپ نے نہرو اور گاندھی کے بارے میں لکھی گئی تحریریں پڑھی ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ نے ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے؟''

''نہیں۔''

''میرے دوست!'' اس نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کی جائے۔'' وہ مسلمان تھا اور ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویشن کر رہا تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی انڈین، انگریز یا یورپی ہوتا تو میں یہی خیال کرتا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہے اور مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں بغض رکھتا ہے۔ اس لیے اس نے ایسی بات کی ہے۔

بہرحال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے آتے جاتے رہے۔ کئی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مطالعے میں بھی اضافہ ہوا تب ہمیں معلوم ہوا کہ کئی ملکوں کی یونیورسٹیوں میں گاندھی اور نہرو کو پڑھا جاتا ہے۔ ان کی کتابوں کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ وہ ایسے پاگل اور ذہنی مریض نہیں تھے جیسا کہ ان کے متعلق ہمارے ہاں تصور کیا جاتا ہے۔

ایک دوسری مثال ہم اپنے بچپن اور لڑکپن میں جب تک اپنے ملک تک محدود تھے یہی سنتے رہے کہ انگریز اور یورپی بیکار لوگ ہیں۔ مغرب کے باسی کافر ہیں۔ گاؤں کی مسجد میں پتلون کے ساتھ نماز پڑھی جاتی تھی تو مولوی اور دوسرے نمازی ٹوکتے تھے۔

''تم یہ کافروں والا ڈریس پہن کر نماز کیوں پڑھتے ہو اس طرح نماز نہیں ہوتی۔'' بعد میں ہمیں انگلینڈ اور یورپ کے ملکوں میں وہاں کے لوگوں کے درمیان رہنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ ان کے دلوں میں پڑوسیوں کا احترام اور بیماروں کا کس قدر خیال ہے۔ انسان ذات تو کیا وہ پرندوں کو بھی تکلیف نہیں پہنچاتے۔ مغرب میں امن امان اور انصاف کی حالت دیکھ کر کبھی کبھی ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ مسلمان ہمارے ملک میں ضرور ہیں لیکن اسلام تو یہاں ہے۔ وہ انہی باتوں پر عمل کرتے ہیں جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے۔ پتلون نہ صرف انگریز بلکہ مصری، ترکی اور مورا گو کے لوگ بھی پہنتے ہیں۔ اسی لباس میں نماز بھی پڑھی جاتی ہے۔ فرانس میں ایک ہزار سے زائد مساجد ہیں۔ انگلینڈ، سویڈن اور ڈنمارک جیسے ملکوں کی مسجدوں میں تمام مسلمان پتلون پہن کر نماز پڑھنے آتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک اور کلچر بھی عام ہے کہ ہم ہنسی مذاق اور پھکو پن میں دوسری قوموں کی تذلیل کرتے ہیں۔ یہ انتہائی غیر شائستہ اور نامناسب بات ہے۔ ہمارے ہاں حماقت اور بے وقوفی کی ہر بات سکھ یا پٹھان سے منسوب کی جاتی ہے۔ ہر بنگالی کو بھوکا اور قحط زدہ سمجھا جاتا ہے۔ سندھیوں کو اجڈ تصور کیا جاتا ہے اور اندرون سندھ ہندو سندھی کو ڈرپوک اور بزدل جیسا لقب دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی خود ساختہ باتیں اور لیبل کا مسلسل ذکر سن کر ہمارا ذہن اسی مطابق سیٹ ہو جاتا ہے۔ اسی تناظر میں میرا جہاز کیپ

انڈین کونسل ایکٹ

1857ء میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہندوستانیوں نے علم بغاوت بلند کیا اور ملک کے طول وعرض میں جنگِ آزادی برپا ہوگئی۔ برطانوی پارلیمانی نے یہ محسوس کر کے کہ یہ انتشار کمپنی کی حکومت کی کمزوری اور اس کی بدعنوانیوں کا نتیجہ ہے، امن بحال ہوتے ہی 1858ء میں ایک شاہی اعلان کے ذریعے کمپنی کی حکومت کو توڑ کر اور پاک و ہند کو براہِ راست برطانوی حکومت کے ماتحت لے کر جاری کردہ اصلاحات میں از سرنو ترامیم کیں اور یہ ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے:

1۔ گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ کے ممبروں کی تعداد چار سے پانچ کردی گئی اور وزیر ہند کو اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہے تو سپہ سالار افواج ہند کو بھی کونسل کا رکن مقرر کردے۔

2۔ گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا کہ مجلس قانون ساز میں مجلس انتظامیہ کے ارکان کے علاوہ کم سے کم چھ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ارکان کا اضافہ کرسکتا ہے۔ ان نئے ارکان میں نصف کا سرکاری اور نصف کا غیر سرکاری ہونا لازمی تھا۔

3۔ مختلف محکمے مختلف ارکان کے سپرد کیے جانے کا اختیار گورنر جنرل کو کردیا گیا۔

4۔ بمبئی (اب ممبئی) اور مدراس کی مجالس قانون ساز کو اپنے اپنے صوبوں کے لیے الگ قانون بنانے کا حق دیا گیا تاکہ وائسرائے کا انتظامی کام آسان ہوجائے۔

5۔ وائسرائے جب چاہے ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں مجالس قانون ساز قائم کرسکتا ہے۔

وردی جزیرے کی واحد جیٹی سے جالگا۔ وہ شاید میری ملازمت کا پہلا سال تھا۔

ہم کراچی سے روانہ ہوئے تھے۔ ان ایام میں سوئیز کینال بند تھی۔ ہم پورے افریقا کے گرد گھوم کر اور بحر اوقیانوس (ایٹلانٹک) سے گزر کر انگلینڈ اور یورپ کی دو تین بندرگاہوں میں پہنچے تھے۔ وہاں سے ہمیں ویسٹ انڈیز کے جزیرے ٹرینیڈاڈ کی طرف جانا تھا۔ جہاز کے لیے پانی اور ایندھن جبرالٹر سے لینا تھا لیکن ہمارے نااہل پولش کیپٹن کی غلط پلاننگ کے سبب تاخیر ہوگئی اور ہمیں خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ساٹھ کی دہائی کے آخری برسوں کی بات ہے۔ اس زمانے میں ہمارے ملک نے قومی جہاز راں کمپنی کا آغاز کر کے جہاز تو خریدنے شروع کردیے تھے لیکن انہیں چلانے کے لیے عملہ موجود نہیں تھا۔ ہمارے ہر جہاز کا کیپٹن اور چیف انجینئر غیر ملکی تھا۔ ہمارے ملک کی میرین اکیڈمی کے قیام کو چھ برس ہوچکے تھے۔ وہاں جہاز چلانے والے انجینئر اور نیوی گیٹر تربیت پارہے تھے۔ فی الحال پہلی بیچ جہازوں پر جاچکی تھی اور ہماری دوسری بیچ حال ہی میں جہازوں پر سوار ہوئی تھی۔ ہمیں اعلیٰ عہدوں تک پہنچنے کے لیے مزید چار پانچ برس درکار تھے لہٰذا ہمارے ملک کے جہاز چلانے والے تمام اعلیٰ عہدوں پر گورے فائز تھے۔ ہمیں یہ بھی اب معلوم ہوا ہے کہ ضروری نہیں کہ گوری چمڑی والا سرجن، ڈاکٹر، انجینئر اور جہاز کا کیپٹن اپنے کام میں ماہر اور بہترین منتظم ہو۔ ہمارے کیپٹن کی صبح کا آغاز بیئر کے ڈبے سے ہوتا تھا اور رات وہسکی کی بوتل پر ختم ہوتی تھی۔ وہ اپنی جان سے بھی بے زار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جہاز سمیت ہمیں بھی سمندر کی تہ میں لے جائے گا۔

ہم میڈیٹرینین سمندر سے نکلے تو بحراوقیانوس بھوکے شیر کی طرح دھاڑتا نظر آیا۔ ایسے بگڑے ہوئے سمندر میں طویل مسافت درپیش ہو اور کسی سمندر کو مکمل طور پر پار کرنا ہو جہاں دنیا کے براعظموں سے کٹ کر سفر کرنا ہو ایسے میں جہاز کا فیول آئل اور لیوب آئل ختم ہوجائے تو سامنے موت رقص کرتی نظر آتی ہے لیکن ہمارا کیپٹن جہاز کو مزید مغرب کی سمت میں لے جانے کے احکامات دیتا رہا۔ ہم اس طرح یورپ اور افریقا براعظم سے دور ہوتے چلے گئے یعنی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو کنارہ ہماری پہنچ سے دور ہوتا۔

''آپ لوگ فکر نہ کریں۔'' کیپٹن نے گویا ہمیں تسلی

6۔ صوبائی مجلس قانون ساز کے ارکان کی تعداد چار سے آٹھ تک مقرر کی گئی جن میں سے کم از کم نصف کا غیر سرکاری ہونا لازمی تھا۔ ایسی مجالس میں ہندوستانیوں کو بھی لیا گیا لیکن انہیں صرف رائے دینے کا حق حاصل تھا۔

انڈین کونسل ایکٹ 1892ء اس ایکٹ کی رو سے ایکٹ 1861ء میں حسب ذیل اصلاحات کی گئیں:

1۔ مقننہ (Legislature) کو بجٹ پر بحث کرنے اور دوسرے امور کے متعلق حکومت سے سوال کرنے کا حق دیا گیا۔

2۔ گورنر جنرل کو مقننہ کے ارکان کی تعداد میں بارہ سے سولہ تک اضافہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں، یونیورسٹیوں اور تجارتی ایوانوں کو مقننہ کے لیے اپنے نمائندے نامزد کرنے کا حق دیا گیا تاکہ صوبائی مقننہ کے ارکان کی تعداد بڑھ سکے۔ یہ ایکٹ برطانوی پارلیمان نے ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کے مطالبات حقوق کے پیش نظر پاس کیا۔

انگریزوں نے انڈین کونسل ایکٹ 1892ء نافذ تو کر دیا لیکن اس کا کچھ اثر قبول کرنے کی بجائے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف مزید نفرت پیدا ہوگئی کیوں کہ ان اصلاحات کی وجہ سے ہندوستان کے عوام مطمئن نہ تھے اور وہ مزید مراعات چاہتے تھے۔ 1892ء کی دستوری اصلاحات ملکی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب نہ کی گئی تھیں اس لیے وہ جلد ہی ناکام ہوگئیں۔ ان حالات میں گورنر جنرل نے نئی تجاویز مرتب کرنے کے لیے اگست 1906ء میں ایک کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں 1909ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا۔

مرسلہ: سلطان شاہ۔ ساہیوال

دیتے ہوئے کہا۔ ''اٹلانٹک سمندر میں ایک جگہ کیپ وردی جزیرہ واقع ہے میں دس سال پہلے ایک یونانی جہاز پر کیڈٹ تھا۔ میرا کیپٹن جہاز کو اسی جزیرے پر لے گیا تھا۔ وہ جزیرہ شاپنگ کے لحاظ سے بہت بہتر ہے اور آپ کو چاروں طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آئیں گی۔'' اس نے آخری جملے پر خاصا زور دیا۔

دوسرے دن کیپٹن خود بھی پریشان ہوگیا۔ وہ الجھن کا شکار نظر آنے لگا۔ سب کہنے لگے کہ اب ہم پیچھے بھی نہیں جاسکتے کیونکہ جہاز کا ایندھن ایک آدھ دن میں جواب دینے والا تھا۔ وہاں سے قریبی بندرگاہ بھی سات دن کی مسافت پر تھی۔ اگر ہمارے پاس کم از کم سات دن کا ایندھن ہوتا تو ہم سب سے قریبی بندرگاہ (نیویارک) پہنچ سکتے تھے۔ سمندر مزید choppy (خراب) ہوتا چلا گیا۔

کیپٹن نے کہا۔ ''ہم کیپ وردی جزیرے کے قریب ہی موجود ہیں۔''

''یہ آپ یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' ہم نے جاننا چاہا۔

''اس علاقے میں ہمیشہ سمندر بگڑا ہوا ہوتا ہے اور طوفان بھی آتے رہتے ہیں۔''

ہم سری لنکا اور ہانگ کانگ کے جزیرے بھی دیکھ چکے تھے لیکن وہ گھنٹوں کے فاصلے پر ہیں ان کے علاوہ ہم لکھ دیپ اور مالدیپ جزائر کے قریب سے بھی گزر چکے تھے۔ وہ مختصر ہونے کے باوجود پُرسکون سمندر میں ہیں۔ ان کے چاروں اطراف میں سکون ہی سکون ہے۔ وہاں چھوٹی کشتیاں بھی گویا کسی چکنی سڑک پر چل رہی ہوں اور یہاں ہمارا دیوہیکل آہنی جہاز سمندر کے غیض و غضب سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بپھری لہریں اسے تنکے کی طرح اچھال رہی تھیں۔

''نقشہ پرانا ہے اور جہاز کا ریڈار بھی درست کام نہیں کر رہا۔'' آخر کار کیپٹن نے اعتراف کیا کہ ہم بھٹک گئے ہیں۔

''میرے خیال کے مطابق ہمیں بہت پہلے اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

جہاز پر موجود تمام لوگ پریشان ہوگئے تھے۔ کیپٹن نااہلی میں ثانی نہ رکھتا تھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ ہم طوفانی سمندر میں سمت کھو بیٹھے ہیں تب اچانک جزیرے کے آثار نظر آنے لگے۔ بہرحال ہمارا جہاز کیپ وردی

جزیرے کی بندرگارہ سے لگا تو ہماری جان میں جان آئی۔
ہم سوچتے رہے کہ اس مقام سے زیادہ بحری جہازوں کا گزر بھی نہیں ہوتا۔ یہاں فضائی سروس بھی دستیاب نہیں۔ بھٹ شاہ قصبے جیسے مختصر جزیرے کے لوگ گزر بسر کیسے کرتے ہوں گے۔ بہرحال ڈیوٹی فری بندرگاہ ہونے کے سبب جہاز کے لیے ایندھن خاصا سستا ملا یقیناً کمپنی والے بھی خوش ہوں گے کہ اس احمق کیپٹن نے خاصی بچت کرلی تھی جن حالات میں جہاز وہاں تک پہنچا تھا۔ اگر کمپنی کو یہ معلوم ہوجاتا کہ جہاز غرق ہونے سے بال بال بچا ہے تو وہ کیپٹن کو تحریری آرڈر ارسال کرتے کہ آیندہ سستے ایندھن کے لیے ایسی خطرناک بندرگاہ کا رخ ہرگز نہ کرنا۔
ہم بھی شہر کا ناک نقشہ دیکھ کر خوش ہوئے۔ وہاں دستیاب ہر چیز انتہائی کم قیمت تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ڈیوٹی فری پورٹ تھا۔ بندرگاہ پرتگالیوں کے قبضے میں تھی ان کے گورے چہرے نظر آئے تھے۔ مقامی لوگ چاکلیٹی رنگت کے تھے یعنی وہ نہ تو گورے تھے نہ ہماری طرح گندمی رنگت کے اور نہ ہی افریقیوں کی طرح کالے بھجنگ تھے۔ ان کے بال مکرانیوں کی طرح پیچدار تھے۔
ہم سے پہلے شہر کی سیر اور شاپنگ کرکے آنے والے ساتھیوں نے بتایا کہ اس بازار میں دو دکانیں انڈین کی بھی ہیں جہاں کپڑا، گھڑیاں اور ٹرانسسٹر ریڈیو فروخت ہوتے ہیں۔ اس دور میں یہی اہم چیزیں بکی جاتی تھیں۔ ان چیزوں کے علاوہ ٹورسٹ یاشیکا کے کیمرے شوق سے خریدتے تھے۔
میں جس پہلی انڈین دکان میں داخل ہوا اس کا نوجوان سیٹھ دکان میں کام کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ پرتگالی زبان میں باتیں کررہا تھا۔ وہ ہم سے اردو میں بولتا رہا۔ خریداری کے بعد دکان سے روانہ ہوتے وقت میں نے اس سے پوچھا کہ وہ دکان کا مالک ہے یا کسی پرتگالی گورے کی دکان پر ملازم ہے لیکن میرے سوال کے الفاظ شاید میرے ما فی الضمیر کو درست طریقے سے واضح نہ کرسکے میں نے اس سے پوچھا تھا۔
''آپ کون ہیں؟ یعنی آپ دکان کے مالک ہیں یا یہاں ملازمت کرتے ہیں؟''
''میں سندھی ہوں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ مجھے یہ سن کر بہت حیرت ہوئی یقین کی خاطر میں نے سندھی میں اس سے پوچھا۔

''آپ کو سندھی آتی ہے؟''
''جی ہاں، بول سکتا ہوں۔''
''آپ کا تعلق سندھ کے کس علاقے سے ہے؟''
''شاید شکارپور سے۔''
''شاید سے کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''میں یہیں پیدا ہوا ہوں۔''
اس نے جواب دیا۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی حالانکہ وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ نظر آتا تھا لیکن اس کی عمر بائیس برس سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ تقسیم کے وقت یعنی 1947ء میں اس کا باپ یہاں آیا ہوگا اور اس کے بعد یہ پیدا ہوا ہوگا تو اس طرح اس کی عمر اتنی ہی ہونی چاہیے۔
''آپ کے والد نے 1947ء میں سندھ سے ہجرت کی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں میرے والد بارسلونا (اسپین) میں پیدا ہوئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے دادا 1935ء میں سندھ سے لزبن (پرتگال) آئے تھے۔ انہوں نے اسپین میں کاروبار شروع کیا لیکن پھر وہ جلد ہی اس جزیرے پر آگئے تھے کیونکہ ان کے پاس پرتگال کا پاسپورٹ تھا۔''
میں حیرت سے سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس جزیرے پر جہاں آج بھی ہوائی سروس موجود نہیں ہے یہاں اس کا باپ پچیس تیس برس پہلے پہنچا تھا۔ ظاہرہ وہ کسی ہوائی جہاز میں تو آیا نہیں ہوگا۔ اگر وہ کسی بحری جہاز کے ذریعے یہاں آیا ہوگا تو وہ ہمارے جہاز کی طرح ماڈرن نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی طرح اس کا دادا بمبئی سے اسپین یا پرتگال آیا ہوگا وہ بھی بحرہند کیپ آف گڈ ہوپ اور بحراوقیانوس جیسے خوفناک اور ظالم سمندروں کو جھیل کر یہاں تک پہنچا ہوگا۔ اس زمانے کی عام سی کشتیوں میں ایسے سمندروں میں اتنا طویل سفر کرنے والے کو بزدل یا ڈرپوک کیسے کہا جاسکتا ہے؟
پھر ویسٹ انڈیز اور واپسی پر برمودا جزیرے پر وہاں کے مقامی بازاروں میں ہندو سندھیوں کی دوسری اور تیسری نسل کو کاروبار کرتا ہوا دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوئی تھی۔ مجھے اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ شکارپور کے یہ سندھی ہندو سوداگر انسان ہیں یا جن وہ اس زمانے میں کوہ قاف جیسے دور دراز ملکوں اور جزیروں تک جا پہنچے تھے جبکہ وہاں تک گئی قوموں کے لوگوں کی سوچ بھی نہیں پہنچی تھی۔

مضبوط قوتِ ارادی

رئیسہ خالد

وہ ایک ننھا سا بچہ تھا۔ حادثاتی طور پر موت کے جبڑے میں پھنس گیا تھا مگر اس نے حوصلہ نہ ہارا اور دو دن و دو راتیں ایک پتلی سی نالی نما گڑھے میں گزار دیں۔ اس بچے کی وجہ سے اس کا خاندان راتوں رات امیر بن گیا۔

ایک ننھے سے بچے کی قوتِ ارادی کا قصہ

یہ کئی سال پرانا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں ہندوستان گئی ہوئی تھی۔ مئی جون کی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ عموماً میں گرمیوں میں ہی ہندوستان جاتی ہوں۔ کیوں کہ ان دنوں بچوں کے اسکول کالج کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ چھٹیوں کا فائدہ اٹھا کر میں بھارت آئی ہوئی تھی۔ 9 نومبر 2009ء کا دن تھا اور دوپہر کا وقت تھا۔ ہم سب لوگ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر ڈراما دیکھ رہے تھے کہ اچانک ڈراما روک کر یہ خبر سنائی گئی کہ ایک بچہ بورنگ کیے ہوئے گڑھے میں گر گیا ہے۔ یہ واقعہ جے پور راجستھان سے 40 کلومیٹر دور شاہ پور ضلع کے جگت پورا گاؤں میں پیش آیا تھا۔ جگت پورا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پانی نکالنے کے لیے دو تین دن پہلے بورنگ کی گئی تھی۔ اگرچہ بورنگ گاؤں سے کافی دور کھیت میں کی گئی تھی لیکن جب کافی گہرائی کے بعد بھی پانی نہیں نکلا تو گڑھا بھرنے کی بجائے ایک ریت کی بوری سے اس کے دہانے کو ڈھک دیا گیا۔ بورنگ آبادی سے کافی دور کی گئی تھی اس لیے اطمینان تھا کہ بچے اِدھر نہیں آئیں گے لیکن اس دن کچھ بچے جن کی عمریں پانچ سے چھ سال کی تھیں کھیلتے کھیلتے وہاں تک پہنچ گئے۔ یہ غریب کسانوں کے بچے تھے۔ انہیں اس گڑھے کا کچھ پتا نہ تھا۔ اچانک ایک بچہ جس کا نام ساحل اور عمر چار سال ہوگی اس بورنگ پر پڑے ہوئے بوری پر جو گڑھے کو ڈھکنے کے لیے رکھی گئی تھی چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ بچے نے صرف ایک نیکر پہنا ہوا تھا اوپر کا حصہ بالکل ننگا تھا۔ بوری پر پیر رکھتے ہی بوری آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جانے لگی پہلے تو بچوں کو کچھ سمجھ

نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے ان بچوں کے درمیان کوئی بڑا بچہ نہیں تھا۔ تقریباً سب ہم عمر تھے۔ جب انہوں نے بچے کو نیچے جاتے دیکھا تو وہ گھبرا گئے اور دوڑتے ہوئے گاؤں کے لوگوں تک یہ خبر پہنچائی جب گاؤں کے لوگ وہاں پہنچے تو بچہ بہت نیچے گہرائی تک پہنچ چکا تھا۔ نیچے کی چوڑائی کم ہوتی جارہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچہ گہرائی کی آخر سطح تک پہنچ گیا۔ بورنگ میں نیچے کی چوڑائی اوپر سے بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے بچہ نیچے پہنچ کر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اسے ہاتھ پیر پھیلانے کی جگہ بھی نہ تھی۔

گاؤں والوں نے اپنے طور پر اسے نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوسکی۔ کبھی وہ اس میں بالٹی باندھ کر نیچے ڈالتے لیکن نیچے جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے بالٹی وہاں تک نہیں پہنچ پارہی تھی۔ کبھی وہ صرف موٹی رسی نیچے پھینک رہے تھے تاکہ بچہ اسے پکڑ کر اوپر آسکے۔ بچے نے کئی بار رسی کو پکڑ کر اوپر آنے کی کوشش کی لیکن تھوڑا اوپر آتے ہی رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور وہ پھر وہیں پہنچ جاتا جہاں وہ پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ بار بار گرنے سے اس کے زخمی ہونے کا اندیشہ تھا۔ ان کی ساری کوششیں بےکار جارہی تھیں۔ جب بچہ ان سے نہیں نکل سکا تو ان میں سے کچھ لوگ مدد کے لیے شہر کی طرف بھاگے۔

یہ ساری کارروائی ٹی وی مسلسل دکھا رہا تھا۔ اب حکومت کی طرف سے بھی لوگ آنے لگے۔ اس کوشش میں رات ہوگئی۔ بچہ صبح سے بھوکا تھا۔ وقفے وقفے سے اسے کھانے پینے کی چیزیں نیچے ڈالی جارہی تھیں جس میں بسکٹ، ٹافیاں، پانی کی بوتل اور جوس کے ڈبے تھیلوں میں رکھ کر رسی کے ذریعے نیچے پہنچایا جارہا تھا۔ جب بھی کیمرا اسے دکھاتا وہ خاموشی سے بیٹھا نظر آتا۔ نہ تو وہ رو رہا تھا نہ ہی خوف زدہ دکھائی دیتا تھا۔ بالکل ننگ دھڑنگ اور کھانے میں مصروف دکھائی دے رہا تھا۔

لوگ بچے کی ہمت کی داد دے رہے تھے۔ گاؤں کے سارے لوگ بلکہ دوسرے شہر سے بھی لوگ آکر جمع ہورہے تھے لیکن کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے نکالا جائے۔ عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ رات ہوچکی تھی۔ اتنی گہرائی میں انہیں کچھ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ حالانکہ وہاں روشنی کا انتظام کیا گیا تھا۔ ساری رات لوگ کوشش کرتے رہے لیکن کامیابی نہیں ملی۔

صبح جب ٹی وی کھولا تو پتا چلا کہ ابھی تک بچہ نکل نہیں پایا۔ وہاں موجود لوگوں سے بار بار اپیل کی جارہی تھی کہ گڑھے سے دور چلے جائیں۔ وہاں موجود لوگ بھی اس صورتِ حال کو سمجھ رہے تھے کہ اگر گڑھے سے مٹی جھڑی تو پھر بچے کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے کیوں کہ کھیت کی مٹی نرم ہوتی ہے۔ سب لوگ دور کھڑے تھے لیکن سب کے دلوں میں بچے سے اور اس کے والدین سے ہمدردی تھی۔

اس دوران فائر بریگیڈ ابتدائی طبی امداد فراہم کرنے والا عملہ اور پولیس کی خاص نفری موقع پر پہنچ چکی تھی لیکن سب بےبس کھڑے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس معصوم بچے کو کس طرح نکالا جائے زیادہ اہمیت وقت کی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا لوگوں کی پریشانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ بچے کو آکسیجن کی کمی بھی ہوسکتی تھی۔ انہوں نے کیمرا لگایا ہوا تھا جس سے پل پل کی خبریں دیکھی جارہی تھیں۔ بچہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ اسے ہاتھ پیر ہلانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ ایک پوزیشن میں وہ پندرہ گھنٹے سے بیٹھا ہوا تھا۔

امدادی ٹیموں کو بھی سب سے زیادہ خدشہ یہی تھا کہ کسی بداحتیاطی سے بھربھری مٹی اس گڑھے میں نہ گر جائے اور وہ گڑھے میں زندہ دفن ہوجائے۔

امدادی ٹیموں کے ارکان نے آپس میں صلح مشورہ کیا اور پھر مزید وقت حاصل کرنے کے لیے آکسیجن سلینڈر کو ایک کھمبے سے باندھ کر اس کی ٹیوب کو آہستہ آہستہ گڑھے میں ڈال دیا تاکہ آکسیجن کی کمی نہ ہو اور وہ آسانی سے سانس لے سکے چونکہ گڑھے میں پانی نہیں نکلا تھا۔ اس لیے اس کے ڈوبنے کا ڈر نہیں تھا۔

جائے وقوعہ پر کچھ دیر بعد صوبائی وزراء وغیرہ بھی آگئے اور علاقائی عہدے دار مزید مستعد ہوگئے۔ پولیس کی بھاری نفری بھی موجود تھی۔ ریسکیو ٹیم ہر قسم کی تدبیر کر چکی تھی

مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس بچے کو باہر نکالا جائے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جال ڈالا جائے لیکن اس کے لیے گڑھے کو کشادہ کرنا ضروری تھا لیکن یہ بھی مناسب نہیں تھا کیوں کہ گڑھا کشادہ کرنے کی صورت میں بچے پر مٹی گر سکتی تھی جو اس کے دم گھٹنے کا باعث بن سکتی تھی۔

بچے کے والدین رو رو کر التجا کر رہے تھے کہ میرے بچے کو بچا لیں۔ بچے کو کھانے پینے کی چیزیں مسلسل پہنچائی جا رہی تھیں اور پھر بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ گڑھے سے تھوڑا دور ایک اور گڑھا کھودا جائے۔ پھر اس گڑھے کے ذریعے نیچے اترا جائے اور اندر پہنچ کر اس گڑھے کی دیوار احتیاط سے توڑ کر سرنگ بنائی جائے اور اس سرنگ کے ذریعے بچے کو دوسرے گڑھے میں لایا جائے۔ گڑھا کھودنے کے لیے مشین کی ضرورت تھی۔ مشین کے لیے بار بار ٹی وی کے ذریعے اعلان ہو رہا تھا

کیوں کہ ہاتھ سے اتنی گہرائی تک گڑھا کھودنا آسان نہیں تھا۔ وقت بہت لگ جاتا۔ پہلے تو انہوں نے ہاتھ سے کام شروع کیا لیکن جب مشین آگئی تو کام تیزی سے ہونے لگا لیکن اس کام میں رات ہونے کا خدشہ تھا کیوں کہ دوسرے دن کا بھی آدھا حصہ گزر چکا تھا۔ رات سے پہلے پہلے اس بچے کو نکالنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہاں پر زمین زیادہ سخت نہیں تھی کیوں کہ وہ کھیت کا حصہ تھا۔ پھر بھی کھدائی کافی مشکل ہو رہی تھی۔ مگر مشین کی وجہ سے گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو رہا تھا۔

اگرچہ مشین کا انتظام کافی دیر سے ہوا۔ اعلان بہت دیر سے ہو رہا تھا لیکن یہ چھوٹا سا گاؤں تھا اس لیے مشین کو یہاں تک پہنچنے میں کافی دیر ہوئی۔ بچہ خطرے میں تھا۔ بہت سارا وقت گزر چکا تھا مگر بچے کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس عرصے میں وہ ایک بار بھی نہیں رویا بلکہ اطمینان

منصور احمد

1968ء میں پیدا ہوئے۔ عالمی شہرت یافتہ گول کیپر اور سابق کپتان پاکستان ہاکی ٹیم (1996ء) اٹلانٹا (امریکا) اولمپکس۔ وہ راولپنڈی میں پیدا ہوئے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے متعدد اہم بین الاقوامی میچوں میں پاکستان کی نمائندگی کی جن میں 1985ء میں ایشیا کپ، 1986ء میں ایشیا کپ ہاکی ٹورنامنٹ، اندرا گاندھی ہاکی ٹورنامنٹ 1986ء، ''ڈ کپ 1986ء لاہور، سیول ایشین گیمز 1986ء، سیول اولمپکس 1988ء، چیمپئنز ٹرافی 1988ء، ایشیا کپ ہاکی ٹورنامنٹ 1989ء، بیجنگ ایشین گیمز 1990ء، ورلڈ کپ 1990ء، بارسلونا اولمپکس 1992ء، پینا سونک ٹورنامنٹ جرمنی 1993ء، ایشیا کپ 1993ء، ورلڈ کپ 1994ء، ایشیائی کھیلیں 1994ء، چیمپئنز ٹرافی 1994ء، این سی ایم ٹرافی 1994ء، چیمپئنز ٹرافی 1994ء میں پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے اہم کردار ادا کیا اور بہترین گول کیپر کا اعزاز حاصل کیا جس کی بنا پر ایشیا الیون اور عالمی الیون میں بطور گول کیپر شامل کیا گیا۔ 1996ء کے اٹلانٹا اولمپکس کے لیے انہیں ٹیم کیپٹن بنایا گیا تھا۔

مرسلہ: ندیم احسن۔ ملتان

مملوک

تیرہویں صدی عیسوی میں ترکی غلاموں کا ایک جتھا بطور محافظ فوج کے سلاطین مصر کی ملازمت میں تھا۔ بعد میں یہی لوگ مملوک کہلائے۔ ان کا زور اتنا بڑھ گیا کہ 1250ء میں انہوں نے تخت پر قبضہ کر کے خود اپنا بادشاہ مقرر کر دیا۔ چنانچہ یہ مملوک حکمران 1517ء تک مصر پر حکمران رہے۔ جب ترکوں نے مصر پر قبضہ کیا تو مملوک حکمران ترکی سلطنت کے ملازم شمار ہونے لگے۔ جب نپولین نے مصر فتح کیا تو یہ لوگ پھر برسرِ اقتدار آ گئے اور کچھ مدت حکومت کرتے رہے۔ لیکن 1811ء محمد علی پاشا نے ان سب کو قاہرہ قلعے میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مرسلہ: آصفہ بتول۔ پتوکی

سے بیٹھا کھاتا پیتا رہا۔

شام ہونے جارہی تھی اور اب دوسرا دن بھی مکمل ہونے والا تھا۔ زمین کھودنے والے ارکان نے پہلے گڑھے کا جائزہ لیا۔ اس میں تیز روشنی ڈالی۔ طبی امداد کے عملے کی ہدایت پر کچھ لوگ اس سے باتیں بھی کررہے تھے تاکہ وہ غنودگی میں نہ چلا جائے لیکن وہ کھانے پینے میں ہی مست تھا۔ کسی کی باتوں کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بالکل خوف زدہ نہیں ہے۔

اب مشین تیزی سے کام کررہی تھی۔ امدادی ٹیم کا منصوبہ تھا کہ نیا گڑھا اس گڑھے سے ذرا دور کھودا جائے۔ نئے گڑھے میں کچھ لوگ جائیں اور دونوں گڑھوں کے درمیان سرنگ بنائیں۔ سرنگ بناتے وقت بچے پر مٹی گرنے کا امکان تھا۔ یہ خاصا مشکل کام تھا کیوں کہ اس طرح بھی اس کی جان کو خطرہ ہوسکتا تھا۔ اب مشین تیزی سے کام کررہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گڑھا کھد گیا۔

کھدائی پوری ہوچکی تھی۔ صرف اب دونوں گڑھوں کے درمیان سرنگ بنانا تھا جس میں انہیں بہت احتیاط سے کام کرنا تھا۔ دوسرے گڑھے میں بڑی رسی کی ایک لمبی سیڑھی ڈالی گئی۔ اس سیڑھی کے ذریعے دو آدمی نیچے اترے۔ ان کے ہاتھ چھوٹے تگر تو کیلے اوزار لائٹ اور رسی تھی لیکن سرنگ بناتے وقت بڑی احتیاط سے کام لے رہے تھے تاکہ بچے پر مٹی نہ گرے۔ طبی امداد کے عملے کو خدشہ تھا کہ بچہ مٹی گرنے سے ڈر نہ جائے۔ وہ ایک ایک انچ احتیاط سے کھود رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اوپر سے پوچھا گیا تم لوگ خیریت سے تو ہو، جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم لوگ خیریت سے ہیں لیکن احتیاط کی وجہ سے دیر ہورہی ہے۔ کام ست روی سے کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ لوگ تھوڑا اور انتظار کریں ہم اطمینان سے کام کرنا چاہتے ہیں۔

جیسے ہی دونوں گڑھوں کے درمیان راستہ بنا انہوں نے بچے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بچہ بالکل ننگا تھا اس نے نیکر بھی اتار پھینکی تھی۔ انہوں نے بچے کو چادر میں لپیٹ لیا اور باہر لانے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے بچے کی کمر کو زور سے پکڑا اور سیڑھی کے ذریعے اپنی طرف لے آئے۔ انہیں یہ خطرہ بھی ہوگیا تھا کہ سرنگ کی مٹی نرم اور بھربھری ہے اور ہوسکتا ہے کہ پائپ نما سرنگ کسی وقت بھی بیٹھ جائے۔ اب انہوں نے احتیاط سے اور تیز رفتاری سے کام کیا۔ بچے کو رسی سے باندھا اور دوسرے ساتھی کو کھینچنے کا اشارہ کیا پھر تینوں سیڑھی کے سہارے اوپر آگئے۔

باہر ایک ہجوم تھا جو بچے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ بچہ باہر آچکا تھا اور وہ زندہ تھا لیکن اب وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس وقت اسے ماں باپ اور رشتے داروں سے بھی ملنے نہیں دیا گیا۔ طبی امداد کی ایمبولینس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ وہ لوگ اسے سیدھا اسپتال لے گئے۔ اس بچے نے گڑھے میں تقریباً دو دن اور ایک رات گزارہ تھا۔ فوری طور پر اس کے مختلف ٹیسٹ ہوئے۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ والدین اور ڈاکٹروں کے سوالات کا جواب دے رہا تھا اور اپنے بھائی بہنوں سے مل کر خوش ہورہا تھا۔ وہ بچہ اتنا چھوٹا ہو کر بھی بہت ہمت والا تھا۔ اتنی دیر گڑھے میں رہ کر بھی وہ بہت اچھی طرح باتیں کررہا تھا۔ اسپتال کے باہر ایک ہجوم تھا جو بچے کو دیکھنا اور ملنا چاہتا تھا۔ جب انہیں پتا چلا کہ آج وہ پانچ سال کا ہوا ہے تو بہت سارے لوگ اس کے لیے کیک اور تحفے لے کر کھڑے تھے۔ اسے بے شمار تحفے ملے۔ بہت سے لوگوں نے کیش کی شکل میں بہت کچھ دیا۔ بہت سارے سرمایہ دار اس کی تعلیم و تربیت کے اخراجات کا ذمہ اٹھانے کو تیار تھے۔ لوگ اسے مبارک باد دینا چاہتے تھے۔

ہندوستان کے ایک چینل اسٹار پلس نے اس کی تعلیم و تربیت اور سارے اخراجات کا ذمہ لے لیا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے ماں باپ اور بھائی بہن کی زندگی میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ انہیں اتنے پیسے ملے ہیں کہ ان کی زندگی آسان ہوگئی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کے والدین اور بھائی بہنوں کے لیے ہر ماہ رقم بھجوانے کا بھی وعدہ کیا ہے تاکہ وہ لوگ آرام کی زندگی گزار سکیں۔ اس بچے نے اپنی زندگی اذیت میں ڈال کر اپنے اور اپنے گھر والوں کی زندگی سنوار دی ہے۔ وہ اب تک اذیت اور فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ محنت کش تھے۔ زمیندار کے کھیتوں پر کام کرکے بھی اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی مہیا نہیں کرسکتے تھے۔ ان کا اپنا گھر تک نہ تھا۔ جھونپڑی میں گزارہ کررہے تھے۔ ان کے دس بچے تھے اس کا آٹھواں نمبر تھا۔ اب اس کے سارے بہن بھائی اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں اور بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ سچ ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے نواز دیتا ہے۔

۲۰۶۷۰۹

سایۂ اجل

آصف ملک

اس نے سر سے کفن باندھا اور موت کے منہ میں چھلانگ لگا دی۔ اپنے دوست کے چند عزیزوں کو بچانے کے لیے وہ برستی گولیوں سے گزرا۔ دہشت گردوں کے ہر حملے کو ناکام بنایا۔ بدلے میں اسے زندگی بھر کی رفاقت نبھانے کے لیے ایک بیوی مل گئی۔

ہر گام پر ہنگامے، دم بخود کر دینے والی آپ بیتی

1980 کا بوٹسوانا آج کے جدید اور تیزی سے ترقی کرتے بوٹسوانا سے بہت مختلف تھا۔ اس وقت یہ ایک ترقی پذیر اور تقریباً دیہی ماحول رکھنے والا ملک تھا جو جنوبی افریقا، نمیبیا، زمبابوے اور زیمبیا کے درمیان ہے۔ اس کی سرحد کا بڑا حصہ جنوبی افریقا اور نمیبیا سے لگتا ہے۔ جب کہ زمبابوے اور زیمبیا سے اس کی سرحد زیادہ طویل نہیں ہے۔ نمیبیا کی ایک پتلی سی پٹی اسے انگولا سے الگ کرتی ہے جو اس وقت افریقا کا شورش زدہ ملک تھا اور یہاں شدید قسم

کی خانہ جنگی جاری تھی۔ یہ خانہ جنگی صرف انگولا تک محدود نہیں تھی بلکہ آس پاس کے ممالک بھی اس سے متاثر تھے۔ میرا طیارہ دارالحکومت گابرون کے ائرپورٹ کی ریت زدہ اسٹرپ پر اترا تو چند لمحے کے لیے ڈگمگایا تھا۔ میں ڈیڑھ گھنٹے پہلے جوہانسبرگ سے روانہ ہوا تھا۔ ان دنوں وہاں پریٹوریا میں نسل پرست حکومت تھی اور اس کے تعلقات تمام ہی افریقی ممالک سے شدید کشیدہ تھے۔ چند ایک ممالک تھے جن سے جنوبی افریقہ کے تعلقات تھے اور بوٹسوانا ان میں سے ایک تھا۔ یہ تعلقات علاقائی سطح پر تھے ورنہ بوٹسوانا بھی نسل پرستی کا شدید مخالف تھا اس کا اندازہ مجھے ائرپورٹ حکام کے رویے سے ہوگیا۔ میرا جنوبی افریقی پاسپورٹ دیکھتے ہی ان کی بھنویں تن گئی تھیں اور انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کردی تھی۔

”کیوں آئے ہو؟“

”کس لیے آئے ہو؟“

”بوٹسوانا میں کیا کام ہے؟“

”کب واپس جاؤ گے؟“

میں نے تمام سوالوں کے کئی کئی بار جواب دیئے مگر ان لوگوں کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ بہ مشکل مجھے ایک ذرا معقول امیگریشن آفیسر کی مداخلت پر ائرپورٹ سے باہر جانے کی اجازت ملی مگر اس وارننگ کے ساتھ کہ اگر میں مقررہ ایک ہفتے کے اندر یہاں سے واپس نہیں گیا تو میری تلاش شروع ہو جائے گی اور میں جب ملا مجھے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ بوٹسوانا کی جیلیں جہنم سے کم نہیں ہوتی ہیں میرے کچھ واقف کار یہاں کی سیر کر چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مرنے کے بعد اگر انہیں جہنم بھیجا گیا تو انہیں زیادہ مشکل نہیں ہوگی کیونکہ وہ زندگی میں ہی اس کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ ائرپورٹ سے باہر آکر مجھے ٹیکسی تلاش کرنے میں بہت دشواری ہوئی۔ اول تو وہاں کوئی ٹیکسی نہیں تھی اور جو چند ایک گاڑیاں کھڑی تھیں ان کے مالکان کو جب پتا چلتا کہ میں جنوبی افریقا سے آیا ہوں تو میری سفید رنگت میرا جرم بن جاتی تھی اور وہ یوں منہ پھیر لیتے جیسے میں ان سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ بہ مشکل ایک افریقی کو مجھ پر ترس آیا اور وہ مجھے اپنی کھٹارہ پک اپ میں لاد کر شہر لے جانے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کہاں لے جاؤں؟“

”کسی ایسے ہوٹل میں جہاں میں آج رات سکون سے سوسکوں کیونکہ کل صبح مجھے ایک طویل اور مشکل سفر پر روانہ ہونا ہے۔ جس میں آرام کا موقع کم ملے گا۔“

کین شا نوجوان اور چہرے سے ہنس مکھ لگتا تھا وہ ایک باتونی اور بے تکلف ہو جانے والا شخص ثابت ہوا۔ اس نے فخر سے مجھے بتایا کہ وہ نسل پرستی پر بالکل یقین نہیں رکھتا اور سفید فاموں کو بھی اپنی طرح انسان سمجھتا تھا۔ میں اس کا پہلے ہی شکر گزار تھا کیونکہ ائرپورٹ شہر سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے اور میں پیدل اتنا طویل سفر کسی صورت طے نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی نصف راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ وہ یہاں میری آمد اور اس کے مقاصد سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ باقی نصف راستے میں اس نے مجھے راضی کر لیا کہ میں انگولا کی سرحد کے پاس اس کے خاؤدم گیم ریزرو تک کا سفر اس کی کھٹارا... پک اپ میں کروں۔ حالانکہ کسی قدر ہموار سڑک پر بھی اس میں ایسے جھٹکے لگ رہے تھے کہ جوڑ جوڑ ہل رہا تھا اور شہر سے باہر کچے راستوں پر اور جہاں سرے سے راستے ہی نہ ہوں وہاں اس پک اپ میں سفر کے مضمرات کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا مگر جس بات نے مجھے کین شا کی پیشکش قبول کرنے پر آمادہ کیا وہ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہے جہاں میں جا رہا تھا۔

دو دن پہلے لندن سے میرے بچپن کے دوست اور اسکول کے ساتھی میل ہارڈی نے کال کی اور اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں جلد از جلد بوٹسوانا کا سفر کروں اور وہاں ہارڈی خاندان کی ایک فیملی کو جنوبی افریقا لاکر لندن روانہ کرنے کے انتظامات کروں۔ ہارڈی سے میرا تعلق ایسا تھا کہ میں اسے کسی صورت انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے جوہانسبرگ یونیورسٹی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں کال کر کے اطلاع دی کہ میں آنے والے ایک ہفتے تک یونیورسٹی نہیں آسکوں گا۔ میں وہاں افریقا کی فطری حیات پر لیکچر دیتا تھا اور آئے دن کسی نہ کسی سفاری کی سیر میں مصروف ہوتا تھا اس لیے میری اس درخواست کو بھی اسی تناظر میں لیا گیا۔ ہارڈی نے مجھے بتایا۔ ”جیک نمیبیا کی سرحد کے پاس شاکوا کے علاقے میں رائن ہارڈی کا فارم ہے۔ وہ بارہ گھنٹے پہلے سرحد پار کر کے آنے والے انگولا کے کمیونسٹ گوریلوں کا نشانہ بن گیا۔ اب مسئلہ اس کی فیملی کا ہے اس کی بیوی اور دو بچوں کو وہاں سے نکالنا ہے۔ وقت بالکل نہیں ہے ورنہ میں آتا اور ان دنوں میرا ہرنیا پھر مسئلہ کر رہا ہے اس

لیے میری درخواست ہے کہ تم یہ کام نمٹا دو۔"

"کیوں نہیں دوست میں یہ کام ضرور کروں گا۔"

دو مہینے پہلے رومیلا سے میری علیحدگی ہو چکی تھی کیونکہ اسے بالکل پسند نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ گھر میں سکون سے رہنے کی بجائے جنگلوں میں مارا مارا پھروں۔ جب کہ میرا کام ہی یہ تھا۔ میں سال میں چھ مہینے فطری حیات کا مشاہدہ کرتا تھا اور باقی کے چھ مہینے یونیورسٹی میں اس پر لیکچر دیتا تھا۔ رومیلا اور میرا ساتھ چھ سال چلا تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارا کوئی بچہ نہیں تھا ورنہ اس فیصلے سے سب سے زیادہ وہی متاثر ہوتا۔ اب ہم دونوں اپنے اپنے گھر مطمئن تھے۔ تینتیس سال کی عمر میں میرا کیریئر ٹھیک جا رہا تھا اور شاید چند سال بعد میں پروفیسر بن جاتا۔ مگر اس کے لیے پی ایچ ڈی لازمی تھا اور فی الحال میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں گھر، جاب اور سفاری کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ پڑھتا بھی۔ رومیلا سے علیحدگی کے بعد اب شاید موقع تھا مگر میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا۔

ٹیل ہارڈی سے بات کرتے ہی میں نے سب سے پہلے یہ معلوم کیا کہ کوئی پرواز گابرون جا رہی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ دو دن بعد ایک پرواز ہے اور اس میں سیٹ بھی میسر ہے۔ مگر جب میں تیار ہو کر ائرپورٹ پہنچا اور میں نے اس طیارے کو دیکھا تو مجھے شک ہوا کہ یہ منزل پر پہنچائے گا بھی یا نہیں۔ پروں والے اس طیارے میں مشکل سے پچیس مسافروں کی گنجائش تھی مگر اس میں تیس سے زیادہ لوگ سوار تھے۔ افریقا کے مختلف علاقوں میں چلنے والی اس ائرلائن کے پاس ایسے ہی ازکار رفتہ طیارے تھے۔ ممکن ہے حالات نارمل ہوتے تو میں اس میں بیٹھنے سے انکار کر دیتا مگر مجھے بہر صورت جانا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس قسم کے ہی سہی لیکن طیارے بوٹسوانا جا رہے تھے ورنہ تمام معقول ائرلائنز نے اس علاقے کے لیے اپنی پروازیں بند کر دی تھیں۔ میں نے بادل ناخواستہ طیارے میں بیٹھنا قبول کیا۔ جوہانسبرگ سے گابرون کا فاصلہ دو سو کلومیٹرز سے زیادہ نہیں ہے مگر اس طیارے نے لڑکھڑاتے اور اونچے نیچے پرواز کرتے ہوئے یہ فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔

میری حالت ٹھیک رہی مگر دوسرے مسافروں کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ ان میں سے بیشتر الٹیاں کر رہے تھے اور اس ائرلائن کو کوس رہے تھے جس نے ایسا واہیات طیارہ رکھا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ سفر ختم ہوا۔ مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس سفر میں کچھ امتحانات اور میرے منتظر تھے۔

کین شا نے مجھے گابرون کے ایک بہترین ہوٹل تک پہنچایا اور اس بہترین ہوٹل کا یہ عالم تھا کہ اس کے صحن میں بکریاں گھوم رہی تھیں اور جو کمرا مجھے رہائش کے لیے ملا اس میں پہلے سے کوئی دو درجن کبوتر براجمان تھے۔ پورٹر نے معذرت کی کہ روشن دان کا شیشہ ٹوٹا ہونے کی وجہ سے کبوتروں کی آمدورفت روکنا ممکن نہیں تھا۔ مگر میں نے روشن دان میں گتا پھنسا کر اس ناممکن کو ممکن بنا لیا اور رات سکون سے سویا۔ البتہ یہاں کھانا بہت لاجواب تھا۔ بکرے کے فرائی مغز اور افریقا کی مخصوص شراب نے ڈنر کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔ ایک پورٹر میری رات کو رنگین بنانے پر کمربستہ تھا مگر میں نے اس سے معذرت کی کہ میں صرف سونا چاہتا ہوں اور ہرگز جاگنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔

گابرون سے شاکوا کا فاصلہ کوئی ساڑھے چھ سو کلومیٹرز تھا۔ زمینی راستے سے اس پر دو دن لگتے۔ آسان طریقہ یہ تھا کہ میں کوئی چھوٹا طیارہ ہائر کر کے لے جاتا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ کوئی چھوٹے طیارے والا اس علاقے میں پرواز کے لیے تیار نہیں تھا۔ کیونکہ انگولا میں لڑنے والے کمیونسٹ گوریلوں کے پاس روسی ساختہ سام میزائل اور آر پی جی راکٹ تھے جو نیچی پرواز کرنے والے طیاروں کو باآسانی مار گرا سکتے تھے۔ اس لیے کوئی ائرلائن یا نجی طیارہ وہاں جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے اب مجھے یہ طویل سفر زمینی راستے سے کرنا تھا۔ صبح چھ بجے مجھے کین شا نے جگایا۔ وہ نہایت بے تکلفی سے میرے کمرے تک چلا آیا تھا۔ اس نے دروازہ بجا کر کہا۔ "جیک اٹھ جاؤ اگر دیر کی تو سفر دو کی بجائے تین دن کا ہو جائے گا۔"

میرا اٹھنے کا موڈ نہیں تھا مگر دو کی بجائے تین دن کی دھمکی نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ناشتے کے فوراً بعد ہم روانہ ہوئے اور میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہاری پک اپ وہاں تک جا سکے گی؟"

"یہ پک اپ۔" وہ ہنسا۔ "یہ تو شہر میں چل جائے تو بڑی بات ہے۔"

"پھر ہم کیسے جائیں گے؟" میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ جب اس نے مجھے ساتھ چلنے پر راضی کیا تو میں سمجھا کہ وہ اسی پک اپ میں لے کر جائے گا۔ اس نے جواب دیا۔

"ایک بہترین لینڈ کروزر ہے۔ اس میں ہم آرام

سے یہ سفر کر سکتے ہیں۔''

مگر لینڈ کروزر صرف اس حد تک بہتر تھی کہ اس کا انجن اور ٹائر بہترین حالت میں تھے اور باقی اس کا حال پک اپ سے مختلف نہیں تھا۔ ہاں اس میں نشستیں زیادہ تھیں۔ کین شا نے کہا۔''اس میں سب آ جائیں گے۔''

''فی الحال تو مجھے جانا ہے اس کی بعد میں دیکھی جائے گی کہ واپسی کیسے ہوگی اور کون ہمارے ساتھ ہوگا۔''

ہم گابرون سے روانہ ہوئے۔ بوٹسوانا کم آبادی والا ملک ہے اور یہاں بڑے شہروں کی نسبت چھوٹے دیہات کہیں زیادہ ہیں۔ اس وقت یہاں شکار کی اجازت تھی اس لیے دنیا بھر سے شکاری یہاں درندوں اور چرندوں کا شکار کرنے آتے تھے۔ راستے میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں آ رہی تھیں اور ہم ان کے پاس سے گزر رہے تھے۔ مگر دوپہر تک ان آبادیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب ہم جنگلوں اور ویرانوں میں سفر کر رہے تھے۔ میرے پاس بہترین اقسام کی کئی رائفلیں ہیں۔ مگر میں ان میں سے کوئی رائفل نہیں لا سکا تھا اور اب خالی ہاتھ تھا۔ میں نے کین شا سے راستے کے خطرات کا ذکر کیا تو اس نے لینڈ کروزر کے ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک بڑی نال والا پستول نکال کر دکھایا اور بولا۔ ''اس سے ہاتھی کا شکار بھی کیا جا سکتا ہے۔''

مگر مجھے شبہ تھا کہ بہ وقت ضرورت اس سے گولی بھی برآمد ہوگی یا نہیں۔ یہ اسمتھ اینڈ ولسن کا بہت پرانا ماڈل تھا جو آج سے چالیس سال پہلے بننا بھی بند ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کھول کر چیک کیا۔ اندر پرزے اور گراریاں درست حالت میں تھیں۔ البتہ اسے صفائی کی ضرورت تھی۔ کین شا سے تھوڑا ڈیزل لے کر میں نے پستول صاف کیا۔ اس کا میگزین الگ نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں گولیاں بھرنی پڑتی تھیں۔ کین شا کے پاس اس کی گولیوں کا ایک ڈبا بھی تھا۔ ایک جگہ گاڑی رکوا کر میں نے پستول کا تجربہ کیا اور جب اس سے فائر ہوا تو مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے یہ پستول میں نے ہی ایجاد کیا ہو۔ اس خوشی میں ہم نے لنچ کیا جو خشک چنوں اور گرم کافی پر مشتمل تھا۔ شام تک ہم سینٹرل کالاہاری گیم ریزرو تک پہنچ گئے تھے اور یہاں پہنچ کر ہمیں کچھ ہریالی نظر آئی تھی۔

بوٹسوانا کا جنوبی اور جنوب مغربی حصہ تقریباً صحرا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو اس صحرا میں پودے اور گھاس اگ آتی ہے اور اسے کھانے کے لیے شمال سے چرندے آتے ہیں۔ یہاں ہریالی شمال اور کسی قدر شمال مشرق میں ہے۔ صحرائے کالاہاری کا کچھ حصہ جو مغرب سے آتا ہے بوٹسوانا میں بھی موجود ہے۔ اس صحرا کے بارے میں سنا ہے کہ اس میں سفر کرنا جان جوکھم کا کام ہے اور بہت کم مہم جو اس طرف کا رخ کرنے کی ہمت کرتے ہیں۔ شکر ہے ہم اس سے بہت دور سے گزرے تھے۔ کالاہاری گیم ریزرو سے اوپر سرسبز پہاڑی علاقہ تھا۔ البتہ یہاں گھنے جنگل نہیں تھے اور بوٹسوانا کی سفاری کے اکثر خزانے اسی علاقے میں پائے جاتے تھے۔ یہاں کثرت سے شیر، چیتے، ہاتھی، گینڈے، زرافے، زیبرے، جنگلی بھینسے اور نیل گائے جیسے بڑے جانور پائے جاتے تھے۔ ان کے متوازی مختلف نسلوں کے ہرن، لکڑ بھگے، شکاری کتے اور بھیڑیے بھی ملتے تھے۔ جہاں جھیلیں، تالاب اور دریا تھے وہاں مگرمچھ بھی پائے جاتے تھے۔

یہاں رات گزارنے کے لیے ہمیں ایک جگہ مل گئی تھی۔ یہ احاطہ تھا جس کی صرف دیواریں اٹھی ہوئی تھیں اور لینڈ کروزر اس میں آرام سے آ گئی تھی۔ میرے پاس ایک ریڈی میڈ مچھر دانی تھی جس میں کوئی کیڑا مکوڑا یا سانپ بچھو نہیں گھس سکتا تھا۔ اسی وجہ سے میں سکون سے سویا۔ کین شا نے یہ کیا کہ جسم پر تیل مل کر لینڈ کروزر کی چھت پر چڑھ کر سو گیا۔ اس سفر کے دوران میں نے اسے اچھا آدمی پایا۔ وہ ممکن حد تک میرا خیال رکھ رہا تھا اور وہ کام بھی کر رہا تھا جو اس کے ذمے نہیں تھے، جیسے کھانا سرو کرنا اور کافی تیار کرنا۔

اگلی صبح سورج نکلنے سے پہلے ہم بیدار ہوئے۔ ناشتا کیا اور میں نے اس علاقے کا تفصیلی نقشہ پھیلایا جس میں تمام آبادیوں اور خطرناک مقامات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ کین شا میرے ساتھ بیٹھا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔''تمہارے خیال میں شاکوا تک جانے کا مناسب راستہ کون سا ہے؟''

''ویسے تو ایک سڑک اس طرف سے جاتی ہے۔'' اس نے موری گیم ریزرو کے جنوب مغربی حصے کی طرف اشارہ کیا۔''مگر یہ طویل ہے۔ سب سے مختصر راستہ موری گیم ریزرو کے جنوب مشرق میں واقع قصبے مان سے گزرتا ہے اس کے بعد کا سفر جھیل اوکوانگو کی وادی میں ہوگا۔''

''مگر یہاں پانی ہوگا۔''

''ان دنوں موسم خشک ہے اور بہت کم جگہوں پر پانی

ملے گا۔ یہاں ہموار ریت ہوگی جس پر لینڈ کروزر بہتر سفر کرتی ہے۔ ہم آج شام تک شاکوا پہنچ جائیں گے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے مگر یہاں جانوروں کے خطرات زیادہ ہوں گے۔''

''بہت کم۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس وقت خشک سالی کی وجہ سے بیشتر چرندے اور ان کی وجہ سے بیشتر درندے شمال کی طرف جا چکے ہیں، وہ اس مہینے کے آخر تک ہی واپس آئیں گے۔ پانی کی کمی ہے مگر مچھ بھی اپنے بنائے غاروں میں چلے جاتے ہیں۔''

مجھے کین شا کی تجویز مناسب لگی اور میں نے اسی راستے سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم سورج نکلتے ہی روانہ ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ناہموار علاقے شروع ہوگئے۔ اس میں دور تک پھیلی ہوئی ڈھلانیں تھیں اور کہیں کہیں گہری کھائیاں تھیں۔ یہ اصل میں اس جھیل کا حصہ تھیں جو اس موسم میں خشک ہو جاتی ہے اور جب یہاں اور وسطی افریقا میں بارش ہو تو یہ بھر جاتی ہے۔ اس کے کناروں پر آبادیاں تھیں مگر گیم ریزرو کے علاقے میں آبادیاں بہت کم اور قدیم تھیں۔ اصل آبادیاں جھیل کے اوپری حصے میں تھیں جو پتلا سا تھا مگر یہ گیم ریزرو سے باہر تھا۔ شاکوا کی آبادی بھی اسی میں تھی۔ مگر یہ جھیل کے بالکل آخری حصے میں نمیبیا کی سرحد کے ساتھ تھی۔ تین گھنٹے بعد ہم نشیب میں اتر رہے تھے اور اب جھیل کی وادی میں سفر کر رہے تھے۔ یہاں جا بہ جا پانی کے تالاب کھڑے تھے مگر پانی کم تھا اور سڑتا ہوا کیچڑ زیادہ تھا جس کی بدبو دماغ خراب کر رہی تھی۔ یہاں گرمی بھی شدید تھی۔ زمین سے بھاپ سی اٹھ رہی تھی جو دور کے منظر کو دھندلا رہی تھی۔

''یہاں سے اوکوانگو کی وادی کا آغاز ہے۔'' کین شا نے کہا۔ ''اس کا شمار چھوٹی شاخوں میں ہوتا ہے۔ چند کلومیٹرز بعد ہم اصل جھیل میں داخل ہوں گے۔''

جیسے جیسے لینڈ کروزر نشیب میں جا رہی تھی منظر وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں بے تحاشہ لمبی گھاس اگی ہوئی تھی اور ایسی جھاڑیاں تھیں جو پانی آنے پر زمین سے اپنی جڑیں چھوڑ دیتی تھیں اور پانی پر تیرتی ہوئی پھر کسی خشکی تک پہنچ کر دوبارہ سے جڑیں قائم کر لیتی ہیں۔ کین شا نے کہا۔ ''اس وقت یہاں سانپوں کی بہتات ہوگی۔ اگر ہم کہیں رکے بھی تو باہر جانے سے گریز کرنا ہوگا۔''

کین شا کا کہنا درست ثابت ہوا، یہاں جھیل کی ریت جو خشک ہو چکی تھی اس پر لینڈ کروزر کے ٹائر بہت اچھی طرح جم رہے تھے اور ہم تیز رفتاری سے آگے جا رہے تھے۔ شام سے پہلے ہم اوکوانگو کی وادی کے وسط میں پہنچ گئے تھے اور یہاں سے شاکوا چالیس کلومیٹرز کی دوری پر تھا۔ اگر ہم گھوم کر آ رہے ہوتے تو اب تک یہاں سے بہت دور ہوتے۔ تاریکی پھیلتے پھیلتے ہم رائن ہارڈی کے فارم تک پہنچ گئے تھے۔ یہ خاصا بڑا فارم تھا جس کی حد بندی یوکلپٹس کے دیو قامت درختوں اور ان کے تنوں سے بندھی خاردار تاروں سے کی گئی تھی۔ وہاں تاریکی تھی مگر جب ہم اتر کر اندر داخل ہوئے تو روشنیاں لہرانے لگیں اور کوئی چلا کر بولا۔ ''خبردار کون ہے یہاں آنے والے کو گولی مار دی جائے گی۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میں میری سے ملنے آیا ہوں میرا نام جیک ہومر ہے اور مجھے رائن ہارڈی کے کزن ٹیل ہارڈی نے یہاں بھیجا ہے۔''

ہم جہاں تھے یہاں سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گولی چلانے کی دھمکی پر کین شا نے لینڈ کروزر کی ہیڈ لائٹس بھی بند کر دی تھیں۔ چند منٹ بعد روشنی دوبارہ نمودار ہوئی۔ یہ کیروسین لیمپ تھے۔ اس پورے علاقے میں کہیں بجلی نہیں تھی اور یہاں لوگ روشنی کے لیے مٹی کا تیل یا کوئی اور چیز استعمال کرتے تھے۔ دو سیاہ فام آگے آئے ان میں سے ایک کے پاس رائفل تھی۔ میں نے اور کین شا نے ہاتھ اٹھا لیے۔ چند لمحے بعد میری آگے آئی۔ وہ تقریباً تیس برس کی جوان اور دلکش عورت تھی۔ اس نے خاکی پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی مگر اس میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر دکھ کا تاثر تھا۔ یہ فطری بات تھی، اس کے شوہر کے انتقال کو ابھی تین دن ہوئے تھے۔ اس نے آگے آ کر کہا۔ ''تم جیک ہو؟''

''ہاں؟''

''مجھے ٹیل کا تار ملا ہے، اس نے تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تھا۔'' وہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی آ جاؤ گے۔''

''ٹیل نے مجھے ایمرجنسی میں آنے کو کہا تھا اس لیے میں ایمرجنسی میں آیا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہاں حالات کیسے ہیں؟''

''اچھے نہیں ہیں۔ ہمیں پھر کمیونسٹ گوریلوں کے حملے

کا خطرہ ہے۔ان کا نشانہ خاص طور سے سفید فام ہیں۔ علاقے کے بہت سے سفید فام یہ جگہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔''

میری نے کین شا کو اپنے ملازمین کے حوالے کیا اور مجھے لے کر اپنے مکان میں آئی۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا دو منزلہ خوب صورت مکان تھا جو فارم کے وسط میں واقع تھا۔ نیچے نشست گاہ، کچن، ڈائننگ ہال اور اسٹڈی تھی جب کہ اوپر بیڈ روم تھے۔ تاریکی کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ رائن نے فارم اور گھر بہت سنوار کر رکھا تھا۔ ڈائننگ ہال میں میز پر دو عدد بچیاں خاموشی سے بیٹھی ماں کا انتظار کر رہی تھیں، ان کے لیے کھانا لگ گیا تھا۔ ان کی عمریں نو اور سات سال تھیں اور دونوں نقوش میں ماں پر گئی تھیں۔ میری نے ان کا تعارف کرایا۔ بڑی والی نائش تھی جب کی چھوٹی میریا تھی۔ میرے لیے انتظام کرنے میں کچھ وقت لگا اور کھانا شروع ہوا۔ میں نے بچیوں کے سامنے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک سیاہ فام ملازمہ سرو کر رہی تھی۔ ڈنر کے بعد ہم کافی کے لیے باہر برآمدے میں آئے۔ بچیاں اوپر سونے چلی گئی تھیں۔ ملازمہ کافی رکھ کر گئی تو میری نے کہا۔

''میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے اتنی دور سے زحمت کی۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''اس میں زحمت کی کوئی بات نہیں ہے، میں نے بتایا نا کہ ٹیل میرا بہترین دوست ہے اور اس نے مجھ سے کہا۔ اب تم بتاؤ کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''فیصلہ؟''اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔''میں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتی ہوں۔ شاید تم نہ آتے تو کل میں یہاں سے جانے والی ایک اور فیملی کے ساتھ چلی جاتی۔''

''یعنی جانا ہے اور جلد جانا ہے۔'' میں نے کہا۔''تب تم فوراً پیکنگ شروع کر دو۔ کیا تمہارے پاس کوئی گاڑی ہے؟''

''پیکنگ میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔''اس نے سر ہلایا۔''ایک جیپ ہے۔ یہ آرام دہ۔ اور بہترین حالت میں ہے۔''

''سامان لینڈ کروزر میں آجائے گا۔ میں، تم اور بچیاں جیپ میں ہوں گے۔''میں نے فوری فیصلہ کیا۔''میں تھکا ہوا ہوں اور نیند سے مر رہا ہوں لیکن اگر مجھے غسل کے لیے کچھ پانی مل جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''یہاں پانی بہت ہے نیچے ایک بہت اچھا غسل خانہ ہے۔''میری نے بتایا۔''جب تک تم نہا لو میں اوپر تمہارے لیے کمرا ٹھیک کر دیتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے میں نیچے لاؤنج میں سو جاؤں گا۔''میں نے کہا مگر میری نہیں مانی جب تک میں غسل سے فارغ ہوا اس نے اوپر کمرا سیٹ کر دیا تھا۔

گرد اور میل اترنے کے بعد میں تازہ دم ہو گیا تھا اور رہی سہی کسر پُرسکون نیند نے پوری کر دی۔ صبح میری آنکھ کھلی تو کھڑکی سے فطرت سے بھرپور ہوا آرہی تھی۔ مگر اس سے لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے شیو کی اور ضروریات سے فارغ ہو کر نیچے آیا جہاں میری اور بچیاں تیار ہو کر ناشتے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کا تمام سامان بکسوں اور سوٹ کیسوں میں، پیک ہو کر برآمدے میں جمع تھا اور ملازمین اسے لینڈ کروزر میں لوڈ کرا رہے تھے۔ جب تک ہم ناشتے سے فارغ ہوئے یہ کام ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں میری اور بچیوں کے ہمراہ مکان کے عقب میں درختوں تلے رائن کی قبر پر آیا۔ میری نے پھولوں اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا اور میں اس دوران میں خاموش کھڑا رہا تھا۔ ہم بوجھل دل کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ ہماری گاڑیاں فارم سے نکلیں تو میں نے میری سے کہا۔''تم بتا رہی تھیں کہ یہاں سے ایک فیملی اور جا رہی ہے۔''

''جانسن فیملی۔''اس نے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔''وہاں ان کا فارم ہے۔ یہ دو میاں بیوی اور ان کا ایک نوجوان بیٹا ہے۔ ان کے فارم پر بھی حملہ ہوا تھا مگر خوش قسمتی سے وہ محفوظ رہے۔ رائن میرے منع کرنے کے باوجود گوریلوں سے بات کرنے چلا گیا اور انہوں نے اسے گولی مار دی۔''

''اگر ہم ان کو بھی ساتھ لے لیں۔'' میں نے کہا تھا کہ اس طرف سے گرد اڑتی دکھائی دی اور پھر ایک پرانا فورڈ ٹرک نمودار ہوا اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میری نے کہا۔

''یہ مسٹر جانسن کا ٹرک ہے۔''

ٹرک میں مارک جانسن، اس کی بیوی زوفر اور بیٹا ایرک بھی تھے۔ ٹرک ہمارے پاس رکا اور اس سے مارک نے جھانک کر کہا۔''میری تم بھی جا رہی ہو؟''

''ہاں کیا سب خیریت ہے؟''

''خیریت کہاں؟''وہ تلخی سے بولا۔''وہ پھر آرہے ہیں اور ہم جتنی جلد یہاں سے نکل جائیں اچھا ہے۔ ابھی وہ

نمیبیا کی حدود میں ہیں۔''

مارک نے کہتے ہی ٹرک چلا دیا تھا اور میں نے اس کی پیروی کی۔ کمیونسٹ گوریلوں کی آمد کا سن کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی اور یہی حال میری اور بچوں کا تھا۔ میریا نے تو رونا شروع کر دیا تھا۔ نائش اسے چپ کرا رہی تھی۔ میں نے میری سے کہا۔ ''ہم اوکوانگو کی وادی سے ہوتے ہوئے آئے ہیں۔''

''وادی سے۔'' میری بولی۔ ''وہ راستہ سیدھا ہے مگر پیچھا کرنے والے بھی سیدھے اسی راستے پر آئیں گے۔''

''تب میرا خیال ہے مارک سے مشورہ کر لیا جائے۔'' میں نے کہا اور ہارن دے کر اسے روکا۔ ہم فارمز سے خاصا آگے نکل آئے تھے اس لیے وہ رک گیا مگر وہ اب بھی خوفزدہ تھا۔ میں نے اسے میری کے خدشے کے بارے میں بتایا تو وہ مزید خوفزدہ ہو گیا۔ ایرک نے کہا۔

''میری ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ وادی میں سفر کی صورت میں ہمیں آسانی سے آلیں گے۔''

''تب ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا اور کین شا کو بھی مشاورت میں شامل کر لیا۔ وہ ہمارے ساتھ موجود واحد سیاہ فام تھا اور میں نے محسوس کیا کہ مارک اینڈ فیملی اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید ان میں بھی نسل پرستی کا عنصر تھا یا پھر وہ کمیونسٹ گوریلوں کے حملے کے بعد سیاہ فاموں کے خلاف ہو گئے تھے۔ مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ ہم نے نقشے نکال لیے تھے۔ کین شا نے مشورہ دیا۔ ''ہمیں وادی کراس کر کے مشرق کی طرف سیلنڈا گیم ریزرو کی طرف جانا چاہیے۔ یہاں ہموار میدان ہے اور ہم تیز رفتاری سے سفر کر سکیں گے۔ گیم ریزرو میں ہمیں گارڈز کا تحفظ بھی مل جائے گا۔''

''ہم ان پر بھروسا نہیں کر سکتے۔'' مارک نے انکار کیا۔ ''وہ ہمارے خلاف گوریلوں کا ساتھ دیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' کین شا نے یقین دلانا چاہا مگر مارک نہیں مانا اور میری کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی ہمنوا ہے۔ میں نے پوچھا۔

''تب ہمارے پاس متبادل راستہ کیا ہے؟''

مارک نے نقشے پر مخالف سمت انگلی رکھی۔ ''ہمیں اس طرف سے جانا چاہیے۔''

''یہ راستہ بہت مشکل ہے اور اس میں تہہ در تہہ ڈھلانیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد کسی ڈیڈ اینڈ پر پہنچ جائیں اور ہمارے پاس پلٹنے کا موقع بھی نہ ہو۔''

مارک مجھ سے بحث کرنے لگا، کین شا اپنی تجویز پیش کر کے خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے بھی جان لیا تھا کہ یہ لوگ اسے پسند نہیں کر رہے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ کین شا کے بتائے راستے پر سفر کیا جائے مگر مارک اور اس کا بیوی بیٹا تیار نہیں تھے۔ میری غیر جانبدار تھی۔ اگر وہ میری اور کین شا کی حمایت کرتی تو شاید میں جانسن فیملی سے اپنی بات منوا لیتا۔ بالآخر طے ہوا کہ ہم وادی میں سفر کریں گے اور کسی غیر متوقع صورتحال میں فیصلہ کریں گے۔ ہم اس بحث میں خاصا وقت ضائع کر چکے تھے اس لیے فوری روانہ ہوئے۔ سب سے آگے مارک کا ٹرک تھا اس کے پیچھے لینڈ کروزر اور سب سے آخر میں جیپ تھی۔ میری نے سوال کیا۔ ''کیا تمہیں اس سیاہ فام پر اعتماد ہے؟''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیوں نہیں، یہ گابرون سے میرے ساتھ ہے۔''

''ہم سفید فام یہاں سیاہ فاموں پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''شبہ ہے یہاں سیاہ فام لوگ کیمونسٹوں کے حملے میں شامل ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ سفید فام یہاں سے چلے جائیں اور وہ ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیں۔''

''ہو سکتا ہے لیکن کین شا کا تعلق یہاں سے نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ میری سمجھ گئی کہ کین شا کے حوالے سے اس کی بد اعتمادی مجھے اچھی نہیں لگی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گئی۔

رائن کے پاس دو عدد رائفلیں تھیں جو اس وقت جیپ میں موجود تھیں۔ کین شا کے پاس پستول تھا۔ میرا خیال تھا کہ جانسن فیملی کے پاس بھی اسلحہ تھا اور اگر کوئی ایسا موقع آتا کہ ہمیں گوریلوں کا سامنا کرنا پڑ جاتا تو ہم خالی ہاتھ نہیں تھے۔ صورت حال کی سنگینی بچوں نے بھی محسوس کی تھی وہ جیپ کی پچھلی نشست پر تھیں۔ دونوں بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھیں اور انہوں نے کچھ دیر بعد خبردار کیا۔ نائش بولی۔

''مام کوئی ہمارے پیچھے آرہا ہے۔''

یہ سنتے ہی میری نے جیپ کے کلوزٹ سے دوربین نکالی اور جیپ کا اینگل آئرن پکڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے پیچھے مڑ کر دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اس کی آسانی کے لیے میں نے رفتار کم کر دی تھی۔ چند لمحے بعد وہ کانپتی آواز میں

بولی۔ ’’میرے خدا یہ گوریلے ہیں وہ دو بڑی جیپوں پر ہمارے پیچھے آرہے ہیں اور ایک جیپ پر ایل ایم جی بھی لگی ہے۔ وہ ابھی چند میل دور ہیں۔‘‘

یہ نہایت تشویشناک اطلاع تھی۔ میں نے رفتار تیز کرتے ہوئے ہارن دے کر آگے والوں کو ہوشیار کیا۔ شاید انہوں نے بھی عقب میں آتے گوریلوں کو دیکھ لیا تھا اور رفتار بڑھا دی تھی۔ جھیل کی خشک ریت پر گاڑیاں تیز رفتاری سے دوڑ سکتی تھیں مگر یہاں حد رفتار بھی کم ہو جاتی تھی۔ مارک کا ٹرک بڑا اور بھاری تھا پھر اس کا انجن زیادہ طاقتور تھا۔ وہ تیزی سے آگے جانے لگا۔ کین شا کی لینڈ کروزر بھی تیز رفتار تھی اور وہ بھی یہاں تیز چل سکتی تھی۔ مسئلہ میری کی جیپ کا تھا یہ چھوٹی تھی۔ اگرچہ اس کا پیٹرول انجن طاقتور تھا مگر وزن کم ہونے کی وجہ سے یہ ریت پر اپنے ٹائر درست طریقے سے نہیں جما پا رہی تھی اور نتیجے میں اس کی رفتار اتنی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ جیپ دونوں اگلی گاڑیوں سے پیچھے اور پیچھے آنے والی گاڑیوں کے نزدیک ہونے لگی۔ اس وقت ہم شاکوا سے کوئی بیس کلومیٹرز دور نکل آئے تھے۔

اچانک عقب سے ایل ایم جی کا برسٹ چلا اور گولیاں جیپ کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ میری اور بچیوں نے چیخ ماری۔ میری چلا چلا کر نائش اور میریا کو سر نیچے کر کے لیٹ جانے کو کہہ رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے ہی لیٹ چکی تھی۔ صورتِ حال یک دم ہی بہت سنگین ہو گئی تھی۔ میں نے جیپ کی رفتار بڑھانے کی کوشش کی مگر وہ پہلے ہی اپنی حد رفتار پر چل رہی تھی۔ اس ریت پر اس سے زیادہ تیزی سے چلانا ممکن نہیں تھا۔ میری مجھ سے کہہ رہی تھی کہ کچھ کروں اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہمارے بائیں طرف پانی کے چھوٹے چھوٹے تالاب آرہے تھے اور ان میں کہیں کہیں سرکنڈے اور جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں۔ سیدھے راستے پر ہم ایل ایم جی کا آسان شکار تھے۔ میں نے اچانک فیصلہ کیا اور جیپ کو بائیں طرف گھما دیا۔ پانی کے ایک چھوٹے تالاب کے ساتھ ہوتے ہوئے ہم دوسری طرف آئے اور ایک بار پھر تالابوں کے متوازی سفر کرنے لگے۔ اب ہمارے اور گوریلوں کے درمیان تالاب حائل تھے مگر جیپ گھومنے کی وجہ سے انہیں موقع مل گیا اور ہمارے تقریباً متوازی آگئے تھے۔

’’جیک، وہ پاس آگئے ہیں۔‘‘ میری نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

اب ہم زیادہ خطرے میں تھے اور میں نے جیپ کو دور کرنا شروع کر دیا۔ مگر میں اسے ایک حد سے زیادہ دور لے جا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ آگے ریت ختم ہو جاتی اور جھاڑیاں اور گھاس آجاتیں۔ تالابوں کے دوسری طرف کین شا اور مارک کا ٹرک بہت آگے جا چکے تھے۔ ایل ایم جی کا برسٹ چلا تو ہمارے دل اچھل کر حلق میں آگئے مگر گوریلوں کا نشانہ ہم نہیں تھے۔ وہ لینڈ کروزر اور ٹرک کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرا برسٹ چلا اور میں نے ٹرک کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ میری بولی۔ ’’ٹرک نشانہ بن گیا ہے۔‘‘

گوریلے جیپ کو نظر انداز کر کے لینڈ کروزر اور ٹرک کی فکر میں تھے کہ وہ بڑے تھے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ان میں زیادہ لوگ ہوں گے حالانکہ سب سے **زیادہ افراد** اس جیپ میں تھے۔ میں ممکن حد تک جیپ کو دور لے آیا تھا اور اب یہاں سے ڈھلان اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کین شا کی لینڈ کروزر ٹرک کے پاس پہنچ کر رکی اور جانسن خاندان عجلت میں ٹرک سے اتر کر اس میں سوار ہو گیا۔ عقب سے گوریلے بدستور ایل ایم جی استعمال کر رہے تھے۔ مگر وہ لوگ خوش قسمتی سے محفوظ رہے۔ کین شا نے لینڈ کروزر آگے بڑھائی اور اسے ٹرک کے آگے لے آیا اس طرح وہ عارضی طور پر گوریلوں کی فائرنگ سے محفوظ ہو گیا تھا جب تک وہ ٹرک کراس کر کے آگے نہ آتے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گوریلوں کی توجہ ہماری جیپ کی طرف ہو گئی اور ایک برسٹ اس طرف آیا تو میں نے فوری فیصلہ کیا اور جیپ کا رخ مشرق کی طرف کر دیا۔ اب ہم جھیل کی وادی سے باہر کا رخ کر رہے تھے۔ جھاڑیوں میں آنے سے ہمیں عارضی طور پر گوریلوں سے پناہ مل گئی تھی۔

مگر یہ چھٹکارا عارضی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس طرف آئیں گے اور ان کے آنے سے پہلے میں جھیل کی وادی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اب درمیان میں بڑے تالاب آرہے تھے اس لیے گوریلے ہم سے دور ہو گئے تھے۔ میں کین شا اور جانسن فیملی کے لیے فکر مند تھا مگر ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ کین شا کی تجویز مان لیتے تو اس وقت ہم گوریلوں سے دور اور محفوظ ہوتے جو اب موت کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں اور ناہموار راستوں سے گزرتی جیپ اچھل کود رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم بھی اچھل کود رہے تھے۔ میں نے اسٹیرنگ تھام رکھا

تھا۔ میری اور بچیوں نے اینگل آئرن پکڑا ہوا تھا۔ ہم ذرا اوپر آئے تو راستہ ہموار ہوگیا۔ پانی پینے کے لیے آنے والے جانوروں کی آمدورفت سے وہاں راستے بن گئے تھے اور میں ایسے ہی ایک راستے پر جیپ چلا رہا تھا۔ میری نے کچھ کہا تو میں نے سنا نہیں۔

''کیا کہا؟''

''کین شا کی لینڈ کروزر۔'' اس نے عقب میں اشارہ کیا۔ میں نے جیپ روک دی اور پلٹ کر دیکھا تو لینڈ کروزر بھی تالاب عبور کرکے اس طرف آگئی تھی اور اس کے پیچھے گوریلوں کی ایک چھوٹی جیپ تھی جس پر ایل ایم جی نہیں تھی مگر اس میں موجود گوریلے جدید ترین رائفلوں سے مسلح تھے اور لینڈ کروزر پر گولیاں برسا رہے تھے۔ مارک اور ایرک بھی ان کو جواب دے رہے تھے۔ وہ ہم سے ذرا آگے کوئی ڈھائی سو میٹرز کی دوری پر ایسے ہی ایک راستے پر تھے۔ کین شا نے وہی کیا جو میں نے کیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ گوریلے بھی آگئے تھے۔ میں ایک رائفل لے کر جیپ پر کھڑا ہوگیا اور اس کا رخ گوریلوں کی جیپ کی طرف کرکے فائرنگ کرنے لگا۔ میری اور بچیاں مخالف سمت میں نیچے اتر گئی تھیں تاکہ آنے والی گولیوں سے محفوظ رہیں۔ میری کوشش تھی کہ گوریلوں کی جیپ کے ٹائر ناکارہ کردوں۔ یہ ونچسٹر کی سنگل شاٹ رائفل تھی مگر اس کی مار اور درستگی بہت زیادہ تھی۔

میری طرف سے کی جانے والی فائرنگ کا گوریلے بھی جواب دے رہے تھے۔ مگر ان کی خودکار رائفلوں کی مار اتنی نہیں تھی۔ ایک رائفل خالی ہوتی تو میں دوسری استعمال کرتا تھا اور نیچے بیٹھی ہوئی میری خالی رائفل لوڈ کرتی تھی۔ اندھا دھند گولیاں برساتے ہوئے مجھے خیال نہیں رہا کہ ایمونیشن کم ہے۔ ایک بار رائفل خالی ہوئی تو میری نے بتایا کہ اس کا ایمونیشن ختم ہوگیا ہے۔ دوسری کا بھی کم رہ گیا تھا۔ اس لیے اب میں احتیاط سے فائر کررہا تھا اور بالآخر جیپ کا ایک ٹائر اڑانے میں کامیاب رہا۔ کین شا اور جانسن فیملی چلتی لینڈ کروزر سے فائرنگ کی وجہ سے کامیابی حاصل نہیں کرسکے تھے اور میں رکا ہوا ہونے کی وجہ سے کامیاب رہا۔ اس کے فوراً بعد میں نے جیپ آگے بڑھا دی کیونکہ گوریلے اب پیدل فائرنگ کرتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ میں ڈرائیو کررہا تھا اور انہیں جواب دینے کی ذمے داری میری نے سنبھال لی۔ اس نے کامیابی سے گوریلوں کو پیچھے رکھا جب تک ہم وادی سے نکل کر کھلے اور ہموار میدان میں نہیں آگئے۔

کین شا کی لینڈ کروزر بھی باہر نکل آئی تھی۔ میں نے اس کی طرف رخ کرنے کی بجائے اس کے متوازی سفر جاری رکھا اور بتدریج اس کے پاس ہوتا گیا۔ کین شا نے بھی رکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بھی گوریلوں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم بالکل قریب آگئے تھے اور میں نے ہارن دے کر کین شا کو رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑیاں رکتے ہی سب نیچے اتر آئے کیونکہ سب کا برا حال تھا۔ جھٹکوں نے جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ کین شا نے نیچے اترتے ہی کہا۔ ''میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہمیں اسی طرف آنا پڑا نا۔''

''تم نے ٹھیک کہا تھا۔'' میں نے تائید کی۔ ''مگر اب ہمیں پیچھے آنے والی اس مصیبت سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے۔''

مارک نے سر ہلایا۔ ''ان کی جیپ ناکارہ ہوئی ہے مگر وہ جلد اس کا ٹائر بدل کر ہمارے پیچھے آئیں گے۔ میری فائرنگ سے دو گوریلے مارے گئے یا زخمی ہوئے ہیں۔''

میری فکرمند ہوگئی۔ ''اب یہ انتقام کے لیے پیچھے آئیں گے۔''

میں نے نقشہ نکالا اور اندازے سے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''میرا خیال ہے ہم یہاں ہیں اور سلینڈا گیم ریزرو یہاں سے کوئی اسی کلومیٹرز دور ہے۔''

''ہم ان پر بھروسا نہیں کرسکتے۔'' مارک نے پھر کہا۔

''کیونکہ وہ سیاہ فام ہیں؟'' کین شا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ہم بھی ان گوریلوں کے خلاف ہیں، یہ ہمارے ملک میں گھس کر لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور لوٹ مار کرتے ہیں۔''

میں نے نرمی سے کہا۔ ''مارک ہمیں ان پر بھروسا کرنا ہوگا کین شا ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

مارک سوچ رہا تھا اور ایرک لینڈ کروزر کی چھت پر چڑھ کر مغرب کی طرف دیکھ رہا تھا کہ گوریلے تو نہیں آرہے ہیں۔ میں نے کین شا سے پوچھا۔ ''ایندھن کی کیا پوزیشن ہے؟''

''کافی ہے۔'' وہ بولا۔ ''ہم واپس مان تک جاسکتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں آگے کے لیے ایندھن مل جائے گا۔''

میں نے جیپ میں دیکھا اس کی ٹنکی تین چوتھائی بھری ہوئی تھی اور عقب میں پانچ پانچ گیلن والے دو کین رکھے

تھے۔ گویا اس حوالے سے صورت حال تسلی بخش تھی۔ ہمارے پاس پانچ عدد رائفلیں تھیں مگر ایمونیشن کی صورت حال تسلی بخش نہیں تھی۔ اوّل تو یہ سب ہی سنگل شاٹ رائفلیں تھیں اور دوسرے اب کسی کے کارتوس زیادہ نہیں تھے۔ اچانک ایرک چلایا اور لینڈ کروزر سے نیچے کود گیا۔ ''وہ آرہے ہیں۔''

''کون کتنے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دونوں جیپیں ہیں وہ بھی جس پر ایل ایم جی لگی ہے۔'' ایرک نے کانپتی آواز میں کہا۔ ایل ایم جی والی جیپ کا سن کر میں بھی فکر مند ہوگیا تھا۔

''ہمیں فوراً روانہ ہونا چاہیے۔'' میں نے جیپ کی طرف جاتے ہوئے کہا اور کین شا سے بولا۔ ''میری اور بچیوں کو تم لینڈ کروزر میں لے جاؤ۔ مارک اور ایرک تم میرے ساتھ آؤ۔''

زو فر بولی۔ ''نہیں میرا بیٹا اور شوہر لینڈ کروزر میں سفر کریں گے یہ زیادہ محفوظ ہے۔''

اس سے پہلے میں اس خود غرض عورت کو کوئی جواب دیتا۔ اس کے شوہر نے اسے جھڑک دیا۔ ''تم اپنا منہ بند رکھو۔ میری اور بچیوں تم لینڈ کروزر میں جاؤ۔''

میری بچیوں کو لینڈ کروزر میں لے گئی اور کین شا نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ ایرک اور مارک جیپ میں پچھلے حصے میں آگئے اور انہوں نے رائفلیں سنبھال لی تھیں۔ میں نے جیپ آگے بڑھائی۔ ایرک آنکھوں سے دوربین لگائے ہوئے تھا اس نے کہا۔ ''وہ تقریباً دو میل پیچھے ہیں۔''

میں نے جیپ کی رفتار بڑھائی اور گھاس کے میدان میں وہ اچھلتی کودتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں سبزہ زیادہ تھا اور اب جانور بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کین شا ذرا فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ فاصلے پر رہے تاکہ عقب سے آنے والے نشانوں کے پاس پاس ہونے کا فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ جھیل کی وادی کی نسبت یہاں سخت زمین پر جیپ اور لینڈ کروزر پوری رفتار سے چل رہی تھیں اور عقب میں آنے والی گاڑیاں فاصلہ کم کرنے کی کوشش میں اتنی کامیاب نہیں تھیں۔ فاصلہ کم ہو رہا تھا مگر اس کے کم ہونے کی رفتار نہایت سست تھی۔ ایرک جھٹکوں کی وجہ سے بہ مشکل خود کو سنبھال رہا تھا مگر وہ کھڑا رہا اور اسی کی وجہ سے میں جیپ کے راستے کا تعین کر رہا تھا۔ وہ مجھے گائیڈ کر رہا تھا۔ میں بتدریج جیپ کو دائیں طرف کاٹ رہا تھا۔ مارک نے کہا۔

''آگے دوما نام کی ایک آبادی بھی ہے۔''

''اس طرف جانا بیکار ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ عام سے لوگ ہیں، ان گوریلوں سے ہمارا بچاؤ نہیں کر سکیں گے۔ گیم ریزرو کے گارڈز ہی ہمیں ان سے بچا سکتے ہیں۔''

''مجھے شبہ ہے کہ وہ ایسا کریں گے۔'' مارک نے کہا۔

''ہم دوما کے پاس سے گزر رہے ہیں۔'' ایرک نے خبردار کیا، اب وہ آگے دیکھ رہا تھا۔ ''ہمیں بائیں طرف مڑنا ہوگا۔ آگے مجھے ایک نشیب نظر آرہا ہے۔''

یہ نشیب اصل میں اوکوانگو جھیل کا ایک نکلا ہوا سرا تھا جو یہاں تک چلا آیا تھا اور ہمیں اس سے بچتے ہوئے آگے جانا تھا۔ میں جیپ کو بائیں طرف موڑنے لگا۔ زمین پر چار سے پانچ فٹ اونچی گھاس تھی جس کے پار دیکھنا ڈرائیور کے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے ایرک میری آنکھیں بنا ہوا تھا اور میں اس کی ہدایت پر پوری رفتار سے جیپ چلا رہا تھا۔ دوسری طرف میری کین شا کے لیے یہی کام کر رہی تھی۔ ہم نشیب کے پاس آتے جا رہے تھے۔ ایرک نے بتایا کہ عقب میں آنے والی گاڑیاں سیدھی جا رہی تھیں اور وہ اچانک ہی نشیب کے سامنے جا نکلتیں اور انہیں چکر کاٹ کر آگے آنا پڑتا۔ یہ اچھی خبر تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں تاخیر کا سامنا کرنا پڑتا اور ہمارا گیم ریزرو پہنچنے کا امکان روشن تھا۔ اچانک جیپ کے آگے ڈھلان آئی اور وہ اس میں اترتی چلی گئی۔ کین شا کی لینڈ کروزر میرے پیچھے تھی۔ وہ بھی نشیب میں آئی۔

یہ خشک جھیل کا آخری حصہ تھا اور اونچی گھاس میں چھپا ہوا تھا اس لیے آخر تک اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ پھر جیسے یہ ڈھلان آئی تھی اسی طرح ختم بھی ہوگئی اور جیپ دوبارہ سے نکل کر میدان میں آگئی۔ جب تک جیپ نشیب میں رہی ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہا تھا کہ ابھی اس کے سامنے کوئی رکاوٹ یا گڑھا آئے گا اور ہمارا سفر یہیں ختم ہو جائے گا۔ اس رفتار سے حادثے میں اگر بچ بھی جاتے تب بھی فرار کے قابل نہ رہتے۔ مگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم بچ کر دوسری طرف نکل آئے تھے اور یہاں سے سلینڈا گیم ریزرو بیس کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ ایرک جو ڈھلان پر آنے کے بعد بیٹھ گیا تھا وہ پھر کھڑا ہو گیا اور اس نے دوربین سے دیکھا تو

خوشی سے چلایا۔ ”وہ پیچھے رہ گئے ہیں، نشیب کے سامنے رکے ہوئے ہیں اب ان کو چکر لگا کر آنا پڑے گا کم سے کم ایک میل کا۔“

”وہ آئیں گے۔“ مارک نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اس لیے زیادہ خوش مت ہو۔“

میں بھی خوش تھا مگر اچانک ہی جیپ کے انجن سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور بونٹ سے دھواں اٹھنے لگا میری نظر حرارت بتانے والے کانٹے پر گئی جو آخری حد پر تھا۔ انجن سیز ہوگیا تھا۔ مگر میں نے جیپ نہیں روکی میں چاہتا تھا یہ جس حد تک جا سکتی ہے چلتی رہے۔ تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد انجن بالکل ہی جواب دے گیا اور اس سے شعلے اٹھنے لگے۔ جیپ رکی اور ہم سب اتر کر بھاگے کہ انجن پھٹ ہی نہ جائے۔ کین شا نے دیکھ لیا تھا کہ جیپ میں مسئلہ ہوگیا ہے اس نے لینڈ کروزر روک لی اور ہم دوڑتے ہوئے اس میں سوار ہوگئے۔ میں اور مارک عقبی حصے میں سوار ہوگئے جب کہ ایرک نے فرنٹ سیٹ پر میری کی ڈیوٹی سنبھال لی اور دوربین کی مدد سے راستہ دیکھنے لگا۔ میری نے پوچھا۔ ”جیپ کو کیا ہوا؟“

”انجن سیز ہوگیا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر وہ پیچھے رہ گئے ہیں اور انہیں گھوم کر آنے میں کچھ وقت لگے گا۔“

کین شا نے کہا۔ ”انجن چھوٹا تھا اور تم نے اس پر زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا اسی وجہ سے وہ سیز ہوگیا۔“

”ہاں مگر جان بچانے میں اس کا خیال کہاں رہتا۔“ میں نے کہا اور بوتل سے پانی پیا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

”کیا خیال ہے اس وقت گیم ریزرو میں کوئی ہوگا؟“ مارک نے پوچھا تو میں چونک گیا۔ یہ سیزن نہیں تھا ابھی جانوروں کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے عام طور سے گیم ریزرو کے گارڈز اور افسران بھی چھٹی پر ہوتے تھے۔ وہاں کیمپ میں عام طور سے چند ایک افراد ہی پائے جاتے تھے۔

”دیکھتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیمپ شاید پندرہ کلومیٹرز دور رہ گیا ہے۔“

یہاں باقاعدہ راستے تھے اس لیے لینڈ کروزر اب زیادہ رفتار سے جا رہی تھی اور راستہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر ایرک عقب کی نگرانی کر رہا تھا۔ جس وقت ہم کیمپ کے قریب تھے ایرک نے خبردار کیا۔ ”وہ اس طرف آچکے ہیں اور ہم سے چار میل کی دوری پر ہیں۔“

”وہ نظر آرہے ہیں؟“

”نہیں لیکن گرد اڑ رہی ہے۔“

گوریلوں کی آمد کا سن کر ہمارا عارضی اطمینان ہوا ہو گیا تھا۔ وہ بلائے جان کی طرح پیچھے پڑ گئے تھے اور کسی صورت جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اب ایرک آگے دیکھ رہا تھا اور اس نے ہی کیمپ دیکھ لیا۔ ویسے سب نے دیکھ لیا تھا کیونکہ کیمپ کی سب سے واضح نشانی وہاں لگی ہوئی ہوائی چکی تھی جو زمین سے پانی کھینچتی تھی۔ چند منٹ بعد ہم کیمپ میں داخل ہو رہے تھے جسے چاروں طرف سے بڑے بانسوں کی باڑ لگا کر بند کیا گیا تھا۔ یہ خاصا مضبوط قسم کا کیمپ تھا جس میں کوئی جانور نہیں گھس سکتا تھا مگر جو ہمارے پیچھے آرہے تھے ان کے لیے اس کی مضبوطی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اپنے دو ساتھیوں کے مارے جانے یا زخمی ہونے پر وہ جوش انتقام سے بھرے ہوئے تھے اور اگر ہم ان کے ہاتھ آجاتے تو ہماری زندگیوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ مارک، ایرک اور میری بھی یہی بات سوچ رہے تھے کہ یہاں ہم محفوظ نہیں تھے۔ کیونکہ کیمپ خالی تھا اور وہاں سوائے اس سامان کے اور کچھ نہیں تھا جو یہاں استعمال ہوتا تھا۔ اسلحے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے وہاں ریڈیو تلاش کرنا چاہا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ گیم افسران نے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑی تھی جس کے چوری ہونے کا خطرہ ہو۔ کین شا بھی ہمارے ساتھ لگا ہوا تھا اس نے کہا۔

”یہاں سے تیس کلومیٹرز مشرق میں لین یانٹی سفاری ہے وہاں سارے سال گیم وارڈن رہتے ہیں۔ ہمیں وہاں سے مدد مل سکتی ہے۔“

میں نے فوری فیصلہ کیا۔ ”تب ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”لیکن ایک مسئلہ ہے۔“ کین شا بولا۔ ”شاید اب ایندھن وہاں جانے کے لحاظ سے کافی نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے آخر کے چند کلومیٹرز ہمیں پیدل طے کرنا ہوں گے۔“

”بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو یہاں سے نکلو۔“

پیچھے آنے والے گوریلوں کا خیال سب کے ذہن پر حاوی تھا۔ اس لیے سب ہی دوڑ کر لینڈ کروزر میں سوار ہوئے اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ یہاں گھنے درخت اور اونچی درخت نما جھاڑیاں تھیں اس لیے اب ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ گوریلے کہاں ہیں۔ مگر ایک اطمینان یہ بھی تھا کہ

گوریلوں کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کہاں ہیں؟ کین شانے عقل مندی کرتے ہوئے کیمپ سے ایک نقشہ اٹھالیا تھا جس میں اس علاقے میں راستوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ میں فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھا اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ میری، زوفر اور بچیاں پچھلی سیٹ پر تھیں اور سب سے پیچھے مارک اور ایرک بیٹھے تھے۔ ایرک پیچھے دیکھ رہا تھا اچانک اس نے خبردار کیا۔ ”میرا خیال ہے وہ قریب ہیں۔ جھاڑیاں ہل رہی ہیں جیسے ان کے پاس سے تیز رفتار گاڑیاں گزر رہی ہوں۔“

اسی طرح جھاڑیاں لینڈ کروزر کے گزرنے سے ہل رہی تھیں۔ میں اور سب ہی فکر مند ہو گئے۔ معاً عقب سے فائر ہوئے مگر یہ فائر اندازے سے کیے گئے تھے اس لیے کوئی گولی ہماری طرف نہیں آئی تھی۔ شاید انہوں نے بھی جھاڑیوں کے ہلنے سے اندازہ لگایا تھا کہ ہم کہاں ہو سکتے تھے؟ مارک جوابی فائر کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا کہ اس طرح گوریلوں کو یقینی پتا چل جاتا کہ ہم کہاں ہیں ابھی تو وہ اندازے سے فائرنگ اور پیچھا کر رہے تھے۔ لینڈ کروزر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم کوئی دس کلومیٹرز کا فاصلہ طے کر چکے تھے کیونکہ کین شانے رفتار کسی بھی موقع پر پچاس کلومیٹرز فی گھنٹے سے کم نہیں کی تھی اور کبھی کبھی وہ ستر تک پہنچ جاتی تھی۔ اس لحاظ سے اوسط رفتار ساٹھ کلومیٹرز فی گھنٹا بنتی تھی اور ہمیں کیمپ سے نکلے ہوئے دس منٹ ہونے کو آئے تھے۔

کین شا رفتار بڑھا کر کم ایندھن میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر بیس منٹ بعد ایندھن بتانے والا کانٹا اپنے آخری سرے پر پہنچ گیا تھا اور لینڈ کروزر اس وقت ریزرو پر تھی پھر یہ بھی ختم ہو گیا اور اس کی رفتار سست پڑنے لگی۔ میری نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”اب کیا ہوگا۔“

انجن کھانسا اور بند ہو گیا مگر گاڑی اپنے مومنٹم میں چلی جا رہی تھی اور یہ جہاں تک جاتی ہمارے لیے اچھا تھا۔ اچانک کین شانے جیپ راستے سے اتار کر ایک طرف گھما دی۔ اس طرف دو جھاڑیوں کے درمیان جگہ تھی۔ اس نے نیچے اترتے ہوئے عجلت میں کہا۔ ”نشان مٹاؤ اور گاڑی چھپاؤ۔ ان کو پتا نہ چلے کہ ہم پیدل ہو گئے ہیں۔“

کین شانے بروقت عقل مندی کی بات کی تھی۔ ہم سب فوری اس کی تجویز پر عمل کرنے میں لگ گئے۔ لینڈ کروزر کے زور سے ہٹ جانے والی جھاڑیوں کو کھینچ کر اپنی جگہ کیا اور انہیں مزید قریب لانے لگے۔ کین شاہ اور ایرک گاڑی دھکیل کر جھاڑیوں کے مزید اندر کر رہے تھے۔ میری اور بچیاں ٹائروں سے دب جانے والی گھاس کو کھینچ کر سیدھا کر رہی تھیں۔ پھر میری نے کپڑا مار کر مٹی پر ٹائروں کے نشانات مٹائے۔ اس دوران میں گوریلوں کی جیپوں کے انجنوں کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ نزدیک آ رہے تھے اور اسی راستے پر تھے۔ ہم بھی عجلت میں جھاڑیوں میں آئے اور ایسی جگہوں پر دبک گئے جہاں گزرنے والے گوریلے ہمیں نہ دیکھ سکیں۔ کین شا اور ایرک اب جھاڑیاں ڈال کر لینڈ کروزر کو چھپا رہے تھے۔ میں اور مارک بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔

لینڈ کروزر کی چھت اونچی تھی اور خطرہ تھا کہ باہر سے گزرتے گوریلے اسے دیکھ نہ لیں اس لیے ہم چھت اور اس طرف کا حصہ خاص طور سے چھپا رہے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے ہم نے یہ کام مکمل کر لیا اور سب مختلف جگہوں پر دبک گئے۔ میں نے کہا۔ ”ہوشیار رہنا ممکن ہے وہ دھوکا نہ کھائیں اور ہمیں تلاش کر لیں اس لیے ہمیں حملہ کرنے میں پہل کرنا ہوگی ورنہ وہ ہمیں نہیں بخشیں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ مارک نے سر ہلایا۔

”عورتوں اور بچوں کو پیچھے بھیج دو۔“ میں نے کہا۔ میری اور زوفر بچیوں کو لے کر لینڈ کروزر کی اوٹ میں چلے گئے۔ انجنوں کی آواز اب بہت نزدیک آگئی تھی اور گوریلے آپس میں اونچی آواز میں جو گفتگو کر رہے تھے وہ بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر پہلے جیپ پاس سے گزری۔ یہ چھوٹی والی جیپ تھی۔ اب بڑی جیپ جس پر ایل ایم جی تھی وہ نزدیک آ رہی تھی اور اچانک ہی ایل ایم جی کا برسٹ چلا۔ وہ آس پاس جھاڑیوں پر برسٹ مار رہے تھے کہ ہم ان میں چھپے ہوں تو ان کا نشانہ بن جائیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ جان جائیں گے کہ اب لینڈ کروزر نہیں چل رہی ہے کیونکہ جھاڑیاں ہلنا بند ہو گئی تھیں۔ اگر ہم پیدل تھے تو لازمی ان ہی جھاڑیوں میں کہیں تھے اور وہ جھاڑیوں میں برسٹ مار کر اپنی تسلی کر رہے تھے۔ ہم سب مزید دبک گئے بلکہ زمین پر لیٹ گئے تھے۔ اگلا برسٹ ہماری طرف والی جھاڑیوں پر مارا۔ وہ ہم سے کچھ دور تھا۔ اگر کسی کی اضطراری آواز نکلی بھی تھی تو وہ برسٹ کے بھیانک شور میں دب گئی۔

ایل ایم جی سنبھالنے والا گوریلا گھوم گھوم کر دونوں

طرف برسٹ مار رہا تھا اور جب جیپ بالکل ہماری سامنے پہنچی تو وہ مخالف سمت میں برسٹ مار کر گن کا رخ ہماری طرف کر رہا تھا۔ میرا دل ایک لمحے کو رک گیا کیونکہ مجھے گن کی نال دکھائی دی رہی تھی اور پھر اس سے نکلنے والے شعلے بھی دکھائی دیے۔ گولیاں جھاڑیوں کو ادھیڑتی گزر گئیں اور یہ برسٹ ہم سے ذرا آگے لگا تھا۔ اگر گن ایک لمحے پہلے گھومی ہوتی تو ہم بالکل سامنے تھے۔ سب نہ سہی کوئی ایک بھی نشانہ بن جاتا تو گوریلوں کو علم ہو جاتا اور اس کے بعد وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔ جب جیپ آگے نکلی تو سب نے نہ جانے کب سے دبا ہوا سانس خارج کیا تھا۔ برسٹ اب بھی رہ رہ کر چل رہا تھا اور ایسے میں سر اٹھانا بھی خطرناک تھا۔ اگر وہ غلطی سے بھی اس طرف نال کر دیتے تو ہم بچ نہیں سکتے تھے۔ ایل ایم جی کی گولی کئی فٹ موٹے کنکریٹ سے گزر جاتی ہے۔ ان جھاڑی نما درختوں کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ اس لیے جب تک برسٹ کی آواز نزدیک سے آتی رہی سب دبکے رہے۔ جب وہ خاصی دور نکل گئی تو ہم کھڑے ہوئے اور کین شا نے کہا۔

''وہ واپس آئیں گے۔ اسی طرح برسٹ مارتے ہوئے کیونکہ انہیں یقین ہے ہم ان ہی جھاڑیوں میں روپوش ہیں۔''

''ان کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' مارک بولا۔

''لیکن کس طرف؟'' میری نے سوال کیا۔ میں نے نقشہ نکال کر دیکھا۔ میں نے اندازے سے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''ہم یہاں ہیں۔''

''یہ کیا ہے؟'' میری نے گہرے سبز رنگ پر انگلی رکھی۔

''یہ بھی ایک نشیب ہے جو نمیبیا کی سرحد کے اندر تک چلا گیا ہے۔ یہاں گھنے درخت اور جھاڑیاں ہیں اس لیے اس کا رنگ سبز دکھایا گیا ہے۔''

''یہاں سے کتنا فاصلہ ہوگا؟'' مارک نے سوال کیا۔

''شاید آدھا یا پون کلومیٹرز۔''

''تب ہم سفاری کی طرف جانے کی بجائے اس طرف کیوں نہ جائیں۔'' مارک نے تجویز پیش کی۔ ''گوریلے ہمیں اس لحاظ سے تلاش کریں گے کہ ہم لازمی سفاری کی طرف جا رہے ہیں اور ہم اس سے مخالف سمت میں ہوں۔''

''ہاں یہ تو ہے اور پھر وہاں چھپنے کی جگہیں بھی زیادہ ہوں گی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہمیں بہت احتیاط سے اور دیکھ بھال کر جانا ہوگا۔ اس کا امکان ہے گوریلوں نے کچھ لوگوں کو جیپوں سے اتار دیا ہو اور وہ چھپے ہوئے ہمارے سامنے آنے کے منتظر ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کین شا نے کہا۔ ''میں پہلے راستہ دیکھ لوں۔ جب میں اشارہ کروں تو پھر تم میں سے ایک آگے آئے۔''

وہ دبے قدموں کچے راستے تک گیا اس نے جھاڑیوں سے جھانک کر دیکھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس طرف کوئی نہیں ہے تو اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور سب سے پہلے میں گیا۔ راستہ کراس کر کے میں دوسری طرف جھاڑیوں میں پہنچا۔ اب میں اور کین شا راستے کی دونوں طرف نگرانی کر رہے تھے اور باقی ایک ایک کر کے راستہ پار کر رہے تھے۔ یہ مشکل سے چار گز چوڑا راستہ تھا جو اوپر سے جھاڑیوں کی وجہ سے اور تنگ ہو گیا تھا۔ جب سب اس طرف آ گئے تو آخر میں کین شا آیا۔ اس نے اپنی شرٹ اتار لی تھی اور آتے ہوئے مٹی پر اسے مارتا آیا کہ ہمارے قدموں کے نشانات مٹ جائیں۔ میں اب تک اسے محض ایک ڈرائیور سمجھتا آیا تھا مگر اس نے یہاں اپنے مشوروں اور ذہانت سے مجھے اور یقیناً باقی سب کو بھی متاثر کیا تھا۔ بعد میں اس نے تسلیم کیا کہ کبھی وہ ایک جنگجو گروپ کا حصہ رہا تھا مگر پھر اسے انسانوں کا خون بہانے سے نفرت ہو گئی اور وہ سب چھوڑ کر گابرون چلا گیا جہاں اب وہ محنت کر رہا تھا۔

دوسری طرف آتے ہی ہم ایک قطار میں اور جھک کر آگے بڑھنے لگے۔ میں نے سب کو ایسے رنگ چھپانے یا اتارنے کو کہا جو دور سے نمایاں ہوں۔ جس کے پاس کوئی شوخ رنگ کی چیز تھی وہ اس نے اتار دی یا چھپالی۔ سب سے آگے مارک اور ایرک تھے۔ عورتیں اور بچیاں درمیان میں تھے۔ میں اور کین شا پیچھے تھے۔ ہم خاص طور سے سوکھی شاخوں کا خیال کر رہے تھے کیونکہ ان کے چٹخنے کی آواز بہت دور تک جاتی اور زمین پر دیکھ بھال کر پاؤں رکھ رہے تھے۔ عقب سے ایل ایم جی کا فائر رہ رہ کر ہو رہا تھا اور وہ جتنی فراغ دلی سے گولیاں برسا رہے تھے، صاف لگ رہا تھا کہ ان کے پاس ایمونیشن بے حساب ہے۔ فائرنگ کی آواز نزدیک آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یعنی کین شا کے خدشے کے مطابق وہ پلٹ کر آ رہے تھے۔ میں نے کین شا اور دوسروں

سے کہا۔ ”اب تیز چلو، وہ یہاں آنے والے ہیں اور ابھی ہم ایل ایم جی کی حد میں ہیں۔“

میرا اندازہ تھا کہ ہم نے تین سو گز کا فاصلہ طے کیا تھا۔ ایل ایم جی کی مار ہزار گز سے زیادہ ہوتی ہے۔ ابھی ہم پانچ سو گز دور گئے ہوں گے کہ ایل ایم جی والی جیپ واپس آگئی اور اس نے برسٹ مارا تو ہمارے دائیں طرف ایک چھوٹا درخت تنا کٹ جانے سے چرچراتی آواز کے ساتھ زمین بوس ہوگیا۔ میں نے تیز سرگوشی میں سب کو نیچے لیٹ جانے کو کہا۔ سب لیٹ گئے اور اپنے سر کو بازوؤں میں چھپا لیا۔ اگرچہ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا مگر فائرنگ میں سر کو بچانے کے لیے یہ پوز اختیار کیا جاتا ہے۔ نائش اور میریا خوف سے رونے لگی تھیں مگر ان کی آواز اتنی دبی ہوئی تھی کہ بہ مشکل ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ میری نے انہیں اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ احتیاطاً سب ہی تنوں کے پیچھے تھے۔ مگر گولیاں تنوں کا کیا حال کر رہی تھیں یہ ہم دیکھ ہی چکے تھے۔ جیپ نزدیک آرہی تھی جب وہ ہماری طرف برسٹ مارتی تو گولیاں واضح شاخوں اور تنوں کو چھلنی کرتی جاتی تھیں۔ پھر ایل ایم جی کا برسٹ چلا اور گولیاں ہمارے اوپر سے گزری تھیں۔ سب ہی دم سادھے پڑے تھے کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ جب جیپ آگے بڑھ گئی اور اگلا برسٹ جو مخالف سمت چلا تھا سنائی دیا تو میں نے سر اٹھانے کی ہمت کی اور پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں۔“

”میں اور بچیاں ٹھیک ہیں۔“ میری نے کہا۔ پھر باری باری سب نے تصدیق کی کہ وہ ٹھیک ہیں۔ سب کی طرف سے اطمینان کے بعد میں نے کہا۔

”اب ہمیں تیزی سے چلنا ہوگا۔“ میں نے کہا اور میریا کو اپنی پیٹھ پر سوار کرلیا۔ وہ بچیاں تھیں اور اتنی بھاگ دوڑ نے انہیں تھکا دیا تھا۔ ایرک نے نائش کو اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا اور ہم تیزی سے گھنے جنگل کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک عقب سے گوریلوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم کچھ دیر کو ٹھٹکے اور پھر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے کہا۔ ”انہوں نے لینڈ کروزر دیکھ لی ہے۔“

”اب وہ ہمارے پیچھے آئیں گے۔“ زوفر بولی۔ ہم سب میں وہی سب سے زیادہ خوفزدہ تھی۔ میں نے نرمی سے کہا۔

”ہمیں اچھی اُمید رکھنی چاہیے ہوسکتا ہے وہ ہمیں گیم ریزرو کی طرف جانے والی سمت میں تلاش کریں۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں تیزی سے آگے بڑھنا چاہیے۔“

سب ہی ہر ممکن تیزی سے چل رہے تھے۔ اچانک کین شا نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو رکنے کو کہا۔ وہ کان لگا کر سن رہا تھا پھر اس نے زمین پر لیٹ کر کان اس سے لگایا اور کچھ دیر سنتا رہا۔ میں اس کی طرف جھکا اور اشارے سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کوئی گاڑی ہماری طرف آرہی ہے۔“

”میرے خدا وہ اب گاڑیوں میں بیٹھ کر ہمیں تلاش کریں گے۔“

میرا خیال تھا کہ گوریلے جھاڑیوں میں پیدل ہی ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ یہاں گاڑی چلانا آسان نہیں تھا مگر انہوں نے اپنی کوئی جیپ یہاں جنگل میں گھسا دی تھی۔ کین شا نے کہا اسے ایک ہی گاڑی محسوس ہوئی ہے۔ ہم اب بھاگ رہے تھے اور کچھ دیر بعد عقب سے جھاڑیاں اور شاخیں ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ جیپ کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے بڑے رقبے میں ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ یہ ان کی چالاکی تھی اس طرح گھومتے ہوئے انہیں ہماری جھلک مل سکتی تھی۔ سیدھا آنے کی صورت میں باقی علاقہ ان کی نظروں سے اوجھل رہتا۔ اس کا ہمیں بھی فائدہ ہوا اگر وہ سیدھا آتے اور ہماری سیدھ میں آتے تو کچھ ہی دیر میں ہمیں آلیتے مگر اب ہمیں موقع مل رہا تھا کہ ان کی پہنچ سے دور رہ سکیں۔ مجھے بھاگنے کے دوران ایک چھوٹی ٹیلہ نما پہاڑی دکھائی دے رہی تھی اور ہم اسی کی طرف جا رہے تھے۔ مارک نے کہا۔

”ہم وہاں پناہ لے سکتے ہیں۔“

کین شا نے اعتراض کیا۔ ”وہاں ہم پھنس جائیں گے اور یہ ہمیں گھیر لیں گے۔“

”بلندی سے ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

”ان رائفلوں سے؟“ کین شا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم بھول رہے ہو ان کے پاس ایل ایم جی ہے اور ممکن ہے راکٹ لانچر بھی ہوں۔ ہم ایک منٹ بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”کین شا ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”ہماری عافیت اسی میں ہے کہ ہم ان سے دور رہیں۔“

"لیکن ہم کب تک اس طرح بھاگتے رہیں گے؟" مارک بولا۔ "ہماری حالت دیکھو۔"

"اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو بھاگتے رہنا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ مگر مارک اور اس کی بیوی زوفر اب تھک گئے تھے۔ وہ عمر رسیدہ تو تھے ہی ساتھ ہی وہ اوور ویٹ بھی تھے اور اس لیے ذرا سی بھاگ دوڑ نے انہیں تھکا دیا تھا۔ اس لیے وہ ایسی باتیں کر رہے تھے۔ مگر ایرک نوجوان اور مضبوط تھا اس نے ماں باپ سے کہا۔

"جیک ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں چلتے رہنا ہے۔"

پہاڑی اتنی نزدیک نہیں تھی جتنی کہ لگ رہی تھی ہمیں اس تک پہنچنے میں مزید ایک گھنٹا لگ گیا تھا اور سب کا تھکن اور اس سے بھی زیادہ پیاس سے برا حال تھا۔ ہم افراتفری میں گاڑیاں چھوڑ کر بھاگے تھے اور صرف میری نے ایک چھاگل لی تھی جس میں دو لیٹر پانی تھا مگر وہ اس نے نائش اور نیریا کے لیے مخصوص کر رکھی تھی اور ہمیں اب تک ایک ایک گھونٹ ہی ملا تھا۔ میں میری سے متفق تھا کہ پانی بچوں کے لیے رکھنا چاہیے کیونکہ وہ پیاس برداشت نہیں کر سکتی تھیں، ہم بڑے کر سکتے تھے مگر اب ایسا لگ رہا تھا کہ پانی کے پیچھے جھگڑا ہوگا کیونکہ زوفر کئی بار میری سے پانی مانگ چکی تھی۔ میری نے اسے دو بار دیا اور اس نے خاصا پی بھی لیا تھا۔ اس لیے اب میری اسے پانی نہیں دے رہی تھی وہ اس کی بات بھی نہیں سن رہی تھی۔ ہمارے پیچھے آتی گاڑی کسی اور سمت نکل گئی تھی اور اب اس کی آواز نہیں آ رہی تھی اس لیے سب بات کر رہے تھے۔ زوفر نے اچانک درشت لہجے میں کہا۔

"تم سن کیوں نہیں رہی ہو مجھے پیاس لگی ہے مجھے پانی دو۔"

میری نے اسے گھورا۔ "تم پہلے ہی خاصا پانی پی چکی ہو اس لیے اب تمہیں ایک گھونٹ بھی نہیں ملے گا ویسے بھی اس میں اب ایک لیٹر پانی رہ گیا ہے۔"

زوفر نے فوراً اپنے بیٹے اور شوہر سے کہا۔ "تم سن رہے ہو مجھے پیاس لگی ہے اور یہ عورت پانی نہیں دے رہی ہے۔"

میں نے مداخلت کی۔ "تم دو بار پانی پی چکی ہو اور خاصا پیا ہوا ہے۔ ہم میں سے کسی کو ایک گھونٹ سے زیادہ نہیں ملا ہے۔ ہم سب صبر کر رہے ہیں تم بھی صبر کرو۔"

اس نے پاؤں پٹخے۔ "مجھ سے پیاس برداشت نہیں ہوتی۔"

مارک نے میری سے کہا۔ "اسے پانی دے دو۔"

"میں نہیں دوں گی۔" وہ بولی۔

"میرا خیال ہے آگے کہیں پانی ملے گا۔" کین شا نے کہا۔ "یہاں نشیب میں پانی ہوگا۔"

"ہم اس پہاڑی سے آگے نہیں جائیں گے۔" مارک نے کہا۔ "ہمیں پانی دے دو تم لوگ آگے جا کر پی لینا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم شوق سے یہاں ٹھہرو۔ لیکن ہم سے پانی کی توقع مت کرنا یہ صرف بچیوں کے لیے ہے۔"

صورت حال کشیدہ ہو گئی تھی مارک نے ایرک کی طرف دیکھا اور اگر وہ اس کے ساتھ ہوتا تو شاید مارک زبردستی پر اتر آتا۔ اس کے پاس اسلحہ تھا وہ دونوں رائفلوں سے مسلح تھے جب کہ ہمارے پاس ایک رائفل اور ایک پستول تھا۔ مگر ایرک نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تو مارک مجبور ہو گیا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اب راستہ بدل لوں۔ میں نے ایرک سے کہا۔ "تم ان کے ساتھ رہو۔"

اس نے سر ہلایا اور بولا۔ "آئی ایم سوری۔"

نائش کو اب کین شا نے اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا تھا۔ میں نے ایرک کا شانہ تھپکا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ مارک، ایرک اور زوفر پہاڑی پر چڑھنے لگے تھے۔ میں نے سب سے رفتار تیز کرنے کو کہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ جس طرح سے نمایاں ہو کر پہاڑی پر چڑھ رہے تھے جلد گوریلوں کی نظر میں آ جاتے۔ گوریلے اس طرف آتے تو ہمارا بھی نظروں میں آنے کا امکان تھا اس لیے ہم جتنی دور نکل جاتے اتنا ہی محفوظ رہتے۔ پہاڑی کے بعد دور تک پھیلا ہوا گھنا جنگل اور جھاڑیاں تھیں۔ میں نے نقشہ نکال کر دیکھا تو اس کے مطابق ہم نمیبیا میں داخل ہو چکے تھے کیونکہ پہاڑی نمیبیا کی حد میں تھی۔ اگر یہاں ہمارا سامنا سرحدی محافظوں سے ہو جاتا تو شاید ہم گرفتار کر لیے جاتے۔ مگر ابھی تک کسی انسان سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ پہاڑی سے کوئی ایک میل دور نکلنے کے بعد ہم ستانے کے لیے رکے۔ چل چل کر سب کا برا حال تھا۔ میں نے میری اور کین شا کو آگاہ کیا کہ اب ہم نمیبیا میں ہیں۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" کین شا بولا۔ "اس طرف نمیبیا کی سرحدی فورس کے لوگ نہیں ہوتے ہیں تب ہی تو

انگولا کے گوریلے اتنی آسانی سے بوٹسوانا تک چلے آئے۔‘‘
’’مگر ہمیں واپس جانا ہوگا۔‘‘ میں نے نقشہ زمین پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ’’میرا خیال ہے ہم یہاں ہیں۔‘‘
’’شاید۔‘‘ میری بولی۔ ’’پھر؟‘‘
’’یہاں سے گیم ریزرو تقریباً بیس کلومیٹرز جنوب مغرب میں ہے اور ہمیں اس طرف جانا ہوگا۔‘‘
’’ابھی؟‘‘ میری فکرمند ہوگئی۔
’’نہیں ہمیں کم سے کم آج کی رات یہیں رکنا ہے اس کے بعد ہی ہم جانے کا سوچ سکتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے ہمیں کوئی پناہ گاہ تلاش کرنی ہوگی۔‘‘
’’یہ کام میں کروں گا۔‘‘ کین شا نے کہا۔ ’’تم ان کے پاس یہیں رکو۔‘‘
میں نے سر ہلایا۔ ’’لیکن تم رائفل لے جاؤ۔ تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔‘‘
کین شا کے پاس پستول تھا میں نے وہ لے کر اسے اپنی رائفل دے دی۔ کین شا آگے چلا گیا۔ میں میری اور بچوں کو لے کر نسبتاً گھنی جھاڑیوں میں آگیا جہاں ہمیں آسانی سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ ہم صبح روانہ ہوئے تھے اور اس بھاگ دوڑ میں اب شام ہونے والی تھی۔ کسی نے ایک لقمہ نہیں کھایا تھا۔ میرا پیٹ خالی ہو چکا تھا مگر میں صبر کرسکتا تھا۔ البتہ نانش اور میریا سے صبر نہیں ہو رہا تھا انہوں نے بھوک کی شکایت شروع کردی۔ میری انہیں بہلا رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ’’میں آس پاس دیکھتا ہوں شاید کوئی پھل مل جائے۔‘‘
میری سہم گئی۔ ’’پلیز زیادہ دور مت جانا۔‘‘
’’نہیں میں پاس رہوں گا۔‘‘ میں نے کہا اور جھاڑیوں سے نکلا۔ یہاں کچھ بڑے درخت بھی تھے۔ میں گھوم پھر کر ان کا جائزہ لینے لگا مگر خاصی تلاش کے بعد بھی مجھے کسی درخت پر پھل یا کھانے کے قابل کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ میں خالی ہاتھ واپس آیا تو وہ تینوں مایوس ہوئی تھیں۔ میں نے تسلی دی۔ ’’ابھی تو ایک کوشش کی ہے۔ کچھ دیر میں کین شا آجائے تو میں پھر کوشش کروں گا۔ اسے یہاں کے بارے میں زیادہ پتا ہوگا۔‘‘
کین شا کو گئے ہوئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ وہ جاتے ہوئے میری سے چھاگل بھی لے گیا تھا کہ کہیں پانی مل گیا تو وہ اسے بھر لائے گا۔ اچانک دور سے فائرنگ کی آواز آئی تو ہم متوحش ہوگئے۔ میں اندازہ نہیں کرسکا تھا کہ آواز کس طرف سے آئی تھی اور یہ برسٹ تھا جو خودکار رائفل سے مارا جاسکتا ہے ہم میں سے کسی کے پاس خودکار رائفل نہیں تھی۔ مجھے اور میری کو کین شا کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ مگر دوسری بار برسٹ چلا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ آواز شمال مغرب سے آئی تھی جس طرف پہاڑی تھی اور پہاڑی پر جانسن فیملی تھی۔ میری بولی۔ ’’ایسا لگتا ہے گوریلوں نے ان کو تلاش کرلیا ہے۔‘‘
’’ایسا ہی لگ رہا ہے۔‘‘
میری اب کچھ اور سوچ رہی تھی۔ ’’اگر ان میں سے کوئی زندہ گوریلوں کے ہاتھ آگیا تو وہ ہمارے بارے میں بتا دے گا۔‘‘
میں نے مارک اور زوفر کی جو فطرت دیکھی تھی تو یہ بالکل ممکن تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ بے شک ہم گھنی جھاڑیوں میں تھے مگر یہاں ہمیں تلاش کیا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف اگر ہم یہاں سے آگے روانہ ہو جاتے تو کین شا کو کیسے پتا چلتا اور ہم اس سے بچھڑ جاتے۔ وہ شمال مشرق کی طرف گیا تھا۔ کسی قدر غور و فکر کے بعد میں نے میری سے کہا۔ ’’ہم اسی طرف چلتے ہیں جس طرف کین شا گیا ہے۔ اس طرح اس کے ملنے کا امکان بھی رہے گا اور ہم خطرے سے دور ہو جائیں گے۔‘‘
تاریکی چھانے کے قریب تھی اور ایک گھنٹے سے زیادہ کے آرام نے ہمیں پھر سفر کے قابل بنا دیا تھا۔ اب بچیاں بھی از خود چل سکتی تھیں۔ ہم آگے بڑھے۔ اس طرف جنگل کم گھنا ہو رہا تھا کیونکہ ہم نشیب کی طرف جا رہے تھے جہاں بارشوں کے زمانے میں پانی بھر جاتا ہے اس لیے یہاں زیادہ تر جھاڑیاں اور سرکنڈوں والی گھاس تھی۔ ہم ذرا آگے گئے ہوں گے کہ مجھے پانی کی نمی محسوس ہوئی۔ میں حیران ہوا کہ ہم پانی کے اتنے نزدیک تھے۔ مگر جب ہم اس تالاب تک پہنچے تو وہاں سبز کائی سے ڈھکے اور سڑے پانی کو پا کر ہماری امیدوں پر پانی پڑ گیا تھا۔ یقیناً کین شا بھی یہاں آیا ہوگا اور مایوس ہو کر آگے گیا ہوگا۔ ہم بھی آگے بڑھ گئے۔ عقب میں چند بار برسٹ چلے تھے اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ اگر گوریلوں نے جانسن فیملی کو دیکھ لیا تھا تو یقیناً ان کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ ورنہ اتنی خاموشی نہ ہوتی۔ ساری فائرنگ خودکار ہتھیاروں سے ہوئی تھی اور اس میں کوئی سنگل فائر نہیں تھا۔ یعنی مارک اور ایرک کو اپنے ہتھیار

استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

ہم کوئی ایک میل اور آگے آئے ہوں گے کہ تاریکی چھا گئی۔ بچیاں اور میری سہم گئی تھیں۔ نائش اور میریا نے روشنی کرنے کی فرمائش کی۔ میرے پاس ماچس تھی اور ہم مشعل جلا سکتے تھے مگر یہ گوریلوں کو اپنی راہ دکھانے کے مترادف ہوتا۔ اس لیے میں نے مشعل جلانے سے گریز کیا۔ اب تک کین شا بھی نہیں ملا تھا اس لیے میں نے جنوب کی طرف جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ اب ہمیں اس نشیب سے نکل کر گیم ریزرو کی طرف جانا تھا اور ہمارے پاس وقت کم رہ گیا تھا۔ میری نے اب خود کو میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا جیسا میں کہتا تھا ویسا ہی کرتی تھی۔ اس لیے جب میں نے یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میریا کا ہاتھ میں نے تھاما ہوا تھا اور نائش کو میری نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے ہم احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔

کچھ دیر میں چاند نکل آیا تو کسی قدر روشنی ہو گئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد میرا اندازہ تھا کہ ہم نشیب سے نکلنے والے تھے۔ میری اور بچیاں تھک گئی تھیں اور میں بھی کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا اس لیے ہم رک گئے۔ اب بات کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تھا کہ اس بے سرو سامانی میں اگر ہم نے آج ہی رات گیم ریزرو تک رسائی حاصل نہ کی تو کل صبح کا سورج ہمارے لیے پیغام اجل لائے گا اور پیاس ہی ہمیں ہلاک کرنے کے لیے کافی ہو گی۔ دوسری صورت میں گوریلے روشنی میں ہمیں زیادہ آسانی سے تلاش کر سکتے تھے جب کہ ابھی تاریکی تھی اور ہم اس کی آڑ میں لین یا نٹی سفاری تک پہنچ سکتے تھے۔ یہی بات میری کے ذہن میں تھی اس نے کہا۔ ”ہمیں لازمی صبح سے پہلے مدد چاہیے، شاید ہم تو بچ جائیں لیکن میری بچیاں......“

وہ بولتے بولتے رک گئی مگر اس کا مطلب واضح تھا۔ بچیاں اس صورت حال میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ دونوں اگرچہ کم عمر تھیں مگر ان کا وزن اچھا خاصا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے میریا کو اٹھا کر ہو گیا تھا۔ ہم انہیں اٹھا کر زیادہ دیر سفر نہیں کر سکتے تھے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ ہماری اپنی حالت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اس لیے اس سے پہلے کہ ان کی اور ہماری ہمت جواب دے جاتی ہمیں کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا تھا۔ یہاں سے نکلنے کی صورت میں ہمیں جانوروں سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے ان کی اتنی فکر نہیں تھی کیونکہ میرے پاس پستول تھا مگر میں فائر کرتا تو یہ گوریلوں کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ جیسے جیسے چاند اوپر ہو رہا تھا روشنی بہتر ہوتی جا رہی تھی اور کچھ دیر بعد ہم ہموار میدان میں نکل آئے۔ یہاں گھاس تھی اور کہیں کہیں اکیلے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔

ہم ہر ممکن تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ میری کے پاس دوربین تھی۔ وہ وقفے وقفے سے پلٹ کر دوربین سے دیکھ رہی تھی۔ ہم کوئی دو کلومیٹرز آگے آئے ہوں گے کہ اس نے پلٹ کر دیکھا اور بولی۔ ”جیک دیکھنا میرا خیال ہے وہی لوگ ہیں۔“

میں نے اس سے دوربین لی تو مجھے ایک جیپ نشیب سے نکلتی دکھائی دی۔ ہماری دونوں جیپیں بیکار ہو چکی تھیں یہ لازمی گوریلوں کی جیپ تھی۔ اس سے پہلے وہ یہاں تک آتے ہمیں آگے بڑھ جانا تھا۔ میں نے نائش کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ”ہمیں بھاگنا ہوگا۔ پوری قوت اور ہمت سے۔“

بچیاں بھی گوریلوں کی آمد کا سن کر خوفزدہ تھیں اس لیے جب ہم بھاگے تو انہوں نے ہمارا پورا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ اس وقت گھنی اور اونچی گھاس میں جانا خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ درندے یہیں گھات لگاتے ہیں۔ مگر ہمارے پیچھے یقینی موت تھی اور اس سے بچنا ضروری تھا۔ اس لیے ہم اونچی گھاس میں گھس گئے۔ ابھی چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ جیپ نزدیک آ گئی اور اس کے اوپر لگی ہوئی سرچ لائٹ چاروں طرف لہرانے لگی۔ ہم جہاں بھاگ رہے تھے یہاں بڑی گھاس والے قطعے زیادہ نہیں تھے اور ہمیں اکثر اوقات کھلی جگہوں پر بھاگنا ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کھلی جگہ پر ہم کسی وقت بھی نظروں میں آ سکتے ہیں۔ اس لیے بھاگتے رہنا دانشمندی نہیں ہو گی۔ ایک جگہ بڑی گھاس میں گھسے تو میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر میری اور بچیوں کو وہیں روک لیا۔ میری نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”کیوں رکے ہو وہ پاس ہیں؟“

”اسی لیے رک گیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ سرچ لائٹ استعمال کر رہے ہیں اور ایک بار ہم نظر میں آ گئے تو پھر بھاگ بھی نہیں سکیں گے۔ اس لیے رکنا ضروری ہے۔“

بات میری کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے نائش اور میریا کو اپنے پاس کر لیا اور سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ میں گھاس سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ گوریلے ایک کھلی جگہ رک گئے تھے اور اب جیپ سے اتر کر پھیل رہے تھے ایک شخص جیپ میں کھڑا

ہوا سرچ لائٹ گھما رہا تھا۔ جیپ سے اترنے والے گوریلوں کی تعداد نصف درجن کے قریب تھی۔ میں فکرمند ہوا کہ وہ رکے کیوں تھے۔ کیا ان کو یہاں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا تھا۔ مگر اس صورت میں وہ گولیاں برسا چکے ہوتے شاید انہیں شک ہوا تھا کہ ہم یہیں ہو سکتے تھے۔ پیدل ہم اس سے زیادہ دور نہیں جا سکتے تھے اس لیے وہ ہمیں یہاں تلاش کر رہے تھے۔ میں نے میری اور بچیوں سے کہا۔ ”آواز مت نکالنا اور کوشش کرو کہ بالکل نیچے رہو۔“

گوریلے اونچی آواز میں آپس میں بات کرتے ہوئے آس پاس پھیل رہے تھے۔ میں نے سر نیچے کر لیا تھا کیونکہ اب وہ نزدیک تھے اور میرا سر نظر آ سکتا تھا۔ گوریلے آس پاس کی اونچی گھاس کے قطعے کھنگال رہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اس جگہ کے نزدیک آ رہے تھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ میں نے پستول نکال لیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ ہم نے آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آنا تھا۔ ورنہ ہمارا انجام بھی وہی ہوتا تو شاید جانسن اینڈ فیملی کا ہو چکا تھا۔ گوریلوں نے انہیں قابو کرنے کے بعد ہلاک کیا تھا۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہوئی تھی۔ دو گوریلے ہماری طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے اے کے سینتالیس رائفلیں اٹھا رکھی تھیں اور ان کی شرٹ کے ساتھ لگی بیلٹ سے دستی بم بھی لٹک رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ مسلح تھے اور ہم کسی صورت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

میری نے بچیوں کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا تاکہ وہ غلطی سے بھی آواز نہ نکالیں۔ یہاں کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی جو ہمارے جسموں پر چڑھ رہے تھے اور یقیناً بچیوں کو بھی کاٹ رہے تھے۔ وہ ہل رہی تھیں اور اگر میری نے ان کا منہ نہ بند کیا ہوتا تو وہ آواز بھی نکال سکتی تھیں۔ گوریلے اب اتنے پاس تھے کہ ہم ان کے ہانپنے کی آواز بھی سن سکتے تھے۔ وہ گھاس میں گھس آئے تھے اور اس جگہ سے شاید چند فٹ کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ میری انگلی ٹریگر پر بالکل تیار تھی اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر گولی چلانی پڑی تو مارنے کے لیے چلاؤں گا کیونکہ ان کو ذرا موقع ملا تو وہ سب کو چھلنی کر دیں گے۔ انہیں مار کر میں ان کے ہتھیاروں پر بھی قبضہ کر سکتا تھا۔ ہائی اسکول کے بعد میں نے لازمی فوجی تربیت حاصل کی تھی اور فوجی نوعیت کے تمام ہتھیار چلانا جانتا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ نزدیک آتے اور ہمیں دیکھتے یا مجھے حرکت میں آنا پڑتا۔ اچانک نشیب کی طرف سے ایک فائر ہوا۔ یہ سنگل شاٹ تھا۔ وہ سب چونکے اور پھر چلائے۔ وہ سب دوڑتے ہوئے جیپ میں سوار ہوئے جیپ گھومی اور جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں اور میری دم بہ خود تھے۔ میری نے کہا۔ ”یہ فائر کس نے کیا ہے؟“

میرے ذہن میں ایک ہی نام آیا تھا کین شا کا۔ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم گھیر لیے گئے ہیں اور اس سے پہلے گوریلے ہمیں تلاش کرتے اس نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے فائر کیا۔ رائفل اسی کے پاس تھی۔ میں نے میری سے کہا۔ ”جس نے بھی کیا ہو یہ ہمارے لیے موقع ہے اور شاید آخری موقع ہے۔“

ہم اٹھ کر تیزی سے گیم ریزرو کی طرف روانہ ہو گئے جو میرے اندازے کے مطابق یہاں سے کوئی ستر کلومیٹرز کی دوری پر تھا۔ چلتے، دوڑتے اور بعض اوقات خود کو گھسیٹتے ہوئے یہ فاصلہ ہم نے کیسے طے کیا یہ میں نہیں جانتا۔ ہمارے پاس وقت نہیں تھا اور سفر کے آخری حصے میں ہمیں نائش اور میریا کو بھی اٹھانا پڑا تھا۔ جب ہم گیم ریزرو میں داخل ہوئے تو میں نے پستول سے ایک فائر کیا اور وقفے وقفے سے اس وقت تک فائر کرتا رہا جب تک گیم ریزرو کے گارڈز ہم تک نہیں پہنچ گئے۔ وہ ہمیں اپنی گاڑی میں کیمپ تک لے گئے۔ جہاں ہمیں پانی اور کھانے کو ملا تھا۔ اگلے دن بوٹسوانا کی پولیس کا ایک دستہ وہاں پہنچا اور انہوں نے گیم ریزرو کے گارڈز کے ساتھ مل کر اس سارے علاقے کو کھنگالا جہاں گوریلے ہمارا پیچھا کرتے رہے تھے۔ پہاڑی کے نزدیک سے مارک، زوفرا اور ایرک کی لاشیں ملی تھیں البتہ کین شا دو دن بعد زخمی حالت میں مل گیا۔ اسے گولی لگی تھی مگر وہ گوریلوں سے بچنے میں کامیاب رہا تھا۔ اسی نے فائر کر کے گوریلوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور اسی وجہ سے ہماری جان بچی تھی۔

دوسرے دن ہم گابرون کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں ایک طیارہ ہمیں واپس جوہانسبرگ لے جانے کے لیے موجود تھا۔ جوہانسبرگ سے میری اور بچیاں لندن روانہ ہوئی تھیں مگر میری نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ وہ واپس آئے گی۔ وہ واپس بھی آئی اور اب وہ میرے ساتھ ہے۔ ہمارے دو بیٹے ہیں۔ نائش سات سال بعد واپس لندن چلی گئی۔ البتہ میریا ہمارے ساتھ ہی ہے۔

▲▲▲

میں اپنی شکاری زندگی کے جس باب کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنانے چلا ہوں، وہ ایک یادگار واقع ہے۔
مجھے ہندوستانی پولیس میں تعینات ہوئے چھٹا برس تھا، جب میرا تبادلہ ریاست میسور کے ضلع سموگا کردیا گیا۔
میری تعیناتی شہر سموگا سے تین میل کی مسافت پر واقع قصبے ''تلنگارتھی'' میں ہوئی۔ یاد رہے کہ میسور کا یہ جنگلاتی علاقہ صدیوں سے چیتوں کا مرکز رہا ہے۔ ان دنوں بھی وہاں چیتوں کی کثرت تھی۔ علاقے کی بیشتر آبادی ہندو تھی، جو

تلنگارتھی کا آدم خور

اے آر راجپوت

اس علاقے میں ایک دو نہیں آٹھ آدم خوروں کا ایک گروہ انسانوں کا شکار کررہا تھا۔ ان سے نمٹنے کا سن کر شکاریوں کا پتا پانی ہو جاتا۔ ایسے وقت میں اس نے ان آدم خوروں سے نمٹنے کا اعلان کر دیا۔

شکار کتھا کے شوقینوں کے لیے ایک دلچسپ قصۂ شکار
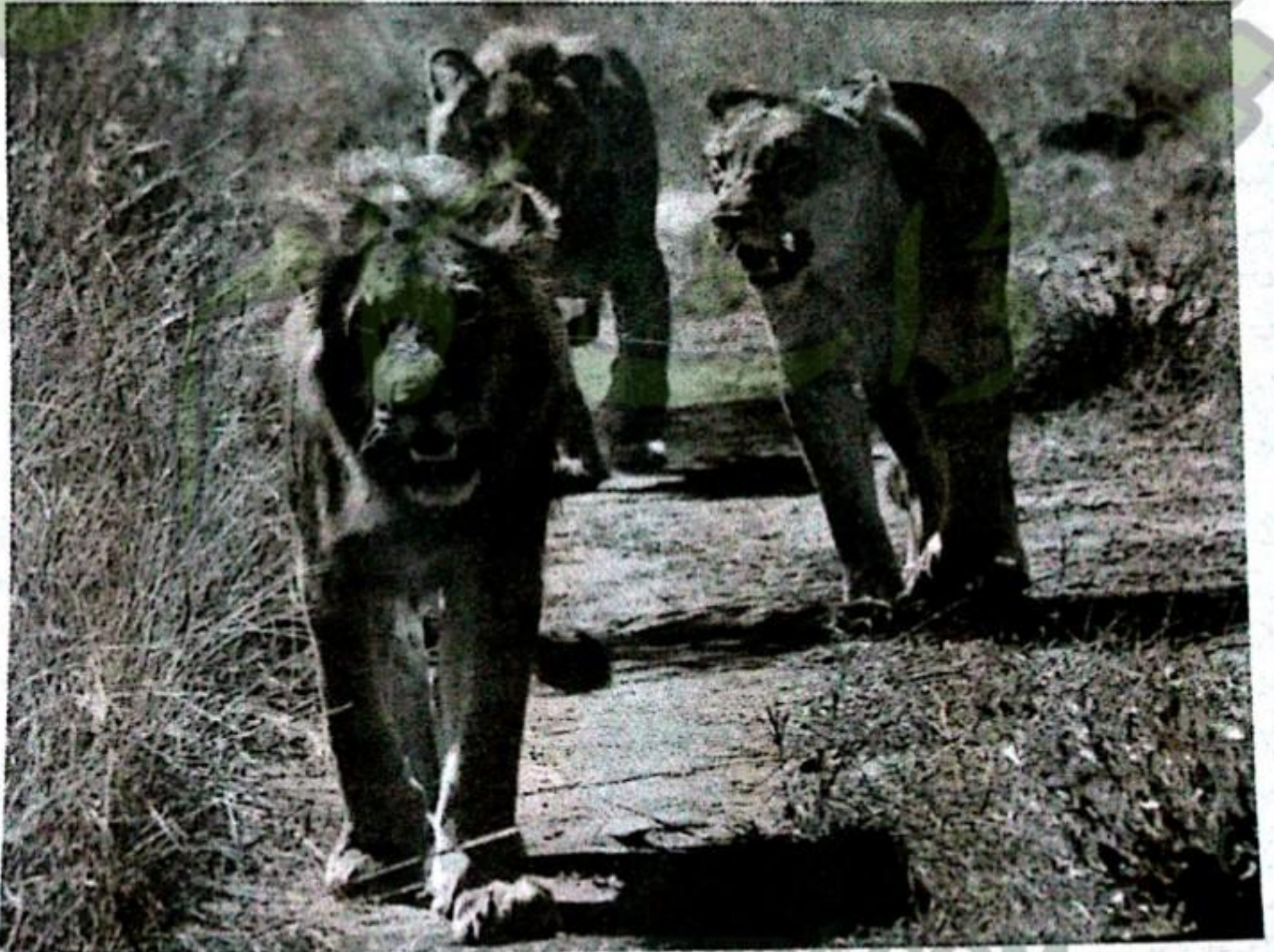
اپنے مردے جلاتے تھے۔ یہ رسم کسی ندی یا دریا کے کنارے ادا کی جاتی تھی۔

اس زمانے میں تلکارتھی کے کئی دیہات پہاڑیوں پر واقع تھے۔ ندی یا دریا ان سے کئی میل دور نیچے وادی میں بہتے تھے۔

یوں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دیہاتیوں کو مردے جلانے کے لیے کس قدر وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ عام حالات میں ہندو اپنی یہ مذہبی رسم بڑے اہتمام سے ادا کرتے لیکن جب کسی وباء کے باعث لوگ زیادہ تعداد میں مرنے لگتے تھے تو یہی رسم خاصی حد تک سادہ اور سہل بن جاتی تھی۔ عموماً وہ مردے کے منہ میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈالتے اور اسے چوبی تختے میں باندھ کر نیچے وادی میں پھینک دیتے۔

1918ء میں جب ان علاقوں میں انفلوئنزا پھیلا تو تلکارتھی کے ہندوؤں نے یہی طریقہ آزمایا۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ ان کی یہ مذہبی رسم کچھ عرصے بعد ان کے لیے موت کا پیغام بن جائے گی۔

ان وادیوں میں چیتوں کی بہتات تھی۔ دوران وباء انسانی لاشوں کی وافر دستیابی کے باعث کئی چیتے آدم خوری میں مبتلا ہوگئے۔

درندے عموماً مرا ہوا شکار نہیں کھاتے۔ لگتا ہے ان دنوں جنگل میں شکار کم تھا، اس لیے وہ انسانی لاشوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی وباء ختم ہوئی، اس سے کہیں زیادہ مہلک ''وباء'' آدم خور چیتوں کی شکل میں تلکارتھی کے گردونواح پر نازل ہوگئی۔

مجھے نہیں معلوم کہ آدم خوروں کی صحیح تعداد کیا تھی اور انہوں نے اپنی وارداتوں کا آغاز کیسے کیا؟

بہرطور...... میں نے سات ماہ کے دوران چھ آدم خور چیتے ہلاک کیے جو مخصوص علاقوں میں خوف و ہراس پھیلائے ہوئے تھے۔

میرے ہاتھوں ایک ہی مقام پر ہلاک ہونے والے آدم خوروں کی یہ ریکارڈ تعداد تھی۔

چھ آدم خوروں کی ہلاکت کے بعد علاقے میں ایک ماہ تک سکون رہا۔ دیہاتیوں سمیت میں بھی یہی سمجھا کہ شاید مردم خور بننے والے تمام چیتے واصل جہنم ہو چکے ہیں مگر یہ ہماری بھول تھی۔

ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ ایک دن کوئی دیہاتی تھانے دوڑا دوڑا آیا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان مجھے بتایا کہ اس کے بھائی کو چیتا اٹھا کر لے گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میں اور راجو اس کے ساتھ چل پڑے۔

راجو کے پاس شارٹ گن تھی اور میرے پاس رائفل اور ٹارچ تھی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور ہم رات سے پہلے ہی جائے وقوعہ کا معائنہ کرنا چاہتے تھے۔

مقررہ جگہ پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ بستی سے ذرا ہٹ کر جنگل کے کنارے دو جھونپڑیاں واقع ہیں۔ ایک جھونپڑی کی دیوار پھٹی ہوئی تھی اور زمین پر کسی کے گھسیٹے جانے کے نشانات کے ساتھ ساتھ خون کے دھبے بھی واضح تھے۔ پھٹی ہوئی دیوار کی ہیئت دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ چیتا جسیم اور طاقت ور ہے۔

ہم دونوں نے دیہاتی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور چیتے کے نقوش پا اور خون کے نشانات کا معائنہ کرتے ہوئے جھونپڑے سے دور نکل آئے۔ فضاء میں موت کا سکوت چھا یا ہوا تھا۔ مگر میری چھٹی حس مسلسل خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔

جیسے ہی میں نے ٹارچ کی روشنی جنگل کی سمت پھینکی تیس گز دور جھاڑیوں میں پل بھر کے لیے دو نگینے سے چمکے اور اگلے ہی لمحے کسی درندے کی غصیلی غراہٹیں، خاموش فضاء میں طلاطم برپا کرگئیں۔ ہم وہیں رک گئے۔ راجو نے اپنی شاٹ گن اور میں نے رائفل کاندھے سے لگالی۔ درندے کی طرف سے کسی بھی لمحے حملہ متوقع تھا۔ لیکن اس نے مقابلے کی بجائے فرار کو ترجیح دی اور ہم نے جھاڑیوں کی تلاشی لی۔ جست لگا کر جھاڑیوں سے نکل بھاگا۔ اس کا رخ جنگل کی طرف تھا۔ اس کی محض جھلک ہی نظر آئی تھی پھر وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ہمیں اتنا موقع بھی نہ ملا کہ اس پر گولی چلاتے۔

آدم خور نے ابھی آدھا شکار ہی کھایا تھا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، تاکہ چھپنے کی کوئی جگہ مل جائے، جہاں ہم اس کی واپسی کا انتظار کرسکیں۔ ابھی ہم جائزہ لے ہی رہے تھے کہ معاً ایک لرزا دینے والی دھاڑ سنائی دی۔ اور تیس، چالیس گز دور جھاڑیاں بھی ہلنے لگیں جیسے طوفان آرہا ہو۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ چیتا بہت چالاک ہے اس نے ہمیں مغالطے میں ڈالنے کے لیے فرار کا ڈراما رچایا اور آدھے راستے سے واپس آگیا۔ ہمارے دائیں جانب پانچ فٹ اونچی ایک گھنی جھاڑی تھی جو خاصی

پھیلی ہوئی تھی۔ میں پنجوں کے بل اس طرف رینگنے لگا، اور راجو کو جھونپڑیوں کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

راجو جیسے ہی جھونپڑیوں کے قریب پہنچا، ایک دیو ہیکل چیتا اس پر حملہ آور ہوگیا۔ اس وقت میرے اور راجو کے درمیان بمشکل بیس پچیس گز کا فاصلہ تھا۔ جیسے ہی چیتا نشانے کی زد میں آیا، میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیے۔

اسی لمحے راجو کی شاٹ گن چلنے کا بھی دھماکا سنائی دیا۔ میں نے ایک پل کے لیے چیتے کو فضاء میں قلا بازی کھاتے دیکھا اور پھر وہ نظروں سے یوں اوجھل ہوگیا جیسے ہوا میں تحلیل ہوگیا ہو۔

دوران شکار اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا مجھے کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر وہیں رک کر میں بھی جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ یہ جھونپڑا چیتے کی دست برد سے محفوظ رہا تھا۔ اس میں دو عورتیں اور وہ مرد بیٹھا نظر آیا جو ہمیں بلا کر لایا تھا۔

تینوں سخت خوف زدہ تھے۔ ایک عورت تو اس کی بیوی تھی جبکہ دوسری اس کے بھائی کی بیوہ جسے آدم خور نے ہلاک کردیا تھا۔ ہم نے انہیں تسلی دی تو ان کے اعصاب پُرسکون ہوئے۔

بدقسمتی سے اس مقام پر گھاس اور خاردار جھاڑیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ادھ کھائی لاش کے قریب کوئی درخت بھی نہ تھا جس پر مچان بنائی جاسکے۔

تھوڑی دیر بعد پورا چاند طلوع ہوگیا اور دور دور تک چھٹکی ہوئی چاندنی نے گھاس کے قطعوں کو منور کردیا۔ ہمارے پاس وافر مقدار میں گولیاں موجود تھیں اور ہمیں یقین تھا کہ آدم خور باقی ماندہ لاش کھانے واپس ضرور آئے گا۔

جھونپڑے میں موجود تینوں نفوس اب بھی دہشت زدہ تھے۔ ہمارے اصرار کے باوجود وہ گاؤں جانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دن چڑھنے کے بعد ہی وہاں سے جائیں گے۔ اس دوران راجو نے لالٹین روشن کردی۔ اب مجھے جھونپڑے کی دیوار کے ساتھ چھکڑے کا پہیہ پڑا نظر آیا۔ قریب جا کے دیکھا تو وہ خاصا مضبوط اور وزنی تھا۔

اسے دیکھتے ہی مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ یہ کہ لاش کے قریب ایک گہرا گڑھا کھود کر اسے کمین گاہ بنالیا جائے۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس پر چھکڑے کا پہیہ رکھا جاسکتا تھا...... یوں گڑھے کے اندر سے میں نہ صرف لاش پر نظر رکھتا بلکہ درندہ ادھر آتا تو خاصے قریب سے اسے نشانہ بھی بنایا جاسکتا تھا۔

یہ منصوبہ راجو کو بھی بہت پسند آیا۔ خوف زدہ مرد نے ہمیں پیسے کے علاوہ ہمیں زمین کھودنے کا نہ صرف سامان مہیا کیا بلکہ کھدائی میں ہماری مدد بھی کی۔ کھدائی کے دوران نکلنے والی مٹی جھونپڑے کے آس پاس پھیلادی گئی۔ طے یہ پایا کہ میں اس میں بیٹھ کر آدم خور کا انتظار کروں گا جبکہ راجو شاٹ گن لے کر جھونپڑے میں ہوگا۔ دراصل اس امر کا قوی امکان تھا کہ آدم خور ادھ کھائی لاش کی بجائے جھونپڑے پر حملہ آور ہوجائے تاکہ تازہ شکار کرلے۔ ایسے میں راجو اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔

ہوا کا گزر نہ ہونے کے باعث گڑھے میں اچھی خاصی گرمی تھی۔ میرے سر پر تاروں بھرا آسمان دلفریب منظر پیش کررہا تھا۔ ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی قریب ہی کھڑا زور زور سے سانس لے رہا ہے۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا اور رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ میں خوانخواہ باہر جھانک کر اپنی کمین گاہ کا راز فاش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دبی دبی غراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ آدم خور بچی کھچی لاش کھانے کے لیے آپہنچا ہے۔ میں رائفل سیدھی کیے آہستہ آہستہ پنجوں کے بل اوپر اٹھا اور از حد احتیاط سے پہیہ سرکا کر باہر جھانکا، تو یہ دیکھ کر چونک گیا کہ ایک کی بجائے دو آدم خور وہاں موجود تھے۔ ایک لاش کو اگلے پنجوں میں دبائے اپنے خونخوار دانتوں سے نوچ رہا تھا جبکہ دوسرا کچھ فاصلے پر بیٹھا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ ایسے رخ پر بیٹھا تھا کہ گڑھا بھی بہ خوبی دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے میرا اوپر اٹھتا ہوا سر دیکھ لیا۔

وہ یک دم دھاڑ کر پنجوں پر کھڑا ہوگیا، اور مجھے اپنی لال انگارہ آنکھوں سے یوں گھورنے لگا کہ پل بھر کے لیے میرا دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا۔ میرے لیے یہ سوچنا ہی دوبھر ہوگیا کہ اب کیا کروں......؟ مجھے ایک نہیں دو آدم خوروں کا سامنا تھا۔ اگر ایک پر گولی چلاتا تو دوسرا کود کر مجھ پر آپڑتا۔ میرے اور ان کے درمیان فاصلہ بھی خطرناک حد تک کم تھا۔

میں رائفل تیار حالت میں سانس روک کر انتظار

کرنے لگا کہ پہلے کون سا آدم خور مجھ پر حملہ کرتا ہے لیکن ہوا اس کے برعکس.........

مزے سے لاش کی ہڈیاں چباتے اور گوشت نوچتے ہوئے چیتے نے جب یہ دیکھا کہ دوسرا چیتا جارحانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا ہے اور غرا رہا ہے تو وہ یہ سمجھا کہ اس پر حملہ کرنے لگا ہے۔ یہ مغالطہ میرے لیے کارآمد ثابت ہوا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے لاش کھانے والے آدم خور نے دل دہلا دینے والی غراہٹوں سے دوسرے چیتے پر حملہ کر دیا۔ دونوں آپس میں بے تحاشہ لڑنے لگے۔ یہ میرے لیے امداد غیبی ہی تھی۔ میں آہستہ سے پیچھے ایک طرف سرکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں دھڑ تک گڑھے سے باہر تھا۔ میں نے چیتوں کی طرف نظر دوڑائی تو بے تحاشہ ہلتی ہوئی گھاس اور گرد کے بادل کے سوا، کچھ دکھائی نہ دیا۔ بس غصیلی غراہٹیں ہی پتا دیتی تھیں کہ اس طرف دو خون آشام درندے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔

میں گولی چلا سکتا تھا، مگر یوں دونوں میں سے کوئی زخمی ہو کر فرار ہو جاتا، جو میں نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجھے زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد ہی غراہٹوں کی شدت میں کمی آ گئی۔ جس کے ساتھ ہی ایک چیتے کی غراہٹوں کی آوازیں دور ہوتی سنائی دینے لگیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ پسپا ہو چکا ہے۔

اب میں رائفل کا نیدھے سے لگا کر منتظر تھا کہ کب گرد کا بادل بیٹھے اور میں فاتح درندے کو نشانہ بنا لوں۔ چند ثانیئے بعد ہی درندہ گرد کے مرغولے سے نمودار ہوا۔

ہدف کو چند گز کے فاصلے پر دیکھ کر میں جوش اور خوشی سے بھر گیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر اس کی جانب جھونک دیے۔

ساکت فضاء میں چار سو پچاس ایکسپریس کا کان پھاڑ دھماکا ہوا۔ مگر یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پیر پھول گئے کہ گولیوں سے آدم خور کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ شاید میں عجلت میں تاک کر گولی نہ چلا سکا۔

اس سے قبل کہ میں رائفل بھرتا، آدم خور نے غضب ناک دھاڑ کے ساتھ میری جانب جست لگا دی۔ اسے خود پر حملہ آور ہوتے دیکھ کر میری جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ میں جلدی سے جھک کر گڑھے میں دبک گیا اور زندگی بھر کی مشاقی اور مہارت بروئے کار لاتے ہوئے رائفل دوبارہ بھرنے لگا۔ عین اسی لمحے دم بہ خود سی فضاء شاٹ گن کے فائر سے گونج اٹھی۔

راجو کو شاید میرے گڑھے میں دبکنے کا ہی انتظار تھا۔ افسوس کہ اس کی گولی بھی ضائع ہو گئی۔ کیونکہ عین اسی لمحے میں نے آدم خور کو اپنے اوپر سے جست لگاتے دیکھا۔ اسی لمحے پھر شاٹ گن کا دھماکا سنائی دیا اور ساتھ ہی ایک ہولناک انسانی چیخ سے میں دہل گیا۔ وہ چیخ میرے ساتھی راجو کی تھی۔

بس پھر کیا تھا، میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اچھل کر گڑھے سے باہر نکلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دس گز دور لمبی لمبی گھاس، بے تحاشہ ہل رہی تھی۔ ساتھ ہی غراہٹوں اور انسانی کراہوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے درندہ اور انسان آپس میں گتھم گتھا ہوں۔ جیسے ہی میں قطعہ گھاس کے نزدیک پہنچا، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ایک تنومند چیتا راجو سے لڑتے ہوئے اسے پھاڑ کھانے کے چکر میں تھا۔ راجو اس کے خوفناک دانتوں اور تیز نوکیلے پنجوں سے بچنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اسی کوشش میں اس کی پگڑی کھل گئی تھی اور لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ جس پر خون کے سرخ سرخ دھبے واضح نظر آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔

میں جانتا تھا کہ راجو زیادہ دیر اس غیر معمولی طاقت ور جیم شحیم چیتے کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ میں اگر گولی چلاتا تو چیتے سے زیادہ راجو کے نشانہ بننے کے امکانات تھے، مگر یوں محو تماشا بھی تو نہیں رہا جا سکتا تھا۔ میں نے چیتے کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک ہوائی فائر داغ دیا۔ سماعت پاش دھماکا گونجتے ہی چیتے نے فوراً خشم ناک نگاہوں سے میری جانب گھورا اور خون آلود دانت نکال کر غرایا۔

زخمی راجو کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں برآمد ہو رہی تھیں۔

عین اسی لمحے جب چیتا مجھ پر حملہ کرنے یا نہ کرنے کے شش و پنج میں مبتلا تھا، میں نے اس کی پیٹھ کا نشانہ لے کر گولی داغ دی۔ وہ میری پیشہ ورانہ مہارت کی کڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔ چیتے کی پشت ایسے زاویے پر تھی کہ اگر میرا نشانہ خطا بھی ہو جاتا تو گولی سیدھی راجو کے سینے میں اتر جاتی۔

خوش قسمتی میرے ساتھ تھی۔ گولی کھا کر چیتا خون آشام غراہٹ کے ساتھ اچھلا تھا۔ اس دوران راجو نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر لیٹے لیٹے ہی لوٹ لگائی اور چیتے کی گرفت سے نکل گیا۔

چیتا جیسے ہی تڑپ کر گرا، میں نے تاک کر دوبارہ فائر

کردیا۔ گولی نے اس کی پیشانی کا مہلک بوسہ لیا اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اور مزید دو گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔

درندے کی موت کا اطمینان ہونے کے بعد میں تیزی سے راجو کی طرف بڑھا۔ بلاشبہ وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ جب میں نے اسے تھاما تو اس کے زخموں سے خون ابل کر میرا لباس بھی تر کرنے لگا۔ تاہم وہ چیتے کی موت پر خوش تھا۔ میں اسے اٹھا کر جھونپڑے میں لے گیا۔ خوش قسمتی سے اس کے زخم زیادہ سنگین نہیں تھے۔ البتہ خون زیادہ مقدار میں بہہ گیا تھا۔

اس آدمی کی مدد سے میں نے راجو کو فوراً گاؤں پہنچایا۔ صبح کاذب کا وقت تھا۔ گاؤں والے رائفلوں کے دھماکے اور چیتے کی غراہٹوں کی آوازیں سن کر پہلے ہی لاٹھیاں اور بلم لے کر نکل آئے تھے۔ ان میں میرے تھانے کے سپاہی بھی تھے۔ ضروری مرہم پٹی کے بعد راجو کو میسور کے فوجی اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ آدم خور درندوں کے دانتوں اور پنجوں میں خاص قسم کا زہر ہوتا ہے جس کے باعث زخم جلدی نہیں بھرتے اور اگر بر وقت علاج نہ کیا جائے تو زہر سارے جسم میں پھیل کر ویسے ہی اثرات پیدا کرتا ہے جیسے باؤلے کتے کے کاٹنے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اگرچہ تلگارتھی کا ساتواں آدم خور میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا مگر مجھے ایک پل قرار نہ تھا۔ ایک طرف مجھے راجو کی فکر تھی دوسری طرف اس آدم خور چیتے کے متعلق تشویش جو میری آنکھوں کے سامنے فرار ہوا تھا۔ اگر راجو کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہ آتا تو میں اسی رات اس کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوتا۔ اب مجھے آدم خور کی طرف سے جوابی حملے کا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جلد یا بدیر کسی آبادی پر حملہ ضرور کرے گا۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ تلگارتھی کی پہاڑیوں میں پایا جانے والا وہ آٹھواں آدم خور چیتا اس جتھے کا آخری ''رکن'' تھا، جس کے باقی ساتھی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے۔ اس یقین کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ساتویں آدم خور کی ہلاکت کے بعد آس پاس کی آبادیوں سے کسی واردات کی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔ لوگ تو اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ تمام آدم خوروں کا صفایا ہو چکا ہے۔

راجو کو اسپتال میں دو ہفتے ہوئے تھے، جب ایک روز علی الصباح مجھے آدم خور کی تازہ ترین واردات کی اطلاع ملی۔ میں اس وقت ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک آدمی خبر لایا کہ آدم خور نے بالم کوٹ میں ایک شخص کو ہلاک کر دیا ہے۔

بالم کوٹ، وہاں سے تین میل دور تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی اس بدنصیب کے بھائی نے مجھے حادثے کی تفصیل بتائی۔

مقتول کے گھر کی ایک کھڑکی پہاڑوں کی طرف کھلتی تھی۔ اس کا یہ معمول تھا کہ وہ رات کو کھڑکی کے پاس بیٹھ کر حقہ پیا کرتا تھا۔

حادثے والی رات وہ حسب معمول کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی دروازے کی دہلیز پر بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ اچانک کسی خوں خوار درندے کی غراہٹ سن کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اگلے ہی لمحے درندے کی غضیلی غراہٹوں میں اس کے شوہر کی چیخیں بھی مدغم ہو گئیں۔ اس مکان کا دروازہ چار فٹ چوڑی گلی میں کھلتا تھا۔ جس کے دونوں جانب مکان تھے۔ درندے کی غراہٹیں اور اس آدمی کی چیخیں سن کر تمام گھروں کے دروازے بند ہو گئے۔ وہ عورت دوڑ کر اپنے دیور کے مکان پر پہنچی اور رو رو کر اس حادثے کا بتایا۔ دیور بلم سنبھال کر اپنے بھائی کی مدد کو پہنچا مگر وہاں خون کے چھینٹوں اور کھڑکی کے جھولتے پٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

زمین پر نشانات کی چھان بین سے معلوم ہوا کہ چیتا اپنے شکار کو گلی کے آخر تک گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ پھر اسے ہلاک کر کے ایک ندی کے کنارے ویران کھیتوں میں پہنچا۔ وہاں بیٹھ کر ضیافت اڑائی اور بچا کھچا حصہ چھوڑ کر غائب ہو گیا۔

اس قصبے میں آدم خور کی یہ پہلی واردات تھی۔ تجربے کی بنیاد پر مجھے یقین تھا کہ وہ آدمخور چیتا اسی گاؤں پر دوبارہ شب خون ضرور مارے گا۔ چونکہ ہم نے لاش صبح صبح ہی دریافت کر لی تھی۔ اس لیے آدم خور کے استقبال کی تیاری کے لیے میرے پاس پورا دن تھا۔

وہاں پنجوں کے بے شمار نشانات دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ بستی پر حملہ آور ہونے سے قبل چیتے نے تین چار پھیرے لگا کر اطمینان کر لیا تھا کہ وہ مقام شکار کے لیے موزوں ہے یا نہیں۔

چیتے کی گزر گاہ کا تعین کر لینے کے بعد میں نے اس

جگہ ایک مچان بنانے کا فیصلہ کیا۔ گاؤں والوں کی مدد سے اس جگہ مچان تیار کرلیا۔

یہ ایک مضبوط اور ہر لحاظ سے بہترین مچان تھا۔ پہلے زمین پر لکڑی کے تختوں کا چبوترا بنایا گیا پھر اس کے گرد گنی بانس مضبوطی سے گاڑھ دیئے گئے۔ ان بانسوں کے ساتھ پہلے چبوترے سے چار فٹ بلند ایک اور چبوترا بنایا گیا اور اس سارے ڈھانچے کے گرد خاردار تار لپیٹ دی گئی۔ جب میں اوپری چبوترے پر سامان خورد ونوش کے ساتھ رائفل سمیت براجمان ہوگیا تو گاؤں والوں نے میری ہدایت کے مطابق مچان کو چاروں طرف سے خشک گھاس اور پتوں سے یوں ڈھانپ دیا کہ قریب سے دیکھنے پر بھی اس پر خشک گھاس کے ڈھیر کا گمان گزرتا تھا۔

بیٹھنے کے بعد میں نے چیتے پر گولی چلانے کے لیے گھاس .... میں ایک سوراخ بنالیا۔ وہ چاندنی رات تھی اور مجھے برقی ٹارچ کی ضرورت نہیں تھی۔

رات کے دس بجے سامنے والی پہاڑیوں سے بندروں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر ہر طرف موت کا سناٹا چھا گیا۔

یکایک تیز ہوا چلنے لگی جس کے باعث درخت کے پتوں کے ساتھ ساتھ میری کمین گاہ کو ڈھانپنے والی گھاس میں بھی کھڑ کھڑاہٹ ہونے لگی۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ بندروں کی آوازیں سن کر میں جان گیا تھا کہ کوئی درندہ پہاڑوں سے اتر رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھلا آدم خور کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا؟ لیکن لحہ بہ لحہ تیز ہوتی ہوا نے بھی میرے اوسان خطا کردیے۔ مجھے یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں ہوا میری مچان کی گھاس اڑا کے مجھے ظاہر نہ کردے۔

میرا دماغ انہی خدشات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ مجھے تیز ہوا کے شور میں دبی دبی غراہٹیں سنائی دیں۔ لیکن مجھے یہ اندازہ نہ ہوسکا تھا کہ وہ غراہٹیں کس سمت سے آئی تھیں؟ میں اپنی جگہ ساکت وجامد بیٹھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا مگر کوئی ذی روح دکھائی نہ دی۔

اسی لمحے پہلے سے بلند غرانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور تمام احتیاطی تدابیر بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے سر پر سے گھاس ہٹا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے قریب ہی کہیں بادل گرجا ہے۔ مگر یہ درندے کی گرج تھی جو میرے سر کے عین اوپر سنائی دی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ جلدی کرو، ورنہ مارے جاؤ گے۔ میں برق سرعت سے اسی جانب گھوم گیا۔ عین اسی لمحے مجھے باڑھ کا سہارا لیے ہوئے چیتے کا خوفناک سر نظر آ گیا۔ وہ مکار درندہ گھاس کی اوٹ لے کر عقب سے مجھ پر حملہ آور ہوا چاہتا تھا۔ اس کی انگارہ آنکھیں مجھ پر مرتکز تھیں۔

میں نے یکے بعد دیگر دو فائر اس پر جھونک دیئے۔ درندہ گرج کے ساتھ الٹ کر دور جا پڑا۔ میں نے جلدی سے گھاس ہٹا کر نیچے جھانکا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان نہ تھا۔ نہایت قریب سے چیتے کا سامنا کرنے پر میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

یک لخت چبوترے کے نیچے کھڑ کھڑاہٹ ہوئی اور ایک قدآور چیتا نکل کر پہاڑوں کی طرف بھاگا۔ میں نے اس پر یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلائیں، مگر تینوں خطا گئیں۔ تھوڑی دیر قبل میں جس کیفیت سے دوچار ہوا تھا اس نے میرے حواس بری طرح مختل کردیئے تھے۔ شاید اسی لیے میں درست نشانہ نہ لگا سکا تھا اور آدم خور میری نظروں کے سامنے پہاڑوں میں روپوش ہوگیا۔

وہ رات میں نے مچان میں ہی گزاری۔ جب پو پھٹے گاؤں سے لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح نوجوان پہنچے تو میں مچان سے نیچے اترا۔

زمین کا معائنہ کرنے پر میں نے دیکھا کہ ایک جگہ چیتے کا خاصا خون اور کچھ فاصلے پر ایک نوکیلا دانت پڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری ایک گولی نے اس کا ایک جبڑا زخمی کرڈالا تھا۔

میں نے ناشتے کے بعد گاؤں والوں کو چوپال میں جمع کیا اور آدم خور کے خلاف ان کے جذبات ابھارتے ہوئے .... ان سے ہانکا کرنے کو کہا۔ پہلے تو آدم خور کی ہیبت کے باعث کوئی تیار نہ ہوا لیکن جب میں نے انہیں یقین دلایا کہ درندے کو کاری زخم آئے ہیں اور اب محض اسے ڈھونڈ کر جہنم واصل کرنا باقی ہے تو خاصی حیل وحجت کے بعد بارہ مضبوط اور توانا جوان میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہوگئے۔

جن شکاریوں کو پہاڑی جنگلات میں آدم خور چیتے یا شیر کے تعاقب میں نکلنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ یہ مرحلہ کتنا دلچسپ اور امید وبیم کی کیفیت سے بھرپور ہوتا ہے اور خطرناک وجان لیوا بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

زخمی ہونے کے بعد درندے کی غیض وغضب اور

عیاری کی انتہا نہیں رہتی۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے جان پر کھیل جاتا ہے۔ اگر شکاری یا ہانکا کرنے والے ذرا بھی بزدلی دکھائیں تو ان میں سے کسی کی تکا بوٹی کر ڈالنا درندے کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہانکا کرنے والے خالی ٹین گلے میں لٹکائے میرے دائیں بائیں نصف دائرے کی صورت میں پھیل کر آگے بڑھنے لگے۔ جبکہ میں ان کے وسط میں چیتے کے خون اور پنجوں کے نشانات کا بہ غور جائزہ لیتا آگے بڑھ رہا تھا۔ پہاڑی علاقہ شروع ہونے سے قبل راہ میں خاصا گھنا اور دشوار جنگل پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ دور دور تک کوئی ایسا مقام نہ تھا جہاں چیتا پناہ لیتا۔

میں چوں کہ تلگارتھی کے سات آدم خوروں کو بڑی کامیابی سے ٹھکانے لگا چکا تھا، اس لیے کچھ زیادہ ہی بے باک اور نڈر بن گیا۔ تاہم مجھے علم تھا کہ یہ آخری آدم خور اتنی آسانی سے ہتھے چڑھنے والا نہیں۔ ہم جوں جوں آگے بڑھے، جنگل دشوار گزار ہوتا گیا۔

آخر ہم ایسے مقام پر جا نکلے جہاں چھ چھ فٹ اونچی خاردار جھاڑیاں، جابجا راہ میں حائل تھیں۔ جب میں نے ان جھاڑیوں میں گھسنے کی کوشش کی تو باریک کانٹوں نے میرے کپڑے تار تار کر دیے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو وہیں رکنے کا اشارہ دے دیا۔ رکتے ہی ان کے ٹین پیٹنے میں شدت آ گئی۔ ایک مقام پر چیتے کے بالوں کا گچھا اٹکا دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ اس سے ذرا آگے کافی مقدار میں خون کے چھینٹے بھی نظر آئے۔

میں نے ساتھیوں سے کہا کہ ٹین پیٹنا بند کر دیں۔ مجھے یقین تھا کہ مفرور چیتا انہی جھاڑیوں میں کہیں دبکا بیٹھا ہے۔ تصدیق کے لیے میں نے مٹی کے چند ڈھیلے جھاڑیوں میں پھینکے، تو موذی درندہ ہولے سے غرایا۔ چیتے کی غراہٹیں سن کر میرے ساتھی آن واحد میں پلٹ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مجھے ان سے ایسی ہی بزدلی کی توقع تھی۔ اب میں تنہا درندے کے مقابل تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھی تو جھاڑیوں میں دو تین فائر جھونک دیے۔

جنگل کا سکوت ان گنت پرندوں اور بندروں کی چیخوں سے درہم برہم ہو گیا۔ چند ہی ثانیوں بعد ان میں چیتے کی غراہٹیں اور دور ہوتی گرج بھی شامل ہو گئی۔

اگر خاردار جھاڑیاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو تلگارتھی کے آخری آدم خور کا قصہ اسی وقت تمام ہو جاتا۔

بہر حال میں اپنی ناکامی پر کف افسوس ملتا ہوا گاؤں پہنچا تو لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے ان سب کی بزدلی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ان کا بھاگ جانا فطری عمل تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ زخمی چیتا زیادہ دیر بھوک برداشت نہ کرنے کے باعث جلد کسی نہ کسی انسان کی تلاش میں آبادی کا رخ کرے گا۔ لیکن چار دن گزرنے کے باوجود اس کا نام ونشان نہ ملا۔ امید وبیم کی یہ کیفیت حد درجہ اعصاب شکن اور

حوصلہ پست کر دینے والی تھی۔ میں جلد از جلد اس کوفت سے نجات چاہتا تھا۔ جب ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود چیتے کی کوئی خبر نہ ملی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا ہے۔

☆☆☆

ایک روز میں نے پھر گاؤں والوں کو چوپال میں جمع کیا اور ان پر زور دیا کہ چیتے کو تلاش کریں، کہیں نہ کہیں اس کی لاش مل جائے گی۔ مگر آدم خور کی ہیبت ان کے دلوں پر اس قدر مسلط تھی کہ کسی نے بھی میرا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ ادھر میری رخصت کی معیاد ختم ہونے میں چار دن باقی رہ گئے تھے۔ اگر راجو زخمی نہ ہوا ہوتا تو میں اس کے ہمراہ پہاڑوں کا رخ کر سکتا تھا مگر تنہا جانے میں کئی خطرات تھے۔ چیتوں کے علاوہ ان پہاڑوں میں دوسرے خطرناک درندوں اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کی بھی بہتات تھی۔ اس لیے تنہا وہاں جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

جب میری رخصت ختم ہونے میں دو دن باقی تھے تو ایک عجیب و غریب واقع پیش آیا۔ مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اگر وہ واقع رونما نہ ہوتا تو شاید مجھے تلگار تھی کے اس آخری آدم خور سے دو دو ہاتھ کیے بنا ہی واپس... لوٹنا پڑتا۔

میں گاؤں سے باہر برگد تلے نمبردار سے باتوں میں مصروف تھا کہ اس نے میری توجہ پہاڑوں کی طرف مبذول کروائی۔ دور پہاڑوں کے دامن میں گرد کا بادل سا اڑتا نظر آرہا تھا جو آہستہ آہستہ قریب ہوتا گیا۔ مزید قریب آنے پر ہمیں ایک گھوڑے کا ہیولہ نظر آیا۔

جب قریب آیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ گھوڑے تو میں نے کئی دیکھے تھے مگر اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ اس قدر شاندار جانور تھا کہ صاحب ذوق شاعر اس پر پورا دیوان تحریر کر سکتا تھا۔ گھوڑے کی پشت پر ایک شخص اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کی پشت اور ٹانگوں پر جابجا گہری خراشیں تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔

میں نے نمبردار کی مدد سے زخمی کو گھوڑے کی پیٹھ سے اتارا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نمبردار گاؤں کے حکیم کو بلا لایا، جس نے زخمی کے زخم صاف کر کے ان پر مختلف جڑی بوٹیوں کا لیپ لگایا اور پٹی کر دی۔

اجنبی کے زخم دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی کسی چیتے کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی ہے۔ پہاڑوں میں چوں کہ چیتوں کی بہتات تھی اس لیے مجھے اس کی حالت پر حیرت نہ ہوئی تھی۔ البتہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ان پہاڑوں میں مردم خور چیتوں کا وجود ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی بعید نہ تھا کہ گھڑسوار پر اسی چیتے نے ہی حملہ کیا ہو جو میرے ہاتھوں زخمی ہو کر بھاگ نکلا تھا۔

زخمی تا حال بے ہوش تھا۔ حکیم کے مطابق اس کی وجہ بکثرت خون کا بہہ جانا تھی اور چند گھنٹوں بعد اسے ہوش آجانا تھا۔ اجنبی سے فارغ ہو کر میں اس گھوڑے کی طرف متوجہ ہوا۔ گاؤں والے بھی بڑے انہماک کے ساتھ اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ گھوڑا درخت کے نیچے باندھ دیا گیا تھا مگر وہ بار بار گردن موڑ کر اپنے مالک کی طرف دیکھتا تھا۔ یقیناً وہ سدھایا ہوا اور اپنے مالک کا انتہائی وفادار تھا۔

اجنبی کے قبضے سے دو ایسی چیزیں برآمد ہوئیں جنہوں نے مجھے اس کی طرف سے شک و شبہے میں مبتلا کر دیا تھا ایک تو اس کے پہلو سے جھولتی تلوار، جس کے دستے پر شیر کا سر کندہ تھا۔ دوسرے ایک چرمی تھیلی جس میں بیش قیمت لعل و جواہر بھرے تھے۔

میں نے فوراً تھانے سے تین سپاہی بلا بھیجے۔ مجھے شک تھا کہ یہ زخمی گھڑسوار کوئی واردات کر کے آرہا ہے اور ہیرے لوٹ کا مال تھا۔ میں نے سپاہیوں کو زخمی کی نگرانی پر معمور کر دیا۔

میں پھر گھوڑے کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے قریب جانے پر اس نے منہ اٹھایا اور زور سے ہنہنایا۔ میں نے اسے چمکارا۔ قریب جا کر اس کی پیٹھ تھپکی اور اس کی لگام کھونٹے سے کھول کر تھام لی، گھوڑے نے ایک جھٹکے سے لگام میرے ہاتھ سے چھڑائی اور پھریری لے کر زخمی کی طرف بڑھ گیا۔ یہ دیکھ کر چارپائی کے گرد کھڑے لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔

گھوڑا اپنے مالک کو سونگھنے لگا۔ اس کی طرف سے کوئی حرکت نہ ہونے پر وفادار حیوان کے حلق سے کربناک آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ بار بار پچھلے سم زمین پر مار کر بے چینی کا اظہار کرنے لگا۔ گاؤں والوں کے لیے اس کی یہ حرکت بے معنی تھیں، لیکن شکاری ہونے کے ناطے میں سمجھ گیا کہ گھوڑا کسی مخصوص مقام پر جانے کا اشارہ کر رہا ہے۔

میں نے فوراً اپنا سامان تیار کیا، تلوار اور تھیلی اردلی کی تحویل میں دی اور زخمی کا دھیان رکھنے کی تاکید کر کے اجنبی کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ خلاف توقع اس نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ جیسے ہی میں نے اس کی لگام ڈھیلی

چھوڑیں، وہ سبک رفتاری سے تلگار تمی کی پہاڑیوں کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

چرنے اور پانی پینے کے بعد وہ تازہ دم ہو گیا تھا۔ اس لیے طوفانی رفتار سے زمین کو کچلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

دوپہر کے وقت میں میدانی علاقہ پار کر کے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں وقفے وقفے سے چھوٹی بڑی چٹانیں راہ میں حائل ہونے لگیں۔ اب گھوڑے کی رفتار سے بھی تھکن جھلکنے لگی تھی۔ میں اسے تھوڑی دیر ستانے کا موقع دینے کی غرض سے لگامیں کھینچیں لیکن وہ نہیں رکا اور آگے بڑھتا رہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تھکن اور پیاس کے باوجود جلد از جلد کسی خاص جگہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پگڈنڈی نما راستے پر دوڑتے ہوئے اچانک گھوڑا ایک چٹان کے قریب خود بخود آہستہ ہو گیا۔ اس کے کان یوں متحرک ہو گئے جیسے وہ کوئی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ چٹان سے ایک راستہ بائیں جانب کو جاتا تھا، گھوڑا اسی پر گھوم گیا۔ آگے نشیبی علاقہ تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا۔

سنگلاخ چٹانوں میں گھری ہوئی ایک سرسبز و شاداب وادی میرے سامنے تھی۔ تیس چالیس گز کے فاصلے پر پانی بلندی سے ایک جھرنے کی صورت میں گر رہا تھا اور وہاں پیالے کی شکل کا تالاب بن گیا تھا۔ میں گھوڑے سے اتر آیا۔

وہ منظر اس قدر دلفریب تھا کہ میں پل بھر کے لیے مبہوت رہ گیا۔ درختوں پر بڑی تعداد میں بندر ادھم مچاتے پھر رہے تھے۔ ان کے چہرے سیاہ اور دمیں لمبی لمبی تھیں۔ تالاب میں خوش رنگ پرندے نہا رہے تھے۔ تالاب سے ذرا فاصلے پر قطار میں تین غار تھے۔ ان میں ایک کے دہانے پر پہنچ کر گھوڑا اپنے اگلے سم زور زور سے چٹانوں پر مارنے لگا۔

میں غور سے اس کا مشاہدہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک دہانے پر ایک انسانی ہیولہ نمودار ہوا۔ میں اپنی جگہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ وہ ایک سرو قد لڑکی تھی۔ نہایت پاکیزہ چہرے کے تاثرات کی مالک لڑکی۔ سب سے پہلے اس کی نظر گھوڑے پر پڑی۔ پھر اس کی متلاشی نگاہوں نے تالاب کا طواف کیا۔ اور بالآخر مجھ پر آ کر ٹھہر گئیں۔ ایک انگریز کو اپنی جانب متوجہ پا کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ غار میں جا گھسی۔ جب دوبارہ باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک خنجر چمک رہا تھا۔

میں نے رائفل کاندھے سے لٹکائی اور اپنے دونوں

جامع التواریخ

ایلخانی دور کی تصنیف۔ اس کا مؤلف رشید الدین فضل اللہ ہمدانی (1227ء۔1318ء) اباقا، غازان اور الجائتو منگول بادشاہوں کا وزیر تھا یہ تاریخ وقائع عالم اور خاص کر مغلوں کی سلطنت اور غازان کی بادشاہت کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔ 1310ء میں مکمل ہوئی۔

مرسلہ: اکبر درانی، حب (بلوچستان)

ہاتھ اوپر اٹھائے آگے بڑھنے لگا۔

”رک جاؤ...... ورنہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔“ ...... وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

”میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا......“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکی۔ شاید ایک انگریز کی زبان سے مقامی بولی سن کر اسے حیرت کا دھچکا لگا تھا۔

”خدا کے لیے خنجر پھینک دو...... میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں......“

”تم نے اکبر سلطان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟“ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی مانند گرجی۔ ”تم یقیناً مجھے گرفتار کرنے آئے ہو؟“

”میں شکاری ہوں......“ میں نے رائفل اتار کر دور پھینکتے ہوئے کہا۔ ”اکبر سلطان میرے گاؤں میں ہے۔ تم خود دیکھ لو، اس کا گھوڑا ہی مجھے یہاں لایا ہے۔“

میرے یہ الفاظ اس پر اثر کر گئے۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے پہلے مجھے اور پھر گھوڑے کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل کر پہاڑوں میں گونجتی چلی گئی۔

عین اسی لمحے گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر زور سے ہنہنایا۔ اس سے قبل کہ میں صورت حال کا درست اندازہ لگا پاتا۔ عقب سے چیتے کی غصیلی غراہٹ ابھری۔ اور میں قطعی غیر ارادی طور پر پلٹ گیا۔ افسوس، اس وقت تک چیتا عقبی چٹان سے میری جانب جست لگا چکا تھا۔ اس کی انگارہ آنکھیں، کھلے پنجے، اور خونخوار دہانہ لحہ بہ لحہ میرے قریب آرہے تھے۔ میں نے اپنے اوسان بحال رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ اور زمین پر پڑے جست لگا دی۔

چیتے کا جسم اتنی قوت سے میرے جسم سے ٹکرایا کہ میں رائفل تک پہنچنے سے قبل ہی اس کے وجود تلے دب

کر کھردری زمین سے جا ٹکرایا۔ آن واحد میں درندہ مجھ سے لپٹ گیا۔ چیتے سے مڈبھیڑ ہونے کا یہ میرا پہلا موقع نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ حواس قابو میں رکھ کر میں خود کو درندے کی گرفت سے آزاد کرا سکتا ہوں۔ چیتا میرا داہنا شانہ جبڑوں سے بھنبھوڑنے لگا۔ اس نے میری دونوں رانیں مضبوطی سے اپنے پچھلے پنجوں سے جکڑے رکھی تھیں۔ میں نے دونوں پیر پوری قوت سے اٹھائے اور ان کے وزن سے چیتے کا وزن ایک طرف ڈالنا چاہا۔

عین اسی لمحے فضا رائفل کے دھماکے سے گونج اٹھی اور گرم گرم خون کا فوارہ میرے چہرے پر پڑا۔ چیتے کے پیٹ کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ میں نے فوراً دونوں پاؤں سمیٹے اور زخمی چیتے کو پوری قوت سے ایک طرف اچھال دیا۔ اسی لمحے رائفل دوسری بار گرجی اور چیتے کا سر پاش پاش ہوگیا۔

میں نے زخموں سے چور اپنا وجود سمیٹا اور چٹان کے ایک ابھرے ہوئے کونے کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی ہاتھ میں رائفل تھامے کسی فاتح جرنیل کی طرح کھڑی تھی۔ میں بائیں ہاتھ سے اپنا زخمی شانہ دبائے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ ساتھ ہی مجھے ابکائی آئی اور میں حواس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

ہوش آنے پر میں نے خود کو پیال پر پڑے پایا۔ میرا زخم صاف کر کے پٹی کردی گئی تھی۔

سرہانے والی لڑکی متفکر انداز میں بیٹھی تھی۔ جیسے ہی میں نے آنکھیں کھولیں اس نے ایک برتن میرے منہ سے لگا کر نہایت شیریں سیال میرے حلق میں انڈیل دیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے اندر توانائی سی محسوس ہوئی۔ لڑکی نے دوبار مجھے وہ سیال پلایا۔

''اب بتاؤ، اکبر سلطان کہاں ہے؟'' جب میں اپنے حواسوں میں آیا تو اس نے مجھے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ خیریت سے ہے۔'' میں نے تکلیف بھری سسکاری کے ساتھ جواب دیا۔ ''لیکن تم کون ہو؟ اور ان خطرناک پہاڑیوں میں کیا کر رہی ہو......؟''

''کبھی ہم محلات میں رہا کرتے تھے۔'' اس نے یاس بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر تمہاری حکومت نے ہمیں گھر سے بے گھر کردیا۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم کھلے بندوں رہنے لگے تو انگریز سرکار ہمیں گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دے گی۔''

میں حیرت سے اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ میرے تصور میں اکبر سلطان سے برآمد ہونے والی شاہی مہر والی تلوار اور جواہرات گھوم گئے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ان دونوں کا تعلق میسور کے دلیر مسلمان حکمران ٹیپو سلطان کے خاندان سے تھا۔ میں نے سنا تھا کہ جب انگریزوں نے سرنگاپٹم پر قبضہ کیا تو ٹیپو سلطان کے خاندان کو حراست میں لے لیا گیا۔ تاہم کچھ افراد ہاتھ نہ آئے۔ اور اب وہ روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی جوڑا یوں چیتوں کے درمیان بھی زندگی بسر کررہا ہوگا۔

شاید یہ ان کی رگوں میں دوڑنے والے شاہی خون کی تاثیر تھی، کہ انہوں نے ایسے کٹھن مقام میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

بعد ازاں مجھے لڑکی نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر اکبر سلطان کے ہمراہ کئی برس سے تلگارتھی کی پہاڑیوں میں رہ رہی ہے۔ خوراک کی ضرورت وہ جنگلی پھلوں اور شکار کے ذریعے پوری کرتے ہیں۔ جب کسی اور شے کی ضرورت ہوتی .... تو اکبر سلطان قیمتی پتھر سموگا کے ایک شناسا جوہری کے ہاتھ فروخت کرآتا۔ گزشتہ روز بھی وہ اسی غرض سے روانہ ہوا تھا کہ اس کا سامنا چیتے سے ہوگیا۔ یہ وہی چیتا تھا جس کا میں پیچھا کررہا تھا۔ یہ جان کر مجھے ازحد خوشی ہوئی تھی کہ تلگارتھی کا آخری آدم خور جہنم واصل ہوچکا تھا۔

میرے بہتیرے اصرار پر بھی لڑکی میرے ساتھ گاؤں جانے پر تیار نہ ہوئی۔ بلکہ اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا اور اکبر سلطان کے زخم مندمل ہوتے ہی میں اسے واپس بھیج دوں گا۔

جب میں گاؤں واپس پہنچا تو اکبر سلطان کو ہوش آچکا تھا۔ میں نے اسے تنہائی میں ساری داستان سنائی۔ اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتادے تو میں اس کی مدد کروں گا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد میری خصوصی سفارش اور گواہی پر تاج برطانیہ نے ان دونوں کو رسمی کارروائی کے بعد نہ صرف معاف کردیا بلکہ وظیفہ مقرر کر کے دہلی میں ان کی رہائش کا انتظام بھی کردیا۔

اس واقعے کو کئی برس بیت چکے ہیں۔ مگر آج بھی میرے پاس محفوظ ٹیپو سلطان کی شاہی مہر والی تلوار، مجھے اس کی یاد دلاتی رہتی ہے۔
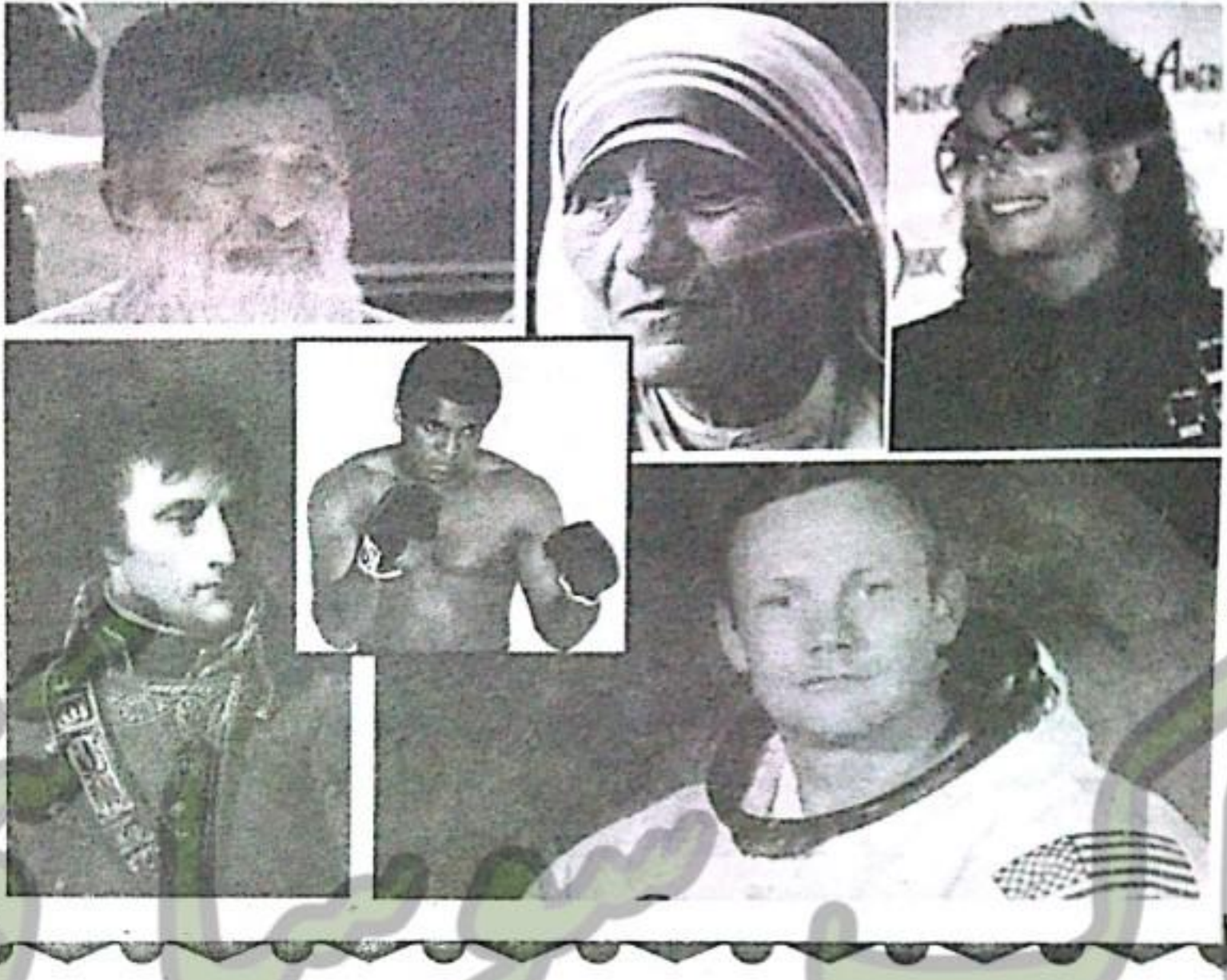
عزیزِ جہاں

کشمالہ حسن

مثبت مقصد' زندگی کے لیے اہم ترین امر ہے، جس طرح ناخدا کے بغیر کشتی بے معنی ہے۔ جو شخص مقصد کے بغیر زندگی گزار رہا ہو اس کی زندگی لاحاصل ہے۔گر روپیشِ نظر مقصد نہ ہو تو اس زندگی میں حرارت ہو گی نہ لذت۔ خواہشات کا بھی فقدان ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ عقلمندانِ عالم کی زندگی مقصد کے حصول میں بیتی ہے۔

بامقصد زندگی کے حامل شخصیات کا مختصر مختصر تعارف

خدا نے جب انسان کو تخلیق کیا تو اس میں خیر و شر کی خوبیاں اور خرابیاں دونوں رکھ دیں۔ جس طرح تاریخ انسانی ایسے لوگوں کے ناموں سے بھری ہوئی ہیں جنھوں نے اپنی شیطانی حرکتوں سے نفرتیں پیدا کیں۔ جو ظالم، بے رحم اور بے حس لوگ تھے جن کے نزدیک انسانی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔

اسی طرح ایسے بھی لوگ تھے جن سے بے انتہا محبت کی گئی۔ جن کے ایک اشارے پر لوگ اپنی جانیں نچھاور

کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ایسے لوگوں کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے تھا۔

سائنس، مذہب، آرٹ، فلسفہ، جنگ، تعمیرات غرض یہ کہ کوئی بھی شعبہ ہو یہ لوگ قابلِ احترام اور قابلِ محبت قرار پائے۔

اب دیکھا جائے تو ایسا کیوں ہوا؟

اس کی ایک وجہ سامنے آتی ہے کہ ایسے لوگوں میں خیر کے پہلو زیادہ نمایاں تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے شعبوں کے ماہرین ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان سے اسی لیے پیار کیا جاتا تھا۔

میرے خیال میں انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ پیار اور احترام ہمارے نبی پاک کا کیا گیا۔ جس زمانے میں آپ دنیا میں تشریف فرما تھے اس وقت بھی ان پر جان دینے والوں کی کمی نہیں تھی اور آج بھی پورا عالم اسلام ان کے احترام کی خاطر اپنی جانیں دے سکتا ہے۔ یہ عزت مرتبہ اور یہ پیار کسی اور کو نہیں مل سکا اور مل بھی نہیں سکتا کیوں کہ آپ تو اللہ کے محبوب ہیں۔

پھر حضرت عیسیٰ عیسائیوں کے علاوہ مسلمانوں کے لیے بھی قابلِ احترام ہیں۔ اس طرح اگر دیگر مذاہب کو دیکھا جائے تو مہاتما بدھ۔ دنیا کا ایک بہت بڑا طبقہ ان سے محبت کرتا ہے۔ پھر زرتشت، مہاویر وغیرہ۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے بلا امتیاز رنگ و نسل ہر ایک کو فائدہ پہنچایا۔ ہر ایک سے پیار کیا اور آج دنیا انہیں پیار کر رہی ہے۔

یہ تو مذہبی لوگ تھے جبکہ دنیا کے چند بڑے لوگوں کے علاوہ ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے جو عزیز جہاں بنے ہوئے ہیں۔

ان میں ہر شعبے کے لوگ ہیں۔

آئیں کچھ ایسے لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ حضرات عزیز جہاں کیوں بنے۔

افغان لڑکی: سب سے پہلے ایک ایسی لڑکی کا ذکر کروں گا جس کا نام تک شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں گے۔ اس لڑکی سے کوئی بڑا واقعہ کوئی کارنامہ بھی منسوب نہیں ہے۔ اس کے باوجود پوری دنیا کے لوگوں نے اس لڑکی سے غائبانہ پیار کیا۔ اس کے لیے ہمدردی محسوس کی۔ 1985ء میں نیشنل جیوگرافک والوں نے اس کی ایک تصویر شائع کی تھی بس اتنی سی بات تھی اور ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس لڑکی کے خدوخال، اس کے چہرے پر چھائی ہوئی بلا کی معصومیت اور سب سے بڑھ کر اس کی گہری سبز آنکھیں۔

ایسی گہری سبز آنکھیں شاید ہی اس سے پہلے کبھی دیکھی گئی ہوں۔ ایسی آنکھوں کا سلسلہ جینیاتی طور پر چنگیز خان تک جاتا ہے۔

دراصل ان آنکھوں ہی نے اس لڑکی کو اتنی ہمدردی دلوادی تھی لوگوں نے اس سے پیار محسوس کیا تھا۔

اس لڑکی کا کیا ہوا، وہ کسی کو نہیں معلوم لیکن اس کی تصویر دیکھ لینے والے اسے آج تک بھلا نہیں سکے ہیں۔

محمد علی (پرانا نام کاسٹیس کلے): امریکا کا لیجنڈ، تین بار کا ورلڈ چیمپئن، لاکھوں دلوں کی دھڑکن۔ لوگوں نے اس سے بے پناہ پیار کیا۔

رنگ میں اس کی پھرتی قابلِ دید ہوا کرتی۔ اس کے چہرے کا بھولا پن سونے پر سہاگہ کی طرح تھا۔ پھر جب اس باکسر نے اسلام قبول کرلیا تو پورا عالمِ اسلام اس کا دیوانہ ہو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ٹی وی پر محمد علی کے مقابلے آیا کرتے تو ہم سب رات رات بھر ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہتے۔

صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے۔ کروڑوں دعائیں اس کے ساتھ ہوا کرتیں۔ خاص طور پر مسلمان اسے اپنا ہیرو سمجھتے تھے۔

ایسا پیار بھی بہت کم ہی لوگوں نے حاصل کیا ہوگا جتنا محمد علی کے حصے میں آیا تھا۔

میری انٹونی: ہوسکتا ہے بہت سے لوگوں نے اس کا نام بھی نہ سنا ہوگا لیکن ایک زمانہ تھا کہ لوگ اس پر اپنی جانیں نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ جوان، خوب صورت، باوقار۔

وہ فرانس کی آخری ملکہ تھی اور اس سے پیار کرنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ فرانس کی آخری ملکہ تھی بلکہ اس نے غریبوں اور عام لوگوں کی بھلائی کے لیے بہت کچھ کیا۔

اس نے اپنے ملک کو خوش حال بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کا خواب تھا کہ اس کے ملک کے لوگوں پر کبھی پریشانیاں نہ آئیں۔

وہ کسانوں اور مزدوروں میں گھل مل جایا کرتی۔ ان کے مسائل معلوم کرتی۔ انہیں حل کرنے کی کوشش کرتی۔

شاید ان ہی باتوں نے اسے عوام میں اتنا مقبول بنا دیا تھا۔

یہاں بھی وہی فلسفہ سامنے آیا ہے کہ جو دوسروں کو

پیار دے گا، دوسرے بھی بدلے میں اسے پیار ہی دیں گے۔

میری کا انجام بہت الم ناک ہوا۔ باغیوں نے اسے موت کی سزا دے دی تھی۔ اس کا سر اڑا دیا گیا لیکن اس کی یادیں ابھی بھی باقی ہیں۔

جون آف آرک: اس خاتون نے بھی بے پناہ پیار سمیٹا۔ اپنے زمانے میں ہی لوگ اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کا احترام کیا جاتا۔

جون آف آرک کا احترام اس طرح کیا جاتا ہے جیسے کسی سینٹ یا صوفی کا کیا جاتا ہو۔ اس نے بھی اپنی زندگی لوگوں کو اچھائی کے راستے پر آنے کی تلقین میں گزار دی۔

لانس آرم اسٹرونگ: اس کی کہانی بالکل مختلف نوعیت کی ہے۔ یہ ایک کھلاڑی ہے اور بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ یہ شخص مسلسل سات برسوں تک سائیکل ریس میں فرانس کا چیمپئن رہا ہے۔ ٹوروں فرانس نام کے مقابلوں میں اس کی شمولیت اس کی فتح کی ضامن ہوا کرتی اور یہ وہ شخص ہے جس سے بے انتہا پیار کیا گیا۔ اس کو سراہا گیا۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، لڑکیاں سب اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے تاب رہا کرتے تھے۔

اس کی وجہ اس کا سائیکل ریس چیمپئن ہونا نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ شخص کینسر کا مریض تھا۔ جی ہاں وہ موذی مرض جس کا خوف ہی مار دیا کرتا ہے۔ لوگ بستر پکڑ لیتے ہیں لیکن یہ شخص اس کے باوجود برسوں تک عزم و ہمت کی مثال بنا رہا۔

اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ہمت جوان اور ارادے مضبوط ہوں تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے اس لیے اس شخص سے اتنا پیار کیا تھا۔

نیل آرم اسٹرونگ: اب ایک اور آرم اسٹرونگ کا ذکر ہو جائے۔ یہ شخص پوری دنیا کا چہیتا خلا باز تھا۔ دنیا کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف تھا۔ اس کی تصویریں گھروں میں لگائی جاتیں۔ اس پر گانے بنائے گئے۔

آج بھی ہر شخص اس کے نام سے واقف ہے۔ کیوں کہ یہ انسانی تاریخ کا پہلا انسان ہے جس نے چاند پر قدم رکھا تھا۔

اس نے یہ کارنامہ 1969ء میں انجام دیا اور اس وقت سے ہی اس کے نام کی دھوم مچ گئی تھی۔ نیل آرم اسٹرونگ، نیل آرم اسٹرونگ۔ نیلام گھر سے لے کر دنیا کے

ہر کوئز شو میں اس کے بارے میں سوال پوچھا جاتا رہا۔ ایسی مقبولیت شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہو۔

اب یہاں اس قسم کے لوگوں کی دو کیٹیگری سامنے آتی ہے۔

ایک تو وہ ہوتے ہیں جن کی ساری زندگی کار خیر میں گزرتی ہے۔ جو ایک عمر لگا کر کسی نہ کسی شعبے میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ فلاح و بہبود کے کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ تب جا کر انہیں مقبولیت کا درجہ ملتا ہے۔

یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ مقبولیت اور شہرت دو مختلف چیزیں ہیں کوئی ضروری نہیں کہ جو مشہور ہو وہ مقبول بھی ہو لیکن جو مقبول ہوتا ہے وہ مشہور بھی ہوتا ہے۔

بہرحال تو دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اچانک شہرت پا جاتے ہیں۔ کوئی ایک واقعہ کوئی ایک مہم انہیں مشہور کر دیتی ہے اور انہیں اس اچانک شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ مقبولیت کا درجہ حاصل کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

لاڈگ وان بیتھروان: مشہور زمانہ جرمن کمپوزر اور پیانو نواز۔ برسوں گزر جانے کے بعد اس کی شہرت کم نہیں ہوئی۔ اس شخص نے مغربی کلاسیکی موسیقی کو عروج پر پہنچا دیا۔

جب وہ زندہ تھا۔ اس وقت بھی پورا جرمن اور دنیا کے دیگر ممالک کے لوگ اس سے پیار کرتے تھے اور موت کے بعد بھی اس کی مقبولیت اور شہرت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

الیگزینڈر گراہم بیل: اس موجد نے بھی بے شمار لوگوں کا پیار اور احترام حاصل کیا۔ اس کی ایک ایجاد لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔ چاہے وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی فاصلے پر کیوں نہ ہوں۔ جی ہاں، اسی نے ٹیلی فون ایجاد کیا تھا۔

مارلن برانڈو: اب ذکر ہے ایک اداکار کا۔ یہ اداکار عہد ساز تھا۔ مارلن برانڈو کا نام اداکاری میں سند کے طور پر لیا جاتا۔ فلمی حلقے اس تیکھے اور وجیہ اداکار سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اس کے نام پر کئی ادارے وجود میں آ گئے۔

مارلن برانڈو فلمی دنیا میں اپنے عہد کا ایک بڑا نام رہا ہے اور آج بھی لوگ اس سے عقیدت رکھتے ہیں۔ اس عقیدت اور اس پیار کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔

ہمفرے بوگارڈ: ہالی ووڈ میں اداکاری کا بادشاہ تسلیم

کیا گیا ہے۔ تیس اور چالیس کی دہائی میں چھا جانے والا۔
یہ وہ اداکار تھا جس نے اداکاری کو آرٹ بنا دیا تھا۔ چونکہ یہ مخلص اور پیار کرنے والا انسان تھا۔ اس لیے اسٹوڈیو کے عملے سے لے کر ناظرین تک اس سے محبت کرتے تھے۔ ایسے لوگ اگر ہندوستان میں ہوں تو فوراً بھگوان بنائے جاتے ہیں لیکن بوگارڈ انسان تھا اور انسان ہی رہا۔

نپولین بونا پارٹ: 1799ء میں اقتدار میں آیا۔ ویسے تو یہ شخص ایک جرنیل اور ایک حکمران تھا لیکن اس کی مقبولیت فرانس والوں سے جا کر معلوم کریں۔ نپولین فرانس کی تاریخ کا سب سے بڑا ہیرو ہے۔ اس نے جس انداز کی زندگی گزاری اور جن اصولوں کو اپنایا وہ آج بھی مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔ اس کے اقوال دہرائے جاتے ہیں اور فرانسیسی قوم اپنے اس ہیرو کو ہر دم یاد رکھتی ہے۔

فیڈرل کاسترو (کیوبا کا ڈکیٹیٹر): کہنے کو تو یہ ایک آمر تھا لیکن کیسا ہی آمر ہو کوئی قوم کسی کو پچاس برسوں تک برداشت کہاں کرتی ہے۔

کاسترو پورے پچاس برسوں تک آمر ہونے کے باوجود عوام کا ہیرو بنا رہا۔ یقیناً کوئی نہ کوئی بات تو اس میں ضرور ہوگی۔

چارلی چپلن: (ایک عظیم اداکار) کروڑوں دلوں پر راج کرنے والا۔ پوری دنیا جس کی تقلید کیا کرتی۔ لوگ اس سے والہانہ طور پر محبت کرتے تھے۔ اس کی نقالی پوری دنیا میں ہوتی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز اس کی مونچھیں۔ اس کی حرکات وسکنات دلوں پر نقش ہیں۔

چارلی چپلن نے ابتدا میں بہت برے دن دیکھے تھے۔ پھر اس کی صلاحیتوں اور قدرت کی فیاضیوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

ونسٹن چرچل (برطانوی وزیراعظم): چرچل صرف وزیراعظم ہی نہیں تھے بلکہ بہت بڑے ادیب اور دانش ور بھی تھے۔ ان کی بے ساختہ باتیں۔ ان کے پُرمعنی اور دل چسپ جملہ پورا ماحول تخلیق کر دیا کرتے۔ چرچل نے لٹریچر میں نوبیل پرائز بھی حاصل کیا تھا۔ چرچل کا شکار پوری دنیا میں مشہور ہے اور ایک علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ برطانیہ کو اپنے اس باکمال وزیراعظم پر فخر ہے اور فخر رہے گا۔

یہ چرچل ہی تھے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں کے باوجود برطانوی قوم میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کی۔

کرسٹوفر کولمبس: اب ذکر ہے ایک مہم جو کا۔ کولمبس نے اسپین کی ملکہ کے حکم پر بحری سفر اختیار کیا اور امریکا دریافت کرلیا۔ کولمبس کی اس دریافت نے ایک نئے امکانات کے دروازے کھول دیے۔ اسپین کی آبادیاں اس سرزمین میں قائم ہونے لگیں جو اس نے دریافت کی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب وہ اس عظیم کامیابی کے بعد واپس پہنچا تو تقریباً پورا شہر اس کے استقبال کے لیے بندرگاہ پر موجود تھا۔

میری کیوری (سائنس داں): وہ لوگ جو کسی بھی حوالے سے دکھی انسانیت کے لیے کام کر جائیں۔ لوگ ان کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور ان کی یادوں کو سینوں سے لگائے رکھتے ہیں۔

میری کیوری کا انسانیت کے لیے سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ اس نے ریڈیو ایکٹی ویٹی دریافت کی اور یہ عظیم دریافت کینسر کی تھراپی کے کام آتی ہے۔ میری کیوری نے دوبار نوبیل انعام حاصل کیا جو اپنی جگہ ایک ریکارڈ ہے۔

دلائی لامہ (بدھوں کا مذہبی پیشوا): کروڑوں لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔ اس سے پیار کرتے ہیں۔ دلائی لامہ کو ایک خاص قسم کا تقدس حاصل ہے۔

دلائی لامہ تبت کے بودھوں کے عظیم پیشوا ہیں۔ چینیوں کی لشکر کشی کے بعد انہوں نے تبت میں جا کر پناہ لی تھی۔

یہ وہ شخص ہیں جن کی ذات کے گرد تقدس کا ایک ہالہ سا رہا ہے۔ ان کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ پر عمل کرنا لاکھوں کروڑوں لوگوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ اس لیے بہت زیادہ چاہے جانے والوں کی فہرست میں دلائی لامہ کا نام بھی آتا ہے۔

لیونارڈو ڈاونچی: انجینئر، مجسمہ ساز، مصور اور نہ جانے کیا کیا۔ انسانی تاریخ میں اس شخص کو اس کے بے مثال آرٹ کی وجہ سے ہمیشہ پسند کیا گیا۔ اس سے محبت کی گئی۔

لیونارڈو ونچی نے پورے روم کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ بہت کم ایسے مصور ہوں گے جنہوں نے لوگوں سے اتنا پیار سمیٹا ہوگا۔ جتنا ونچی کے حصے میں آیا ہے۔ آرٹ سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس نام سے واقف ہے۔

پرنسز ڈیانا: کروڑوں دلوں پر راج کرنے والی شہزادی۔ بلا کی خوب صورت، فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ

کر حصہ لینے والی۔ ایک بار اس سلسلے میں پاکستان بھی آچکی تھی۔

ڈیانا کو بلاشبہ دلوں کی دھڑکن کہا جاسکتا تھا۔ جب وہ ہنستی تو دوسروں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی اور جب وہ غم زدہ ہوتی تو پوری دنیا کا ماحول افسردہ دکھائی دینے لگتا۔

اس نے شہزادہ چارلس سے شادی کی تھی لیکن وہ شادی چل نہیں سکی۔ اس کے باوجود ڈیانا کی محبت لوگوں کے دلوں سے کم نہیں ہوئی۔ ایک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے جنازے میں لندن والوں کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے پوری دنیا کے لوگ ٹی وی اسکرین کے حوالے سے شریک تھے۔ ایسی کون سی آنکھ تھی جو اس کی موت پر نم نہ ہو۔

چارلس ڈکنز: ہر عہد کا بے مثال برطانوی ناول نگار۔ ڈکنز کو اس کی زندگی میں بھی مقبولیت حاصل تھی اور اس کی موت کے بعد بھی اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ یہاں میں پھر یہ واضح کردوں کہ مقبولیت اور شہرت دو مختلف چیزیں ہیں۔ کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو مشہور بھی ہوں اور مقبول بھی۔ ڈکنز کا شمار بھی ایسے ہی ادیبوں میں ہوتا ہے۔

والٹ ڈزنی: بے انتہا پسندیدہ، بچوں اور بڑوں دونوں میں مقبول۔ والٹ ڈزنی کو پوری دنیا کے بچوں کا دوست کہا جاتا ہے۔ اس کے تخلیق کردہ کارٹون کیریکٹر دنیا بھر کے بچوں کے دل بہلاتے رہتے ہیں۔

دنیا میں ایسا کون سا گھر ہے یا ایسا کون سا شخص ہے جو والٹ ڈزنی کو نہ جانتا ہو یا اس کے کارٹون کیریکٹرز سے واقف نہ ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے ڈزنی لینڈ بنا کر پوری دنیا کو ایک بے مثال تحفہ دے دیا ہے۔ والٹ ڈزنی پوری دنیا کے پسندیدہ ترین انسانوں کی فہرست میں ایک نمایاں مقام پر ہے۔

تھامس ایڈیسن: ایک سائنس داں۔ ایک مؤجد۔ یہاں پھر وہی تھیوری سامنے آتی ہے کہ لوگ اس کو یاد رکھتے ہیں جس نے ان کی زندگی میں آسانیاں پیدا کی ہوں یا ان کے دکھ بانٹے ہوں۔

ایڈیسن نے ویسے تو درجنوں ایجادات کیں لیکن اس کی ایک ایجاد نے پوری دنیا کو فائدہ پہنچایا ہے اور وہ ایجاد ہے بلب۔

دنیا کے تقریباً ہر گھر میں روشنی بکھیرنے والا بلب۔ کون ہے جو ایڈیسن کی اس ایجاد سے فائدہ نہ اٹھاتا ہو یا اسے استعمال نہ کرتا ہو۔ اس لیے اس موجود سے پیار کیا جاتا ہے اور اس کا نام پیار سے لیا جاتا ہے۔

آئن اسٹائن: جدید سائنس کا بابا۔ ایٹم بم کا نظریہ پیش کرنے والا۔ سائنس داں کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا دانش ور۔ یہ وہ شخص ہے جس کو مثال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں ذہانت کی بات ہوتی ہے وہاں سب سے پہلے آئن اسٹائن کا نام آتا ہے۔ اس کے اپنے زمانے میں بچے جوان سب اسے پسند کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آئن اسٹائن سائنس دانوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ سائنس داں تھا تو غلط نہیں ہوگا۔ اس کو سراہنے والے ہر دور میں تھے اور آج بھی ہیں۔

کلارک گیبل: ایک بہت بڑا اور مقبول اداکار۔ اس نے فلم ”گون ود دی ونڈ“ میں اپنی تاثراتی اور رومانوی اداکاری سے دلوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ ہالی ووڈ کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ وہ دلوں پر راج کرنے والا اداکار تھا۔ اس کے پرستار اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب رہتے تھے۔

راک ہڈسن (اداکار): یہ بھی ایک کمال کا اداکار تھا۔ ایک بار پھر میں واضح کرتا چلوں کہ اس مضمون میں صرف شہرت کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ مقبولیت پہلی شرط ہے۔ یعنی وہ کون ہے جس نے اپنے انداز اور اپنی عادتوں کی وجہ سے دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ راک ہڈسن بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس کی موت ایڈز میں مبتلا ہو کر ہوئی تھی۔

مارلن منرو: یہ اپنے عہد کی خوب صورت اداکارہ سمجھی جاتی رہی ہے۔ بہت جلدی انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی موت خودکشی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ شاید اس کی بے وقت اور الم ناک موت نے اسے مقبولیت کی انتہا پر پہنچا دیا۔ مارلن منرو کو آج بھی ایک سیمبل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک تصویر شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ شائع ہونے والی تصویروں میں سے ایک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے امریکی صدر کینیڈی کے ساتھ اس کا افیئر چل رہا تھا۔ بہرحال یہ وہ اداکارہ ہے جس نے افسانوی شہرت حاصل کرلی تھی۔

بروس لی: اب ایک اور ایسے اداکار کا ذکر جو بہت

جلدی مر گیا۔ صرف بتیس سال کی عمر میں اور دنیا بھر میں اپنے کروڑوں مداحوں کو سوگوار چھوڑ گیا۔ صرف ایک اداکار ہی وہ نہیں بلکہ مارشل آرٹ چیمپئن بھی تھا۔ اس نے بہت کم فلموں میں کام کیا لیکن اس کی ہر فلم کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ملی۔ امریکا کے علاوہ پوری دنیا میں اس کے چاہنے والے موجود تھے اور آج بھی اس کا نام پیار سے لیا جاتا ہے۔

اور اب ذکر ہے دو ایسی شخصیات کا جن کا شعبہ گلوکاری اور اداکاری تھا لیکن پوری دنیا میں ان کے چاہنے والے جنون کی حد تک ان سے محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک تھا ایلوس پریسلے اور دوسرا تھا مائیکل جیکسن۔

ایلوس پریسلے: اس گلوکار اور اداکار نے اتنی محبت پائی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر خواتین اس کے لیے پاگل رہتی تھیں۔ اس کا ایک واقعہ بہت دل چسپ ہے۔ وہ ایک بار اپنی سفید کار ایک اسٹور کے سامنے کھڑی کر کے اندر اسٹور میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب واپس آیا تو گاڑی کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ لڑکیوں نے اس کی گاڑی پہچان کر اس کو اتنے بوسے دیے تھے کہ لپ اسٹک کے نشانات سے گاڑی کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ ایسا تھا ایلوس پریسلے۔ راک اینڈ رول جیسے مشہور رقص کا بانی۔ اس کی شخصیت میں بھی بے پناہ جاذبیت تھی۔ وہ ایک خوب صورت انسان تھا۔ آج بھی پوری دنیا میں اس کے چاہنے والے موجود ہیں۔

مائیکل جیکسن: یہ وہ دوسرا گلوکار ہے جس نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کے کنسرٹ میں لڑکیاں اس کی آواز سن کر جنونی ہو جاتی تھیں۔ اس نے اپنی گلوکاری سے ایک مزاج متعین کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ وابستہ کہانیوں نے اسے ایک افسانوی شخصیت بنا دیا تھا۔ اس کے بارے میں جب بھی کوئی خبر شائع ہوتی تو پوری دنیا اس میں دل چسپی لیتی تھی۔ ایسی عالم گیر شہرت اور مقبولیت بھی بہت کم کے حصے میں آئی ہوگی۔

ڈاکٹر اسٹیفن ہاکنز (سائنس داں): اور اب وہ سائنس داں جو برسوں سے اپنے بستر پر مفلوج پڑا رہنے کے باوجود دلوں پر حکمراں رہا۔ لوگ اس سے والہانہ پیار کرتے ہیں کیوں کہ وہ دنیا کا ایک بڑا سائنس داں ہونے کے علاوہ عزم و ہمت کی ایک نادر مثال بھی ہے۔ وہ اپنے بستر پر معذور پڑا ہوا ہے لیکن اس کے ذہن کی برتری کو پوری دنیا تسلیم کرتی ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ آئن اسٹائن کے بعد وہ سب سے بڑا دماغ ہے۔ اسٹیفن ہاکنز کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہے۔ وہ ایک داستان ہے۔ ایک مثال ہے۔

جان ایف کینیڈی: امریکی صدر تو آتے جاتے رہتے ہیں کیوں کہ ہر ایک کا ٹرن او ور ہوتا ہے۔ چار سال یا آٹھ سال لیکن کینیڈی جیسی مقبولیت اور پیار شاید ہی کسی امریکی صدر نے حاصل کی ہو۔

امریکا کے علاوہ پوری دنیا میں لوگ اس سے پیار کرتے تھے۔ ایک تو اس کی شخصیت ہی ایسی تھی پھر اس کی پالیسیوں نے بھی اسے ایسا ہی مقبول بنا دیا تھا۔

اس کے قتل کے بعد اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

جیکولین کینیڈی: کینیڈی کا ذکر ہو اور یہ ناممکن ہے کہ جیکولین کا نام نہ آئے۔

وہ امریکا کی محبوب ترین خاتون اوّل رہی ہے۔ اس کے تیکھے نقوش اور دل موہ لینے والی پرسنالٹی نے اسے پوری دنیا کی محبوب ترین خاتون بنا دیا تھا۔

کینیڈی کی موت کے بعد جب اس نے اوناسیس سے شادی کر لی تو لاکھوں کے دل ٹوٹ گئے۔ کیوں کہ یہ انسانی فطرت رہی ہے کہ انسان جس کو اپنے دل میں جگہ دے دیتا ہے اسے ہر حال میں بلند و بالا ہی دیکھنا چاہتا ہے۔

وہی حال ایران کی ملکہ فرح دیبا کا تھا۔

ایک عالم اس کے حسن اور اس کی اداؤں کا دیوانہ رہا ہے۔ وہ ایران کے بادشاہ رضا شاہ پہلوی کی بیوی تھی۔ کروڑوں دلوں میں بسا کرتی تھی۔

لیکن پرنسس ڈیانا سے زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔

ہیلن لیکر: کیا خاتون تھی۔ جس کی شخصیت سے پیار وابستہ تھا اور آج بھی ہے جب بھی عزم، ہمت اور مسلسل جدوجہد کی تاریخ لکھی جائے گی ہیلن لیکر کا نام ضرور آئے گا۔

نو ماہ کی عمر میں وہ اندھی اور گونگی ہو گئی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ زندگی سے ہار مان کر ایک طرف بیٹھ جاتی۔ لیکن اس نے اپنی کامرانیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اس نے بیچلر ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد خدمت خلق پر کمربستہ ہو گئی۔

اس نے خواتین اور غربت زدہ لوگوں کے لیے اچھے

کام کیے کہ آج پوری دنیا اس کا نام عزت، احترام اور پیار سے لیتی ہے۔

مہاتما گاندھی: ہندوستان کی جنگِ آزادی کے سب سے بڑے انسان۔ ہندوستان میں لوگ اس حد تک ان سے پیار کرتے ہیں کہ انہیں باپو کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

گاندھی جی کو مہاتما کہا جاتا ہے اور ہندوستانی روایت کے مطابق مہاتما کا لقب یوں ہی نہیں مل جاتا۔ ساری عمر کی جدوجہد اور تپسیا دیکھنی پڑتی ہے۔

مہاتما گاندھی نے اپنے لوگوں کا بے پناہ پیار حاصل کیا اور ہندوستان کی تاریخ میں جب کسی ایک شخصیت کا نام آتا ہے تو وہ ہیں مہاتما گاندھی۔

قائداعظم محمد علی جناح: ہم پاکستانیوں نے ان سے بہت پیار کیا۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ قائداعظم نے انگریزوں سے جنگ لڑ کر ہمیں ایک ملک دیا ہے اور دوسری وجہ ہے ان کا کردار۔

ان کے اصول، ان کی سچائی، ان کی دیانت داری اور ان کا وژن جو بدقسمتی سے ان کے بعد کسی اور کے نصیب میں نہ آسکا۔

اس لیے پورا پاکستان ان سے بے پناہ پیار بھی کرتا ہے اور ان کا احترام بھی کرتا ہے۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔

نیلسن منڈیلا: عہد حاضر کی ایک بہت بڑی شخصیت۔ جنوبی افریقا کا یہ لیڈر حق اور صداقت کی علامت بن کر سامنے آیا۔ اس نے اپنی بے مثال جدوجہد سے پوری دنیا کو اپنا گرویدہ کرلیا۔

تیس برسوں کی جیل کاٹی لیکن نسلیت کے خلاف اس کی آواز میں کہیں کمزوری نہیں ہوئی۔ 90ء میں رہائی ملی۔ 1994ء میں حکومت میں آئے لیکن کچھ دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔

اور ایسے لوگ مرتے کہاں ہیں۔ نیلسن منڈیلا تو آج بھی زندہ ہیں۔

بل گیٹس: عہدِ حاضر کا ایک اور بڑا نام۔ مائیکروسوفٹ کے بانی۔ کئی برسوں تک دنیا کا امیر ترین انسان کا اعزاز۔ لوگوں نے بل گیٹس سے اس لیے محبت نہیں کی کہ وہ مائیکروسوفٹ کے بانی اور دنیا کے امیر ترین شخص ہیں بلکہ اس محبت کا سبب یہ ہے کہ بل گیٹس پوری دنیا میں اپنے فلاحی کاموں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ دنیا بھر میں جہاں انسان پریشانی میں ہو بل گیٹس کا ادارہ مدد کے لیے آجاتا ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا فلاحی ادارہ بل گیٹس ہی کا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ شخص تقریباً اپنی ساری دولت فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ اس کے بعد قدرت اسے پھر نواز دیتی ہے۔

اس شخص نے بھی دنیا بھر کے لوگوں کی دعائیں سمیٹی ہیں۔ یہ اسی کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

فلاحی کاموں کے حوالے سے ہمارے یہاں بھی ایک بہت بڑا نام ہے اور وہ ہے عبدالستار ایدھی کا۔

ایسا کون پاکستانی ہے جو ایدھی صاحب کے نام اور کارناموں سے واقف نہیں ہے۔ جہاں انسان تڑپ رہا ہو، کسی مصیبت میں مبتلا ہو، وہاں ایدھی اور ان کا عملہ سب سے پہلے پہنچ جاتا ہے۔

فلاحی خدمت کا ایسا کون سا شعبہ ہے جہاں ایدھی صاحب موجود نہ ہوں لوگ ان پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرتے ہیں۔

ایدھی صاحب نے جتنا پیار حاصل کیا ہے پاکستان میں شاید ہی اتنا پیار کسی اور کے حصے میں آیا ہوگا۔

خدمت خلق کے شعبے میں ایک اور بہت بڑا نام مدر ٹریسا کا ہے۔

انہوں نے زندگی غریبوں اور ناداروں کے لیے وقف کر دی۔ احترام اور پیار سے ان کو مدر کہا جاتا ہے۔

1997ء میں انتقال ہوا لیکن یہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگی ان کی موت سے مشروط نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہیں۔

یہ تو چند نام ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے بے شمار لوگ ہیں جو اس لیے زندہ ہیں کہ انہوں نے انسانیت کے لیے کام کیا۔

انسانوں کی فلاح کے لیے۔ انسانوں کی سوچ کے معیار کو بلند کرنے کے لیے۔ چاہے وہ ارسطو ہو یا ولیم شیکسپیئر۔

یہ انسانی تاریخ کے محبوب ترین افراد ہیں۔ اب کہاں تک ان کا ذکر کیا جائے۔ بس اتنا جان لیں کہ انسانی تاریخ نے جہاں ایک طرف قابلِ نفرت لوگ پیدا کیے ہیں وہیں دوسری طرف محبت اور احترام کے قابل لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔
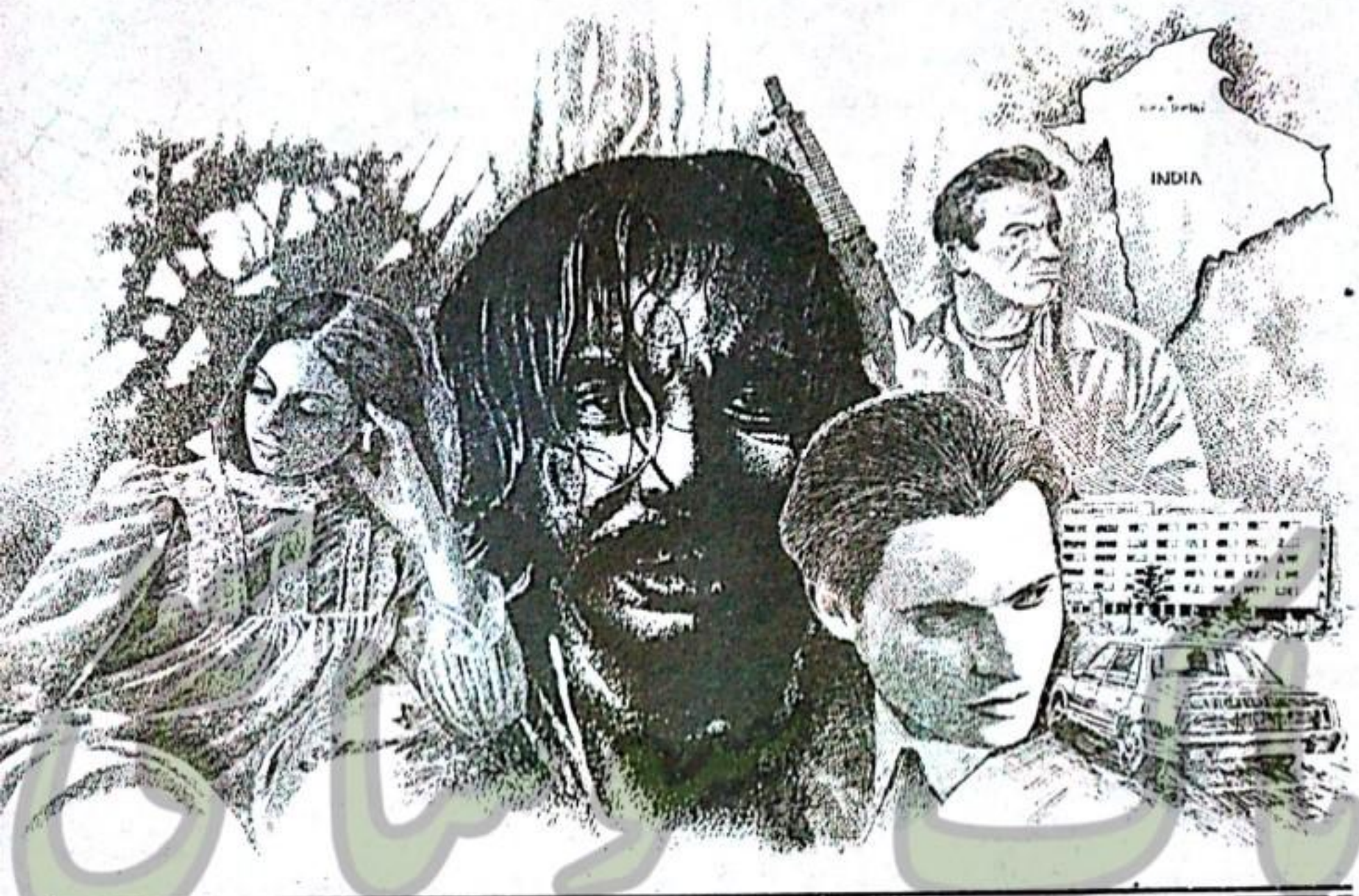
سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 99

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذھن ودل کو بھٹکاتا ھے، جذبوں کو مھمیز دیتا ھے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ھے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ھے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نھیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رھی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ھوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہروتھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "جسونت ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر....." مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چنا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنادیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ

مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا" پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم ...... چلے جا رہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ وہاں سے چلا تو صرف زیبی میرے ساتھ تھی۔ ہمیں بندر نما گوشت خور مخلوق نے گھیر لیا تھا۔ ان سے بچنے کے لیے ہم دوڑ رہے تھے کہ ایک کنواں نما غار میں جا گرے۔ اوپر سے وہ مخلوق پتھر برسانے لگی۔ ہم بچنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ مخلوق خود بھاگنے لگی۔ تبھی اوپر سے ایک برفانی آدمی نے نیچے دیکھا اور قلابازی کھاتا ہوا اندر کودا۔ تبھی اوپر سے راجا عمر دراز کے آدمی نے رسی پھینکی اور کنویں سے نکل کر اس کے ساتھ عمر دراز کے پاس پہنچے پھر انہی کے ساتھ ایک نئی منزل کی طرف چل پڑے۔ اس سرنگ میں اترے جو وادی تک جاتی تھی۔ میں اکیلا ہو چکا تھا کہ برف والے سے ملاقات ہو گئی برف والے میں کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔

(اب آگے پڑھیں)

صرف رائفل ہی نہیں بلکہ میری جیکٹ اور اس میں موجود تمام چیزیں غائب تھیں۔ میں قطعی نہتا ہو گیا تھا۔ مجھے حرکت کرتا دیکھ کر دو سپاہیوں نے بہت تیزی سے تیر کمان نکال کر تیر مجھ پر تان لیے۔ سپاہیوں نے کھالوں اور فر سے بنے ہوئے مخصوص لباس پہن رکھے تھے۔ ان کے سینوں اور بازوؤں پر کسی لکڑی سے بنے ہوئے حفاظتی خول تھے اور پیروں میں تسموں والے چمڑے کے جوتے تھے۔ سروں پر لکڑی سے بنے ہوئے خول پہنے ہوئے تھے۔ ان کے نیزوں کی انی اور ترکش میں نظر آنے والے تیروں کی نوک کسی معمولی درجے کی دھات کی بنی ہوئی تھی۔ راجا عمر دراز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سوائے سونے اور چاندی کے کسی دھات سے ناواقف تھے۔ میں نے ہاتھ اوپر کیے اور بولا۔ "مجھے کیوں پکڑ رہے ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے۔" بولنے والے سپاہی نے حیرت سے کہا۔ "یہ ہماری زبان نہیں ہے۔"

"یہ باہر سے آیا ہے جناب۔" دوسرے نے ادب سے کہا۔ "اسی لیے ہمیں حکم ملا ہے کہ اسے گرفتار کر کے لے آئیں۔"

عجیب بات تھی وہ لوگ اردو بول رہے تھے اگرچہ لہجہ مختلف تھا مگر زبان اردو ہی تھی اور میں نے ان سے اردو میں ہی پوچھا تھا مگر وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ میں اس بات پر بھی چونکا تھا کہ انہیں میری گرفتاری کا حکم دیا گیا تھا اور وہ لوگ میری آمد سے واقف تھے۔ یہ تو طے تھا کہ وہ نیچے سے آئے تھے۔ البتہ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ریناٹ کے آدمی تھے یا سامیرا کی طرف بھیجے گئے تھے۔ مزید تعجب اس بات پر تھا کہ

وہ اردو بول رہے تھے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی اردو بولنے والا ملے گا مگر پہلے برف والا اور اب یہ سپاہی بھی اردو بول رہے تھے۔ میں نے پھر کہا۔ "میں اردو میں بات کر رہا ہوں تم لوگ سمجھ نہیں رہے ہو؟"

مگر اس بار انہوں نے میری بات پر توجہ نہیں دی اور ان میں سے دو نیزہ بردار آگے آئے۔ ان کا انداز جارحانہ نہیں تھا مگر وہ محتاط اور پوری طرح چوکس ضرور تھے۔ میں کنارے کی طرف تھا اور کسی قسم کی مزاحمت کی صورت میں میرے مارے جانے کے امکانات خاصے زیادہ تھے۔ چاہے وہ ان کے ہاتھوں ہوتے یا نیچے گرنے کی صورت میں ہوتے۔ نہ جانے برف والے نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا اور پھر وہ مجھے بے یارومددگار یہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے یقیناً کسی مقصد کے تحت ایسا کیا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا اور مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے اور کھڑا ہو گیا۔ یہ ہتھیار ڈالنے اور تابع ہونے کا یونیورسل اشارہ ہے جو یہ بھی سمجھ گئے۔ آگے والے دو حصوں میں بٹ گئے تھے اور انہوں نے مجھے گویا نیچے جانے کا راستہ دیا۔ میں آگے بڑھا تو وہ دونوں میرے پیچھے آ گئے اور دو میرے دائیں بائیں۔ دو آگے بھی تھے۔ پہلے بولنے والا جو سربراہ بھی لگ رہا تھا اس نے کہا۔ "ہوشیار رہنا اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ خطرناک آدمی ہے۔"

جب وہ بول رہا تھا تو میری نظر اس کے ہونٹوں پر مرکوز تھی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ ہونٹ اور منہ مختلف انداز میں ہلا رہا ہے اور مجھے سنائی دوسرے انداز میں دے

رہا ہے۔ میں حیران ہوا تھا کہ یہ کیا حیرت انگیز بات ہے۔ کیا وہ اپنی زبان میں بات کر رہا تھا اور مجھے سنائی اردو میں دے رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ میری بات نہیں سمجھ پا رہے تھے کیونکہ میں اردو میں بول رہا تھا۔ دوسرے سپاہی نے کہا۔ ”ہمیں جلد نیچے چلنا چاہیے تاکہ ہم رات سے پہلے آرگون پہنچ جائیں۔“

اس بار مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بول کچھ رہا تھا مگر اس کی بات مجھے اردو میں سنائی دے رہی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ سوچتے ہوئے میرا ہاتھ بے ساختہ کن پٹی کی طرف گیا جہاں برف والے نے انگوٹھے سے دبایا تھا اور مجھے لگا کہ میرے سر میں کوئی دھماکا ہوا ہو۔ کیا اس نے میرے ساتھ کچھ کیا تھا؟ اس نے انگوٹھے سے ضرب لگا کر میرے دماغ کی کسی خفیہ صلاحیت کو بیدار کر دیا تھا جس کی وجہ سے میں ان لوگوں کی زبان سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ برف والا بھی ہونٹوں کو مختلف انداز میں حرکت دیتا اور مجھے سنائی اردو میں دیتا تھا۔ کیا یہ ٹیلی پیتھی کی کوئی قسم تھی جس میں انسان اپنے خیالات دوسرے تک پہنچاتا ہے۔ جب تک وہ میرے ساتھ تھا اپنی صلاحیت کی وجہ سے میری بات سمجھ رہا تھا اور مجھے اپنی بات سمجھا رہا تھا۔ مگر میں اس سے جدا ہونے والا تھا اور اب مجھے دوسروں کو اپنی بات سمجھانی تھی اور اس سے زیادہ مجھے دوسروں کی بات سمجھنی تھی۔

جب میں نے برف والے سے کہا تھا کہ میں وادی والوں کی زبان نہیں سمجھتا ہوں تو اس نے مجھے فکر نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد اس نے میرے سر کے ساتھ کچھ کیا تھا جس کے اثر سے میں بے ہوش ہوا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد یہ حیرت انگیز بات سامنے آئی کہ میں وادی والوں کی بات سمجھ رہا تھا۔ البتہ وہ میری بات سمجھنے سے قاصر تھے۔ سربراہ نے مجھے اشارے سے نیچے اترنے کو کہا۔ اس کے خیال میں، میں بھی اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے وہ اشاروں کی زبان میں کام چلا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر میں ان کی زبان سمجھ رہا تھا تو مجھے یہ بات جتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ان کا قیدی بن گیا تھا اور ان کی گفتگو سے آگاہی مجھے فائدہ پہنچا سکتی تھی۔ اس لیے اب میں نے بھی یہی ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا کہ میں ان کی بات سمجھ نہیں رہا ہوں۔ ہم نیچے اتر رہے تھے اور شام قریب تھی۔ اور پردھند کی وجہ سے سورج کی پوزیشن واضح نہیں تھی مگر روشنی میں کمی آ رہی تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ ہم کوئی دو یا ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ جیسے جیسے نیچے جا رہے تھے موسم معتدل ہو رہا تھا اور سردی کا احساس تو اس بلندی پر بھی کم تھا جہاں برف والے کا ڈیرہ تھا مگر اب یہ احساس نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ گرم اونی پینٹ اور گرم ہائی نیک میں مجھے الجھن ہو رہی تھی اور عین ممکن تھا کہ نیچے جاتے جاتے مجھے گرمی لگنے لگتی۔ مجھے برف والے کی گفتگو یاد تھی اس نے کہا تھا کہ وہ وادی میں ہونے والے تنازعے میں میرا کردار چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ میں فریقین میں صلح کرا کے اس وادی کی حکمرانی سنبھال لوں۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ جس وادی کے لوگ اس حد تک نسل پرست تھے کہ باہر سے آنے والے کسی فرد کو وادی میں برداشت نہیں کر سکتے تھے اور اگر کوئی آ جاتا تو اسے ثابت کرنا پڑتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر نہیں آیا بلکہ غلطی سے آیا ہے ورنہ دوسری صورت میں اسے سزائے موت دی جاتی تھی۔ وہ لوگ باہر سے آنے والے ایک فرد کو کس طرح اپنا حکمران تسلیم کر سکتے تھے۔

میں گرفتار ہو کر نیچے جا رہا تھا اور یہ یقیناً میری تاج پوشی کے لیے نہیں لے جا رہے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ برف والے نے مستقبل کی کسی پلاننگ یا اپنے کسی خیال کے تحت مجھے نیچے والوں کے حوالے کیا تھا۔ لیکن لازمی نہیں تھا کہ اس کی پلاننگ درست ثابت ہوتی یا اس نے جو سوچا ہو وہی ہو۔ اگر مجھے دشمن تصور کر لیا جاتا تو میرے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ شاید مجھے فوری جلاد کے حوالے کر دیا جاتا۔ اب تک یہ بھی واضح نہیں تھا کہ مجھے نیچے لے جانے والے کون تھے۔ ریناٹ یا اس کے مخالف جو سامیرا کی قیادت میں اس سے لڑ رہے تھے۔ میں نے پہلے ان سپاہیوں سے عندیہ لینے کا سوچا مگر یہ مجھے مناسب نہیں لگا اور یہ مجھے نیچے لے جا رہے تھے۔ کچھ دیر میں واضح ہو جاتا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

برف والے کے بارے میں جتنا سنا اور جانا اور پھر دیکھا تھا۔ وہ ایک پُراسرار اور ماورائی قوتوں والا شخص نظر آیا تھا۔ اس نے اس برف زار میں ایک ایسا طلسم خانہ بنا رکھا تھا جس کی بیشتر چیزیں عقل کو چکرا دینے والی تھیں۔ اس کے اندر خفیہ صلاحیتیں موجود تھیں اور وہ مستقبل کے بارے میں پیش گوئی بھی کرتا تھا مگر میری عقل کا اصرار تھا کہ میں اس کی بات آنکھ بند کر کے ماننے سے گریز کروں، اگرچہ دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اس سے الجھنا نہیں چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی مخالفت نہ کرنی پڑے۔ یہاں آتے ہی میں جیسے اچانک سب سے کٹ گیا تھا۔ راجا عمر دراز کے علاوہ

میرے تمام ساتھی مارے جا چکے تھے اور اب راجا عمر دراز بھی غائب تھا۔ مگر اوشا مل گئی اور وہ صحیح سلامت بھی تھی۔ البتہ وہ ابھی بحالی کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ برف والے نے کہا تھا کہ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا انحصار برف والے پر تھا۔

ہم ایک ٹیڑھی میڑھی اور بہت تنگ پگ ڈنڈی پر سفر کر رہے تھے جو وادی کی دیواروں سے چمٹی ہوئی نیچے تک جا رہی تھی۔ اس پر سنبھل کر قدم رکھنا پڑتے تھے۔ کسی زمانے میں اس پر قدمچے بنائے گئے ہوں مگر وقت کے دھارے نے انہیں گھس کر سیدھا کر دیا تھا۔ بہت سی جگہوں پر دیوار اور چٹان گرنے سے راستہ بہت ہی تنگ اور خطرناک ہو گیا تھا۔ شاید اس کی مرمت نہیں کی گئی تھی اور یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ اتنے طویل راستے کو بلاوجہ مرمت کرنا بہت ہی مشکل کام تھا بلکہ وادی کے حکمران اور کرتا دھرتا چاہتے ہوں گے کہ یہ راستہ بھی باقی نہ رہے تاکہ نہ کوئی باہر سے یہاں آسکے اور نہ یہاں سے کوئی باہر جا سکے۔ راستہ جس طرح ختم ہو رہا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ جلد ان کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ مگر وہ باہر والوں کو نہیں جانتے تھے۔ ان کو وادی میں آنے کے لیے ان خطرناک راستوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ چاہتے تو بہت آرام سے اندر اتر جاتے اور آسانی سے اس وادی پر قابض ہو جاتے۔

جیسے جیسے ہم نیچے جا رہے تھے موسم گرم ہوتا جا رہا تھا۔ اوپر چھائی دھند اب اتنی اوپر رہ گئی تھی کہ نیچے سے گھنے بادل جیسی لگ رہی تھی۔ بلندی سے نیچے آنے کے بعد وادی کی دیواریں اب اوپر دکھائی دے رہی تھیں اور مختلف جگہوں سے آبشار کسی دھندلے سفوف کی طرح نیچے گر رہی تھیں۔ اتنے فاصلے سے پانی کی بجائے یہ بس سفید دھند جیسی لگ رہی تھیں۔ شاید اسی پانی سے وادی کی پانی کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ کیونکہ اوپر سے پوری وادی میں نہ تو کوئی دریا دکھائی دیا تھا اور نہ ہی پانی کا کوئی بڑا ذخیرہ تھا۔ چند ایک جگہوں پر نیلا رنگ تھا جو چھوٹے تالابوں یا چشموں کی نشان دہی کر رہا تھا اور یہ پانی ضرورت کے لیے ناکافی ہے۔ بارش اور اوپر سے آنے والی آبشاروں کا پانی ہی وادی کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ سردیوں میں جو برف گرتی ہے اس کا پانی پگھلنے کے بعد زمین میں جذب ہو جاتا ہوگا۔ وہ بھی کام آتا ہوگا۔

راجا عمر دراز بھی میرے لیے ہر چیز لایا تھا سوائے گھڑی کے، اس لیے میں درست اندازہ نہیں لگا سکتا تھا مگر خیال تھا کہ ہمیں نیچے پہنچنے میں کوئی دو گھنٹے لگے تھے۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی اور ماحول نیم تاریک ہو رہا تھا۔ ہم بھول بھلیوں جیسی جگہ نکلے جو چٹانیں ٹوٹنے سے وجود میں آئی تھیں۔ راجا عمر دراز نے اپنے سفرنامے میں ان کا ذکر بھی کیا تھا جب واپسی کے وقت یہاں اسے ایک ہارن نے گھیر لیا تھا۔ ہارن کا خیال آتے ہی میرے اندر پھریری سی آ گئی۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہاں کوئی ہارن آ گیا تو یہ نصف درجن سپاہی ان قدیم ہتھیاروں سے اپنا اور میرا دفاع کیسے کریں گے؟ مگر جب چٹانوں سے نکل کر کھلی جگہ آئے تو وہاں مزید کوئی دو درجن مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ ہمارا منتظر تھا اور وہ بھاری کمانوں اور تیروں سے مسلح تھے۔ ان کے تیر دیکھ کر لگ رہا تھا کہ یہ ہارن جیسے بڑے اور خطرناک جانور کے بنائے گئے ہیں۔ وہ پوری تیاری سے آئے تھے۔ میں ایک بار پھر فکرمند ہو گیا کہ نیچے والوں کو میری آمد کی اطلاع کیسے ہوئی؟

ہارن تو نہیں ایک اور جانور سے سامنا ہوا۔ ہم کچھ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ جنگل سے ایک عجیب الخلقت جانور نکلا۔ وہ بھالو سے مشابہہ تھا اور بہت مشکل سے چل رہا تھا۔ اس کے چلنے سے ہڈیاں چٹخنے جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اپنی سست چال اور ڈھیلے پن سے وہ ایسا جانور لگ رہا تھا جس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر ہم پر پڑی وہ ناقابلِ یقین تیزی سے ہماری طرف لپکا چند سپاہی آگے آئے اور انہوں نے کمانوں پر چڑھے تیر کھینچ لیے۔ وہ منتظر تھے کہ جانور موزوں حد میں آئے تو وہ اس پر اپنے تیر آزمائیں مگر ہوشیار جانور اس سے پہلے رک گیا۔ چند لمحے وہ رک کر کسمساتا اور پھر رخ بدل کر دوبارہ جنگل کی طرف جانے لگا۔ مگر وہ اسی طرح بہ مشکل اور چٹختی آوازیں نکالتا ہوا چل رہا تھا۔ مزید عجیب بات یہ تھی کہ جب وہ بہت تیزی سے لپکا تھا تو اس کے جسم سے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ تیر کھینچے سپاہیوں نے چلے واپس ڈھیلے کر دیے اور ان میں سے ایک نے کہا۔ ”کاش گونر ذرا آگے آتا بہت دن ہوئے اس کا گوشت کھائے ہوئے۔“

مجھے یاد آیا کہ راجا صاحب نے اس جانور گونر کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے ہارن کے ساتھ ایک اور جانور کا ذکر کیا تھا جو گونر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا مگر کچھ دیر بعد نہ صرف اس کی بلکہ ہارن کی زیارت بھی ہو گئی۔ مگر ہارن مردہ حالت میں تھا اور بھیڑیئے سے مشابہہ لیکن اس سے خاصے بڑے یہ جانور اس

کی لاش پر پلے پڑ رہے تھے۔ وہ اس کا بہت سا حصہ کھا چکے تھے اور ہم ان سے خاصے دور تھے اس لیے میں ہارن کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا۔ البتہ بھیڑیے نما جانوروں کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا کیونکہ ہمیں دیکھتے ہی وہ دوڑے دوڑے آئے۔ البتہ جب سپاہیوں نے ان پر تیروں کی بوچھاڑ کی اور ان میں سے ایک تیر کھا کر گرا اور باقی معمولی زخمی ہوئے۔ تب وہ پلٹ کر بھاگے اور واپس جاتے ہی ہارن کی لاش پر پل پڑے جو یقیناً ان کے کئی وقت کے کھانے کے لیے کافی تھا۔

کچھ دیر بعد بہ ظاہر مردہ ہو کر گرنے والا جانور بھی اٹھ کر بھاگا اسے دو تیر لگے تھے مگر یہ جان لیوا نہیں تھے، وہ بھی جاتے ہی دعوت میں شامل ہو گیا۔ نہ جانے یہ ہارن انہوں نے مار گرایا تھا یا پھر کسی وجہ سے مر گیا تھا اور ان کی ضیافت ہو گئی تھی۔ ممکن ہے ان کے پاس کھانے کے لیے ہارن نہ ہوتا تو شاید وہ اتنی آسانی سے ہماری جان نہ چھوڑتے۔ گونر کے مقابلے میں اس جانور سے سپاہی خوفزدہ ہو گئے تھے اور انہوں نے تیر اندازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ان کے قریب آنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ جب وہ پسپا ہوئے تو ایک سپاہی نے پسینا پونچھتے ہوئے گونر کا گوشت کھانے والے شوقین سپاہی سے کہا۔ ”ممکن ہے اسمار نے بھی بہت دنوں سے انسان کا گوشت نہیں کھایا ہو۔“

راجا عمر دراز نے اس جانور کا یہی نام بتایا تھا۔ جب تک میں وادی کو اوپر سے دیکھتا رہا یہ مجھے اتنی بڑی اور وسیع نظر نہیں آئی تھی مگر جب میں اس میں اترا اور سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے اس کی وسعت اور کشادگی کا احساس ہوا۔ نیچے آنے کے بعد اس کا مخالف سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم شہر سے کچھ ہی دور تھے۔ اب اس کی دیواریں اور ان پر بنے ہوئے نگرانی کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔ راجا عمر دراز نے مجھے اس کا نام شاید آرگون بتایا تھا مگر مجھے پکا علم نہیں تھا اس لیے میں نے شہر کی طرف اشارہ کیا اور نزدیک چلنے والے سپاہی سے کہا۔ ”آرگون؟“

”آرگون۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ میرے سوالیہ انداز سے سمجھ گیا تھا۔ سپاہی مجھے گرفتار کر کے لے جا رہے تھے مگر ان کا رویہ ہتک آمیز اور خراب نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے گھیرا ہوا ضرور تھا مگر نہ تو دھکے دیئے تھے اور نہ ہی گالیوں سے نوازا تھا۔ حد یہ کہ تاریکی ہونے کے باوجود تیز چلنے کو نہیں کہا تھا۔ جنگل سے آگے آنے کے بعد اب ہم کھیتوں اور باغات سے گزر رہے تھے۔ یہاں وادی میں بسنے والے کام کرتے تھے اور ان کی حفاظت کے لیے مسلح دستے تھے۔

یہ جگہ جنگل سے زیادہ دور نہیں تھی اور اس کا خطرہ تھا کہ جنگل سے ہارن، اسمار یا گونر انسانوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ ان سے حفاظت کے لیے مسلح سپاہی لازمی تھے۔ بیشتر کام کرنے والے جا چکے تھے اور کچھ جا رہے تھے۔ جیسے ہی ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر پڑتی وہ رک جاتا اور جب ہم آگے نکلتے تو وہ پیچھے آتا تھا۔ شاید میرے لباس سے ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ میں باہر سے آیا ہوں۔

اب راستے میں جو ملتا وہ ہمارے پیچھے چل پڑتا اور جب تک ہم قلعے کے پاس پہنچے کوئی دو ڈھائی سو افراد ہمارے پیچھے ہجوم کی صورت میں جمع ہو چکے تھے۔ قلعے کی فصیل پر ہر دس فٹ کے بعد ایک مشعل روشن تھی۔ جب کہ گیٹ کے آس پاس اس سے کہیں زیادہ روشنی تھی۔ یہاں فصیل پر بھاری منجنیق کمانیں نصب تھیں جن سے تیر بہت قوت کے ساتھ اور دور تک پھینکے جا سکتے تھے۔ ان کے تیر بھی خاصے بھاری تھے۔ کچھ دیر میں ہم قلعے کے بڑے گیٹ کے سامنے تھے۔ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا یہ بھاری گیٹ پہیوں پر چلتا تھا ورنہ اس کا بوجھ صرف قبضے نہیں اٹھا سکتے تھے۔ پہیے برقرار رکھنے کے لیے زمین پر پتھر کا فرش ڈالا گیا تھا۔ گیٹ کا چھوٹا حصہ کھلا ہوا تھا جس سے لوگ اندر داخل ہو رہے تھے۔ ہم بھی اسی دروازے سے اندر آئے۔ اندر آتے ہی جنگل کے پاس انتظار کرنے والا حفاظتی دستہ ہم سے الگ ہو گیا اور ایک طرف موجود بیرک نما عمارت کی طرف چلا گیا۔ میں ان ہی نصف درجن سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔

فصیل اور شہر کے درمیان ایک بڑا میدان تھا اور اس کے بعد شہر کا آغاز ہو گیا۔ شہر کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے میں نے اسے ویسا ہی پایا جیسا راجا عمر دراز نے بیان کیا تھا۔ صاف ستھرا اور منظم انداز میں آباد اس شہر میں مکان چھوٹے بڑے ضرور تھے لیکن سب مضبوط اور صفائی سے بنے ہوئے تھے۔ بیشتر مکان اور عمارتیں پکی اینٹوں سے بنی تھیں۔ البتہ محلات اور سرکاری و شاہی عمارات پتھروں سے بنی تھیں۔ اسی طرح لوگوں کا لباس ایک جیسا تھا سب نے لمبے سے کرتے نما لباس پہن رکھے تھے جن کی کمروں پر پٹکا باندھ کر ان کا ڈھیلا پن قابو میں کیا تھا۔ لباس بنا بھی ایک جیسے میٹریل سے تھا یعنی اظہار امارت کا ذریعہ لباس نہیں تھا۔ اسی طرح سب پیدل چل رہے تھے اور کسی کے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ بیل گاڑیاں تھیں جن میں گائے سے ملتا جلتا جانور استعمال کیا جاتا تھا مگر وہ صرف بار برداری کے لیے مخصوص

تھیں۔ شہر میں روشنی کے لیے جگہ جگہ لکڑی کے کھمبوں پر مشعلیں روشن تھیں۔ کسی خاص روغن سے جلنے والی ان مشعلوں کی روشنی خاصی تیز تھی۔

شہر منظم انداز میں بسایا ہوا تھا۔ سڑکیں اور گلیاں صاف ستھری اور پختہ تھیں۔ یہاں سیوریج کا نظام یقیناً زیر زمین تھا کیونکہ مجھے کہیں بھی پانی بہتا نظر نہیں آیا۔ پہلے غریب طبقے کی آبادی تھی۔ اس کے بعد متوسط طبقے کی آبادی آئی اور آخر میں طبقہ امرا کے محلات شروع ہو گئے۔ اگرچہ یہ ہمارے معیار سے خاص بڑے نہیں تھے مگر اس وادی کے لحاظ سے یقیناً خاصے بڑے تھے۔ امرا کے محلات کے بعد شاہی محل اور اس سے ملحق دفاتر کا سلسلہ شروع ہوا۔ شہر کی تمام اہم سرکاری عمارات اور ادارے اسی علاقے میں تھے۔ لوگوں کا جو ہجوم شہر کے باہر سے ساتھ آیا تھا اب تک ہمارے پیچھے تھا۔ جب ہم سرکاری وشاہی علاقے میں داخل ہوئے تو یہاں کسی قدر مختلف وردیوں میں شاہی محافظ تعینات تھے۔ انہوں نے عام لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ شاید یہاں بلا اجازت کسی کو آنے نہیں دیا جاتا تھا، جیسا کہ ساری دنیا میں رواج ہے۔

میرا خیال تھا کہ مجھے رینانٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ شہر میں آمد سے ہی ثابت ہو گیا تھا کہ میں رینانٹ کا قیدی بن گیا ہوں۔ برف والے کی باتوں سے مجھے لگا تھا کہ اسے رینانٹ اور سامیرا کی لڑائی سے زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ وادی کا نظام برقرار رہے۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر لڑائی ہوئی تو وادی تباہ ہو جائے گی۔ رینانٹ تک کسی طرح ہماری آمد کی اطلاع پہنچی تھی اور اس نے اپنے آدمی روانہ کیے تھے۔ وہ اوپر سے آنے والوں کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہو گا اسی لیے میرا خیال تھا کہ مجھے رینانٹ کے حضور پیش کیا جائے گا مگر اس کی بجائے مجھے ایک عمارت میں لایا گیا جو اپنے انداز سے ہی قید خانہ لگ رہی تھی اور یہاں مجھے عمارت کے منتظم کے حوالے کر دیا گیا۔ دستے کے سربراہ نے کہا۔ ”یہ اس وقت تک آپ کے پاس ہے جب تک اسے طلب نہ کیا جائے۔“

منتظم ایک جوان آدمی تھا۔ لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم کا مالک۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”یہ کون ہے اور اسے کیوں پکڑا ہے؟“

”یہ اوپر سے آیا ہے، آج ہمیں شاہی دفتر سے حکم ملا کہ اوپر جائیں اور وہاں جو ملے اسے گرفتار کر کے نیچے لے آئیں اور قید کر دیں۔ اسے یہاں چھوڑ کر پھر میں شاہی دفتر میں اطلاع کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، اس کا کوئی سامان ہے؟“

”اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔“

منتظم نے میرا جائزہ لیا۔ ”اس نے عجیب طرح کا لباس پہنا ہوا ہے۔“

”اس وادی سے باہر سے آنے والے ایسا ہی لباس پہنتے ہیں جناب۔“ سربراہ نے جواب دیا۔ ”اب مجھے اجازت دیں۔“

منتظم نے سر ہلایا۔ مجھے لانے والے سپاہی چلے گئے اور منتظم نے تالی بجائی۔ فوراً ہی دو سپاہی اندر آئے اور منتظم نے میری طرف اشارہ کر کے انہیں حکم دیا۔ ”اسے بند کر دو۔ خیال رہے یہ شاہی قیدی ہے۔“

سپاہی مجھے عمارت کے ایک حصے میں لائے اور یہاں دو قطاروں میں بنے کمروں میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر داخل ہوا تو عقب میں دروازہ بند ہو گیا۔ منتظم نے مجھے شاہی قیدی قرار دیا تھا اس لیے مجھے شاید یہاں کا سب سے اچھا کمرا دیا گیا تھا۔ اس میں ایک عدد لکڑی کا بستر بھی تھا۔ لکڑی کی بنی ایک چھوٹی سی میز پر مٹی کا بنا ہوا جگ اور مٹی کا ہی گلاس بھی تھا۔ اس میں پانی تھا اور میں نے ایک گلاس پانی پیا۔ اتنے طویل سفر کے بعد بھوک لگنا لازمی تھی مگر یہاں فی الحال کھانے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ نیچے آتے ہی مجھے گرمی لگنے لگی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس یہی کپڑے تھے اور انہیں اتار نہیں سکتا تھا۔ عقب میں روشن دان تھا اور اس سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا ورنہ شاید مجھے کپڑے اتارنے ہی پڑتے۔ بیڈ پر کسی قدر نرم گدا تھا۔ میں نے جوتے اتارے اور بستر پر لیٹ گیا۔

بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ برف والے نے مجھے دھوکا دیا اور نہتا کر کے رینانٹ کے حوالے کر دیا جسے خود اس نے سفاک حکمران قرار دیا تھا۔ مگر میں اپنے اندر اس کے خلاف کوئی جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بالکل مطمئن تھا بلکہ مجھے رینانٹ کی طرف سے تشویش تھی کہ آخر اسے مجھ سے کیا پرخاش تھی جو اس نے خاص دستہ بھیج کر مجھے گرفتار کرایا تھا۔ برف والا اس دستے کی آمد سے باخبر تھا اور شاید وہ جانتا تھا کہ رینانٹ مجھے کیوں بلا رہا ہے۔ پھر مجھے یاد آیا جب اس نے میری کن پٹی پر اپنا انگوٹھا رکھا تو اس سے پہلے اس نے مجھے کسی کیرٹ کا نام لے کر اسے یاد رکھنے کو کہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیرٹ کون ہو

سکتا ہے اور برف والے نے مجھے اس کا نام کیوں یاد رکھنے کو کہا تھا۔ جب ہم شہر کی حد میں داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی اور تاریکی مکمل طور پر چھا گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی سات کے آس پاس کا وقت تھا اور اس کو بھی ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ یعنی آٹھ بج چکے تھے یا بجنے والے تھے۔

جب میں شہر میں آیا تو مجھے سڑکوں اور گلیوں میں نہ تو کوئی بچہ دکھائی دیا اور نہ ہی کوئی عورت نظر آئی۔ مرد نظر آئے تو وہ بھی سر جھکائے تیز قدموں سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ اسی طرح بیل گاڑیاں بھی سڑکوں پر آ جا رہی تھیں مگر صاف لگ رہا تھا کہ شہر سونے والا ہے۔ یہ لوگ جلد سو جانے کے عادی ہوں گے۔ ہمارے گاؤں دیہات میں بھی لوگ جلد سو جانے کے عادی ہیں۔ کیونکہ وہاں دیر تک جگانے والی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ اگرچہ اب ہمارے دیہاتوں میں بھی ٹی وی، کیبل، انٹرنیٹ اور موبائل پہنچ گیا اور شاید کچھ عرصے بعد وہاں بھی لوگ دیر سے سونے کے عادی ہو جائیں مگر اس وادی لے لوگ کئی ہزار سال پرانے انداز میں جی رہے تھے۔ اس میں جلد سو جانے کی عادت بھی شامل تھی۔ میں لیٹا ہوا تھا کہ لکڑی کا مضبوط دروازہ کھلا اور ایک شخص لکڑی کی ٹرے اٹھائے اندر آیا۔

ٹرے میں ایک بڑا سا پیالہ اور ایک چھوٹا پیالہ تھا۔ اس نے ٹرے بستر کے کنارے رکھ دی اور مجھے اشارے سے کھانے کو کہا۔ پھر اس نے جگ اٹھا کر دیکھا اور اسے لے کر باہر نکل گیا۔ وہ پانی لینے گیا تھا۔ میں ٹرے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس میں بڑے پیالے میں کھیر نما چیز تھی اور چھوٹے پیالے میں ایک سبز سیال تھا۔ میں نے کھیر کو سونگھا تو اس سے چاولوں جیسی خوشبو آئی پھر چکھ کر دیکھا تو اس کا ذائقہ ہلکا سا نمکین تھا۔ میں نے لکڑی کے چمچ سے ہی اسے کھا کر دیکھا اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ مکمل نباتی شے تھی۔ کھیر اچھی خاصی تھی اور اسے کھا کر میرا پیٹ بھر گیا تھا۔ پھر میں نے سبز سیال سونگھا اور فوراً ہی مجھے مکروہ سی بو محسوس ہوئی۔ یہ یقیناً کوئی نشہ آور مشروب تھا اس لیے میں نے اسے چکھنے سے بھی گریز کیا۔ عام طور سے قیدیوں کو نشہ فراہم نہیں کیا جاتا ہے لیکن شاید مجھے شاہی قیدی ہونے کے ناطے شراب بھی دی گئی تھی۔ ٹرے لانے والا کچھ دیر بعد آیا اور اس نے مشروب کو جوں کا توں پا کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے نفی میں سر ہلا کر اس پر واضح کیا کہ میں مشروب سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتا ہوں۔ اس نے اصرار نہیں کیا اور ٹرے اٹھا کر واپس چلا گیا۔

میں بستر پر دراز ہو گیا۔ مگر کچھ دیر بعد ہی دوسرا مسئلہ شروع ہوا اور مجھے دروازہ بجانا پڑا۔ میں کچھ دیر کے لیے برداشت کر سکتا تھا مگر ساری رات گزارنا مشکل تھا۔ وہی شخص آیا جو ٹرے لایا تھا اور میں نے اسے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اپنی حاجت سے آگاہ کیا اور وہ مجھے کمرے سے نکال کر واش روم کے لیے مخصوص حصے تک لایا۔ مجھے حیرت ہوئی جب میں نے وہاں جدید ڈبلیوسی سسٹم موجود پایا۔ جس میں پانی بہانے کا بندوبست بھی تھا۔ حد یہ کہ وہاں لوٹا بھی تھا۔ اگرچہ اس کی ٹونٹی اتنی بڑی نہیں تھی جیسی ہمارے لوٹے کی ہوتی ہے، مگر مناسب تھی۔ واش روم میں بدبو کی بجائے ایک الگ مہک تھی۔ شاید یہاں صفائی کے لیے کچھ ڈالا جاتا ہوگا۔ مٹی سے بنے پائپ سے پانی آ رہا تھا اور پانی روکنے کے لیے کارک نما لکڑی سے بنا ہوا اسٹاپر تھا جو رسی سے منسلک تھا اسے نکالنا اور لگانا آسان کام تھا۔ میں نے خاصی دیر لگائی اور کوشش کی کہ مجھے جلد یہاں نہ آنا پڑے۔ واپس کمرے میں آیا تو طبیعت ہشاش بشاش تھی۔

بہت ساری پریشانیوں اور سوالات کے باوجود میں زیادہ پریشان نہیں تھا اس لیے مجھے جلد نیند آ گئی۔ بہت دنوں کی مسلسل تھکن اور سفر کی وجہ سے بے آرامی کے بعد مجھے اس رات بہت اچھی نیند آئی اور میں تقریباً ساری رات سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو باہر ہلکی سی تاریکی تھی یعنی صبح ہونے والی تھی۔ میرا ذہن ہلکا اور جسم جیسے سکون والی کیفیت میں تھا۔ میں اٹھ کر فرش سے تقریباً سات فٹ اونچے روشن دان تک آیا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے کناروں پر جما کر خود کو اوپر اٹھایا اور بہت تازہ ہوا میں گہری سانس لینے لگا۔ ایسی ہوا میں نے کہیں محسوس نہیں کی تھی۔ شہروں اور آبادیوں سے بہت دور ایسے ویرانوں میں بھی ہوا میں وہ تازگی نہیں ہوتی جو اس ہوا میں موجود تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا ابھی وجود میں آئی ہو۔ میرے ذہن کی بہت معمولی سی کسل مندی بھی اس ہوا نے چوس لی اور میں چاق و چوبند ہو گیا۔ یہاں سے آسمان کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا اور یہ آسمان نہیں بلکہ اوپر چھائی دھند تھی۔ جب میرے بازو تھک گئے تو میں پلٹ کر واپس بستر کی طرف آیا۔

باہر روشنی تیز ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے صیادوں کی طرف سے کسی ردِعمل کا انتظار تھا اور مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رات کھانا لانے والا صبح بھی ناشتا لایا اور ناشتے میں وہی کھیر نما دلیہ اور اس کے ساتھ چائے نما مشروب تھا۔ اس کی مہک چائے جیسی تھی لیکن ذائقہ ذرا مختلف تھا۔ ٹرے

لانے والے نے مجھے اشاروں سے سمجھایا کہ میں جلد ناشتا کرلوں کیونکہ قید خانے کا منتظم میرا منتظر تھا۔ اگر منتظم میرا منتظر تھا تو یہ اس کا مسئلہ تھا اس لیے میں نے اطمینان سے ناشتا کیا کھیر نما دلیہ اس وقت ہلکا سا میٹھا تھا۔ گویا یہ لوگ بھی اس بات کے قائل تھے کہ ناشتے میں کچھ میٹھا ہونا چاہیے۔ میں مقامی چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ٹرے والا آگیا۔ مگر اس بار وہ اشارے کرنے کی بجائے اس وقت تک کھڑا رہا جب تک میں نے چائے ختم نہیں کر لی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھے لے کر وہاں سے نکلا۔ منتظم کے دفتر میں وہ موجود تھا اور اس کے ساتھ کسی قدر فاخرانہ لباس میں ایک جوان العمر اور دلکش شخص بھی موجود تھا۔ اس نے وہی مقامی طرز کا لمبا سا کرتہ نما لباس پہنا ہوا تھا مگر یہ سرخی مائل زعفرانی رنگ کا تھا اور اس پر اس نے سرخ رنگ کا پٹکا باندھ رکھا تھا۔ اس کے لیے گھنگریالے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کے گلے میں سیاہ موتیوں کی مالا تھی۔ وہ منتظم سے بات کر رہا تھا اس نے ایک اچٹتی نظر مجھ پر ڈالی اور منتظم سے پوچھا۔ ''اسے کوئی تکلیف تو نہیں دی؟''

''نہیں جناب۔'' منتظم نے ادب سے کہا۔ ''اسے لانے والے سپاہیوں نے بتا دیا تھا کہ یہ شاہی قیدی ہے اور اس سے اچھا سلوک کیا گیا ہے۔''

''میں اسے لے جا رہا ہوں جلد اسے شاہ اعظم کے سامنے پیش کرنا ہے۔''

''بالکل جناب، کیا میں اپنے سپاہی آپ کے ساتھ کروں؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ منتظم نے ایک سپاہی بلوایا اور اسے حکم دیا کہ وہ مجھے باہر تک چھوڑ کر آئے۔ سپاہی نے مجھے اشارہ کیا اور میں باہر آیا۔ زعفرانی لباس والا پہلے ہی باہر نکل گیا تھا۔ باہر اس کے ساتھ چار سپاہی موجود تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا اور ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ دن میں یہاں خاصی چہل پہل تھی اور ہر طرح کے سرکاری اور شاہی ملازم آ جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اعلیٰ عہدیدار اسی طرح کے سرخی مائل زعفرانی لباس میں تھے اور انہوں نے سرخ پٹکے باندھ رکھے تھے گویا یہ افسران کی کوئی خاص قسم کی تھی۔ اس بار بھی میرا خیال نہیں تھا کہ مجھے ریناٹ کے حضور پیش کیا جائے گا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب مجھے ایک دفتر نما عمارت میں لایا گیا اور مجھے لانے والے نے ایک دروازے کے باہر چاروں سپاہیوں کو روک دیا اور مجھے لے کر اندر آیا۔ یہ ایک خوبصورت سا کمرا تھا جس میں دبیز قالین کے ساتھ ایسا فرنیچر تھا جو فرشی نشست میں کام آتا ہے۔ چھوٹی میزیں اور نیچی تپائیاں وغیرہ تھیں۔ اس نے اپنے جوتے اتارے اور قالین پر براجمان ہوتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بیٹھ جاؤ شہباز۔''

میں دنگ رہ گیا۔ اپنا نام تو میں نے برف والے کو بھی نہیں بتایا تھا۔ مجھے خیال تھا کہ وہ جانتا ہے لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ اس وادی کا ایک فرد میرا نام جانتا ہو گا۔ میں نے بے ساختہ پوچھا۔ ''تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟''

''مجھے برف والے نے بتایا ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

اب مجھے خیال آیا کہ وہ میری بات سمجھ رہا تھا جب کہ میں بدستور اردو بول رہا تھا۔ ''تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

وہ آہستہ سے ہنسا۔ ''جب میں نے برف والے کا نام لیا تب ہی تمہیں سمجھ جانا چاہیے تھا۔''

مجھے خیال آیا کہ کہیں وہی تو کیرٹ نہیں ہے اور میں نے کہا۔ ''میں آپ کو نہیں جانتا ہوں۔''

''میرا نام رائل ہے۔'' اس نے جواب دیا تو مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی تھی، وہ کیرٹ نہیں تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیرٹ کون ہے مگر میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ یہ نام زبان پر نہ لاؤں۔ برف والے نے اہم ترین موقع پر خاص طور سے مجھے یہ نام بتا کر یاد رکھنے کو کہا تھا اور مجھے اسے اتنا عام نہیں لینا چاہیے تھا۔

''میں اب تک سمجھ نہیں سکا کہ تم نے برف والے کا حوالہ کیوں دیا ہے؟''

''تم نہیں جانتے برف والے کو؟'' اس کا لہجہ مصنوعی تحیر لیے ہوئے تھا۔ ''کیا تمہیں اس نے نہیں بھیجا ہے۔''

''میں اسی کے پاس سے لایا گیا ہوں لیکن اس نے مجھے نہیں بھیجا ہے۔'' میں نے اس بار بھی غلط بیانی سے کام لیا۔ ''ہاں میں اس کے ساتھ تھا اور پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ میں اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا اور جب مجھے ہوش آیا تو میں چھ سپاہیوں کے نرغے میں تھا وہ مجھے یہاں لے آئے۔''

''تمہیں برف والے نے بھیجا ہے۔'' رائل اپنے الفاظ پر زور دے کر بولا۔ ''تم ڈرو مت، کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں بھی تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔''

سچی بات ہے کہ اس کی بات نے مجھے ایک لمحے کو چکرا دیا تھا۔ اگر میری چھٹی حس خبردار نہ کرتی تو شاید میں اقرار کر

لیتا کہ مجھے برف والے نے بھیجا ہے۔ مگر اس کی بے تابی نے مجھے بتا دیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے ایک طرف سے پردہ ہٹا کر ایک پری اندر آئی۔ اسے آپ قدیم انداز کی روایتی پری مت سمجھیے گا۔ آج کل انٹرنیٹ پر پریوں کے گیم (بچوں کے لیے) عام ہیں جنہیں آپ آن لائن بھی کھیل سکتے ہیں۔ ان میں پریوں کو نہایت جنسی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کے جسمانی خدوخال اور ملبوسات (اگر انہیں لباس کہا جا سکے) ناقابل بیان ہوتے ہیں۔ یہ کچھ اسی قسم کی پری تھی اس نے سرخ رنگ کا روایتی کرتہ پہنا ہوا تھا مگر یہ کرتہ نہایت باریک تھا اور جہاں اس کے بدن سے لگتا تھا نہایت تفصیل سے سب عیاں کر دیتا تھا میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور بے ساختہ لاحول پڑھی۔ وہ خاموشی سے آئی اور دوزانوں بیٹھ کر اس نے تپائی سے ام الخبائث کا بلوریں جگ اور گلاس اٹھائے۔ جب وہ دوسرے گلاس میں بھی سبز شراب ڈالنے لگی تو میں نے منع کیا۔ ''میں نہیں پیتا ہوں۔''

''تم نارس نہیں پیتے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ یہاں شراب کو نارس کہا جاتا تھا اور اسے پینا اتنا عام تھا کہ میرے نہ پینے پر اس نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے مختصر اور قطعی لہجے میں کہا۔

''اس کے لیے مت نکالو۔'' اس نے لڑکی کو حکم دیا۔ ''پھلوں کا رس لے آؤ۔''

لڑکی نے جام اس کے سامنے سونے کی طشت میں رکھا اور اٹھ کر چلی گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ ایک عام سرکاری افسر کے ٹھاٹ تھے۔ اس کی وجہ یہاں وسائل کی فراوانی نہیں بلکہ وسائل کو چند افراد کے لیے مخصوص کر لینا تھا۔ اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''تم اوپر سے کیسے آئے؟''

''برف والے آدمیوں سے بچنے کے لیے نیچے اترے تھے۔''

اس کے چہرے پر بے یقینی نظر آئی۔ ''یہ غلط ہے تم وادی میں اترنے آئے تھے؟''

''سب نہیں صرف چند لوگ اس مقصد کے ساتھ آئے تھے اور وہی مجھے زبردستی لائے تھے مگر برف والے آدمیوں کے حملے کے بعد میں ان کی قید سے فرار ہوا اور وادی میں اتر گیا۔'' میں نے غلط بیانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''پتا نہیں میں کیسے نیچے ایک راستے تک پہنچا اور پھر مجھے برف والا ملا اور اس نے بتایا کہ وہ برف والا ہے۔''

''اس نے تمہیں نیچے وادی میں جانے کو کہا؟''

''اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی بلکہ اس نے مجھے بتایا کہ وادی میں باہر سے کوئی فرد نہیں آ سکتا ہے۔''

''لیکن تم آ گئے ہو۔'' اس نے تیور بدل کر کہا۔

''ہاں لیکن اپنی مرضی سے نہیں آیا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی گواہی برف والا بھی دے گا۔''

لڑکی اب بلوریں جام میں پھلوں کا رس لے آئی اور میرے عین سامنے بیٹھی کہ مجھے ایک بار پھر لاحول پڑھنا پڑھی۔ وہ بلاشبہ فتنہ بدن تھی۔ اس وادی میں اب تک میرا سامنا جتنے مردوں سے ہوا میں نے ان کو مروجہ پیمانوں کے لحاظ سے حسین و جمیل پایا تھا۔ ان کے جسم قدرتی طور پر متناسب اور مضبوط تھے۔ رنگت سرخ و سفید تھی اور بالوں کی رنگت میں بھی یورپ کا رنگ نمایاں تھا۔ یعنی سرخ، بھورے اور سنہری رنگ زیادہ نظر آ رہے تھے۔ سیاہ اور سرمئی رنگ کے بال کم لوگوں کے تھے۔ عورت اب تک ایک ہی دیکھی تھی اور وہ ایسی تھی کہ سپر ماڈل بن سکتی تھی۔ وہ گئی تو رائل نے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ مگر تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہاں قدم رکھ کر تم کس مشکل میں پڑ گئے ہو اور میں چاہتا ہوں تم اس مشکل سے نکل جاؤ۔''

''میں کس مشکل میں پڑ گیا ہوں اور اس سے کیسے نکل سکتا ہوں؟''

''باہر سے جو فرد یہاں آتا ہے اسے سزائے موت دی جاتی ہے۔''

''ایسا جان بوجھ کر آنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے میں جان کر نہیں آیا اور اگر میں بے ہوش نہ ہوتا تو شاید واپس جا چکا ہوتا۔''

''یہ قانون پرانا ہے، نئے قانون کے تحت اب باہر سے آنے والے ہر فرد کو صرف سزائے موت ملتی ہے۔''

''یعنی میرا مقدر بھی سزائے موت ہے۔''

''تم بچ سکتے ہو۔'' اس نے ذرا آگے جھک کر کہا۔ ''اگر تم میری بات مان لو تو؟''

''کون سی بات؟''

''یہاں برف والے سے زیادہ کوئی شخص معزز نہیں ہے اگر تم کہہ دو کہ تم کو برف والے نے بھیجا ہے تو تم سزائے موت سے بچ جاؤ گے۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''صرف یہ کہنے سے میں بچ جاؤں گا؟''

''میں ضمانت دیتا ہوں۔''

اس قسم کی ضمانتوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ بہت

عرصے سے اسی وشت کی سیاحی کر رہا تھا جہاں ہر دوسرا فرد رائل جیسا ملتا تھا۔ ’’صرف جان بخشی ہوگی؟‘‘

’’نہیں تم کو وادی سے باہر بھی بھیج دیا جائے گا۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

اس نے وضاحت کی۔ ’’کوئی مشکل نہیں ہے اچانک تمہاری موت کا اعلان کر دیا جائے گا اور بہ ظاہر تم دفن ہو جاؤ گے لیکن درحقیقت تم وادی سے باہر جا چکے ہو گے۔‘‘

میرا خیال ہے اس نے میری موت کے بارے میں جو کہا تھا اس کے الفاظ میں صرف وہی سچ تھے باقی اس نے ہول سیل میں جھوٹ بولا تھا۔ میں نے سوچا اور پوچھا۔ ’’اگر میں یہ بات نہ مانوں اور سچ بول دوں تو؟‘‘

’’تب تمہیں بچانا ممکن نہیں ہوگا۔ کچھ دیر بعد تمہیں شاہ اعظم کے دربار میں پیش کیا جائے گا اور وہاں سے تمہاری موت کا حکم صادر ہوگا آج شام سے پہلے تم دنیا سے رخصت ہو چکے ہو گے۔‘‘

ایسا بالکل ممکن تھا۔ دیکھا جائے تو میں موت کے گھیرے میں تھا اور کسی وقت بھی میرا فرشتۂ اجل سے سامنا ہو سکتا تھا۔ اس لیے رائل کی بات پر یقین نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر برف والے کے حوالے سے اس نے جو بات کی تھی اس سے ہی رائل اور اس کے آقا کی نیت کی خرابی سامنے آ گئی تھی۔ اگرچہ یہ ڈھکی چھپی تھی مگر مجھے امید تھی کہ وہ مکمل کر سامنے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ میں سوچ رہا تھا اور رائل مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مگر اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ رائل کو کس نے میری بات سمجھنے کے قابل بنایا، کیا یہاں برف والے جیسی صلاحیت کسی اور شخص میں بھی تھی؟ یہ کوئی ناممکن کام نہیں تھا جو ایک شخص کر سکتا ہے وہ دوسرا بھی کر سکتا۔ رائل میں مجھے یہ صلاحیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ عام سا دنیا دار شخص تھا جو اپنا حصہ چالاکی و مکاری سے وصول کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ اگر یہاں ایسا کوئی فرد تھا تو لازمی طور پر وہ برف والے کے خلاف تھا اور میرا بھی ہمدرد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ ’’تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جلدی فیصلہ کر لو۔‘‘

میں نے سرد آہ بھری۔ ’’تم نے کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔ اب میں سوائے جھوٹ بولنے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔‘‘

وہ خوش ہو گیا۔ ’’تم نے بالکل درست فیصلہ کیا اور جلد اس کا نتیجہ بھی تمہارے سامنے آ جائے گا۔‘‘

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا اور بہ ظاہر میں وہاں اکیلا تھا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ آس پاس نگراں ہوں گے۔ مگر مجھے نگرانوں کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی اس فتنہ بدن کی تھی کہ وہ کہیں تنہائی میں یہاں نہ آ جائے۔ پتا نہیں پھلوں کا رس لاجواب تھا یا اس کے ہاتھوں نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ میں نے بارہا مختلف قسم کی کاک ٹیل رس بھی پی ہے لیکن جیسی کاک ٹیل یہ تھی ایسی میں نے کبھی نہیں پی۔ اس وادی کی ہر چیز ہماری دنیا سے مشابہ ہوتے ہوئے بھی الگ سی تھی۔ جیسے ہی میں نے جام خالی کیا رائل آ گیا اور اس نے کہا۔ ’’اب چلو وقت قریب ہے۔‘‘

میں چونکہ جوتوں سمیت ہی قالین پر فروکش ہو گیا اس لیے صرف اٹھ کر باہر آ گیا۔ ہمارے باہر آتے ہی چار سپاہی ساتھ ہو گئے اور ہم اس عمارت سے بھی باہر آئے۔ اب ہم جس طرف جا رہے تھے وہ شاہی محل کا خاص حصہ لگ رہا تھا۔ یہاں فن تعمیر اور اس میں چیزوں کا استعمال بالکل منفرد اور الگ تھا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک عالی شان عمارت کے سامنے رکے۔ اس کی در جن سے اوپر سیڑھیوں کے بعد بہت بڑا سا برآمدہ تھا جس کی بلند چھت کا بوجھ سہارنے کے لیے پتھر کے بنے متعدد ستون موجود تھے۔ یہ تمام عمارت سفید رنگ کے پتھر سے بنی تھی جو سنگ مرمر سے مل رہا تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے اور ایک بہت بڑے دروازے سے ایک طویل راہداری میں داخل ہوئے۔ اس کے فرش پر سرخ رنگ کے دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر مصوری کے نمونے آویزاں تھے۔ کیونکہ یہ حصہ اندر تھا اس لیے روشنی کی خاطر یہاں ہر کچھ قدم کے فاصلے پر ایسی شمعیں روشن تھیں جن کے دھوئیں سے مہک سی اٹھ رہی تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر چند قدم کے بعد مسلح سپاہی بھی موجود تھے۔ تین جگہوں پر ہمیں روکا گیا تو رائل نے مخصوص اجازت نامہ دکھایا اور اسے آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ راہداری کے آخر میں ایک عظیم الشان ہال تھا۔ جس کے وسط میں ستونوں کی تین قطاریں تھیں۔ یہاں چھت کی بلندی کم سے کم تیس فٹ ضرور تھی۔ اس کے ایک سرے پر کوئی دس فٹ اونچا چبوترا تھا جس پر شاید خالص سونے سے بنا ہوا کرسی نما تخت رکھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں قطاروں میں کرسیاں رکھی تھیں اور یہ ریناٹ کا دربار تھا۔ کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے تھے مگر میں نے نوٹ کیا کہ چبوترے کے پاس والی ذرا بڑی اور زیادہ خوب صورت کرسیاں خالی تھیں۔ دیواروں پر حریری پردے لہرا رہے تھے

اور یہاں روشنی کا ایسا نظام تھا جو بہ ظاہر دکھائی نہیں دیتا تھا مگر یہ ہال کو مخصوص انداز میں روشن کر رہا تھا۔ فرش اور دیواروں کو جس حد تک سجایا جا سکتا تھا یہ ہال اتنا ہی سجا ہوا تھا۔ چھت سے جھنڈے لٹک رہے تھے۔ رائل مجھے لے کر چبوترے سے ذرا فاصلے پر رک گیا۔

میرا خیال تھا کہ ابھی کوئی گجر بجے گا جو شاہ اعظم کی آمد کا اعلان کرے گا۔ مگر اس کی بجائے ایک سریلی اور کوکتی نسوانی آواز بلند ہوئی۔ اس میں الفاظ کی بجائے سر تھے۔ یعنی وہ سر جو کلاسیکل مغنیہ اپنے حلق سے برآمد کرتے ہیں۔ عرف عام میں اسے راگ درباری کہا جاتا ہے مگر یہاں یہ سر دوسرے مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ آواز سنتے ہی کرسیوں پر درباری کھڑے ہو گئے اور تقریباً رکوع والی حالت میں چلے گئے۔ ان کے ساتھ رائل اور اس کے چاروں سپاہی بھی اسی پوزیشن میں چلے گئے۔ مگر میں سیدھا کھڑا رہا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے بھی جھک جانا چاہیے مگر میرا دل نہیں مانا کہ میں کسی انسان کے سامنے از خود یوں جھکوں۔

آواز جاری تھی کہ ایک ادھیڑ عمر مگر مضبوط جسم کا شخص چند افراد کے ساتھ ایک طرف سے ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی چھڑی تھی جو یقیناً حکمرانی کا نشان تھی۔ سر پر سونے کا دائرے میں بنا ہوا تاج تھا جس پر مختلف جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھی مختلف ملبوسات میں تھے۔ وہ سب اپنی اپنی کرسیوں کے پاس رکتے ہوئے رکوع والی پوزیشن میں جاتے رہے اور جب تاج پوش شاہانہ انداز میں چلتا ہوا ہال کے سرے پر واقع چبوترے تک پہنچا اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے تخت پر جا بیٹھا تو باقی سب بھی اپنی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ اس نے ایک نظر پورے ہال پر ڈالی اور پھر اس کی تمام تر توجہ مجھ پر مبذول ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سرد اور بے تاثر تھیں۔ میں نے ایک بار ٹی وی پر شارک سے متعلق پروگرام دیکھا تھا اور اس میں شارک کی آنکھیں کچھ اسی طرح کی تھیں۔ اگرچہ اس کی آنکھیں ابھری ہوئی نہیں تھیں مگر ان میں سرد مہری اور سفاکی شارک جیسی تھی۔ وہ یقیناً نیکاٹ کا بیٹا ریناٹ تھا۔

میں اب تک سمجھنے سے قاصر تھا کہ برف والے نے مجھے یہاں کیوں بھیجا تھا اور اسے یہ توقع کیوں تھی کہ میں اس وادی میں متحارب فریقوں کی جنگ میں کوئی کردار ادا کر سکوں گا۔ اگر میں کوئی کردار ادا بھی کرتا تو وہ کم سے کم اس شخص کے لیے ہرگز نہیں ہوتا جس سے مجھے پہلی نظر میں چڑ ہو گئی تھی۔ مجھے لگا کہ مرشد یا ڈیوڈ شا جیسا ایک اور کردار میرے سامنے آ گیا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کا کوئی ذاتی کردار نہیں تھا اور وہ صرف قوت کے بل بوتے پر خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہو۔ اس نے میری طرف ہاتھ دراز کیا اور حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تم نے مجھے تعظیم نہیں دی۔''

''کیونکہ میں شاہ اعظم کی رعایا میں سے نہیں ہوں۔ میں وادی کا فرد بھی نہیں ہوں۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ یہ اطمینان صرف ظاہری نہیں تھا۔ بلکہ میں اندر سے بھی پوری طرح مطمئن تھا۔ نہ جانے کیوں یہ شخص مجھے کسی جابر حکمران سے زیادہ مسخرہ لگا تھا جو شاہ اعظم بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی براہ راست میری بات سمجھ سکے گا مگر وہ نہیں سمجھا تھا اور رائل نے ذرا آگے آ کر میری بات کا ترجمہ کیا۔ اگرچہ اس کا ترجمہ بھی مجھے اردو میں سنائی دے رہا تھا۔ ریناٹ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کڑک کر کہا۔

''اس وادی میں رہنے والا ہر فرد میری رعایا میں شامل ہے۔''

میں نے ظاہری ادب سے کہا۔ ''میں بتا چکا ہوں کہ میں وادی سے تعلق نہیں رکھتا۔''

رائل کے ترجمے نے ریناٹ کے غصے میں اضافہ کیا تھا اور میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے آواز میں مزید گرج شامل کی۔ ''یہاں باہر سے آنے والے ہر فرد کی سزا موت ہے۔''

''میں واقف ہوں لیکن میں خود نہیں آیا بلکہ شاہ اعظم کے سپاہی مجھے گرفتار کر کے لائے ہیں۔''

''جب تمہیں گرفتار کیا گیا تب تم وادی میں تھے۔'' ریناٹ نے حقارت سے کہا۔

''مجھے تسلیم ہے لیکن وادی میں بھی مجھے برفانی آدمیوں نے آنے پر مجبور کیا ورنہ میرا وادی میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔''

''تم سزائے موت کے مستحق ہو چکے ہو۔'' ریناٹ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ایک مسخرہ شخص تھا جو غصے میں آ کر اپنا اصل منصوبہ بھول گیا تھا اور مجھے سزائے موت سنانے جا رہا تھا۔ رائل نے بروقت کھنکار کر کہا۔

''آپ بجا فرما رہے ہیں شاہ اعظم، لیکن آپ کی انصاف پروری کا تقاضہ ہے کہ اس سے حجت اتمام کر

لیں۔ یہ پوری طرح اپنے جرم کا اقبال کرے تب اسے سزائے موت دی جائے۔"

رائل نے نہایت ہوشیاری سے اسے یاد دلایا کہ حضور اپنے پلاٹ سے ہٹ رہے ہیں۔ وہ جلدی سے سنبھل گیا اور اس کا اظہار اس کے تاثرات سے بھی ہو رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "اچھا ہوا کہ میں نے تمہیں سزا نہیں سنائی ورنہ موت اسی وقت تمہارا مقدر بن جاتی، تمہارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ ہے؟"

رائل میری طرف گھوما اور اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اگر تم اپنی صفائی پیش کر سکو تو شاہ اعظم کو رحم دل بھی پاؤ گے۔"

"دوسری صورت میں تمہارے لیے سزائے موت ہی ہوگی۔" رینانٹ نے اصل بات کہہ دی۔ لفظ دوسری کی جگہ بہر کر لیا جائے تو اس کے حقیقی عزائم کی عکاسی ہو جاتی۔ میں جواب میں خاموش رہا اور جب خاموشی کا یہ وقفہ کچھ زیادہ طول پکڑ گیا تو رائل نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"لگتا ہے تمہارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ کیا تم مزید اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتے؟"

"کون بھری جوانی میں مرنا چاہتا ہے لیکن بدقسمتی سے میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو جو کچھ ہے وہ میں بتا چکا ہوں۔"

رائل کا منہ ایک لمحے کو کھلا رہ گیا۔ غالباً اسے مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی اور جب وہ مجھے کمرے میں چھوڑ کر کہیں گیا تھا تو اس نے یقیناً رینانٹ کو یہی اطلاع دی ہوگی کہ مرغا پھنس گیا اور وہ اپنے دربار کی پالی سجا لے تاکہ مجھے ٹھیک سے حلال کر سکے۔ مگر مرغے نے عین موقع پر پالی میں اترنے سے انکار کر دیا۔ رائل نے جلدی سے کہا۔ "تم نے مجھے برف والے کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔"

"میں نے تمہیں برف والے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔" میں نے اطمینان سے اسے جھٹلا دیا۔ "تمہیں بھی یہی بتایا تھا جو ابھی کہہ رہا ہوں۔"

درباری غالباً حیران تھے کہ میں ان کی زبان جانتا تھا یعنی سمجھ رہا تھا مگر جواب اپنی زبان میں دے رہا تھا اور زیادہ حیرانی اس پر ہوئی کہ رائل میری زبان سمجھ رہا تھا اور مجھ سے اپنی زبان میں بات کر رہا تھا۔ غالباً انہیں اس چکر کا علم نہیں تھا جو برف والے نے میرے ساتھ اور کسی اور فرد نے رائل کے ساتھ چلایا ہوا تھا۔ رائل کی مجبوری یہ تھی کہ وہ مجھ سے اپنی زبان میں بات نہیں کہلوا سکتا تھا یا وہ یا رینانٹ جو کہہ رہے تھے وہ سب سن رہے تھے۔ ان کا پلان جو یقیناً برف والے کے خلاف تھا میرے انکار سے چوپٹ ہو گیا تھا اور اب وہ یہی کر سکتے تھے کہ اس کا بدلہ مجھ سے لیں اور رینانٹ نے یہی کیا۔ اس نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "یعنی تم اقرار کرتے ہو کہ تم اس وادی میں داخل ہوئے جب کہ تمہیں اس کا حق نہیں تھا۔"

"شاہ اعظم جو چاہیں سمجھیں میں اپنی صفائی پیش کر چکا ہوں۔"

میرے جواب سے زیادہ لہجے نے اسے بے قابو کر دیا۔ "اسے آج ہی پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے۔"

اس کے الفاظ نے ہال میں سنسنی کی لہر دوڑا دی تھی کیونکہ فوراً ہی چبوترے کے سب سے نزدیک رکھی زرنگار کرسی سے ایک معمر شخص نے اٹھ کر کہا۔ "شاہ اعظم اس کی سزا یقیناً موت ہے لیکن یہ سزا صرف مہا پجاری دے سکتا ہے۔"

رینانٹ نے اتنی ہی غضب ناک نظروں سے اس بوڑھے شخص کو دیکھا جو یقیناً کسی اعلیٰ سرکاری منصب پر فائز تھا۔ اس نے کہا۔ "وزیر اعظم سربان کیا تم اس شخص کی حمایت کر رہے ہو۔"

"نہیں شاہ اعظم آپ نے میرے پہلے جملے پر غور نہیں فرمایا۔ میں نے کہا ہے کہ اسے سزائے موت دینے کا حق مہا پجاری کا ہے اور وہ یقیناً اسے سزائے موت ہی سنائے گا۔"

مگر رینانٹ کی آتش غضب اس حد تک بھڑک چکی تھی کہ اس نے اپنے وزیر اعظم کے توجہ دلاؤ نوٹس کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا اور بولا۔ "اسے لے جاؤ اور آج کا سورج غروب ہو تو یہ زندہ نہ ہو۔"

وزیر اعظم سربان کے چہرے پر تشویش نظر آئی تھی۔ وہ صورت سے ہی دانش مند اور مخلص آدمی لگ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر مہا پجاری کے اختیارات میں مداخلت کی گئی تو نتیجہ زیادہ اچھا نہیں نکلے گا اس لیے جب سپاہی مجھے گھیر کر لے جا رہے تھے تو وہ سیڑھی چڑھ کر اوپر جا رہا تھا اور پھر اس نے رینانٹ کے کان میں کچھ کہنا شروع کیا تھا۔ میں اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکا کیونکہ درمیان میں اب لہراتے پردے حائل ہو گئے تھے۔ جب تک میں دربار میں اور رینانٹ کے سامنے رہا میرے جذبات دوسرے تھے مگر وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو مجھے پہلی بار اپنی فکر پڑی اور میں نے سوچا کہ میں نے کہیں برف والے پر کچھ زیادہ ہی

اعتبار تو نہیں کر لیا مگر فوراً میرے اندر سے کسی نے نفی کی۔ میں نے برف والے پر نہیں بلکہ اس کائنات کے خالق اور مالک پر اعتبار کیا تھا جس کے قبضہ قدرت میں میری ایک ایک سانس ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں پھر سے پُرسکون ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ رائل میرے پیچھے آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے باہر لانے والے سپاہی سیڑھیوں کے پاس رک گئے اور کچھ دیر بعد رائل اندر سے برآمد ہوا اس کا غصے سے برا حال تھا اس نے آتے ہی کہا۔ ''احمق آدمی کیا تم مرنا چاہتے ہو تمہیں زندگی سے پیار نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''مگر میں بے وقوف بن کر نہیں مرنا چاہتا۔''

وہ مجھے گھورنے لگا۔ ''کیا مطلب؟''

''کیا میں ان کے سامنے سب کہہ دوں؟'' میں نے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔

''ان کی فکر مت کرو، سمجھ لو یہ گونگے بہرے ہیں۔''

''مطلب صاف ہے اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ میں برف والے کے بارے میں جھوٹ بولتا تب بھی مجھے سزائے موت نہیں ملتی۔ اگر تم یا شاہ ریناٹ اپنی بات سے پھر جائیں تو میں کیا کر لوں گا۔''

رائل کے خوشنما چہرے پر سفا کی اور خشونت نمودار ہونے لگی اور مجھے یوں لگا جیسے اس کے چہرے سے نقاب اتر رہا ہو اور اس کی اصل شخصیت نمایاں ہو رہی ہو۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا ہے، شاہ اعظم کے سامنے میری ساکھ خراب ہوئی ہے۔''

''اگر تم چاہو تو یہ ساکھ بحال ہو سکتی ہے لیکن مجھے ٹھوس ضمانت چاہیے کہ پھر مجھے سزائے موت نہیں دی جائے گی اور مجھے وادی سے باہر جانے کی اجازت بھی ملے گی۔''

''یہ ضمانت کیسے دی جا سکتی ہے؟''

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ مجھے کیسے مطمئن کر سکتے ہو۔''

''اب کچھ کرنا بہت مشکل ہے، شاہ اعظم تمہاری موت کا حکم صادر کر چکے ہیں۔'' اس نے مایوسی سے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''اسے کڑی نگرانی میں قید خانے تک لے جاؤ۔''

سپاہیوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا اور وہاں سے روانہ ہوئے۔ چند گھنٹے بعد میں اسی قید خانے میں تھا جہاں میں نے رات گزاری تھی۔ مجھے اسی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ سپاہیوں نے مجھے قید خانے کے منتظم کے حوالے کیا تھا۔ وہ خود مجھے لے کر کمرے تک آیا اور جب بند کرنے لگا تو اس نے اشارے سے پوچھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے لباس کی ضرورت ہے۔ یہ لباس یہاں کے موسم کے لحاظ سے بہت گرم تھا۔ وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا اور میں بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ چند گھنٹے اس لحاظ سے حیرت انگیز تھے کہ یہاں پہلے ہی میری آمد کی توقع تھی اور ریناٹ کو یہ بھی علم تھا کہ میں برف والے کے پاس سے آ رہا ہوں بلکہ یہ بھی علم تھا کہ اس نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ میں ان کی زبان سمجھ سکوں۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ ان تک یہ سب کیسے پہنچا۔ کیا برف والے کے آس پاس ان کا کوئی مخبر تھا۔

دوسرا جھٹکا مجھے یہ جان کر لگا کہ یہاں برف والے کی مخالفت موجود تھی اور میری مدد سے اسے پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق برف والا نیچے کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا تھا اور جب میں اس کے پاس تھا تب بھی میں نے اس کی باتوں سے ایسا کوئی تاثر نہیں لیا کہ وہ نیچے والوں کے درمیان جاری تنازعے میں کوئی ذاتی کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ ہاں اس نے یہ ضرور چاہا تھا کہ میں نیچے جاؤں اور وادی میں جاری تنازعے کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کروں اور شاید اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے یوں مجھے نیچے پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ اس کے باوجود یہاں اس کے خلاف سازش جاری تھی۔ شاید ریناٹ اینڈ کمپنی کو خطرہ تھا کہ کہیں برف والا سامیرا کے گروپ کی حمایت نہ کر دے۔ اس لیے انہوں نے سرے سے اس خطرے کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور پہلے مرحلے میں وہ میری مدد سے برف والے کے خلاف ایک اسٹیج تیار کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے مرحلے میں وہ اسے عدالت یا کسی جرگے کے سامنے کھینچ لیتے اور اسے ریناٹ کی من پسند سزا سنا دی جاتی۔ برف والا روحانی لحاظ سے کتنا ہی طاقتور سہی لیکن بہرحال وہ پوری ریاست کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اب میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ برف والے نے مجھے ریناٹ کے پاس بھیج کر غلطی کی تھی اس کی بجائے وہ سامیرا کے پاس بھیج دیتا تو میں یقیناً اس کے کام آ سکتا تھا۔ مگر شاید نظام قائم رکھنے کی خواہش نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ مجھے ریناٹ کے پاس بھیجے تاکہ میں اس کی طرف سے دوسرے گروپ کے خلاف کچھ کروں۔ یہاں آنے کے بعد میں نے جو دیکھا تھا میں کسی صورت ریناٹ جیسے آدمی کے

لیے کام نہیں کر سکتا تھا۔ اگر یہ بات برف والا سمجھتا تھا تب اس نے مجھے بیکار میں یہاں بھیجا تھا اور دیکھا جائے تو میری جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ریناٹ مجھے سزائے موت سنا چکا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں چونکا۔ آنے والا قید خانے کا ملازم تھا جو کھانا بھی لاتا تھا اس وقت وہ میرے لیے لباس لایا تھا۔ اس نے سلیقے سے تہہ کیا ہوا لباس بستر پر رکھ دیا اور اشارے سے بولا کہ میں کپڑے بدل لوں۔

میں نے سوائے سوتی پاجامے اور آدھی آستین کی سوتی بنیان کے سب اتار دیا اور پھر اس پر کرتہ نما لباس پہن لیا۔ اس کے بازو بغلوں سے کھلے ہوئے تھے اور یہ کہنیوں تک جا رہے تھے۔ اوپر سے نیچے تک یہ ایک جیسا سائز رکھتا تھا اور اس کے ڈھیلے پن کو قابو رکھنے کے لیے پٹکا لازمی تھا۔ یہ چوڑی سی بیلٹ تھی جسے کمر سے باندھا جا سکتا تھا۔ اس کے تسے دائیں طرف لگے تھے۔ اسے پہن کر مجھے عجیب سا لگا تھا مگر یہ لباس آرام دہ اور گرم موسم کی مناسبت سے تھا۔ خادم کچھ دیر بعد آیا اور اس بار وہ میرے لیے مقامی طرز کے جوتے بھی لایا تھا مگر میں نے اسے منع کر دیا اور جب وہ میرا اتارا لباس اٹھانے لگا تو میں نے پھر منع کر دیا اور اسے اشارے سے بتایا کہ میں واش روم جانا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے واش روم تک لے آیا۔ میں نے فارغ ہو کر اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا۔ موقع نہیں تھا مگر جہاں تک ہو سکا بال بھی پانی سے صاف کر لیے۔

خادم مجھے واپس چھوڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ لوگ فطرت میں سادہ تھے۔ ورنہ ہماری دنیا میں قیدیوں پر اتنا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے اور ان کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے جب کہ یہاں مجھے سوائے اس خادم کے اور کوئی نظر نہیں آیا تھا اور وہ بھی مجھے سپاہی نہیں لگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے لیے مشروب لے آیا۔ یہ کوئی سوپ نما چیز تھی مگر گرم نہیں تھی اور اس میں ہلکے سے کسی سبزی کے ٹکڑے بھی تیر رہے تھے۔ میں نے چکھ کر دیکھا تو اس کا ذائقہ اچھا لگا۔ یہ شاید یہاں کا لنچ تھا اس لیے میں نے پورا پیالہ پی لیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں فرار کی کوشش کروں تو شاید مجھے اتنی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ یہ عمارت ساخت کے لحاظ سے قید خانہ ضرور تھی۔ یعنی مضبوط اور آنے جانے کے راستے محدود تھے مگر یہاں پہرے کا خاص انتظام نہیں تھا صرف مرکزی دروازے پر دو مسلح سپاہی تھے اور ایک دو ہی مجھے اندر نظر آئے تھے۔

شاید ان لوگوں کو اطمینان تھا کہ اگر کوئی قید خانے سے فرار ہو بھی گیا تو وہ اس شہر سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے فصیل پر سخت پہرہ دیکھا تھا اور اس پر ہر چند گز کے بعد ایک سپاہی نظر آ رہا تھا۔ شہر سے باہر آنے جانے والوں کی بھی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ میں کوشش کر کے یہاں سے نکل سکتا تھا اور فصیل کے دوسری طرف جانا بھی اتنا مسئلہ نہیں تھا۔ برف والے نے مجھے یہاں متحرک کردار ادا کرنے کے لیے بھیجا تھا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے لیے نہیں۔ اگر میں ایسا کرتا تو یہ میری بے وقوفی بھی ہو سکتی تھی۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے فرار سے کوئی مشکل کھڑی ہو جائے اور برف والے نے جیسا چاہا ہو ویسا نہ ہو۔ مگر کسی قدر غور و فکر کے بعد میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا لباس مقامی ہو گیا تھا اور بڑھ جانے والے بال بھی اب الگ سے نہیں لگ رہے تھے۔ پیروں میں جدید ترین جوگرز تھے مگر یہ لمبے کرتے میں اتنے نمایاں نہیں ہوتے۔

یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر کے میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا اور دیوار سے لگ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور بستر خالی دیکھ کر تیزی سے اندر آیا تھا کہ میں نے اس کی گردن اپنے بازو میں دبوچ لی اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ وہ متوسط جسامت کا جوان آدمی تھا اور یقیناً طاقتور تھا مگر میری مہارت کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ گردن کے نازک حصے پر دباؤ نے اسے جلد شکست تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ دو منٹ میں میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ میں نے احتیاط کی تھی کہ اس کی گردن ایک حد سے زیادہ نہیں دبائی، کیونکہ خطرہ تھا کہ اس کا سانس رک ہی نہ جائے۔ اس کی نبض دیکھی وہ سست تھی مگر باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں باہر آیا۔ یہاں ایک راہداری میں دونوں طرف چار چار کوٹھریاں تھیں اور اس کے آخری سرے پر واش روم تھا۔

باہر جانے کا راستہ دوسری طرف تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو مجھے ناکامی ہوئی۔ وہ باہر سے بند تھا۔ یہاں تالے نہیں ہوتے تھے میں نے کہیں تالا لگا نہیں دیکھا البتہ کنڈی ہوتی تھی اور دروازہ باہر سے کنڈی کی مدد سے بند تھا۔ میں نے زور لگا کر دیکھا مگر پٹ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ چند ناکام کوششوں کے بعد میں نے ہار مان لی کہ اسے کھولنا میرے بس سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ واش روم اور دوسرے

کمرے موجود روشن دان اتنے بڑے نہیں تھے کہ میں ان سے نکلنے کا سوچتا۔ میں واپس کمرے میں آیا اور خادم کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ پانی چھڑکنے اور منہ پر بار بار تھپڑ مارنے کے بعد وہ ہوش میں آ گیا اور اس نے خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے اشاروں سے اسے سمجھایا کہ وہ میری بات کا جواب اپنی زبان میں دے میں اس کی بات سمجھ سکتا ہوں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں سے باہر جانے کا طریقہ کیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں آواز دیتا ہوں تو باہر موجود آدمی ایک چھوٹی کھڑکی کھول کر دیکھتا ہے اور اسے میں نظر آتا ہوں تو وہ دروازہ کھولتا ہے۔ اگر میں نظر نہ آؤں یا میرے ساتھ کوئی اور بھی ہو تو وہ دروازہ نہیں کھولتا ہے۔''

میں نے اشارے سے پوچھا کہ کوئی چھپ کر جائے تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ پوری طرح دیکھتا ہے اور راہداری میں کوئی جگہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی ہے۔''

میں مایوس ہوا کم بختوں نے بہت سادہ لیکن موثر نظام بنایا ہوا تھا۔ میں نے مزید تسلی کی۔ ''اگر تمہیں یرغمال بنا کر لے جاؤں تب وہ دروازہ کھولے گا۔''

اس نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔ ''میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر تم مجھے مار بھی دو تب بھی دروازہ نہیں کھلے گا۔''

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اسے یرغمال بنانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور اسے جانے کی اجازت دی۔ وہ کسی قدر حیران ہوا لیکن پھر تیزی سے باہر نکل گیا اور اس نے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ اب میرے پاس دوسرا موقع یہ ہوتا کہ جب مجھے یہاں سے نکالا جاتا تب میں فرار کی کوشش کرتا۔ مگر میری اولین کوشش نے صیادوں کو ہوشیار کر دیا تھا اور جب مجھے باہر لے جانے کا وقت آیا تو وہ پوری تیاری سے آئے تھے۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو تیرانداز سپاہی تیر تانے ہوئے اندر آئے اور کمرے کے دونوں کونوں میں پوزیشن سنبھال لی۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا کہ میں بستر سے اٹھ بھی نہیں سکا تھا۔ دروازے پر رائل کھڑا تھا اس نے حکم دیا۔ ''الٹے منہ نیچے لیٹ جاؤ اور دونوں ہاتھ پشت پر کرلو۔''

''وہ کیوں؟''

''تمہیں ایک بار پھر شاہ اعظم کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔''

''اگر میں تمہارا حکم نہ مانوں تو۔''

''تب یہ تیرانداز تمہارے پیروں کو نشانہ بنائیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تمہیں بہرصورت شاہ اعظم کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اب تم فیصلہ کرلو کہ کیسے جاؤ گے اپنے پیروں پر چل کر یا کوئی تمہیں اٹھا کر لے جائے۔''

ظاہر ہے میں نے پہلی صورت کو ترجیح دی اور فرش پر اوندھے منہ لیٹ کر دونوں ہاتھ پشت پر کر لیے۔ رائل کے پیچھے سے ایک سپاہی نکل کر آگے آیا اور اس نے میرے دونوں ہاتھ رسی سے باندھ دیئے اور اس کے بعد میرے دونوں پاؤں اس طرح باندھے گئے کہ درمیان میں کوئی فٹ بھر کی رسی موجود رہی تھی یعنی میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر چل سکتا تھا۔ مگر بھاگنا تو درکنار میں بڑے قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جب اس سپاہی نے مجھے باندھ دیا تو ایک سپاہی اور اندر آیا اور اس نے باندھنے والے کے ساتھ مل کر مجھے اٹھا کر کھڑا کیا اور بدستور بازوؤں سے پکڑ کر چلاتے ہوئے کمرے سے باہر لائے۔ دونوں تیرانداز بھی بدستور تیر تانے ہوئے میرے پیچھے آئے تھے اور اس بار میں بالکل مختلف انداز میں ریناٹ کے دربار کی طرف جا رہا تھا۔ اب میں مجرم لگ رہا تھا جب کہ پہلے مجھے ملزم کی طرح لے جایا گیا تھا۔

یقیناً کوئی ایسی تبدیلی آئی تھی کہ ریناٹ دوبارہ مجھے اپنے دربار میں بلوانے پر مجبور ہوا تھا مگر یہ تبدیلی میرے حق میں نہیں تھی۔ شاید کسی کو مطمئن کرنے کے لیے کارروائی پھر سے ہوتی یا میری سزا میں کوئی تبدیلی کی جانی تھی۔ شاید سادہ پھانسی کی بجائے کوئی اور طریقہ اختیار کیا جاتا جس میں آدمی عبرتناک انداز سے موت سے ہمکنار ہوتا ہو۔ بہرحال جو بھی تھا جلد میرے سامنے آ جاتا۔ ہم دربار میں پہنچے تو مجھے اندازہ ہوا کہ آج دربار عام نہیں تھا کیونکہ دونوں طرف کرسیوں پر موجود عام درباری اس وقت موجود نہیں تھے۔ وزیراعظم سربان کے علاوہ وہاں صرف دو افراد اور تھے اور ان کے حلیے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ پجاری تھے۔ ان میں سے ایک کسی قدر پستہ قد اور بھاری چہرے والا شخص تھا۔ اس کی متورم آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بلانوش ہے۔ دوسرا فرد جو اس کے ذرا پیچھے کھڑا تھا اس کے مقابلے میں طویل قامت اور خوشرو تھا۔ نقوش سے وہ کم عمر لگ رہا تھا مگر اس کی عمر تمیں سے زیادہ ہی تھی۔ رائل نے مجھے ان کے سامنے پیش کیا اور بولا۔

''ریاست کا مجرم حاضر ہے۔''

”یہ وادی کا مجرم ہے۔“ بھاری چہرے والے نے سخت لہجے میں کہا۔ ”وادی کا مجرم اصل میں معبد کا مجرم ہوتا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ صرف مہا پجاری کر سکتا ہے۔“

ریناٹ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے غصہ نظر آیا مگر دوسرے لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا اور عیاری سے بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مہا پجاری، مگر میں نے اسے ذاتی توہین پر وہی سزا دی ہے جو آپ اسے وادی میں آنے کی صورت میں دیتے۔“

”اس کے باوجود یہ معبد کے معاملے میں کھلی مداخلت ہے۔“ بھاری چہرے والا بولا جو یقیناً مہا پجاری یا اس کا نمائندہ تھا۔ ”شاہ اعظم یہ نہ بھولیں کہ اس وقت وہ بہت مشکل میں ہیں اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی مشکل میں اضافہ نہیں کریں گے۔“

ریناٹ کا چہرہ مرجھا گیا تھا اس نے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مہا پجاری میری عزت رکھ لیں کیونکہ میں اس دربار عام میں موت کی سزا سنا چکا ہوں۔“

اس سے پہلے کہ مہا پجاری کچھ کہتا اس کے عقب میں موجود خوش رو آدمی نے ذرا جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر شاہ اعظم کسی کارروائی سے پہلے معبد کو اعتماد میں لے لیتے تو شاید کوئی راستہ نکل آتا مگر اب یہ ممکن نہیں ہے۔ وادی کے مجرم کو فوری طور پر ہمارے حوالے کیا جائے تاکہ اس پر مقدمہ چلا کر اسے سزا دی جا سکے۔“

ریناٹ شاید اس کے لیے تیار نہیں تھا مگر وزیر اعظم سربان نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور یقیناً یہی مشورہ دیا کہ یہ وقت معبد سے الجھنے کا نہیں ہے۔ ریناٹ کو پہلے ان حریفوں پر توجہ دینی چاہیے جو اس کے اقتدار کے لیے براہِ راست خطرہ ہیں۔ معبد کے پجاریوں اور برف والے سے بعد میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔ ریناٹ نے بادل ناخواستہ سر ہلایا اور رائل کو حکم دیا۔ ”قیدی کو مہا پجاری کے حوالے کر دیا جائے۔“

مہا پجاری کے چہرے پر جو فاخرانہ تاثرات آئے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ نہایت جاہ پسند اور اپنے اختیارات کے معاملے میں ضدی شخص تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے ریاست اور معبد میں اچھے تعلقات مشکل تھے دوسری طرف ریناٹ کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا تھا۔ مگر یہ دونوں اصل میں مفاد پرست تھے۔ اگر ان کا مفاد ہوتا تو یہ جھکنے میں ایک لمحہ نہ لگاتے اور اگر مفاد نہ ہوتا تو آنکھیں پھیرنے میں دیر نہ کرتے۔ مگر فی الحال دونوں کی بن رہی تھی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے غیر متوقع مگر میرے حق میں تھی۔ میری سزا کا فیصلہ کچھ دیر کے لیے ٹل گیا تھا۔ ریناٹ رائل کو حکم دے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ اس دوران میں، میں بالکل خاموش رہا اور پھر رائل مجھے اسی حالت میں مہا پجاری اور اس کے ساتھی کے ہمراہ باہر لایا جہاں بیل گاڑیوں کے ساتھ مہا پجاری کا حفاظتی دستہ موجود تھا۔ چند ایک پجاری مزید تھے جو باہر ہی رہے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا یہاں صرف پجاریوں کو سواری استعمال کرنے کی اجازت تھی ورنہ میں نے اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کو بھی پیدل چلتے دیکھا تھا۔ البتہ ریناٹ کا علم نہیں تھا کہ جب وہ باہر نکلتا ہوگا تو کوئی سواری استعمال کرتا ہے۔ رائل نے مجھے اسی حالت میں پجاریوں کے حوالے کر دیا اور انہوں نے مجھے ایک بیل گاڑی میں سوار کرایا۔ مجھے یاد آیا کہ معبد جو آرگون سے باہر تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے ایک طویل سرنگ میں سفر کرنا پڑتا تھا اور اس سرنگ میں سفر بیل گاڑیوں کی مدد سے ہوتا تھا۔ بیل گاڑیاں شمال کی طرف روانہ ہوئیں اور کوئی دس منٹ بعد ہم سرنگ کے دہانے کے سامنے تھے۔ یہ خاصی چوڑی سرنگ تھی اور اس میں آنے جانے کے راستے الگ الگ تھے۔ یہاں رائٹ ہینڈ ڈرائیو تھی۔ مہا پجاری کا قافلہ تین بیل گاڑیوں پر مشتمل تھا اور ان پر سنہری رنگ کے پرچم نصب تھے اس لیے جہاں سے یہ گاڑیاں گزرتیں وہاں سب رک جاتے اور لوگ مہا پجاری کی بیل گاڑی کے آگے جھک جاتے تھے۔

مہا پجاری اور اس کا نائب پہلی بیل گاڑی میں تھے۔ دوسری بیل گاڑی میں عام پجاری تھے اور میں تیسری بیل میں معبد کے سپاہیوں کے ساتھ تھا۔ مراتب کے لحاظ سے تینوں گاڑیوں میں فرق تھا۔ باہر ابھی دن تھا مگر سرنگ میں روشنی کے لیے مشعلیں جلانا پڑ رہی تھیں اور ہر چند قدم کے بعد دیوار پر ایک مشعل لگی ہوئی تھی۔ سرنگ کوئی بیس فٹ چوڑی تھی۔ اس کی چھت کو لکڑی کے تختے لگا کر مضبوط کیا گیا تھا اور ان تختوں کو ترچھے ستون سہارا دے رہے تھے جو پتھروں کی مدد سے نصف دیوار تک میں نصب تھے۔ ہر سو گز کے بعد چھت میں سوراخ نظر آتا تھا جو یقیناً تازہ ہوا کی آمد و رفت کے لیے تھا۔ شہر اور یہ سرنگ دیکھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ بے شک جدید ٹیکنالوجی سے ناواقف تھے اور ان کے پاس کوئی کام کی دھات بھی نہیں تھی مگر ان کی ذہانت میں شبہ نہیں تھا کہ انہوں نے اس محدود جگہ رہتے ہوئے بھی

ہر ممکن سہولت حاصل کر لی تھی۔ ورنہ ہماری دنیا میں کتنے ہی قبائل ایسے ہیں جو جدید دنیا سے واقف ہو چکے ہیں اس کے باوجود صدیوں پرانے اور بہت محدود انداز میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے ذرا بھی ترقی نہیں کی تھی۔

میرے جسم پر جو کپڑا تھا یہ کپاس یا لینن جیسے کسی ریشے کا بنا ہوا تھا اور اس کی نرمی اور صفائی ہماری اعلیٰ درجے کی لان یا کاٹن سے کم نہیں تھی۔ سردیوں میں یہ نہ جانے کون سا لباس پہنتے ہوں گے کیونکہ یہ کپڑا یقیناً سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ شاید یہ جانوروں کے اون اور ان کی کھالوں سے سردیوں کے ملبوسات بناتے ہیں۔ چمڑے سے جوتے اور چپل بھی بہت صفائی سے تیار کرتے تھے اور میں نے یہاں لوگوں کے پیروں میں کئی طرح کے ڈیزائن کی چپلیں اور جوتے دیکھے تھے۔ یہ لکڑی کے کام کے بھی ماہر تھے اور اپنے مکان، پکی اینٹ، پتھر اور لکڑی سے بناتے تھے۔ جب میں یہاں آرہا تھا تو میں نے کھیتوں میں کئی طرح کی اجناس لگی دیکھی تھیں کیونکہ پودوں میں فرق تھا اسی طرح باغات میں کئی طرح کے درخت لگے ہوئے تھے۔ یہاں کے طویل موسم سرما کے پیش نظر امکان یہی تھا کہ یہاں زمین سے سال میں ایک فصل ہی حاصل کی جا سکتی ہوگی۔ مگر محدود آبادی کے سبب کم خوراک بھی ان لوگوں کو کافی تھی۔

میں نے دیکھا کہ یہاں لوگ صحت مند تھے اگرچہ شاذ ہی کوئی شخص موٹا نظر آیا مگر دبلے افراد کی تعداد بھی کم تھی اور بیشتر متناسب جسموں کے مالک تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں پوری خوراک مل رہی تھی۔ میں جس بیل گاڑی میں تھا اس میں میرے ساتھ تین سپاہی بیٹھے تھے اور چوتھا فرد جو سپاہی کی وردی میں تھا بیل گاڑی ہانک رہا تھا۔ گاڑی چلانے والے جانور بیل سے ضرور ملتے تھے مگر یہ بیل کی طرح سست نہیں تھے اور بغیر ہانکے خاصی تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھے سپاہی کچھ دیر تو خاموش رہے لیکن پھر انہوں نے دھیمی آواز میں آپس میں گفتگو شروع کر دی۔ وہ میری طرف سے مطمئن تھے کہ میں بندھا ہوا ہوں۔ اس لیے ان کا دھیان میری طرف نہیں تھا اور ان کے اسی اطمینان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ میں کلائی میں بندھی رسی کو حرکت دے کر ڈھیلا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آج پھر خواری ہوگی۔'' ایک سپاہی نے کہا۔ ''یہ منحوس ساتھ ہے اب اس کی نگرانی کرنی ہوگی۔''

''مجھے تو آج رات نورینو سے ملنا تھا۔'' دوسرے سپاہی نے ٹھنڈی سانس لی۔

''پتا نہیں یہ کون ہے اور مہا پجاری اسے کیوں لے جا رہے ہیں۔'' تیسرے نے کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ معبد کے سپاہی تھے اور ظاہر ہے کہ بیشتر وقت آرام کرتے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ میری آمد سے ان کا آرام کم نہ ہو جائے۔ جب وہ میری طرف دیکھتے تو میں ساکت ہو جاتا اور جب آپس میں بات کرتے تو ہاتھ کی رسی ڈھیلی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک بار میرا ہاتھ کھل گیا تو پہلے میں ان سپاہیوں سے نمٹوں گا۔ ان کے پاس تیر کمان اور نیزے تھے۔ اس کے علاوہ کسی پتھر سے بنے گول اور نوکدار ہتھیار تھے جن کی لمبائی فٹ بھر تھی اور شاید انہیں خنجر کی طرح استعمال کیا جاتا ہوگا۔ سامنے سے وار کرنے کی صورت میں یہ مہلک ہتھیار ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ ہتھیار انہوں نے دو دو کر کے اپنے پٹکوں میں اڑس رکھے تھے۔ مجھے اب تک ان کے پاس کوئی دھار والا ہتھیار نظر نہیں آیا تھا۔ کیونکہ دھار والے آلات کے لیے دھات لازمی تھی اور یہ صرف سونے اور چاندی سے واقف تھے جن سے ہتھیار یا اوزار نہیں بن سکتے۔

راجا عمر دراز نے بتایا تھا کہ سرنگ کا سفر آدھے گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اہرام نما معبد آرگون سے کوئی تین میل کی مسافت پر تھا۔ یہ معبد بجائے خود ایک چھوٹا سا قلعہ تھا مگر اس کی فصیل معبد کو چاروں طرف پائے جانے والے ہارن، اسمار اور گونز سے محفوظ رکھنے کے لیے تھی۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے کوئی بیس منٹ ہونے کو آئے تھے اور میں نے مسلسل کوشش کر کے رسی کسی قدر ڈھیلی کر لی تھی مگر اب بھی اس میں سے ہاتھ نکالنا مشکل تھا۔ میں کوشش کرتا تو ہاتھ نکل آتا مگر اس میں زور لگانا پڑتا اور یہ چوکنا ہو جاتے۔ میں چاہتا تھا کہ انہیں آخری وقت تک پتا نہ چلے۔ اس لیے رسی کو مزید ڈھیلا کرتا رہا۔ مگر عین اس وقت جب میں نے رسی اتنی ڈھیلی کر لی تھی کہ ہاتھ نکال سکوں۔ اچانک ہی سرنگ ختم ہو گئی اور ہم معبد کے احاطے میں نکل آئے۔ یہاں بے شمار لوگ تھے جو مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

راستے کے دونوں طرف سبزہ زاروں میں پجاری حسین لڑکیوں کے ساتھ چہل قدمی اور خوش گپیوں میں معروف تھے۔ ہر پجاری نے ویسا ہی سنہری رنگ کا لبادہ پہنا ہوا تھا جو مہا پجاری نے بھی پہن رکھا تھا۔ فرق صرف ان لبادوں پر پائے جانے والے نشانات تھے۔ جن سے پتا چلتا تھا کہ کون کس رتبے کا پجاری ہے۔ جو پجاری نہیں تھے

انہوں نے سفید رنگ کے لباس پہن رکھے تھے اور ان میں لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ یہ خدام اور خادمائیں تھیں۔ یہاں بے شمار سپاہی بھی نظر آرہے تھے۔ میں رک گیا کیونکہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں فرار کی کوشش احمقانہ حرکت ہی ہوتی میں چند منٹ میں پکڑا یا مارا جاتا۔ میں نے دیکھا معبد کے احاطے میں عام راستے بھی ان پتھروں سے بنے ہوئے تھے جن پتھروں سے آرگون میں امرا کے محلات بنے تھے۔ سبزہ زاروں کا معیار کسی طرح بھی مغرب میں پائے جانے والے سبزہ زاروں سے کم نہیں تھا۔

میں نے کم سے کم وطن عزیز میں اس معیار کے سبزہ زار نہیں دیکھے۔ ان میں پھولدار پودوں کے تختے تھے۔ سلیقے سے تراشے ہوئے آرائشی درخت تھے اور جیسے شیو کی ہوئی گھاس تھی۔ سفید پتھر اور سنہری لکڑی کی بینچیں تھیں۔ کہیں کہیں کرسیاں اور میزیں چھپروں تلے نظر آرہی تھیں یہ شاید اعلیٰ پجاریوں کے لیے مخصوص تھیں۔ مگر یہ سب سلیقے اور نظم و ضبط سے زیادہ اس جبر کا نتیجہ تھا جو اوپری طبقے نے نچلے طبقے پر نافذ کر رکھا تھا اور اس جبر کی مدد سے وہ ان سے سب کرا رہے تھے۔ میں نے یہاں خادموں کے چہروں پر وہی بے رونقی اور روبوٹ جیسے تاثرات دیکھے جو شہر کے لوگوں کے چہروں پر نظر آتے تھے۔ راجا عمر دراز ان لوگوں سے ملا ہوا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ عام لوگ جذبات سے اس حد تک عاری تھے کہ وہ ہنسنا ہی نہیں جانتے تھے۔

بیل گاڑیاں پختہ راستوں سے گزرتی ہوئی اس اہرام نما عمارت کے پاس آکر رکیں۔ نزدیک سے یہ عمارت بہت ہی بڑی اور ہیبت طاری کر دینے والی تھی۔ میں نے مصر کے اہرام ٹی وی اور تصویروں میں دیکھے ہیں اس لیے زندگی میں پہلی بار کوئی اہرام پاس سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ سب سے بڑا اہرام جسے خوفو کا اہرام بھی کہتے ہیں اس کی بلندی زمین سے کوئی چار سو پچاس فٹ ہے جب کہ یہ اہرام مجھے زیادہ بلند لگ رہا تھا اور اس کی بنیاد بھی زیادہ چوڑی تھی۔ یہی اہرام اصل میں معبد تھا۔ یہاں عبادت کی رسومات ادا کی جاتی تھیں اور پجاری اجلاس کر کے اہم فیصلے کرتے ہوں گے۔ مہا پجاری اور اس کے قریبی ساتھی بھی اسی جگہ رہائش رکھتے تھے۔ دوسرے پجاریوں کی رہائش کے لیے یہاں دوسری عمارتیں بھی تھیں۔ یہاں چند ایک سپاہی تھے مگر زیادہ لوگ نظر نہیں آرہے تھے۔ میرے خیال میں یہ موقع تھا اگر میں آزاد ہو جاتا اور کسی طرح مہا پجاری کو یرغمال بنا لیتا تو میں یہاں سے فرار ہو سکتا تھا۔ مہا پجاری اور اس کا نائب بیل گاڑی سے اتر آئے تھے۔ میں ہاتھ کھولنے جا رہا تھا کہ مہا پجاری نے اپنے نائب سے کہا۔ ”کیرٹ اسے اندر لے کر آؤ۔“

نیچے آنے کے بعد سے میں نے کئی بار اس شخص کے بارے میں سوچا تھا جس کا نام مجھے برف والے نے دیا تھا اور میں کسی حد تک اس کی کھوج میں بھی تھا مگر اب تک وہ مجھے نہیں ملا تھا۔ رائل کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شاید وہی کیرٹ ہے اور کیرٹ مہا پجاری کا نائب نکلا تھا۔ اپنا نام لیے جانے پر کیرٹ نے مہا پجاری کی بجائے میری طرف دیکھا اور سر کو بہت خفیف سی جنبش دی۔ کسی دوسرے نے یہ بات نوٹ نہیں کی مگر میں نے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسی طرح جوابی جنبش دی۔ مہا پجاری میری طرف توجہ دیئے بغیر اس چھوٹے سے سرنگ نما راستے سے اندر جا رہا تھا۔ جو اہرام کے ایک طرف دیوار میں موجود تھا۔ راستے کے آغاز میں چوکور اور کسی قدر آگے نکلی ہوئی آرچ تھی۔ کیرٹ نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”اسے اندر لے کر آؤ۔“

وہ خود بھی مہا پجاری کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس نے وضاحت نہیں کی تھی کہ مجھے کہاں لانا تھا اس کا مطلب ہے سپاہی جانتے تھے کہ مجھے کہاں لے جانا ہے اور انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر مارچ شروع کر دی۔ سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے تو یہ کچھ دور تک تو سیدھا رہا پھر اوپر جانے لگا۔ یعنی بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ آگے جا کر یہ دو حصوں میں بٹ گیا اور مجھے بائیں طرف لے جایا گیا۔ اس بار راستہ نیچے جا رہا تھا اور ہم ایک چھوٹے ہال میں آنکلے۔ یہاں دیوار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے آگے پتھر کے جالی والے دروازے تھے۔ ایک سپاہی نے دور دیوار پر لگا ہوا ایک لیور نیچے کھینچا تو ایک کمرے کے آگے موجود دروازہ فرش میں دھنس گیا۔ سپاہیوں نے مجھے کمرے میں دھکیل دیا اور فوراً ہی سنگی دروازہ اوپر ہو گیا۔ جب عمر دراز یہاں آیا تھا تو اسے ایک الگ عمارت میں قید کیا گیا تھا جو قید خانے کے لیے مخصوص تھی اور اسی عمارت کے نیچے تہہ خانے میں ہارن والا کنواں تھا۔

مگر اب قیدیوں کو یہاں رکھا جاتا تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا جو اصل میں ذرا بڑے سائز کا ڈبا تھا۔ یہ چار فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا تھا جب کہ اس کی چھت چھ فٹ اونچی تھی اگر میں پورے قد سے کھڑا ہوتا تو میرا سر چھت سے ٹکراتا۔ فرش پر گھاس بچھی تھی مگر یہ بو اور سیلن سے پاک

تھی اس لیے مجھے اس پر بیٹھتے ہوئے کراہیت محسوس نہیں ہوئی۔ جب ہم اہرام میں داخل ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔

کچھ دیر میں ماحول تاریک ہو جاتا اور اگر میرا فیصلہ اگلی صبح ہونا تھا تو تب تک مجھے اسی ڈربے میں قید رہنا تھا جس میں انسان نہ ڈھنگ سے لیٹ سکتا تھا اور نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اگر میں دروازے کی مخالف سمت والی دیوار سے ٹیک لگا کر پاؤں سیدھا کرتا تو یہ دروازے کو چھوتے اور دوسری طرف بیٹھنے کی صورت میں، میں پاؤں بھی سیدھے نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ جگہ معبد کے معتوبین کے لیے مخصوص تھی جن کے لیے قید بھی مسلسل آزار بنا دی جائے۔ جیسا کہ انسانوں کو پنجروں میں بند کیا جاتا ہے اور وہ مستقل ایک ہی پوزیشن میں رہنے کی وجہ سے اپنی فطری حالت کھو دیتے ہیں۔

کیرٹ کا نام سن کر میں نے مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور نہ جانے مجھے اس کا کیا صلہ ملتا۔ اب میرے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہاں بھی اندر مشعلیں جل رہی تھیں اور ان مشعلوں میں کوئی ایسا روغن یا کسی جانور کی چربی استعمال کی جاتی تھی کہ اس سے ہلکا سا دھواں اٹھتا تھا اور یہ دھواں شاید مچھر مکھی اور اسی قسم کے کیڑے مکوڑوں کو دور رکھتا تھا۔ کیونکہ میں نے یہاں اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی جب کہ یہاں وادی میں جتنا سبزہ تھا ان کیڑے مکوڑوں کی موجودگی لازمی تھی۔ البتہ یہ دھواں ناگوار نہیں لگ رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر یہاں گھٹن نہیں تھی جب کہ بظاہر یہ جگہ بند تھی اور آمد و رفت کا ہی ایک راستہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وینٹی لیشن کا کوئی چھپا ہوا بندوبست تھا۔ مصری اہرام بنانے والے بتدریج اس مقام تک پہنچے تھے کہ بڑے اہرام بنا سکیں۔ یعنی انہوں نے پہلے چھوٹے اہرام بنائے اور پھر وہ اس قابل ہوئے کہ ان ہی نمونوں پر بڑے اہرام بنا سکیں۔

میں حیران تھا کہ یہاں کے لوگوں نے کس طرح ایک ہی بار میں اتنا بڑا اہرام بنا لیا تھا۔ اس کی تعمیر میں بھی پتھروں کی بڑی بڑی سلیں استعمال ہوئی تھیں۔ بلندی پر ان سلوں کو کیسے پہنچایا گیا ہوگا جب کہ ہر ایک کا وزن کئی ٹن ہوگا۔ یہ راز ہے کہ اہرام کیسے تعمیر ہوئے تھے۔ ماہرین آج بھی درست طور پر نہیں بتا سکتے کہ مصریوں نے ناقابل یقین وزن کے پتھر اتنی بلندی تک کیسے پہنچائے۔ صرف مصر نہیں بلکہ دنیا میں اور بھی جگہوں پر پتھر کی بلند و بالا تعمیرات ہوئی ہیں اور ان میں بھی بے پناہ وزنی پتھروں کو جس طرح استعمال کیا گیا ہے وہ ماہرین کو آج بھی حیران کر دیتا ہے۔ شاید آغاز میں یہاں آنے والے اسی قدیم نسل سے تعلق رکھتے ہوں جس نے ساری دنیا میں اہرام بنائے تھے اور اس نسل سے اپنا تعلق واضح کرنے کے لیے انہوں نے یہاں بھی اہرام بنایا۔

کئی گھنٹے بعد مجھے باہر سپاہیوں کی نقل و حرکت محسوس ہوئی اور پھر سنگی دروازہ فرش میں دھنس گیا۔ دو سپاہی باہر موجود تھے اور انہوں نے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ ہاتھ میں نے پہلے ہی کھول لیے تھے کیونکہ میں مستقل بندھے رہنے کی اذیت برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ سپاہی مجھے آزاد ہاتھ دیکھ کر چونکے مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں اور میرے پاؤں بھی کھول دیے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ حالات میں تبدیلی آئی تھی اور اب میں اتنا معتوب نہیں رہا تھا کہ مجھے مستقل باندھ کر رکھا جاتا۔ آنے والے سپاہی دو تھے اور وہ مجھے لے کر روانہ ہوئے۔ دوراہے سے باہر کا رخ کیا گیا اور ہم باہر آئے تو آسمان تاریک تھا اور ہوا میں رات کی خوشبو آ گئی تھی۔ سپاہی مجھے اپنے جلو میں لیے ایک چھوٹی اور خوب صورت عمارت کی طرف بڑھے۔ وہ بالکل خاموش تھے اس لیے میں اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے بلانے والا کون تھا۔ میرا ذہن کیرٹ کی طرف گیا تھا اور کچھ دیر بعد اس عمارت کے ایک کمرے میں اسے موجود پایا۔ اس نے سپاہیوں کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور پھر مجھ سے بولا۔ ”بیٹھ جاؤ شہباز۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”تم بھی مجھے جانتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”برف والے نے تمہیں میرا نام بتایا ہوگا۔“

میں تذبذب میں تھا ایک بار میں دھوکا کھاتے کھاتے رہ گیا تھا اور اب دوبارہ دھوکا کھا سکتا تھا۔ میرے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ وہی کیرٹ ہے جس کا نام برف والے نے لیا تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ میں کس کشمکش میں ہوں۔ اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ”ڈرومت میں ہی کیرٹ ہوں اور برف والے نے تمہیں میرا ہی نام یاد رکھنے کو کہا تھا۔“

اب مجھے کسی قدر اطمینان ہوا کیونکہ اس نے درست کہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے کھل کر بات کرنے سے گریز کیا اور بولا۔ ”فرض کرو تم ہی وہ کیرٹ ہو جس کے بارے میں برف والے نے کہا تھا۔ تب بھی اس سے کیا ہوگا کیونکہ برف والے نے مجھے کچھ اور نہیں بتایا ہے۔“

"وہ تمہیں میں بتاؤں گا۔ لیکن تم بیٹھ جاؤ۔ اطمینان رکھو یہاں ہونے والی گفتگو راز رہے گی۔"

میں جوتے اتار کے اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ "مگر مہا پجاری تک یہ اطلاع پہنچ سکتی ہے کہ تم نے مجھ سے ملاقات کی ہے۔"

"یہ ملاقات اسی کی ہدایت پر ہو رہی ہے۔"

میں چونکا۔ "کیا مہا پجاری بھی......"

اس نے ہاتھ اوپر کیا۔ "نتیجہ اخذ کرنے میں جلد بازی مت کرو۔ فیرون ایک عیاش اور جاہ پسند شخص ہے۔ رات ہوتے ہی وہ عیش وعشرت میں کھو جاتا ہے اور یہ اس کی ڈھیل ہے جو وادی میں انتشار پھیلا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں کل سزا سے پہلے تم سے تفتیش کرلوں۔"

"لیکن وہ مجھے ریناٹ کے پاس لے آیا ہے؟"

"اس کے پیچھے بھی میرا دباؤ تھا ورنہ وہ شاید اس کی پروا نہیں کرتا۔"

"ٹھیک ہے تم نے مجھے ریناٹ سے بچا لیا ہے مگر فیرون تو مجھے سزائے موت ہی دے گا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تمہیں سزائے موت دی جائے گی اور تمہیں ہارن کے سامنے پھینک دیا جائے گا۔"

میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ "اتنی خوفناک سزا۔"

"معبد کے مجرموں کو عام طور سے یہی سزا دی جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے مجھے یہ سزا دے دی جاتی ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"تمہیں سزائے موت دے دی جائے گی مگر تمہیں یہاں سے نکال دیا جائے گا۔" اس نے یوں سرسری سے انداز میں کہا جیسے اس کے لیے یہ معمولی بات ہو۔

"وہ کیسے؟"

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے اعتماد سے کہا۔ "تم یہاں سے نکل کر سامیرا کے پاس جاؤ گے۔ تمہیں اس پلان پر عمل کرنا ہے جو سامیرا کے پاس ہے۔"

"کیسا پلان؟"

"یہی کہ کم سے کم خون بہائے بغیر آرگون کو ریناٹ سے نجات دلائی جائے۔ وقت بہت کم ہے کیونکہ جلد ریناٹ خود اپنی فوج لے کر حریفوں کے خلاف لشکر کشی کرنے والا ہے اور وہ بھی کمزور نہیں ہیں تم سوچ سکتے ہو کہ دونوں طرف سے کتنا نقصان ہوگا۔"

"تب مجھے سامیرا کے پاس بھیج دیا جاتا یہاں کیوں بھیجا گیا ہے۔"

"اس کی وجہ ہے۔" کیرٹ کسی قدر بے چینی سے بولا۔ "میرے پاس وقت کم ہے، تمہیں صرف مجھ سے ملنے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ کیونکہ جو میں تمہیں بتا سکتا ہوں وہ کوئی اور نہیں بتا سکتا ہے۔"

"تم کیا بتا سکتے ہو؟"

"ڈیوڈ شا اور اس کے تین ساتھی نیچے آچکے ہیں اور وہ اس وقت ریناٹ کے خاص مہمان ہیں۔ تمہارے بارے میں ڈیوڈ شا نے ہی ریناٹ کو بتایا اور اسی نے رائل کو اس قابل بنایا کہ وہ تم سے بات کر سکے۔"

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ایک تو اس بات پر کہ ڈیوڈ شا نیچے آچکا تھا دوسرے وہ برف والے جیسی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ میں نے خاصی دیر بعد پوچھا۔ "وہ نیچے کیسے آیا؟...... عام راستہ تو برف والے کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

"میں نہیں جانتا مگر مجھے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ ڈیوڈ شا اور اس کے تین ساتھی اس وقت ریناٹ کے پاس ہیں۔" کیرٹ نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں ڈیوڈ شا کے بارے میں کس نے بتایا ہے؟"

"برف والے نے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے یہاں اس کی موجودگی کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"ریناٹ کے گرد معبد کے جاسوس ہیں جو درحقیقت میرے جاسوس ہیں۔"

"برف والا ڈیوڈ شا کی نیچے آمد کے بارے میں پر یقین نہیں تھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ برف والے کے خلاف سازش کر رہا ہے؟"

"ہاں کیونکہ اسے برف والے اور تم سے ہی خطرہ ہے اس لیے وہ تم دونوں سے نجات چاہتا ہے۔"

یہ تو تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔ پہلے ولیم شا اور اس کے ساتھی اورگان کے بھائی اور مہا پجاری موران کے مہمان بن گئے تھے اور انہوں نے اپنی مکاری سے کام لے کر اسے اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ اب ڈیوڈ شا نے بھی یہی کام آرگون کے حکمران کے ساتھ کیا تھا۔ "کیا وادی کے دوسرے لوگ جانتے ہیں کہ باہر سے آئے کچھ لوگ ریناٹ کے مہمان ہیں؟"

"نہیں وہ خاموشی سے نیچے آئے اور ڈیوڈ شا نے ریناٹ سے رابطہ کیا۔ میں نے اسے دیکھا نہیں ہے لیکن میں

محسوس کر رہا ہوں کہ اس شخص میں خوفناکی بہت زیادہ ہے۔''

''تم نے درست کہا، یہ اس ولیم شا کا رشتے دار ہے جو برسوں پہلے اس وادی میں آیا تھا مگر یہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ مکار ہے، اسے سازشوں کا وسیع تجربہ ہے۔اس کی یہاں آمد بہت بڑے فتنے کا سبب بن سکتی ہے۔''

''برف والے نے مجھے ان سب باتوں سے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔'' کیرٹ نے کہا۔''یوں سمجھ لو کہ معبد کے سارے معاملات میں چلا رہا ہوں اور فیرون کا واسطہ بہت کم رہتا ہے۔ اس سے پہلے ہم غیر جانبدار تھے۔ مگر غیر ملکیوں کی آمد کے بعد ہمارا غیر جانبدار رہنا ممکن نہیں ہے۔''

''فرض کرو کہ تمہاری بجائے یہ معاملہ فیرون کے علم میں آتا تو وہ کیا کرتا؟''

''میں نے کہا نا اسی کی بے پروائی کی وجہ سے حالات خراب ہوئے۔ ریناٹ معبد کی نگرانی سے بے نیاز ہوا تو اس نے پر پرزے نکالے اور لوگوں پر ظلم وستم کرنے لگا۔ اس نے بغاوت کو جنم دیا اور اب وادی میں ہماری بقا خطرے میں پڑ گئی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر ریناٹ سے نجات حاصل کر لی جائے تو وادی کے حالات سدھر جائیں گے؟''

''بہت زیادہ امکان ہے۔''

''کیا سامیرا سربراہ بن سکتی ہے؟''

''نہیں ہمارے قانون کے مطابق کوئی عورت نہ تو وادی کی سربراہ بن سکتی ہے اور نہ ہی وہ مہا پجاری بن سکتی ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔''ٹھیک ہے میں تمہارے کام آنے کے لیے تیار ہوں لیکن میں بتا دوں یہاں تبدیلی آ کر رہے گی اور جلد تم لوگوں کو بیرونی دنیا سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ ڈیوڈ شا صرف ایک آدمی ہے اس جیسے انسانوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن پہلے ہمیں اس مسئلے سے نمٹنا ہے۔'' وہ بولا اور اپنے پاس رکھے ایک لکڑی کے صندوق سے ایک رول کیا ہوا کاغذ نکالا۔ ان کا کاغذ ہمارے کاغذ کی نسبت موٹا اور خستہ تھا۔ اس نے رول کھولا اور اسے میرے سامنے بچھایا۔ یہ آرگون اور معبد کا بڑا نقشہ تھا۔ اس میں دونوں کو ملانے والی سرنگ بھی واضح تھی۔ کیرٹ نے نقشے پر بنے چھوٹے سرخ نشانات کے بارے میں بتایا۔''یہاں ہمارے لوگ موجود ہیں مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے، پورے آرگون میں مشکل سے ایک درجن مقامات پر ہمارے خفیہ دستے ہیں اور یہ اسی صورت میں کچھ کر سکتے ہیں جب ریناٹ کی گرفت آرگون پر ڈھیلی ہو جائے۔'' پھر اس نے سرنگ پر ایک جگہ انگلی رکھی۔''یہاں سے اندر آنے کا راستہ ہے۔ میرے کچھ آدمی کوشش کر کے یہاں ایک چھوٹا راستہ بنا چکے ہیں اور اسے اندر آنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' پھر اس نے ایک اور جگہ انگلی رکھی۔''یہاں آرگون کی فصیل میں ایک خفیہ راستہ ہے۔ مگر یہ صرف اندر سے کھل سکتا ہے اور یہاں ریناٹ کے انتہائی اعتماد کے لوگ موجود ہیں۔ اگر یہ راستہ کسی طرح کھل جائے تو براہ راست شاہی علاقے تک رسائی ہو سکتی ہے اور حملہ کرنے والی فوج کو شہری علاقوں سے نہیں گزرنا پڑے گا۔''

میں نقشے کو غور سے دیکھتے ہوئے کیرٹ کی گفتگو ذہن نشین کر رہا تھا۔ جب اس نے اپنی بات مکمل کر لی تو میں نے سوالات کا آغاز کیا۔''تمہارے پاس یہ معلومات ہیں تو تم نے براہ راست سامیرا سے رابطہ کیوں نہیں کیا اور اس معاملے میں میرا ہونا کیوں لازمی ہے۔''

''میں نے بتایا نا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔''

''کم وقت سے کیا مراد ہے؟''

''جلد میں موت سے ہمکنار ہونے والا ہوں۔'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔''یہ پیش گوئی برف والے نے کی ہے اور میرا علم بھی یہی کہتا ہے کہ میں اس کام کی تکمیل تک زندہ نہیں رہوں گا اور باہر سے آنے والا ایک فرد اسے مکمل کرے گا۔''

''کیا لازمی ہے کہ وہ فرد میں ہی ہوں؟''

اس نے شانے اچکائے۔''کیا کہہ سکتے ہیں، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ہم انسان کچھ بھی نہیں جانتے۔ بس اوپر والا جو علم اور عقل دیتا ہے اس کی روشنی میں فیصلے کرتے ہیں۔ کبھی یہ فیصلے درست ہوتے ہیں اور کبھی غلط ثابت ہوتے ہیں۔''

''اب مجھے کیا کرنا ہے؟''

''اس کا فیصلہ تم خود کرو گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کیرٹ نے مجھے جو بتانا تھا وہ بتا دیا تھا اور اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے بارے میں پوچھا۔

''میں یہاں سے کیسے نکلوں گا جب کہ مجھے ہارن کے سامنے پھینک دیا جائے گا۔''

''سزا سے پہلے تمہیں ایک مشروب دیا جائے گا اسے پینے سے جسم سے ایسی بو آتی ہے جس سے ہارن بھڑکتا ہے

اور جس کے پاس سے یہ بو آتی ہے وہ اس کے پاس نہیں آتا۔''

راجا عمر دراز نے بتایا تھا اور وہ ذاتی طور پر بھی یہ مشروب پی چکا تھا۔ اسی وجہ سے ہارن سے اس کی بچت ہوئی تھی۔ کیرٹ اسی مشروب کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ مگر جہاں تک میرے علم میں تھا یہاں ہارن ایک کنویں نما جگہ تھا اور اس میں سے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے کیرٹ سے کہا تو اس نے جواب دیا۔ ''نہیں جگہ ہے، ہارن کو اس کنویں میں ایک خاص راستے سے ہی لایا جاتا ہے اور پھر اسے بند کر دیا جاتا ہے تم اسی راستے سے باہر جا سکو گے۔''

''وہ راستہ بند ہوگا؟''

''نہیں وہ ہارن کے لحاظ سے بند ہوتا ہے انسانوں کے لحاظ سے نہیں۔ تم اس سے نکل سکو گے۔''

''یہ راستہ کہاں نکلتا ہے؟''

''یہاں اس جنگل میں۔'' اس نے معبد کے نزدیک ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں نکلنے کے بعد تم اس قلعے تک جاؤ گے۔'' اس نے آرگون سے ذرا فاصلے پر جنوب میں واقع ایک گول دائرے پر انگلی رکھی۔ ''سامیرا یہیں ہے۔''

''کیا وہ مجھے جانتی ہے؟''

''ہاں اور وہ تمہاری منتظر ہے۔''

میں نے چند سوالات مزید کیے اور جوابات ذہن نشین کرتا رہا۔ کیرٹ کا انداز بتا رہا تھا اور خود میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ اب شاید اس سے ملاقات نہ ہو سکے۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا جیسے کوئی بات کہنا چاہ رہا ہو اور ہچکچا رہا ہو۔ مگر پھر اس نے کہہ دیا۔ ''شہباز میں جو کر رہا ہوں وہ بلا غرض نہیں کر رہا اس میں میری بھی ایک غرض ہے۔''

''کیسی غرض؟''

''میری ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ دو سال کی تھی جب میری بیوی مر گئی اور پھر میں نے اسے ماں باپ دونوں بن کر پالا ہے۔ ایک پجاری کی بیٹی کی حیثیت سے اس کی شادی کسی پجاری سے ہی ہو سکتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ ساری عمر جلتی کڑھتی رہے۔ اس وادی کے سب سے خود غرض، سفاک اور عیاش لوگ یہاں موجود پجاری ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ خوش رہے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔ وہ تم پر بوجھ نہیں ہوگی اس کے پاس بہت قیمتی جواہرات ہیں جو تمہاری دنیا میں بہت زیادہ قیمت رکھتے ہیں۔ شہباز میں تم سے وعدہ نہیں لے رہا لیکن اگر تم کامیاب رہو اور اس وادی کے معاملات تمہارے ہاتھ میں آئیں تو تم جاتے ہوئے ساشا کو یہاں سے لے جانا۔''

میں سوچ میں پڑ گیا پھر میں نے کہا۔ ''کیونکہ تم کوئی وعدہ نہیں لے رہے اس لیے میں بھی دعویٰ نہیں کروں گا، میں جس راستے سے آیا ہوں وہ بہت دشوار ہے اور اس پر اچھے جوان اور مضبوط افراد ہی سفر کر سکتے ہیں۔ پھر ذرائع بھی چاہییں۔ اس لیے اگر ساشا اس سفر کے قابل ہوئی اور میرے پاس وسائل بھی ہوئے تو میں اسے لے جانے کی پوری کوشش کروں گا۔ جہاں تک بوجھ کی بات ہے تو میں نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو کبھی بوجھ نہیں سمجھا۔''

اس نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ ''میں جانتا ہوں تم جو کہتے ہو وہی کرنے پر یقین رکھتے ہو۔''

''میری قسمت کا فیصلہ کب ہوگا؟''

''کل صبح اور دوپہر تک اس پر عمل درآمد کر دیا جائے گا۔''

''جب میں غائب ہو جاؤں گا تو کیا میری تلاش نہیں کی جائے گی، ممکن ہے میں جب اس خفیہ راستے سے نکلوں تو وہاں پہلے ہی ریناٹ یا فیرون کے آدمی میرے منتظر ہوں۔''

''نہیں اسے اتفاق سمجھا جائے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی کو ہارن کے سامنے پھینکا گیا ہو اور وہ بچ گیا ہو، کوئی ایک فرد بھی نہیں بچا ہے۔''

''یہ وہی مشروب ہے جو اورگان نے ایجاد کیا تھا؟''

کیرٹ نے سر ہلایا۔ ''ہاں ہم نے اسے مزید بہتر کر لیا ہے اب یہ ہارن کے ساتھ باقی خطرناک جانوروں کو بھی پاس آنے سے روکتا ہے۔ اب تم جاؤ اور خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرو۔ یاد رکھنا جہاں سے تمہیں نیچے پھینکا جائے اس کے بائیں طرف چند قدم کے فاصلے پر وہ دروازہ ہے۔ اس پر لگے تختوں میں اتنی گنجائش ہے کہ تم وہاں سے نکل سکو گے۔''

میں واپس آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بہ ظاہر کیرٹ ٹھیک ٹھاک لگ رہا ہے یعنی کسی جان لیوا مرض کا شکار نہیں لگتا ہے، تو کیا اس کی ممکنہ موت غیر طبعی ہوگی؟ کیا اس کا راز افشا ہو جائے گا؟

وہی سپاہی مجھے واپس اسی ڈبے میں بند کر گئے تھے۔

کچھ دیر بعد کھانے کے نام پر پتا نہیں کیا دیا گیا اور میں نے

اسے کھانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ سبزیوں کے ساتھ اس سوپ نما چیز میں گوشت کے ریشے بھی تیر رہے تھے اور یہ گوشت کسی حلال جانور کا ہوتا تب بھی اسے حلال تو نہیں کیا گیا ہوگا۔ اس لیے میں صرف پانی پی کر رہ گیا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا مگر یہاں لیٹنا بھی دشوار تھا آدمی گول مول ہو کر ہی لیٹ سکتا تھا اور مجھے ویسے ہی سیدھے اور چت سونے کی عادی تھی، میں بہت کم کروٹ لیتا ہوں اس لیے جلد میرے لیے یوں لیٹنا بھی عذاب بن گیا۔

پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ دنیا بھر میں معتوبین اور جنگی قیدیوں کو اس طرح چھوٹی جگہ میں کیوں قید کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی سزا ہے جو بہ ظاہر سزا نظر نہیں آتی ہے مگر جس پر گزر رہی ہوتی ہے اسے ہی پتا چلتا ہے۔ میں کبھی پاؤں سیدھے کرتا تھا اور کبھی کمر، مگر کسی پوز میں چین و قرار نہیں تھا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد ایک نئی پوزیشن اختیار کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کھڑا ہو جاتا مگر کتنی دیر کھڑا رہ سکتا تھا۔ بالآخر میں دونوں پاؤں پھیلا کر دیوار سے کمر ٹکا کر بیٹھ گیا اور کچھ دیر اسی پوزیشن میں سویا بھی تھا۔ صبح تک میرا حشر ہو گیا تھا اور مجھے اپنے جسم کو کھولنے کے لیے اس محدود جگہ پر مختلف ورزشیں کرنا پڑی تھیں۔ یہ ورزشیں بھی میں نے اسی وقت ایجاد کی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے کبھی اس قسم کی ورزش نہیں کی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ صبح ہو گئی ہے کیونکہ باہر ابھی تک کوئی سرگرمی نہیں ہوئی تھی اور یہاں کوئی موجود بھی نہیں تھا۔ باقی ڈبے خالی تھے صرف ایک ڈبے میں، میں تھا۔ مجھے جس طرح رکھا گیا تھا اب مجھے ریناٹ رحم دل نظر آنے لگا تھا اس کی قید میں، میں آرام سے تھا اور سوائے قید کے اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔

معبد کی قید اتنی اذیت ناک تھی جو باقی معاملات میں سوچا جا سکتا تھا۔ یہ اپنے معتوبین کو ہارن کے سامنے ڈال دیتے تھے۔ میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ وادی والوں کو اصل میں ان سے نجات حاصل کرنی چاہیے تھی۔ مگر ریناٹ اس جابرانہ نظام کے نمائندے کے طور پر ان کے سامنے تھا اس لیے سارا زور اسی پر تھا اور اصل نظام کے بارے میں کوئی سوچنے کو بھی تیار نہیں تھا بلکہ برف والا اور کیرٹ جیسے اچھے لوگ بھی اسے برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور اسے وادی کی بقا کا ضامن قرار دے رہے تھے۔ مگر ساتھ ہی کیرٹ نے اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جانے کی فرمائش بھی کر دی تھی۔ برف والا اکیلا تھا ورنہ شاید وہ بھی اپنی آل اولاد کو یہاں رکھنا پسند نہ کرتا۔ یہ ایسی منافقت تھی جو وہ جان

بوجھ کر کر رہے تھے۔ میں تکلیف میں تھا شاید اس لیے ان کے خلاف بھی سوچ رہا تھا۔ ممکن ہے میں سکون سے ہوتا تو یہ خیال ہی میرے ذہن میں نہ آتا۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد مجھے آہٹ محسوس ہوئی اور میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا اور چلا کر بولا۔ ”مجھے یہاں سے نکالو۔“

آنے والا ایک ہی تھا اور اس نے میرے چلانے کا کوئی اثر نہیں لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک ہی تھا اور معبد سے تعلق رکھنے والا پجاری تھا۔ اس نے نزدیک آ کر پہلے داخلی دروازے کی طرف دیکھا اور پھر منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں چپ ہی تھا پہلا جملہ بھی اضطراری کہہ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے لباس سے ایک چھوٹی سی مٹی کی شیشی نکالی اور آہستہ سے بولا۔ ”مجھے کیرٹ نے بھیجا ہے یہ رکھ لو اور جب دیکھو کہ تمہیں یہاں سے نکالا جا رہا ہے تو اسے پی لینا اور بوتل چھپا لینا۔ سمجھ گئے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اسے بتایا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔ اس نے ایک سوراخ سے بوتل اندر کی اور واپس چلا گیا۔ یہ مشکل سے چار انچ لمبی اور دو انچ موٹی مٹی کی بوتل تھی جس کے منہ پر کارک لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاجامے کی جیب میں رکھ لیا۔ یہاں کسی کو اس کا پتا نہیں چلتا۔ اب میں ذہنی طور پر تیار تھا۔ پجاری کی آمد سے لگ رہا تھا کہ میری طلبی اب زیادہ دیر کی بات نہیں تھی۔ رات کا کھانا پیالے میں ایسے ہی پڑا ہوا تھا۔ میں بھوکا تھا مگر یہ بھوک قابل برداشت تھی اور شاید میرے لیے بہتر تھی۔ اس نے مجھے ذہنی طور پر چوکس کر دیا تھا۔ مگر میرا انتظار ایک بار پھر طویل ہونے لگا اور جب میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھک جاتا تو کھڑے ہو کر سر نیچے کر کے پنجوں کے بل آہستہ آہستہ اچھلتا تھا۔ میں اپنا جسم وارم اپ رکھنا چاہتا تھا۔ شاید ڈیڑھ یا پونے دو گھنٹے بعد سپاہی ہال میں داخل ہوئے اور ان میں سے ایک دیوار پر لگی راڈ کی طرف گیا۔

ادھر اس نے اس پر ہاتھ رکھا اور ادھر میں نے مٹی کی بوتل منہ میں ڈال لی۔ جب تک سنگی دروازہ نیچے ہوتا میں بوتل خالی کر کے واپس پاجامے کی جیب میں رکھ چکا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور میں باہر آ گیا۔ سپاہیوں کی تعداد چار تھی۔ دو مجھے بازوؤں سے پکڑ کر لے جانے لگے۔ تاریخ ایک بار پھر خود کو دوہرا رہی تھی۔ جن مراحل سے راجا عمر دراز گزرا تھا میں بھی ان سے گزر رہا تھا۔ کچھ فرق تھا جیسے مجھے برف والا پہلے ملا تھا اور راجا عمر دراز کو وہ بعد میں ملا تھا۔ اسی طرح اسے بھی ہارن کے

سامنے پھینکنے کی سزا ملی تھی اور میں بھی اس مرحلے سے گزرنے والا تھا۔ اسے بھی بچالیا گیا تھا اور مجھے بھی بچانے کا بندوبست ہوا تھا۔ میں نے جب مٹی کی بوتل کا مشروب حلق سے اتارا تو اس کا ذائقہ اچھا نہیں لگا تھا مگر اب میرے منہ میں خوشگوار سا ذائقہ آرہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے لگ رہا تھا کہ میرا جسم گرم ہو رہا ہے۔ شاید اس کی تاثیر تھی اور اس گرمی سے مجھے پسینا آتا۔ پسینے میں دوا کی بو آتی اور اس سے ہارن بھاگتا تھا۔

سپاہی مجھے معبد سے باہر لائے جہاں نیا دن طلوع ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور مجھے معبد کے پاس ایک عمارت میں لایا گیا۔ اندر گھستے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ قید خانے کی پرانی عمارت تھی مگر اب اسے گودام کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ پرانی کوٹھریاں توڑ کر وسیع ہال بنائے گئے تھے۔ وہاں اجناس اور دوسرا سامان رکھا تھا۔ پہلی منزل کے بعد تہ خانے میں بھی ہال تھے اور جب ہم اس سے نیچے والے ہال میں آئے تب اندازہ ہوا کہ ہم کسی تعذیب گاہ میں ہیں۔ وہاں شدید قسم کی بدبو تھی۔ اس بدبو میں وحشت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے حیوانوں اور سڑے گوشت کی ملی جلی بدبو ہو۔ یہاں اسمار بھی ہوتے تھے۔ جن کو سامنے زندہ معتوبین کو پھینکا جاتا تھا۔ یہ طریقہ اورگان کے بھائی موران نے نکالا تھا۔ پھر اسی نے انسانوں کو ہارن کے سامنے پھینکنا شروع کیا۔ اس کے دور تک وادی میں باہر سے آنے والے ریاست کے مجرم شمار ہوتے تھے مگر اس نے انہیں معبد کا مجرم بنا دیا۔ اسی نے راجا عمر دراز کو مجرم قرار دیا تھا اور ولیم شا کو مہمان بنا دیا تھا۔

یہ قانون اب تک برقرار تھا۔ تبھی مجھے ہارن کے سامنے پھینکنے کی سزا ملنے والی تھی۔ تہ خانے میں فیرون کے ساتھ کیرٹ اور چند اعلیٰ پجاری تھے۔ تہ خانے کے وسط میں ایک کھلا ہوا کنواں تھا جس کا قطر شاید تیس فٹ تھا اور اس کے اندر سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے کوئی گھوڑا چہل قدمی کر رہا ہو۔ کیرٹ نے مجھے بچانے کی تدبیر پہلے ہی کر لی اور مجھے معلوم تھا ہارن میرے پاس نہیں آئے گا اس کے باوجود مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ ایک جلاد تھا جب کہ نصف درجن سپاہی پہلے سے موجود تھے۔ مجھے جلاد نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ تقریباً سات فٹ کا ایسا تنومند شخص تھا کہ اس نے میرا بازو پکڑا تو مجھے لگا کہ میرا بازو کسی شکنجے میں آگیا ہے۔ میں اسے ذرا بھی جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ فیرون نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم اقرار کرتے ہو کہ تم اس وادی میں باہر سے آئے ہو؟''

''ہاں میں باہر سے آیا ہوں اگرچہ میں جان بوجھ کر نہیں آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا جس کا ترجمہ کیرٹ نے کر کے فیرون تک پہنچایا۔

''بے شک تم جان بوجھ کر نہیں آئے ہو مگر یہاں آنے والا ہر فرد موت کا مستحق ہوتا ہے۔'' فیرون نے پرخمار لہجے میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دن میں بھی پیتا تھا۔ ''اس لیے تمہیں سزائے موت دی جاتی ہے۔''

سزائے موت سنانے کے انداز میں بھی بے پروائی تھی جیسے وہ جلد از جلد یہ معاملہ نمٹا کر واپس اپنے عشرت کدے میں جانا چاہتا ہو۔ فیرون کی طرف سے سزا سنائے جاتے ہی کیرٹ نے جلاد کو اشارہ کیا تھا کہ میں نے کہا۔ ''عام طور سے سزائے موت پانے والے کی آخری خواہش پوری کی جاتی ہے۔''

کیرٹ نے میری بات فیرون تک پہنچائی اور اس نے جواب دیا۔ ''یہاں ایسا کوئی رواج نہیں ہے۔''

''پھر بھی میں چاہوں گا کہ جلاد مجھے نیچے نہ پھینکے میں خود نیچے چھلانگ لگانا چاہتا ہوں۔''

کیرٹ نے میری بات دوسروں تک پہنچائی تو فیرون اور اس کے ساتھیوں کے چہروں پر دلچسپی نظر آنے لگی۔ شاید اس سے پہلے کسی نے ایسی فرمائش نہیں کی تھی۔ فیرون نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تمہیں خود چھلانگ لگانے کی اجازت دی جاتی ہے۔''

ان کے لیے یہ حیرت انگیز تھا کہ کوئی فرد خود سے موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جا رہا تھا ورنہ اس سے پہلے جسے ہارن کے سامنے ڈالنے کی سزا دی گئی اسے زبردستی پھینکا جاتا تھا اور یہ تنومند جلاد اسی کام کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اگر میں کہوں کہ میں پُرسکون تھا تو یہ غلط ہوگا۔ میں اندر سے مضطرب تھا اور اوپر سے پرسکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ راجا عمر دراز نے اس جگہ کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ بند ہوتی تھی اور پہلے صرف ایک سوراخ ہوتا تھا جس سے معتوب کو اندر پھینکا جاتا تھا مگر اب پورا کنواں کھلا ہوا تھا اور غالباً ایسا اس لیے کیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تماشائی اندر کا منظر دیکھ سکیں۔ فیرون کے اشارے پر جلاد نے مجھے چھوڑ دیا اور میں نپے تلے قدموں سے کنویں کی طرف بڑھا۔ جیسے جیسے میں آگے جا رہا تھا بدبو شدید ہو رہی تھی اور اب بو ایسی تھی کہ آدمی آسانی سے قے کر سکتا تھا۔ میں نے سانس روکتے ہوئے اندر جھانکا۔

اب تک میں نے صرف اس مخلوق کے بارے میں سنا تھا۔ پہلے دیو مالائی کہانیوں اور فلموں میں پڑھا اور دیکھا تھا اور پھر یہاں ایک مردہ ہارن دیکھا تھا جسے اسمار کھا رہے تھے مگر پہلی بار ایک زندہ ہارن دیکھ رہا تھا۔ نیچے نیم تاریکی تھی اور ایک تنومند جانور ہلکے قدموں سے دائرے میں چل رہا تھا۔ دائرے میں چلنا اس کی مجبوری تھی۔ یہاں اس کے لیے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ اس کا اوپری دھڑ انسان سے مشابہہ تھا مگر یہ بالکل انسان جیسا نہیں تھا۔ اس کی گردن کے پیچھے ریڑھ کی ہڈی ابھری ہوئی تھی اور ہاتھوں میں انگلیوں کی کھرپے سے دکھائی دے رہے تھے۔ کنواں تیس فٹ قطر کا اور اتنا ہی اونچا بھی تھا۔ تقریباً دس فٹ لمبا اور اتنا ہی اونچا ہارن میرے اندازے کے مطابق کم سے کم دو ٹن وزنی تھا اس کا جسم بہت بڑا اور سر کے نیچے دو بیلچے نما ہاتھ دیوار ٹٹول رہے تھے۔ اس کے سر پر لمبے بال تھے جو چلنے کے دوران میں جھول رہے تھے۔ اس نے شاید انسانوں کی سرگرمی محسوس کر لی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور ایسی خوفناک غراہٹ نکالی کہ میں نے ایسی آواز اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ یہ دل میں خوف بھرنے والی آواز تھی۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ میرے جسم سے بو آنا شروع ہو جائے مگر ابھی تک مجھے بو محسوس نہیں ہوئی۔

''دیر مت کرو۔'' فیرون نے گونجتی آواز میں کہا۔ وہ دوسرے کنویں کے ایک سرے پر آ گئے تھے اور اب وہ منتظر تھے کہ میں نیچے کودوں تو وہ ہارن کے ہاتھوں میرا انجام دیکھ سکیں۔ وہ زیادہ تھے اس لیے ہارن ان کی طرف متوجہ تھا اور رک کر اوپر دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک مجھے وہ گیٹ نظر نہیں آیا تھا کہ جہاں سے ہارن کو اس کنویں میں پہنچایا گیا تھا۔ میں جھک کر دیکھ رہا تھا کہ عقب سے جلاد نے میری کمر کو ٹھپکی دی اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے مڑ کر خفگی سے اسے دیکھا۔ اس بار اس نے جیسے دھکا دینے کے لیے دونوں ہاتھ آگے کیے تھے۔ اس کے بعد جو ہوا وہ بے ساختہ تھا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے عقب میں اپنے دونوں پاؤں ہوا میں اچھالے اور کنویں کی منڈیر پر ٹکتے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کا جسم غیر متوازن تھا جب وہ اتنا آگے آیا کہ میں نیچے کود سکوں تو میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔

جلاد کھنچا چلا آیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی تھی، یہ اضطراری چیخ تھی۔ اس کا نصف دھڑ کنویں میں لٹک گیا تھا۔ میں اس کے ہاتھوں کو پکڑے جھول رہا تھا۔ میں نے دیوار پر پاؤں مار کر اسے مزید کھینچا اور وہ نیچے گرنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور نیچے گرتے ہوئے خود کو متوازن کرنے لگا۔ جیسے ہی میرے پاؤں زمین پر لگے میں نے بائیں طرف قلابازی کھائی اور اوپر سے گرتے جلاد کے نیچے آنے سے بال بال بچا تھا۔ اس کے حلق سے دوسری ڈکراتی چیخ نکلی اس بار بھی اسے چوٹ نہیں لگی تھی اور وہ خوف سے چیخا تھا۔ یہ سب دو سیکنڈ میں ہو گیا تھا اور اس دوران میں ہارن ہماری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ غرایا اور ہماری طرف لپکا۔ اسے آتے دیکھ کر جلاد کے حلق سے طویل چیخ نکلی تھی اور اس چیخ نے اسے مروا دیا کیونکہ ہارن نے پہلے اسے اٹھا لیا۔ جلاد پھر دھاڑا تھا اور اس کی چیخ پر ہارن نے ناپسندیدہ انداز میں غرا کر اچانک اسے دیوار پر دے مارا۔ یہ کام اس نے اتنی قوت اور وحشت سے کیا کہ جلاد شاید ایک لمحے میں مر گیا تھا۔

کنویں کی دیواریں پتھروں سے بنی ہوئی تھیں۔ اس دوران میں، میں بیٹھے بیٹھے زمین پر پیچھے سرک رہا تھا۔ میں نے موٹے لٹھوں سے بنا ہوا گیٹ دیکھ لیا تھا۔ یہ گیٹ بھی نہیں تھا بلکہ ہارن کو یہاں لانے کے بعد ان لٹھوں سے یہ راستہ بند کر دیا گیا تھا اور اس میں کہیں کہیں خلا تھا۔ اوپر چیخ و پکار ہو رہی تھی اور سب ہی کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ ہارن بدستور مردہ جلاد کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے اس نے جلاد کی لاش اوپر اچھال دی۔ اس نے ناقابلِ یقین قوت سے اسے پھینکا تھا اور وہ یقیناً کنویں سے خاصا دور جا گرا ہو گا۔ اب ہارن میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ایک اور بھیانک آواز نکالی اور میری طرف آیا۔ چند لمحے کو میری آنکھوں کے آگے موت ناچ گئی تھی۔ اب تک مجھے اپنے جسم سے بو نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں دوا نے اثر نہیں کیا تھا یا میرے جسم کے سسٹم نے اسے ست کر دیا تھا۔ اس کا مجھے بارہا تجربہ ہو چکا تھا کہ مجھ پر غیر مانوس اشیا اور کیمیکلز اثر نہیں کرتے تھے۔ خاص طور سے ٹوکسن وغیرہ۔ پتا نہیں یہ دوا کس قسم کی تھی۔

میں گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور میں نے حرکت کیے بغیر سر گھما کر گیٹ کی طرف دیکھا تھا اور مجھے اس کے نیچے خلا سا محسوس ہوا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی طرف سرکتا یا کوئی بھی حرکت کرتا ہارن کے دونوں کھرپے نما ہاتھ میرے شانوں اور بازوؤں پر جمے اور اس نے کسی کھلونے کی طرح مجھے اٹھا لیا تھا۔ میں نے زندگی میں بھی اتنی بے بسی محسوس نہیں کی جتنی کہ اس وقت محسوس کی تھی اور نہ

ہی موت کو خود سے اتنا قریب پایا تھا۔ ہارن اٹھا کر مجھے اپنے چہرے کے سامنے لے آیا۔ جلاد کے برعکس میں نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ اس لیے نہیں کہ ہارن کو انسانی آواز بھی نا پسند تھی بلکہ اس لیے کہ میری گھگی بندھ گئی تھی۔ اس سے پہلے شاید کبھی خوف کے جذبے کو میں نے اتنا واضح محسوس نہیں کیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی ہارن میرے دونوں شانوں پر زور دے گا اور میرے جسم سے الگ کر دے گا یا پھر جلاد کی طرح دیوار پر دے مارے گا۔

نیم تاریکی اور اس کے منہ سے نکلتی بھاپ نما سانس کی وجہ سے مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ مجھے اس کے بڑے سے چہرے پر موجود درندگی محسوس ہو رہی تھی۔ خوف نے میرے دل کی دھڑکن کو بے انتہا تیز کیا اور دوران خون تیز ہونے کے ساتھ ہی میرے جسم نے جیسے پسینا اگلنا شروع کر دیا اور تب ہارن ناپسندیدہ انداز میں غرایا۔ اس حالت میں بھی میرا ذہن کام کر رہا تھا اور مجھے لگا کہ میرے جسم سے بو آنے لگی ہے۔ اسی لیے ہارن نے ناپسندیدہ آواز نکالی تھی۔ اب وہ مجھے فوری ہلاک کرنے کی کوشش کرتا یا پھینک دیتا۔ امکان یہی تھا کہ وہ مجھے مارنے کی کوشش کرے گا اور اس کے لیے موزوں ترین طریقہ وہی تھا جو اس نے جلاد کو مارنے کے لیے اپنایا تھا۔ یعنی دیوار پر اتنی قوت سے دے مارے کہ ہڈی پسلی سب برابر ہو جائے۔

ہارن نے یہی فیصلہ کیا اور اس نے اچانک میرا ایک شانہ چھوڑ دیا اور دوسرے ہاتھ سے یوں پیچھے کیا جیسے گھما کر دیوار پر دے مارنا چاہتا تھا۔ مگر ہارن دیوار سے دور تھا اور وہ مجھے پکڑے ہوئے نہیں مار سکتا تھا۔ وہ مجھے پھینک کر ہی مار سکتا تھا۔ میں نے بروقت اس کے بہت بڑے کسی موٹی شاخ جیسے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت قائم کی اور شدید جھٹکے کے باوجود اسے نہیں چھوڑا تھا۔ اسے حیرت ہوئی اور جب اس نے مجھے جھلاتے ہوئے ہاتھ دوبارہ پیچھے کیا تاکہ جھٹک سکے تو میں نے اپنی گرفت ختم کر دی۔ میں اڑ کر زمین پر گرا۔ ہارن کے مسلسل دوڑنے اور بول و براز سے مٹی بہت نم و نرم ہوگئی۔ اس لیے زور سے گرنے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گرتے ہی میں مومنٹم کو استعمال کرتے ہوئے گیٹ کے پاس چلا گیا اور ہارن کو ذرا دیر سے احساس ہوا کہ میں نے اس کے ساتھ کیا چالاکی کی تھی۔ میں خلا کے پاس تھا جو میں نے دوسری طرف جانے کے لیے تاڑا تھا۔

ہارن پھر میری طرف لپکا اور مجھے پکڑنے کے لیے جھکا۔ میں خلا کے پاس تھا مگر اس میں داخل ہونے کا وقت نہیں تھا۔ ہارن کے بیلچے نما ہاتھ مجھے اٹھانے کے لیے آگے آئے تھے کہ اچانک اس نے بھڑکی ہوئی آواز نکالی اور یوں پیچھے ہٹا جیسے اس نے میری جگہ کوئی زہریلا سانپ دیکھ لیا۔ وہ ذرا دور ہوگیا اور اس بار مجھے اپنے پاس سے آتی بو خود بھی محسوس ہوئی تھی۔ اسی بو نے ہارن کو پیچھے ہٹا دیا تھا۔ مگر اس محدود جگہ اس سے بچنا مشکل تھا وہ دل کڑا کر کے مجھے ایک ہی ہاتھ مار دیتا تو میرا کچومر نکل جاتا۔ میرا اس جگہ سے نکلنا ضروری تھا۔ میں نے تیزی سے خلا میں گھسنے کی کوشش کی مگر یہ اتنا کشادہ نہیں تھا کہ میں آرام سے نکل جاتا۔ میں پھنس کر مشکل سے جا رہا تھا۔ ہارن نے مجھے پھر اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ مگر اس بار بھی وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اس کا شکار اس کے ہاتھ سے جا رہا ہے۔ مجھے اٹھانے کی کوشش میں اسے وہ بو برداشت کرنی پڑتی تھی جو اسے انتہائی ناپسند تھی۔

حیرت تھی کہ اس جیسے بدبودار اور اس بدبودار ترین جگہ رہنے والے جانور کو بھی کوئی بدبو ناپسند ہو سکتی تھی۔ شاید یہ اس کے اعصاب پر اثر ڈالتی تھی۔ راجا عمر دراز نے بتایا تھا کہ ایک بار کسی کے پاس سے بو آ جائے تو ہارن اس سے دور بھاگتا تھا۔ مگر یہاں دو قباحتیں تھیں ایک تو ہارن بھاگ نہیں سکتا تھا اور دوسرے وہ انسانوں کے ساتھ رہ کر کسی قدر ہوشیار ہو گیا تھا۔ پتا نہیں یہ وہی ہارن تھا جو راجا عمر دراز کے زمانے میں یہاں لایا گیا تھا یا کوئی دوسرا تھا۔ اس نے ہوشیاری دکھائی اور میری طرف پشت کرنے لگا۔ میری چھٹی حس نے فوری خبردار کیا کہ وہ مجھے دولتی مارنے جا رہا ہے۔ دولتی مارنے کے لیے اپنا منہ میرے پاس نہیں لانا پڑتا، یعنی میرے پاس سے آتی بو نہیں سونگھنا پڑتی اور اس کی ہاتھی جیسی لات میرا خاتمہ کر دیتی۔ میں نے اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ اب تک میرے پیٹ تک جسم دوسری طرف جا چکا تھا اور اب میں سینہ لے جا رہا تھا۔ سینہ نکل جاتا تو کام آسان ہو جاتا۔

جب میں ہارن سے بچنے کی جدوجہد کر رہا تھا تو اوپر والے دل چسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جلاد کے مارے جانے پر کچھ دیر ہنگامہ ہوا تھا مگر جلدی پجاریوں کو احساس ہو گیا کہ جلاد کی موت اتنی اہم نہیں تھی۔ اہم وہ تماشا تھا جو انہیں میری موت کی صورت میں دیکھنے کو مل رہا تھا۔ میری جدوجہد اور مزاحمت نے اس تماشے کو مزید دل چسپ بنا دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں ممکنہ حد تک ہارن سے بچنے

کی کوشش کر رہا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ میں زیادہ دیر بچ نہیں سکوں گا۔ مگر جب میں نے گیٹ کے دوسری طرف جانے کی کوشش شروع کی اور اس میں خاصی حد تک کامیاب بھی رہا تھا تو فیرون اور اس کے ساتھی مضطرب ہو گئے اور پھر فیرون نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجھے تیر کا نشانہ بنائیں اور وہ عجلت میں کوشش کرنے لگے۔ جس وقت ہارن مجھے دولتی مارنے کے لیے گھوما اسی وقت اوپر سے تیروں کی پہلی بوچھاڑ آئی اور تقریباً تمام ہی تیر ہارن کو نہایت غیر مناسب جگہ لگے تھے اور اس نے بے ہنگم سی آواز نکالی اور دولتی مارنا بھول گیا۔

صرف ایک تیر میری طرف آیا اور میرے سر کے بالکل پاس لٹھے میں پیوست ہو گیا۔ یہ دو انچ بھی ادھر ہوتا تو میرے سر میں اتر جاتا۔ میرا سینہ پھنس رہا تھا اور میں سانس بالکل خارج کر کے اس خلا سے گزرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں دونوں ہاتھ اندر کر کے خود کو اندر کھینچ رہا تھا۔ تیر کھا کر ہارن غضب ناک ہو گیا تھا اور وہ پھر میری طرف مڑا اور ایک بار پھر دولتی مارنے کے لیے پاس آنے لگا۔ سپاہیوں نے تیروں کی پہلی بوچھار کے بعد دو کوششیں اور کیں مگر دونوں بار ہارن کی حرکت کی وجہ سے وہ مجھے نشانہ بنانے میں ناکام رہے۔ ہارن کو تیر لگنے پر فیرون ان پر دھاڑ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اتنی تیزی سے نہیں نکل سکوں گا کہ ہارن کی دولتی سے بچ سکوں اور اگر وہ میرے سر کو نشانہ بناتا تو میری وفات یقینی تھی۔

میں نے سانس روک کر اور سر گھما کر ہارن کے پیروں کو دیکھا اور اپنا سینہ بائیں طرف سرکایا۔ پہلی کوشش کے بعد میں آرام سے بائیں طرف سرک گیا اور اسی لمحے ہارن نے دولتی ماری۔ وہ گھوڑے کی تیزی سے دولتی نہیں مار پایا تھا اور اسی وجہ سے میں بال بال بچا، تیزی سے سرکنے کی وجہ سے میرا سر بچا اور اس کے کھر کا کچھ حصہ میرے شانے پر لگا اور اس کے ساتھ ہی میں جو دوسری طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا ایک ہی بار میں دوسری طرف نکل گیا۔ دراصل اس نے دولتی مار کر میرا پھنسا سینہ نکال دیا تھا۔ جیسے ہی میرا سر نکلا اس نے دوبارہ دولتی ماری۔ مگر میں اس کی حد ضرب سے دور ہو چکا تھا۔ لٹھے صرف ایک قطار میں نہیں تھے بلکہ یہ قطار در قطار تھے۔ تبھی یہ قائم تھے ورنہ ہارن کی بے پناہ قوت انہیں توڑ دیتی اس نے یقیناً آزاد ہونے کی پوری کوشش کی ہوگی۔ مگر لٹھوں کی مضبوطی زیادہ تھی۔

میں کسی نہ کسی طرح ان سے نکل کر کھلی جگہ آ گیا مگر یہاں مکمل تاریکی تھی اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جدوجہد کے دوران میں تو احساس نہیں ہوا کہ ہارن کی مددگار لات میں بھی کتنی قوت تھی مگر جب میں کھڑا ہوا تو مجھے شانے میں شدید درد کا احساس ہوا۔ میں نے شانہ دیکھا۔ ہلکا سا ورم تھا مگر کندھا اپنا کام کر رہا تھا۔ تاریکی میں کنویں کے اوپر سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے وقت ضائع کیے بغیر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ فیرون میرے پیچھے معبد کے سپاہی روانہ کر سکتا تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس سرنگ کا راستہ کہاں نکلتا ہے۔ میں تیز قدموں سے اندھیری سرنگ کی دیوار ٹٹولتے ہوئے آگے چلنے لگا۔ گیرٹ نے جو نقشہ دکھایا تھا اس میں پیمانے نہیں تھے۔ مگر تناسب تھا اور یہ سرنگ آرگون اور معبد کو ملانے والے راستے کا ایک چوتھائی تھی۔ یعنی زیادہ سے زیادہ نصف میل لمبی ہو سکتی تھی۔

سرنگ مکمل طور پر کچی تھی اور اس کا زیادہ حصہ پتھریلا تھا کہیں کہیں سخت مٹی آتی تھی۔ مجھے خوف گڑھوں کا تھا اچانک راستے میں کوئی گڑھا آ جاتا تو میں اس میں جا گرتا۔ یا ٹھوکر کھا کر زخمی ہو جاتا۔ لٹھوں کے درمیان سے نکلتے ہوئے میرا کرتہ پھٹ گیا تھا اور ایک طرف سے تو یہ شانے سے ہی اتر گیا تھا۔ دائیں کولہے سے بھی پھٹا تھا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ نیچے پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کرتہ لمبا ہو کر بار بار پاؤں میں آ رہا تھا اور میری سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سنبھالوں۔ کبھی اس قسم کا لباس پہنا ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں ہر ممکن تیزی دکھا رہا تھا۔ کوئی دس منٹ بعد سرنگ کا فرش اوپر کی طرف جانے لگا یعنی ڈھلان آ گئی اور یہاں کئی جگہوں پر پانی کھڑا تھا جب اوپر بارش ہوتی ہوگی تو کچھ پانی یقیناً یہاں آ جاتا ہوگا۔ کچھ دیر بعد سرنگ کا دہانہ آ گیا اور یہ بھی لٹھوں سے بند تھا۔

یہاں لٹھوں کے درمیان فاصلہ کم تھا تاکہ اسمار اور گونر جیسے چھوٹے جانور بھی اندر نہ آ سکیں اور ظاہر ہے میں بھی اس میں سے نہیں گزر سکتا تھا مگر بند کرنے والوں نے کہیں نہ کہیں کوئی رخنہ چھوڑا ہوگا اور میں نے جلد اسے تلاش کر لیا یہ ایک چھوٹا تختہ تھا جسے بڑی مہارت سے ایک بڑے خلا میں فٹ کیا گیا تھا۔ میں نے اسے کھینچا اور باآسانی اسے نکال لیا۔ خلا کے دوسری طرف روشنی تھی میں لٹھوں سے نکلنے کے بعد جھاڑیاں اور گھاس پھونس ہٹاتا ہوا کھلے میں آیا۔ یہاں چاروں طرف اونچے گھنے درخت تھے اور ان کے نیچے چھوٹی موٹی بیلیں اور جھاڑی نما پودے اگے ہوئے

تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ دوپہر کا وقت قریب تھا کیونکہ روشنی میں تقریباً دھوپ جیسی کیفیت تھی حالانکہ سورج کی ذرا بھی جھلک نظر نہیں آرہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس طرف جاؤں کہ بڑی چنگھاڑنے جیسی آواز آئی اور ایک طرف سے ایک گونز نمودار ہوا۔

اس نے مجھے دیکھا اور سائلنسر آن کر کے میری طرف لپکا تھا کہ میرے سر کے پاس سے ایک تیر گزر کر اس کی ران پر پیوست ہوگیا۔ اس نے دردناک آواز نکالی اور واپس ہوگیا۔ اس کا سائلنسر جواب دے گیا کیونکہ اس کے پاس سے ہڈیاں ٹوٹنے جیسی آواز پھر آنے لگی تھی۔ تیر کا نشانہ گونز نہیں بلکہ میں تھا۔ تیر گزرتے ہی میں بھڑک کر بھاگا اور ایک درخت کی آڑ میں ہوتے ہوئے اس سمت دیکھا جہاں سے تیر آیا تھا اور مجھے ایک چھوٹے ٹیلے پر سپاہیوں کے لباس کی جھلک دکھائی دی۔ میرا خدشہ درست نکلا۔ فیرون نے فوراً میرے پیچھے آدمی بھیجے تھے۔ میں پھر بھاگا اور میری کوشش تھی کہ جھاڑیوں اور پودوں کی آڑ میں رہوں۔ تیر انداز یقیناً ٹیلے تک نہ رہتے بلکہ میرا پیچھا کر کے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرتے۔ ذرا دور نکلنے کے بعد میں اب ایسی جگہوں کو منتخب کر رہا تھا جہاں میں اپنے جوگرز آزما سکوں۔

بھاگنے سے مجھے دو فائدے ہوتے، ایک میں یہاں سے دور نکل جاتا جہاں میرے دشمن تھے اور دوسرے دوڑنے سے مجھے پسینا آتا اور اس میں شامل دوا کی بو جانوروں کو مجھ سے دور رکھتی۔ ایک جگہ مجھے چھوٹا سا پانی کا چشمہ نظر آیا۔ میں نے اس کا شفاف پانی چکھا اور پینے کے قابل پا کر چند گھونٹ لیے اور پھر سے دوڑنے لگا۔ ایک جگہ میں غیر متوقع طور پر ایک اسمار کے سامنے جا نکلا وہ پیٹ بھر کر قیلولہ کر رہا تھا۔ مگر مجھے دیکھتے ہی اس نے شاید ڈنر کے لیے منتخب کر لیا۔ وہ میری طرف لپکا اور جیسے ہی میرے پاس آیا یوں رخ پھیر کر بھاگا جیسے شیطان لاحول سے بھاگتا ہے۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے جنگل میں اور بھی جانور نظر آئے مگر یہ سب بے ضرر قسم کے چرنے والے تھے جو خود مجھے دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ مگر اب مجھے ہارن، اسمار یا گونز کا خوف نہیں رہا تھا۔

وادی کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ معبد بالکل شمال میں تھا اور شمال مشرق میں اوپر سے نیچے آنے والا راستہ تھا۔ وادی کے مشرق اور جنوب میں باغات اور کھیت تھے۔ اس کے مغرب میں زیادہ تر جنگل تھے۔ ویسے جنگل ہر جگہ تھے مگر اصل جنگل یہی تھا جہاں سے میں گزر رہا تھا۔ کسی قدر شمال میں آرگون آباد تھا اور حریف قلعے اس کے بالکل سامنے جنوب میں تھے۔ گویا مجھے جنوب میں جانا تھا۔ یہ فاصلہ کسی طرح دس میل سے کم نہیں تھا۔ مجھے آرگون سے بھی دور رہنا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس طرف کھیت اور باغات تھے یا نہیں مگر ہونے کی صورت میں آرگون والوں سے سامنا لازمی تھا۔ میں ان سے دور رہنا چاہتا تھا۔ مگر اس سفر کے دوران میں مجھے کوئی کھیت یا باغ نظر نہیں آیا حد یہ کہ یہاں انسانی آثار بھی نظر نہیں آئے تھے۔ راستے تھے مگر یہ جانوروں نے بنائے تھے۔

سپاہیوں کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ انہوں نے پہلے میل کے بعد ہار مان لی ہوگی۔ معبد کی طرف آتے ہوئے میں نے معبد کے سپاہیوں کی جو گفتگو سنی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں حرام خوری کی نہایت پختہ عادت ہو چکی تھی۔ انہوں نے میرے پیچھے زیادہ زحمت نہیں کی تھی۔ تیر اندازی میں بھی ان کا اناڑی پن نمایاں تھا جب وہ تیس پینتیس فٹ کے فاصلے سے مجھے نشانہ نہیں بنا سکے تھے۔ البتہ دونوں بار ان کی تیر اندازی سے مجھے فائدہ ہوا تھا۔ ہارن کو لگنے والے تیر اس کے لیے کانٹوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے مگر اسے لگے غلط جگہ تھے۔ البتہ گونز اگر زندہ رہا تو ساری عمر اس تیر کو نہیں بھول سکے گا۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے دائیں طرف آرگون کے آثار یعنی اس کی فصیل دکھائی دی۔ یہ اس جگہ سے کوئی ایک میل دور تھی اور یہاں بھی فصیل تک کوئی انسانی آثار نہیں تھے۔ مگر اب جنگل چھدرا ہو رہا تھا اور کٹے تنوں سے ظاہر تھا کہ یہاں سے ضرورت کی لکڑی حاصل کی جاتی ہوگی۔

سامنے کھیت اور باغ نظر آرہے تھے تو میں رکا اور ستانے لگا۔ میں نقشے کو ذہن میں رکھ رہا تھا۔ اس کے مطابق مجھے آرگون کے سامنے وسطی قلعے تک پہنچنا تھا یہ آرگون سے کوئی چھ سات میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں سے مجھے دائیں طرف مڑنا تھا اور ایک دائرے میں سفر کرتے ہوئے قلعے تک پہنچنا تھا۔ گویا مجھے اب بھی کوئی دس گیارہ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے پاس سے بدستور بو آرہی تھی اور یہ بو خاصی دیر تک آنی چاہیے تھی مگر کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا کہ جلد میرا جسم پسینے میں اسے خارج کر دے۔ اس جنگل میں یہی میرا واحد ڈیفنس تھا۔ اس لیے میں نے کچھ دیر ستانے کے بعد دوبارہ دوڑنا شروع کر دیا۔ اس طرف بلندی سے وادی میں ایک زبردست آبشار گر رہا تھا۔ اصل میں اس میں پانی اتنا نہیں تھا

بلندی سے گرنے کی وجہ سے اس میں جھاگ بہت زیادہ ہو گیا تھا اور یہ اپنے اصل حجم سے کئی گنا بڑا ہو کر دکھائی دے رہا تھا۔

کل صبح کے بعد سے مجھے کھانے میں صرف ایک مشروب نما چیز ملی تھی اور پھر گزشتہ ایک گھنٹے سے ہونے والی بھاگ دوڑ نے پیٹ کو بالکل خالی کر دیا تھا اور اب اس میں چوہے تقریباً میری جتنی رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ مگر مجھے امید تھی کہ میں سامیرا والے قلعے تک پہنچ گیا تو مجھے وہاں کچھ کھانے کو مل جائے گا۔ شرط صحیح سلامت وہاں پہنچنے کی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد میں وادی کے جنوبی حصے میں داخل ہو چکا تھا یہاں چٹانیں تھیں اور چھوٹے چھوٹے جنگل تھے جن میں درخت بہت ہی اونچے اور گھنے تھے۔ وادی کی دیوار تک اونچے ہوتے یہ درخت کسی سبز ڈھلان کی طرح لگ رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ان پر سبز رنگ کے پردے تنے ہوں۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ تہہ در تہہ بیلیں تھیں جو درختوں پر پردوں کی طرح تن گئی تھیں اور راجا عمر دراز اوپر سے گرتے ہوئے ایسی ہی بیلوں کی وجہ سے مرنے سے بچ گیا تھا کیونکہ انہوں نے اس کے گرنے کی رفتار کم کر دی تھی۔

کھیتوں اور باغوں سے دور رہنے کے چکر میں، میں بڑے لمبے چکر میں پڑ گیا تھا۔ پہلے بھاگ کر اور اب چل چل کر میرا حشر ہو گیا تھا۔ یہ دوسرا گھنٹا تھا جو میں مسلسل سفر میں تھا۔ اب بھوک کے ساتھ پیاس بھی لگ رہی تھی مگر یہاں کہیں پانی نظر نہیں آ رہا تھا چند ایک جگہوں پر گڑھوں میں جو پانی دکھائی دیا وہ ناقابلِ استعمال تھا۔ اب مجھے گرمی لگ رہی تھی مگر پانی کی کمی سے مجھے پسینا نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ میں سے آنے والی مخصوص بو بھی کم ہو گئی تھی۔ میں جہاں سے گزر رہا تھا وہاں چٹانیں تھیں اور ان چٹانوں سے جیسے گرمائش آ رہی تھی۔ دھوپ تو تھی نہیں مگر یہ شاید صرف روشنی جذب کر کے بھی گرم ہو جاتی تھیں۔ چٹانوں اور کھیتوں و باغات کے درمیان جھاڑیوں کا ایک بفر زون تھا اور میں اسی کے پیچھے سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ امکان تھا کہ یہاں کام کرنے والے اصل میں سامیرا کی رعایا تھے۔ لیکن اب میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا اور براہ راست قلعے تک پہنچنا چاہتا تھا۔

پیاس سے اب حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور اب اگر مجھے کہیں کوئی جوہڑ نظر آ جاتا تو شاید میں اس میں موجود پانی بھی پینے کو تیار ہو جاتا۔ مگر کوئی جوہڑ بھی نہیں ملا اور بالآخر میں قلعے تک پہنچ گیا اس تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک چھوٹے قلعے کے پیچھے سے گزرنا پڑا تھا۔ دن کا وقت تھا اور قلعے کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ سپاہی موجود تھے مگر وہ زیادہ توجہ نہیں دے رہے تھے اس لیے میں آرام سے گزر کر قلعے کے اندر پہنچ گیا۔ آرگون کی نسبت یہ چھوٹا قلعہ تھا اور یہاں آبادی منظم نہیں تھی۔ گھر چھوٹے اور گلیاں کسی قدر بے ترتیب تھیں۔ کچھ گلیاں پکی اور کچھ کچی تھیں۔ مگر یہاں لوگ خاصے زیادہ تھے۔ بچے کھیل رہے تھے اور عورتیں آ جا رہی تھیں۔ اگرچہ ان کا لباس اور جوتے اتنے اچھے نہیں تھے جتنے مجھے آرگون میں نظر آئے تھے۔ اسی طرح یہاں لوگوں کی صحت بھی اتنی اچھی نہیں تھی اور وہ کم خوراکی کا شکار نظر آ رہے تھے۔ مگر ان کے چہروں پر مجھے انسانی جذبات دکھائی دیئے۔ وہ آپس میں لڑ رہے تھے۔ ہنس رہے تھے اور کھیل رہے تھے۔ مجھے ایسا کوئی روبوٹ نہیں دکھائی دیا جیسا کہ آرگون کی گلیوں میں چل پھر رہے تھے۔

ان کو دیکھ کر احساس ہو رہا تھا کہ یہ انسان ہیں اور آزاد ہیں۔ یہاں سپاہی بھی تھے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ درحقیقت یہاں مجھے دفاعی انتظامات بھی بہت کم دکھائی دیئے تھے۔ یہ قلعہ جنگی سے زیادہ پناہ گزینوں کا کیمپ لگ رہا تھا۔ قلعہ زیادہ بڑا نہیں تھا مشکل سے پانچ سو گز لمبا چوڑا ہوگا اور اس میں کوئی بھی عمارت بڑی نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ ان میں سے بیشتر لکڑی کے بنے تھے۔ کچھ کچی مٹی اور پتھروں سے بنے تھے۔ اور کچھ پکی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ تقریباً سارے ہی مکانات ایک منزلہ تھے اور مجھے چند ایک ہی مکانوں پر دوسری منزل نظر آ رہی تھی۔ مشکل سے آدھے گھنٹے میں، میں نے پورا قلعہ گھوم کر دیکھ لیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سامیرا یہاں کہاں ہو گی؟ میں اسے کیسے تلاش کروں جب کہ یہاں کوئی میری زبان بھی نہیں سمجھتا۔

ایک جگہ پانی کا گھڑا نظر آیا جس کے ساتھ مٹی کے پیالے تھے۔ گڑھے سے پانی نکالنے کے لیے ایک مگ الگ سے تھا۔ میں نے جلدی سے اس سے پانی نکال کر پیا مگر احتیاط کی کہ پیٹ خالی تھا زیادہ پانی پی کر میری طبیعت خراب ہو سکتی تھی۔ پانی پی کر مجھے سکون ملا تھا اور حلق میں چبھتے کانٹوں سے سکون ملا تھا۔ ایک گلی میں چند بچے کھیل رہے تھے ان میں سے ایک دوڑتا ہوا میری طرف آیا اور مجھ سے ٹکرایا اور اچانک رک گیا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ چند لمحے

گھورنے کے بعد اس نے کہا۔ ''اسی گلی میں آگے چلے جاؤ سامیرا کا مکان بالکل آخر میں ہے۔''

میں دنگ رہ گیا کیونکہ اس پانچ چھ سال کے بچے کے حلق سے برف والے کی آواز برآمد ہوئی تھی۔ بچے نے جملہ ادا کیا اور دوڑتا ہوا واپس اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا اسرار تھا؟ برف والے کی پُر اسرار قوتیں رہ رہ کر سامنے آرہی تھیں۔ پھر میں شور پر چونکا۔ دو بچے اسی بچے کو نیچے گرا کر مار رہے تھے وہ چلاتے ہوئے ان سے بچنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں تیزی سے آگے آیا اور دونوں بچوں کو اس سے الگ کیا تو وہ سسکیاں بھرتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی اپنی ماں کو بتاتا ہوں۔''

اس بار اس کے منہ سے معصوم بچے کی سی آواز نکلی تھی۔ بڑے بچے مجھے اس کا حمایتی پاکر بھاگ گئے تھے۔ بچہ ڈراما نہیں کررہا تھا بچ اس کے توسط سے برف والے نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں گلی کے آخری سرے کی طرف بڑھا جہاں ایک چھوٹا سا احاطہ تھا اور اس احاطے میں وہی چھوٹا سا مکان تھا جس کا نقشہ راجا عمر دراز نے اتنی تفصیل سے بتایا تھا کہ میرے ذہن میں بیٹھ گیا تھا۔ مکان کے برآمدے میں ایک جوان العمر اور نہایت حسین عورت کھڑی تھی۔ اس کے نقوش شاہانہ اور دبدبے والے تھے۔ مجھے اس میں سامیرا کی جھلک محسوس ہوئی۔ راجا عمر دراز نے سامیرا کا ناک نقشہ بھی وضاحت سے بتایا تھا۔ شاید وہ اس کی بیٹی تھی۔ اگر اس نے خاصی تاخیر سے شادی کی ہوگی تو اس کی بیٹی اب چالیس تک کی ہو گی۔ اگرچہ یہ عورت پینتیس کی بھی مشکل سے لگ رہی تھی۔ مگر اس وادی میں رہنے والوں کی عمریں دراز ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کی جوانی کا عرصہ بھی طویل ہوتا ہو گا۔ میں احاطے کے کھلے دروازے پر رکا تو عورت نے کہا۔

''اندر آجاؤ شہباز۔''

میں دنگ رہ گیا اور کچھ دیر بعد بولا۔ ''آپ مجھے جانتی ہیں۔''

''ہاں میں راجا عمر دراز کے ساتھ تمہارا ابھی انتظار کر رہی ہوں۔''

میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا۔ ''آپ...... آپ سامیرا......؟''

''ہاں میں سامیرا ہوں۔'' وہ آگے آئی اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر لے آئی۔ میں جیسے خواب کی سی کیفیت میں

ایک دن کا واقعہ ہے کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کے نام ایک درخواست آئی جسے درخواست گزار کے ہم دست کسی دفتر میں بھجوانا تھا۔ وزیراعظم کے سیکریٹری کی پاس پنسل تک نہیں تھی۔ اس وقت تک اتفاق سے دہلی کے منظور الحق صاحب سیکریٹری کے دفتر میں بینچ پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی جیب سے ایک پنسل نکال کر عطا کی۔ اس سے درخواست پر چند جملے لکھے گئے۔ سیکریٹری کی میز سے سمندری ہوا کے زوردار جھکڑ کاغذوں کو ہر سمت اڑایا کرتے تھے جس کو جمع کرنے کے لیے بینچ پر بیٹھے ہوئے لوگ تعاقب کرتے۔ وزیراعظم کے نورنظر اکبر میاں جو چھوٹے سے بچے تھے۔ ان کے لیے چند دنوں تک اڑتے ہوئے کاغذوں کو دوڑ دوڑ کر پکڑنا دلچسپ تماشا اور تفریحی شغل تھا۔ ایک دن وہ چند گول پتھروں پر رنگ برنگی کاغذ چڑھا کر لائے اور کاغذوں پر رکھ دیے تاکہ آئندہ وہ اڑ نہ جائیں۔ یہ تھا حکومت پاکستان کے عہد طفلی کا پہلا پیپر ویٹ۔

اقتباس: بے تیغ سپاہی از نواب صدیق علی خان

تھا میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک عورت جو کم سے کم اسی برس کی تھی اتنی جوان اور صحت مند نظر آسکتی ہے۔ برآمدے میں بید جیسی کسی لکڑی سے بنی کرسیاں رکھی تھیں اس نے مجھے بٹھایا اور چھوٹی سی تپائی پر رکھا بڑا سا گلاس میری طرف بڑھایا۔ اس میں مشروب تھا اور یہ ایسا تھا جیسے دودھ میں روح افزا ملا دیا جائے مگر اس کا ذائقہ کہیں زیادہ لاجواب تھا۔ میں نے بڑا سا گلاس چند گھونٹ میں خالی کردیا کیونکہ میں شدید.... بھوکا تھا اور اس نے خاصی حد تک میری بھوک کا مداوا کردیا تھا۔ ایسا لگا جیسے وہ واقف ہو کہ میں بھوکا آؤں گا اور مجھے فوری خوراک کی ضرورت ہوگی۔ اس مشروب نے میری ضرورت پوری کردی تھی۔ گلاس خالی کرکے میرے حواس ٹھکانے آئے۔ اس نے مجھ سے گلاس لے کر رکھ دیا اور بولی۔ ''اب کیسا محسوس کررہے ہو؟''

''بہتر، لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں آنے والا ہوں۔''

''اسی نے اطلاع دی جس نے بچے کی مدد سے تمہاری رہنمائی کی تھی۔'' وہ سادگی سے بولی۔ میں نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

''یہ کیا ہے ٹیلی پیتھی ہے یا ساحری جو وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے میری مدد کررہا ہے؟''

''میں نہیں جانتی مگر برف والے کے لیے یہ کام

مشکل نہیں ہیں۔''

''اس نے مجھے یہاں بھیجا مگر پہلے آرگون والوں کے حوالے کردیا اور سمجھ لیں کہ میں موت کے منہ سے نکل آیا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن بچنا تمہارا مقدر ہے۔ کامیابی تمہارا مقدر ہے۔ تم یہاں آگئے ہو اب ہم آرگون اور اس وادی کو ان لوگوں سے آزاد کرالیں گے۔''

میں سوچ رہا تھا کہ بہ ظاہر تو برف والے نے آرگون والوں کی حمایت کی تھی مگر درحقیقت وہ سامیرا کے ساتھ تھا اور اسے معلوم تھا کہ سامیرا کامیاب رہی تو وادی کا صدیوں پرانا سسٹم ختم ہوجائے گا اور وہ اس سسٹم کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس کا کہنا بھی درست تھا کہ اسی سسٹم نے وادی میں انسانوں کی بقا کو ممکن بنایا تھا ورنہ ان کے آپس کے جھگڑے یہاں کی تباہی کا سبب بن جاتے۔ سامیرا مجھے دیکھ رہی تھی اس نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک سوچ رہے ہو آزادی یہاں کی تباہی ہوگی۔ لیکن ہر بقا کو فنا ہے اور شاید فنا کا وقت قریب آگیا ہے۔''

میرے جسم میں اس کے الفاظ نے سنسنی دوڑائی تھی۔ ''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔''

''کیونکہ مجھے لگ رہا ہے کہ صرف اس وادی ہی نہیں بلکہ اس دنیا کا انجام بھی قریب ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کیونکہ ہمارا عقیدہ بھی یہی کہتا ہے کہ دنیا کا انجام قریب ہے۔''

''اس لیے ہمیں ان لوگوں سے نجات حاصل کرنی ہے تاکہ اس انجام سے پہلے سب اپنا راستہ چن سکیں۔''

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ ''کون سے راستے؟''

''وہ راستے جو ناکامی اور کامیابی کی طرف جاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''خیر یہ بعد کی باتیں ہیں ابھی میں تم سے وہ بات کرنا چاہتی ہوں جس کے لیے تمہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔''

پہلے برف والے، پھر کیرٹ اور اب سامیرا کی باتوں سے مجھے لگ رہا تھا کہ ریناٹ اور سامیرا کے درمیان ہونے والے معرکے میں مجھے کسی ایک طرف کی سپاہ کی کمان کرنی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''مجھے کس لیے بھیجا گیا ہے؟''

''تم جانتے ہو۔'' سامیرا نے اپنی فسوں خیز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک اور تازگی تھی کہ میں نے بہت کم آنکھیں ایسی دیکھی تھیں۔

''کسی حد تک جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن بہتر ہوگا کہ تم کھل کر بات کرو۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''شہباز میں چاہتی ہوں کہ تم میری طرف سے اس جنگ میں حصہ لو اور میری فوج کی کمان کرو۔''

میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مگر مجھے فوجی کمان کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہارے طریقہ جنگ سے واقف ہوں۔''

''تم کرلوگے۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''برف والے کا کہنا ہے کہ تم کرسکتے ہو۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو کام سر پر پڑ جانے والی بات تھی۔ اگر میں نہ کرتا تب بھی مارا جاتا۔ اگر ریناٹ ان لوگوں پر قابو پالیتا تو سب سے پہلے میرا خاتمہ کرتا۔ اس لیے مجھے تو لڑنا ہی تھا مگر میں اتنی بڑی ذمے داری لینے سے گھبرا رہا تھا۔ ہزاروں لوگوں کی زندگی وموت میرے شانوں پر آجاتی اور میں خود کو اتنا بڑا بوجھ اٹھانے سے معذور سمجھ رہا تھا۔ سامیرا نے میرے شانے پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھا۔ ''مجھے معلوم ہے عمر دراز تمہیں بیٹے کی طرح سمجھتا ہے، اس رشتے سے تم میرے بھی بیٹے ہوئے اور کوئی ماں اگر اپنے بیٹے سے توقع رکھے تو کیا وہ اسے پورا نہیں کرے گا۔''

''بہت بے حمیت بیٹا ہوگا جو ماں کی بات پوری نہیں کرے گا۔''

''تب سمجھ لو کہ ایک ماں تم سے توقع کررہی ہے کہ اس کا بیٹا اسے اس کے دشمنوں سے بچائے گا اور اس کے دشمنوں کو ختم کردے گا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''آپ نے بات ایسی کردی ہے کہ اب میں انکار کا سوچ بھی نہیں سکتا مگر میں کامیابی کا دعویٰ بھی نہیں کروں گا۔ بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنی جان لڑانے تک سب کرگزروں گا۔''

وہ خوش ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم انکار نہیں کروگے۔ آؤ تم تھکے ہوئے ہو آرام کرو پھر میں تمہیں سب بتاؤں گی۔'' وہ مجھے مکان کے اندر لے آئی اور وہاں ایک سادہ مگر آرام دہ بستر تھا۔ نہ جانے کیوں یہ جگہ مجھے وہی لگی جہاں راجا عمر دراز رہا تھا۔ اس نے بستر پر بٹھایا اور بولی۔ ''اس بستر کو سوائے عمر دراز کے کسی مرد نے نہیں چھوا ہے۔ مگر تم اس کے بیٹے جیسے ہو اور تم اس پر سونے کے حقدار ہو۔''

''آپ نے شادی نہیں کی؟'' میں نے آہستہ سے

پوچھا۔

”نہیں، حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ عمر دراز نے شادی کر لی تھی اور اب اس کے بچوں کے بچوں کی بھی شادی ہو گئی ہے۔“

”جب آپ یہ جانتی ہیں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ راجا صاحب کے دل میں جو مقام آپ کا ہے وہ کسی کا بھی نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“

میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ جانتی ہے کہ راجا عمر دراز بھی اس وادی میں آچکا ہے اور یہ کہ اپنی زندگی کے آخری دور میں ہے کیونکہ اس کے جسم میں پلنے والا کینسر لاعلاج ہو گیا ہے۔ سامیرا وہاں سے چلی گئی تھی۔ میں جوتے اتار کر بستر پر دراز ہو گیا۔ میرا لباس پھٹ گیا تھا مگر خاص فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ اس کے نیچے آدھی آستین کی بنیان موجود تھی۔ میں لیٹا تھا مگر نیند نہیں آئی تھی بس ایک جھپکی سی آئی اور میں پھر ہوشیار ہو گیا۔ شاید اس ذمے داری کے خیال نے مجھے گہری نیند سے باز رکھا جو میرے شانوں پر ڈال دی گئی تھی۔ میں اٹھا تھا کہ سامیرا آگئی اس نے کہا۔ ”تمہارے غسل کے لیے پانی رکھ دیا ہے اور دوسرا لباس بھی ہے۔“

میں خوش ہو گیا کیونکہ شدت سے اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ سفر کے دوران میں میرا جسم میل جمع کرتا رہا تھا اور رہی سہی کسر آج کی دربدری نے پوری کر دی تھی۔ پردوں سے گھرے اس غسل خانے میں بڑے سے لکڑی کے ٹب میں پانی تھا اور اس سے ایسی خوشبو آرہی تھی جیسے اس میں اعلیٰ درجے کا کلون ملا ہو۔ بلکہ شاید کسی کلون کی بھی ایسی خوشبو نہیں ہو گی۔ ایک ٹکیہ سی تھی اور جسم صاف کرنے کے لیے جالی دار کپڑا بھی تھا۔ میں دل سے نہایا اور خود کو بہت تر و تازہ محسوس کیا تھا۔ ایک طرف الگنی پر نیا پاجامہ اور نیا کرتہ لٹک رہا تھا۔ دونوں چیزیں میرے ناپ کے مطابق تھیں۔ صابن نما ٹکیہ نے حیرت انگیز صفائی کی تھی۔ اس نے میرے بال بھی ریشمی کر دیے تھے۔ میں کپڑے پہن کر باہر آیا تو سامیرا نے برآمدے میں ہی چھوٹی سی میز پر کھانا لگایا ہوا تھا۔ تاریکی چھانے والی تھی اور گھر میں اور باہر شمعیں اور مشعلیں روشن ہو گئی تھیں۔

کھانے میں سبزیوں اور اجناس سے بنی چیزیں تھیں اور سب خوب تھیں۔ میٹھے میں شہد اور گندم سے بنی ہوئی ٹکیاں تھیں جیسی کبھی کبھی ماں جی بھی بناتی تھیں۔ سامیرا اصرار کر کے کھلاتی رہی۔ ساتھ ہی وہ مجھ سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا اور میں اسے بتاتا رہا۔ پھر وہ اپنے بارے میں بتانے لگی کہ اورگان کے بعد اس نے بہت مشکل وقت گزارا۔ نیکاٹ کا رویہ دوستانہ نہیں تھا کیونکہ اورگان نے راجا عمر دراز والے معاملے میں اسے دھوکا دیا تھا۔ صرف مہا پجاری ہونے کی وجہ سے وہ محفوظ رہا تھا۔ اورگان کی وفات کے بعد سامیرا سے اس کا رویہ معاندانہ رہا اور اس نے سامیرا کے آرگون آنے پر پابندی لگا دی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ سامیرا اس طرز حکمرانی اور اس نظام کے خلاف ہو گئی تھی جس کا مشاہدہ اس نے معبد میں قیام کے دوران کیا تھا۔ اب وہ اس کے خلاف عملی جدوجہد کر رہی تھی۔

عجیب بات تھی اس نے ساری باتیں کر لیں مگر اس نے راجا عمر دراز کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ وہ اس کے ماضی کے بارے میں ضرور بات کرتی رہی مگر اس کے حال کے بارے میں بات کرتے ہوئے گریز کر رہی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے خود برتن اٹھائے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس مکان میں اکیلی رہتی تھی اور اس کے پاس ایک ملازم تک نہیں تھا۔ اس کا گھر اور کوئی چیز بھی امتیازی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ جس سے پتا چلتا کہ وہ ریناٹ کی مخالف حکمران ہے اور اس کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ جب وہ چائے جیسا مشروب لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”آپ یہاں اکیلی نظر آرہی ہیں، آپ کے پاس جنگی قوت بھی اتنی نہیں لگ رہی ہے۔ یہاں کے برعکس میں نے آرگون میں بہت زیادہ فوجی قوت دیکھی ہے۔“

”یہ حقیقت ہے کہ ہم سپاہیوں کی تعداد اور اسلحے کے لحاظ سے ریناٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتے مگر یہ جنگ ہمیں یہ سوچ کر لڑنی ہے کہ یہ ہمارے بقا کی جنگ ہے۔ اگر ہم ہار گئے تو اپنی زندگی ہار جائیں گے اور وادی کے لیے ہمیشہ کے لیے غلام بن جائیں گے۔“

”وہ غلام ہیں۔“

”نہیں انہوں نے خود پر ایک خول چڑھا رکھا ہے۔ تم نے یہاں کے لوگوں کو نہیں دیکھا کیا وہ تمہیں عام انسان نہیں لگے۔“

میں نے اعتراف کیا اور بولا۔ ”مگر مجھے آپ کے پاس ذرائع کی بھی کمی نظر آئی ہے۔“

”یہ حقیقت ہے کیونکہ یہاں ہمیں ہر چیز کی کمی ہے۔ خوراک کی ضرورت بھی مشکل سے پوری ہوتی ہے۔ دوسری چیزیں بھی سب کو پوری نہیں ملتی ہیں۔ البتہ ہم نے اسلحہ خاصا

بنالیا ہے اور ہمارے پاس کل وقتی سپاہی کم ہیں مگر رضا کار بہت ہیں۔''

''ان کی جنگی مہارت کیا ہے؟''

''سپاہیوں جیسی تو نہیں ہے لیکن وہ ضرورت پڑنے پر جنگ لڑ سکتے ہیں۔''

''مجھے ان کو دیکھنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''آرگون میں آپ کے جاسوس ہیں؟''

''بالکل ہیں۔''

''ان کو پیغام بھیج دیں کہ ریناٹ کی فوجوں کی تیاری پر مسلسل نظر رکھیں اور ان کے بارے میں ہر ممکن معلومات یہاں بھیجیں۔''

وہ چونکی۔ ''تمہارے خیال میں خطرہ ہے؟''

''بالکل ریناٹ جلد مہم شروع کردے گا اور اس میں شاید چند دن بھی باقی نہیں رہے ہیں۔''

''میرا خیال تھا گرتم نے تصدیق کردی۔''

''کیرٹ بھی اس معاملے میں بے چین تھا۔''

''میں ابھی اپنے اہم لوگوں کو بلاتی ہوں اور جاسوسوں کے لیے پیغام بھیجتی ہوں۔'' سامیرا نے کہا اور اٹھ کر گھر سے نکل گئی۔ ایسا لگ رہا تھا اسے سب خود کرنا پڑتا تھا۔ جب کہ اسے لازمی اپنے ساتھ چند آدمی رکھنے چاہیے تھے جو بہ وقت ضرورت اس کے حکم کی تعمیل کر سکیں۔ ذاتی ملازم نہ سہی اسے اپنے کام کے لیے ملازم رکھنے چاہیے تھے تاکہ اس کا وقت بچتا اور وہ اہم کاموں پر توجہ دے سکتی۔ مگر شاید وہ مساوات کے چکر میں اس سے گریز کر رہی تھی۔ اس کی واپسی کچھ دیر بعد ہوئی اور اس کے ساتھ تین آدمی تھے۔ ان تینوں نے سپاہیانہ لباس پہن رکھا تھا۔ سامیرا نے میرا تعارف کرایا اور برف والے کا حوالہ دیا تو وہ مجھ سے گرم جوشی سے ملے تھے۔ صرف سامیرا میری بات سمجھ سکتی تھی اور وہ ترجمان بنی ہوئی تھی اس نے ان پر واضح کردیا کہ اب اس جنگ کا کمانڈر میں ہوں گا جو چند دن میں لڑی جانے والی ہے۔ میرے کمانڈر بننے پر انہوں نے کوئی مخالفانہ ردعمل نہیں دیا مگر وہ یہ سن کر متفکر ہو گئے تھے کہ جنگ چند دن میں ہونے والی تھی۔ سامیرا نے ان کا تعارف کرایا۔

''یہ سومرو ہے۔'' اس نے درمیانی عمر کے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ''فوج کا سربراہ یہ ہے۔'' پھر دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا جو نسبتاً جوان تھا۔ ''یہ کاتمیور ہے، تیرانداز دستے کا سربراہ اور یہ میناٹ ہے نیزہ بردار دستے کا سربراہ۔''

میناٹ عمر رسیدہ اور دبلے جسم کا مالک تھا جیسا کہ ایک نیزہ باز کو ہونا چاہیے۔ تعارف کے بعد میں نے سومرو کی طرف دیکھا اور پہلا سوال کیا۔ ''تمہارے پاس تربیت یافتہ سپاہی کتنے ہیں؟''

''ایک ہزار کے قریب ہیں۔'' اس نے سامیرا کے توسط سے جواب دیا۔ ''ان میں چار سو نیزہ باز ہیں، چار سو تیرانداز اور دو سو مختلف طریقوں سے لڑنے والے سپاہی ہیں۔''

''رضا کاروں کی تعداد کیا ہے؟''

''دو ہزار رضا کار ہیں۔'' اس نے بتایا۔ سامیرا نے اس کا جواب مجھ..... تک پہنچایا اور بولی۔ ''ہمارے ساتھ موجود افراد کی کل تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ پندرہ سے ستر برس کی عمر کا ہر فرد لڑنے والوں میں شامل ہوگا۔''

میں فکرمند ہوگیا کیونکہ آرگون میں، میں نے صرف ڈیوٹی پر اس سے زیادہ سپاہیوں کو دیکھا تھا۔ ایک ہزار سے زیادہ سپاہی تو باہر کام کرنے والوں کی حفاظت پر معمور تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ریناٹ کے پاس تربیت یافتہ فوج ہی اس سے زیادہ ہوگی۔ میں نے آرگون کی فصیلوں پر بھاری تیر پھینکنے والی مشینی کمانیں دیکھی تھیں جب کہ یہاں مجھے ایسی کمانیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ سامیرا نے تصدیق کی کہ ان کے پاس ایسی کمانیں نہیں تھیں۔ اس نے کہا۔ ''ان کو بنانے والے کچھ ماہر ہیں اور وہ سب آرگون میں ہیں۔''

اگر ماہر میسر بھی ہوتے تو اب ہتھیار سازی کا وقت نہیں تھا۔ میں نے سومرو سے کہا۔ ''کل صبح میں تمام لڑنے والوں کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جیسے ہی روشنی ہو ان کو قلعے کے عقب میں واقع میدان میں جمع کرلیا جائے۔''

اس نے یقین دلایا کہ ایسا ہوجائے گا۔ میں نے مزید ہدایت کی کہ تیرانداز الگ ہوں، نیزے باز الگ اور دوسرے ہتھیار استعمال کرنے والے الگ ہوں۔ ساتھ ہی رضا کار اور پیشہ ور سپاہی بھی الگ الگ ہوں۔ اس کے ساتھ میں نے مزید کچھ ہدایات دیں۔ وہ تینوں رخصت ہوئے تو میں نے سامیرا سے کہا۔ ''کیا آپ کو ان تینوں پر مکمل اعتماد ہے؟''

''ہاں کیونکہ یہ میرے شروع کے ساتھیوں میں سے ہیں جب نیکاٹ نے مجھ پر آرگون آنے کی پابندی لگائی یہ تب سے ساتھ ہیں اور انہوں نے ہی اس تحریک مزاحمت کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ کیا تم ان پر شک کر

رہے ہو؟''

''میرا تعلق جس دنیا سے ہے وہاں آنکھ بند کر کے کسی پر اعتماد نہیں کیا جاتا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔'' خاص طور سے معاملہ بھی جب دنیا کا ہو۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں نے بھی ان میں حکومت کا اقتدار کا لالچ محسوس نہیں کیا۔''

''کیا ان کے خاندان بھی یہاں ہیں؟''

''ہاں ان تینوں کے خاندان یہاں ہیں صرف میناٹ کی پہلی بیوی اور بچے آرگون میں ہوتے ہیں انہوں نے اس کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہاں آ کر دوسری شادی کر لی۔''

مجھے میناٹ کی دوسری یا تیسری شادی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اس لیے میں نے پوچھا۔'' آپ یہاں کا نظام کس طرح چلاتی ہیں۔''

''تقریباً سب طے شدہ ہے، ہر شعبے کے سربراہ ہیں جو اپنے اپنے شعبوں کے ذمے دار ہیں۔ ہاں کوئی مسئلہ ہو تو پھر میرے پاس آتے ہیں اور میرا فیصلہ حتمی ہوتا ہے۔''

''کسی بھی حکمران سے لوگ سو فیصد مطمئن نہیں ہوتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے یہاں موجود لوگ آپ سے کس حد تک مطمئن ہیں؟''

میرے اس سوال پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔''ایسا تو کبھی میں نے سوچا نہیں میرا خیال ہے میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ مجھ سے مطمئن نہ ہوں۔''

میں مسکرایا۔''آپ بہت ذہین ہیں مگر سیاسیات کا علم کچھ اور ہی کہتا ہے۔ بہترین طرز حکمرانی سے بھی سب لوگ مطمئن نہیں ہوتے۔ اگر حکمران رعایا کو اپنا گوشت نکال کر بھی کھلا دے تب بھی وہ سب کو مطمئن نہیں کر سکتا ہے۔''

سامیرا الجھن میں پڑ گئی۔''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''کبھی آپ نے جاننے کی کوشش کی کہ ریناٹ کے جاسوس یہاں موجود ہیں یا نہیں۔''

''نہیں کیونکہ یہاں سب لوگ دیکھے بھالے ہیں اور کئی عشروں سے یہاں رہ رہے ہیں۔''

''اس سے یہ نتیجہ بالکل نہیں نکلتا ہے کہ یہاں ریناٹ کے جاسوس موجود نہیں ہیں۔''

سامیرا اس بار پریشان ہو گئی اور اس نے اظہار بھی کر دیا۔''شہباز تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''

''میں نے آپ کو خواب غفلت سے جگا دیا ہے۔ اب آپ اپنے ذہین آدمیوں کو اس پر لگائیں کہ وہ مشکوک سرگرمیاں کرنے والوں پر نظر رکھیں۔ جیسے آپ کے جاسوس آرگون میں ہیں بالکل اسی طرح ریناٹ کے جاسوس یہاں ہو سکتے ہیں۔''

''لوگ ریناٹ سے نفرت کرتے ہیں۔''

''ضروری نہیں ہے لوگ جس سے نفرت کرتے ہوں اس کے لیے کوئی کام کرنے کو آمادہ نہ ہوں۔'' میں نے کہا۔''لالچ بہت بڑا عنصر ہے اسی طرح بہت سے لوگ ہوں گے جو پرانے نظام کو ہی وادی کی بقا کا ضامن سمجھتے ہوں گے اور وہ اسے برقرار رکھنا چاہتے ہوں گے چاہے انہیں ریناٹ کی حمایت کیوں نہ کرنی پڑے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ریناٹ ایک شخص ہے جو بالآخر گزر جائے گا اور اس کے بعد وادی کے حکمران پھر سے معمول پر آ جائیں گے۔ مطلب یہ کہ نظام برقرار رہنا چاہیے۔''

''ایسا نہیں ہے ریناٹ نے نظام کو مکمل طور پر اپنے مقاصد کے لیے تبدیل کر دیا ہے۔''

''صرف اپنے اور اپنے ٹولے کی حد تک عام لوگوں کے لیے پرانا نظام موجود ہے۔''

سامیرا نے سر ہلایا۔''میں دیکھتی ہوں لیکن اس کے لیے آج رات مصروف رہنا پڑے گا۔ اب تم آرام کرو۔''

''میں زیادہ دیر آرام نہیں کروں گا کیونکہ وقت کم ہے اور رات کی تاریکی بہت سی سرگرمیوں کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے ایک رہنما دے دیں جو یہاں سے اچھی طرح واقف ہو اور لوگ بھی اسے جانتے ہوں۔''

''میں اس کا بندوبست بھی کرتی ہوں۔'' سامیرا نے کہا اور پھر کھڑی ہو گئی۔ میرا اندازہ درست تھا وہ ہر کام خود کرتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں کرسی پر ہی آرام کرنے لگا۔ اگرچہ مجھے دو دن میں آرام کا موقع کم ملا تھا اور ایک رات میں نے آرام کی بجائے اذیت میں گزاری تھی۔ مگر میں سچ مچ اس وقت خود کو چاک و چوبند رکھنا چاہتا تھا۔ کرسی پر ہی اونگھتے ہوئے مجھے نیند آ گئی۔ پھر کسی وقت سامیرا نے مجھے جگایا۔ وہ آ گئی تھی۔''تم یہاں کیوں لیٹے ہو اندر چلے جاتے۔''

''نہیں مجھے یہاں اچھا لگ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔''آپ کب آئیں؟''

''ابھی آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔''ابھی نصف رات

کا وقت ہے۔ مجھے دونوں قلعوں میں جانا پڑا اور ہاں میں تمہارے لیے ایک رہنما لائی ہوں۔ وہ یہاں ہر جگہ اور ہر چیز سے واقف ہے، لوگ بھی اسے جانتے ہیں۔''

''اب میری باری ہے آپ آرام کریں اور میں باہر جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اسے بلالیں۔''

سامیرا نے باہر موجود آدمی کو بلایا اور وہ آیا تو میں ذرا حیران ہوا۔ وہ لڑکی تھی۔ یہاں عمروں کا پتا نہیں چلتا ہے مگر وہ نوجوان ہی لگ رہی تھی۔ اس کے حسن میں کمسنی کی ترو تازگی شامل تھی۔ اس نے شوخ سرخ رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ سامیرا نے تعارف کرایا۔ ''یہ روبیر ہے۔''

''کیا یہ میری بات سمجھ سکے گی؟''

''میں نے اسی لیے اسے منتخب کیا ہے۔'' سامیرا بولی اور لڑکی کو حکم دیا۔ ''ادھر آؤ۔''

وہ آگے آئی تو سامیرا نے اسے کرسی پر بٹھا کر اس کی کن پٹی پر اپنا انگوٹھا رکھا اور پھر درمیانی انگلی اس کے ماتھے پر رکھ کر کن پٹی پر انگوٹھے کا دباؤ ڈالا۔ روبیر اسی طرح بے ہوش ہو گئی جیسے میں بے ہوش ہوا تھا۔ سامیرا نے میری طرف دیکھا۔ ''اسے کچھ وقت لگے گا ہوش آنے میں۔''

میں حیران تھا۔ ''آپ یہ علم جانتی ہیں؟''

''ہاں مہا پجاری بننے کے لیے لازمی علوم میں ایک یہ بھی شامل ہے۔''

''مگر فیرون مہا پجاری ہوتے ہوئے بھی اس سے لا علم ہے۔''

''وہ نشہ کرتا ہے اور اس کا اپنا دماغ اس قابل نہیں رہا ہے کہ اپنی اس صلاحیت کو استعمال کر سکے ہاں وہ چاہے تو کسی دوسرے شخص کے دماغ کی صلاحیت بیدار کر سکتا ہے اس میں اولین شرط نشہ نہ کرنا ہے اسی لیے میں نے اس لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔''

اب میں سمجھا تھا شاید ڈیوڈ شا خود بھی یہ صلاحیت استعمال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں نے اسے اکثر نشے کی حالت میں دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ لڑکی ہے کیا اس کا میرے ساتھ رات کے وقت گھومنا مناسب ہوگا میرا مطلب ہے......؟''

''میں سمجھ رہی ہوں لیکن تم فکر مت کرو کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کے پاس یہاں کا کوئی نقشہ ہے؟''

''ہاں میں لاتی ہوں۔'' وہ اندر گئی اور ایک چرمی نقشہ لے آئی، یہ کسی جانور کی کھال پر بنا ہوا تھا اور اس میں وادی اور یہاں کی زمین کا تفصیلی نقشہ موجود تھا۔ آرگون شہر اور تینوں قلعوں کی بھی مکمل وضاحت تھی۔ اسی طرح آرگون اور معبد کو ملانے والی سرنگ بھی اس میں نمایاں تھیں۔ البتہ وہ راستہ نہیں تھا جو معبد سے باہر آتا تھا اور جس سے میں نکلا تھا۔ میں نے سامیرا کو آرگون اور معبد والی سرنگ کا وہ حصہ دکھایا جہاں سے اندر جایا جا سکتا تھا۔ پھر اس خفیہ راستے کی نشان دہی کی جو فصیل سے اندر جاتا تھا۔ ان جگہوں پر نشانات لگائے جہاں آرگون میں ہماری حمایتوں کے ٹھکانے تھے۔ آخر میں، میں نے اس راستے کی نشان دہی کی جو جنگل سے معبد کے اندر جاتا تھا۔ میں بالکل ٹھیک تو نہیں لیکن کسی حد تک درست نشان دہی کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ مگر سامیرا نے کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ ''اس کا فائدہ...... اصل میں تو ہمیں اپنا دفاع کرنا ہے۔''

''یہ ایک تجویز ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ جارحیت ہی بہترین دفاع ہے۔''

''میرا نہیں خیال کہ ہم حملہ کرنے والی حالت میں ہیں۔''

میں نے فی الحال سامیرا سے بحث سے گریز کیا۔ ابھی میں یہاں کے حالات دیکھ لینا چاہتا تھا اس کے بعد ہی میں حتمی فیصلہ کرتا کہ مجھے کیا کرنا ہے البتہ ایک بات میں نے سوچ لی تھی کہ اگر میرے فیصلے سے انحراف کیا گیا تو میں اس معاملے سے دست کش ہو جاؤں گا۔ روبیر تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوش میں آگئی اور سامیرا نے اسے ایک مشروب دیا۔ اسے پی کر وہ چاق و چوبند نظر آنے لگی۔ میں نے تجربے کے طور پر پوچھا۔ ''اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

وہ ذرا حیران ہوئی اور پھر خوش ہو کر بولی۔ ''مجھے تمہاری زبان سمجھ میں آگئی ہے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔''

''سامیرا نے بتایا کہ تم یہاں سے اچھی طرح واقف ہو؟''

''ہاں کیونکہ میں گھر گھر جا کر سامیرا کی طرف سے لوگوں کے مسائل کا پوچھتی ہوں۔ مجھے یہاں کی جگہوں اور لوگوں کا اچھی طرح علم ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں سامیرا کے لیے کام کرتی ہوں۔''

میں نے دیکھا کہ یہاں براہ راست نام لینے کا رواج تھا۔ صرف بادشاہ اور مہا پجاری کے لیے مخصوص القاب تھے۔ باقی سب کے نام تھے اور ولدیت شامل کرنے کا

تکلف بھی نہیں کیا جاتا تھا یعنی سب کے اکیلے نام تھے۔ میں نے سامیرا سے کہا۔ ''مجھے ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔''

''روبیر بہترین سپاہی بھی ہے۔'' سامیرا نے کہا۔

میں نے نرمی سے کہا۔ ''ضرور ہو گی لیکن میں اپنی حفاظت کا خود قائل ہوں۔''

سامیرا نے اندر سے مجھے ایک نیزہ لا دیا۔ تیر کمان کے استعمال میں مہارت درکار ہوتی ہے جو ظاہر ہے میرے پاس نہیں تھی۔ البتہ روبیر کے پاس تیر کمان تھے اور یہ سامیرا کے گھر کے دروازے پر رکھے تھے اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی لاٹھی تھی۔ اس کے دونوں سروں پر کڑے جیسے پتھر تراش کر فٹ کیے گئے تھے اور اسے ایک مہلک ہتھیار کی صورت دے دی گئی تھی۔ میں روبیر کے ساتھ باہر آیا۔ یہ قلعہ تو میں نے سامیرا کی تلاش میں پورا دیکھ لیا تھا۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ''مجھے باقی دو قلعے دیکھنے ہیں۔''

''آؤ لیکن محتاط رہنا رات کے وقت یہاں گونز اور اسمار چلے آتے ہیں۔ ہمیں سپاہی ساتھ لینے ہوں گے۔''

باقی دو قلعوں کا درمیانی قلعے سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا ایک قلعہ دائیں طرف کوئی تین سو گز کے فاصلے پر تھا۔ روبیر نے تیز روشنی والی دو مشعلیں لے لیں ایک میں نے اٹھا لی اور دوسری اس کے پاس تھی۔ پہلے ہم دائیں طرف والے قلعے تک آئے۔ روبیر نے احتیاطاً چار سپاہی ساتھ لے لیے جو رات کے پہرے پر تھے۔ سپاہیوں کی موجودگی سے مجھے بھی اطمینان ہوا تھا کیونکہ میں قلعوں کا باہر سے جائزہ لینا چاہتا تھا۔ یہ ہماری دفاعی لائن تھے اور اس میں کوئی رخنہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ قلعوں کی فصیلوں پر تیز روشنی والی مشعلیں لگی ہوئی تھیں اور ان کی روشنی دور تک جا رہی تھی۔ مقصد دشمن کے اچانک حملے سے باخبر رہنا تھا۔ میں اور روبیر دو ڈھائی گھنٹے تک قلعوں کا جائزہ لیتے رہے۔ اس دوران میں مجھے چند کمزور پہلو نظر آئے اور میں نے روبیر کو نشان دہی کرا دی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ذہین لڑکی تھی اور بات کو جلدی سمجھ جاتی تھی۔ اسی لیے سامیرا نے اسے میرے ہمراہ کیا تھا۔ اس کی دوسری بات مجھے یہ پسند آئی کہ اس نے صنفی جھجک یا بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا اور میرے ساتھ ایسے رہی جیسے کوئی مرد رہ سکتا تھا۔ جب تک ہم باہر رہے۔ اس دوران میں باہر صرف ایک بار ایک اسمار نے ہماری طرف آنے کی کوشش کی اور تیر اندازوں کی کارروائی شروع ہوتے ہی فرار ہو گیا تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ تیر کس قدر تکلیف دہ چیز ہیں۔ جب ہم واپس آئے تو کسی قدر روشنی نمودار ہو رہی تھی اور یہ تاروں والی رات تھی یعنی آسمان صاف تھا۔ روشنی کے ساتھ ہی دھند اٹھنا شروع ہو گئی۔ تینوں قلعوں میں سیاہ اور رضا کار تیار ہو رہے تھے اور قلعے سے نکل کر وسطی یعنی سامیرا والے قلعے کے عقب میں موجود میدان میں جمع ہو رہے تھے۔ ان میں سپاہی اپنی وردیوں میں تھے اور رضا کار عام لباس میں تھے۔

میں اور روبیر سامیرا کے گھر پہنچے جہاں اس کے تینوں خاص آدمی موجود تھے۔ سامیرا ان سے میٹنگ کر رہی تھی اور شاید انہیں میرے خدشات سے آگاہ کر رہی تھی۔ آرگون میں موجود جاسوس ریناٹ کا شعبہ تھے اور وہی ان سے رابطہ کرتا اور معلومات حاصل کرتا تھا۔ سامیرا نے مجھے بتایا کہ جاسوسوں نے آرگون میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں دیکھی جس سے شبہ ہو کہ ریناٹ فیصلہ کن حملہ کرنے والا ہے۔ مگر کیرٹ کا کہنا تھا کہ فیصلہ ہو چکا ہے اور جلد اس پر عمل درآمد بھی کیا جانے والا تھا۔ مگر یہ وقت اس بحث میں الجھنے کا نہیں تھا ہمیں کسی بھی حملے سے دفاع کے لیے مکمل طور پر تیار رہنا تھا۔ میں نے سامیرا سے کہا۔ ''ہمیں کچھ امور طے کر لینے ہیں کہ کسی بھی حملے کی صورت میں ہمیں کیا کرنا ہو گا؟''

''مثلاً کون سے امور؟''

''اول حملے کے وقت عورتیں، بچے اور بوڑھے کہاں ہوں گے؟''

''اپنے گھروں میں۔''

''میرا خیال ہے انہیں اس قلعے میں بلا لینا چاہیے تاکہ سپاہی ان کی طرف سے بے فکر ہو جائیں۔ انہیں اپنے گھر والوں کی طرف سے فکر ہو گی تو وہ ٹھیک سے نہیں لڑ سکیں گے۔ باقی دو قلعے زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سامیرا مان گئی۔

''دوسرے کسی بھی صورتِ حال میں میرا حکم حتمی ہو گا۔''

اس پر وہ تینوں چونکے تھے مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں اور سامیرا بولی۔ ''یہ تو برف والے نے طے کر دیا ہے اس وقت تم یہاں کے حکمران ہو اور مجھ سمیت تمام لوگ تمہارے حکم کے پابند ہیں۔''

''میں چاہوں گا کہ فوج کے معائنے کے دوران میں اس کا اعلان بھی کر دیا جائے۔''

''میں ایسا ہی کروں گی۔'' سامیرا نے یقین دلایا۔

روشنی خاصی ہوگئی تھی اور وہ تمام لوگ جن کا معائنہ کرنا تھا قلعے کے عقبی میدان میں پہنچ گئے تھے۔ ہم بھی باہر آئے۔ میدان میں ایک بے ہنگم سا ہجوم موجود تھا۔ میں نے سومرو، ریناٹ اور کامینور کی طرف دیکھا۔ ''ان لوگوں کو منظم کرو جیسا کہ میں نے کہا تھا۔''

وہ اس کام میں لگ گئے اور انہیں یہ کام کرتے ہوئے جس طرح سے دشواری پیش آرہی تھی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ نہ تو سپاہ پر مکمل کنٹرول تھا اور نہ ہی سپاہ مکمل تربیت یافتہ تھی۔ یہ سپاہیوں کا حال تھا تو رضا کاروں کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ تمام دستوں کو الگ الگ کرنے میں کامیاب رہے۔ اکثر سپاہی ہتھیاروں کے بغیر تھے۔ رضا کار تو بالکل خالی ہاتھ تھے۔ مجھے کوفت ہوئی۔ میں نے واضح کہا تھا کہ انہیں ہتھیاروں کے ساتھ آنا تھا۔ میں نے سومرو سے پوچھا تو اس نے خفت سے جواب دیا۔ ''میں نے کہا تھا مگر شاید ان لوگوں نے ٹھیک سے سمجھا نہیں۔''

''اگر حملے کے وقت یہ اسی طرح اٹھ کر میدان جنگ میں چلے آئے تو لڑائی کا انجام سوچا جاسکتا ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ان لوگوں سے میری گفتگو اب روبیر کے توسط سے ہورہی تھی۔ کامینور کا تیر انداز دستہ سب سے منظم تھا اور وہ سب سے پہلے انہیں الگ اور قطاروں میں کھڑا کرنے میں کامیاب رہا۔ بیشتر تیر انداز کمان لے کر آئے تھے مگر ان کے پاس ترکش نہیں تھے۔ البتہ نیزہ بردار سب سے غیر منظم تھے اور ان میں سے چند ایک ہی اپنے نیزے ساتھ لائے تھے۔ ان میں سے کچھ گوپھن یعنی رسی میں پتھر باندھ کر پھینک کر مارنے کے ماہر تھے اور بعض لاٹھیوں سے لڑتے تھے۔ پیشہ ور سپاہیوں کے بعد اب رضا کاروں کو الگ الگ گروپ میں تقسیم کیا جارہا تھا اور ان کو ایک قطار میں لانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ میں، سامیرا اور روبیر ذرا بلند جگہ کھڑے تھے تاکہ سب کو آسانی سے دیکھ سکیں۔ میں نے سامیرا سے کہا۔

''فوج کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں جانتی ہوں مگر میں ان امور کی ماہر نہیں ہوں، کیا تم ان کو ازسرنو منظم کرسکتے ہو۔''

''کرسکتا ہوں لیکن اس میں وقت لگے گا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ہمارے پاس کتنا وقت ہے۔''

بہ مشکل دو گھنٹے میں یہ تین ہزار افراد اس طرح کھڑے ہوئے کہ میں ان کا جائزہ لے سکوں۔ پہلے سامیرا نے اعلان کیا کہ اب میں فوج کا کمانڈر تھا اور میرا ہر حکم ماننا لازمی تھا۔ سب نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اور سینے پر ہاتھ کر مجھ سے تابعداری کا اظہار کیا۔ اس کے بعد میں نے سامیرا کے ساتھ ان کا معائنہ کیا۔ ہم ہر قطار سے گزرتے ہوئے انہیں دیکھنے لگے۔ پیشہ ور سپاہی پھر بھی بہتر حالت میں تھے مگر رضا کاروں میں اکثر کی صحت اچھی نہیں تھی اور ان کے نرم جسم بتا رہے تھے کہ وہ زیادہ محنت مشقت کے عادی نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ اوور ویٹ بھی تھے مگر اکثر انڈر ویٹ تھے اور ان کو مزید مضبوطی اور پٹھوں کی ضرورت تھی۔ اگر وہ فٹ ہوتے تب ہی ہتھیار ٹھیک سے استعمال کر سکتے تھے۔ جیسے جیسے میں ان کا جائزہ لے رہا تھا یہ مجھے مسخروں کی فوج لگ رہی تھی۔ جب میں تصور میں آرگون اور ریناٹ کی سپاہ کو لاتا تو مجھے لگتا کہ یہ اس کے ایک دستے کا مقابلہ بھی نہیں کرسکیں گے۔ میں معائنہ کرکے واپس سامیرا کی طرف آیا اور اسے اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔ ''ان میں سے بہت کم کام کے آدمی ہیں اور ان کو بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ لڑائی میں کتنی مہارت رکھتے ہیں؟''

''کیا اس میں بھی وقت لگے گا؟''

''بالکل، ویسے میرا اندازہ ہے کہ یہ لوگ ہی یہاں کے ہر کام کے ذمے دار ہیں جیسے کھیتوں میں کام کرنا وغیرہ۔''

''یہ درست ہے ہمارے پاس کل افرادی قوت یہی ہے۔''

میں نے روبیر کی مدد سے انہیں حکم دیا۔ ''آج سہ پہر تم سب کو پھر یہیں جمع ہونا ہے اور اس بار سب اپنا مکمل اسلحہ لے کر آئیں گے اور اسی طرح منظم ہو کر کھڑے ہوں گے۔''

وہ میری بات سن کر منتشر ہونے لگے۔ میں سامیرا کے ساتھ واپس قلعے کی طرف جانے لگا۔ کھیتوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ ''یہاں خوراک کا کتنا ذخیرہ ہے؟''

''ابھی فصل درمیانی ہے سردی کے آغاز سے پہلے کٹے گی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن ہمارے پاس خوراک کا ذخیرہ ہے۔''

ہم قلعے کے گیٹ کے پاس تھے کہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی اور میں نے دیکھا سامیرا کا چہرہ زرد ہوگیا اس نے زیرلب کہا۔ ''اعلان جنگ......''

جاری ہے

بیت بازی
قارئین

(مرزا اسفار بیگ حیدرآباد کا جواب)

امجد علی......... منگیرہ
یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

احمد توحید......... چنیوٹ
یہ زخم عشق ہے کوشش کرو ہرا ہی رہے
کسک تو جا نہ سکے گی اگر یہ بھر بھی گیا

(انوار فاروق شادی پور کا جواب)

فتح محمد خان......... کوہاٹ
میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ شخص آ کے مرے شہر سے چلا بھی گیا

(رانا حبیب الرحمٰن لاہور کا جواب)

ارم نوشین......... منڈی بہاؤالدین
یہ مے کدہ ہے یہاں کس کو ہوش ہے پیارے
تو پہلے خود تو سنبھل مجھ کو ہوشیار نہ کر

آصفہ خورشید......... فیصل آباد
مانا کوئی ہنگامہ نہیں ان کے مقدر میں
مگر اک گونج سناٹوں کی ویرانوں کے ہاتھ آئی

(اشرف علی کراچی کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان......... کھاٹاں
آج دل پھر ضد پر اڑا ہے کسی بچے کی طرح
یا سب کچھ مجھے چاہیے یا کچھ بھی نہیں

(منشی عزیز مے لڈن کا جواب)

ارم حارث......... کراچی
ان آنکھوں سے ملتی ہیں جو آنکھیں سر محفل
شرما کے پھر اپنے کو جھکا دیتی ہیں آنکھیں

(محمد احمد جائی ملتان کا جواب)

رمیش دیوریہ......... سکھر
نہ کوئی چارہ نہ حسرت نہ آرزو نہ طلب
قمر کے واسطے بس آپ کی دعا ہے بہت

عرشیہ ارشد......... ہری پور
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

نرجس زیدی......... کراچی
نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لیے

سنز پروین......... کراچی
نکھرا ہوا کیوں رنگ تغزل کا نہ ہوتا
اس میں کلیم آپ کی کاوش بھی بہت تھی

(آفتاب احمد جائی کراچی کا جواب)

عائشہ بھٹو......... لاڑکانہ
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیسا

(مجی رحمٰن برٹ لیٹ (یو ایس اے) کا جواب)

نادیہ اصفہانی......... اسلام آباد
کون پھر کس کا انتظار کرے
عشق آوارہ حسن ہرجائی

اشرف علی شیروانی......... کراچی
کتنے آسودہ تھے ان گلیوں کے لوگ
جب نہ تھا ہر راستہ آراستہ

فہیم انصار......... حیدرآباد
کچھ راس بھی آئے تھے بدلتے ہوئے موسم
کچھ پھول کی فطرت میں نمائش بھی بہت تھی

عاصمہ اکبر......... کراچی
کل رات کیا بتاؤں کرامات ہو گئی
اندر کے آدمی سے ملاقات ہو گئی

نور عین طلعت......... کراچی
کیا جانے کس کے پاس رکے آ کے فصلِ گل
موسم بدل رہا تھا شجر جاگتے رہے

نوروز ملک......... لاہور
کچھ ایسا کرب تھا پنہاں کسی کے لہجے میں
بہت مخجل رہی میری انا اکیلے میں

(عبدالجبار رومی انصاری لاہور کا جواب)

قائم علی رضوی........ کراچی
اشک یوں نام پہ میرے نکل آئے ہوں گے
سر نہ کاندھے سے سہیلی کے اٹھایا ہو گا

شیر نواز گل........ پشاور
اہلِ ہنر تو سو گئے کٹوا کے اپنے ہاتھ
اور پتھروں میں ان کے ہنر جاگتے رہے

مینا مشتاق........ ملتان
اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا
بنا خونِ فاسد کے لیے تعلیم شِ نیشتر
(ذیشان اکبر کوئٹہ کا جواب)

ناعمہ تحریم........ ملیر کراچی
مایوسیوں نے چھین لیے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے
(رانا حبیب الرحمٰن لاہور کا جواب)

عرفان مروت........ حب
یہ مانا ضبطِ غم میں گریہ و زاری نہ کر پائے
چھپا پا گل مگر خوشبو کی تہ داری نہ کر پائے

معراج محمد عباسی........ ہری پور
یہ دل کہیں کا نہ رکھے گا اعتبار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر
(احمد شاہ کوہاٹ کا جواب)

حمید احمد جائی........ ملتان
تم آنکھ بھی ملنے کی اجازت نہیں دیتے
اور دل تم کو نگاہوں میں بسانے پر تلا ہے
(ناہید ممتاز فیصل آباد کا جواب)

نیلوفر شاہین........ اسلام آباد
مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں جو آ گیا تو چراغ راہ میں جل اٹھے
(احباب خان پشاور کا جواب)

محمد احمد رضا انصاری........ کوٹ ادو
مصلحت ہو گی کوئی مجھ کو بھلا دینے میں
ورنہ احباب کو معلوم ہے میں زندہ ہوں
(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

احباب خان........ پشاور
انیس فوجیں بکھر نہ جائیں صفوں میں مل کر قدم بڑھائیں
مقام راحت قریب تر ہے جو وقت مشکل تھا ٹل گیا

نیاز احمد........ کراچی
اٹھا سا قیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

نسیم زہرہ........ لاہور
اپنا کوئی آنے کو ہو پردیس سے جب بھی
خود کو ہی سرِ راہ بچھا دیتی ہیں آنکھیں

نصرت جبیں........ خان پور
اک بار گلاب عارض و لب کے ترے مہکیں
اک برق تبسم پھر جو چمک جائے تو اچھا

احمد جاوید........ کراچی
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

تبریز حسن........ ملتان
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

منظر علی خان........ لاہور
آتے ہوئے اذان ہوئی جاتے ہوئے نماز
کتنا قلیل وقت تھا آیا گزر گیا
(اکبر توحید کراچی کا جواب)

نسیم منظر........ بفرزون
رچ بس گیا ہے ذہن میں ناصر کسی کا روپ
اب کیا کریں گے کوئی شاہکار دیکھ کر
(نسرین اختر لاہور کا جواب)

سیف اللہ ملک وال........ منڈی بہاؤالدین
ہوا جب زرد پتوں کو جدا شاخوں سے کرتی ہے
ہمیں اپنے بچھڑ جانے کا موسم یاد آتا ہے

(عرفان مروت حب کا جواب)

ناعمہ........ کراچی
غم و خوشی کا توازن کسی کو کیا معلوم
ہزار اشک نکلتے ہیں اک ہنسی کے لیے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 116

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 جولائی 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

24 جولائی 1947ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1989ء میں لندن کی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کی۔ 62 ون ڈے میچوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور 2572 رنز بنائے جس میں 7 سنچریاں شامل ہیں۔ 14 ٹیسٹ اور 13 ون ڈے انٹرنیشنل میچوں میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی۔ دائیں ہاتھ کے بیٹس مین اور آف بریک بالر رہ چکے ہیں۔

علمی آزمائش 114 کا جواب

ایڈولف ہٹلر 1889ء میں برنو نام کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ اس کی وجہ سے ایک بڑی جنگ کا آغاز ہوا۔ کہتے ہیں اس نے قسم کھائی تھی کہ اپنے ملک سے ایک ایک یہودی کو ختم کر دے گا۔ اس کے حکم سے ایک ایک وقت میں دو دو ہزار یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

انعام یافتگان

1۔ ناصر خان آفریدی، ڈی آئی خان　2۔ زریاب خان، کوہاٹ　3۔ صفدر حیات محمود، لاہور

4۔ صالحہ پروین، اسلام آباد　5۔ ناصر اصغر ملک، ملتان

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی نسیم منظر، ناعمہ تحریم، سید عزیز الدین، زہیب احمد، خادم حسین، نادر نیازی، محمد ریحان، ناصر حسین ناصر، فرحت فاطمہ، نعمان قریشی، شاہین ربانی، غیاث احمد، ارشد علی، ندیم افضل، ایوب آغا، حکیم اللہ حسن زئی، فرحت ندیم، مرزا اختر بیگ، احمد علی، ارشاد حسین، انیس بھٹائی، عطا محمد، کاشان قریشی، یاسین جوکھیو، محمد سلیم، قیام احمد۔ لاہور سے عبد الجبار

رومی انصاری، منظر علی خان، رانا حبیب الرحمن، عبدالرشید، نجیب اللہ خان، ریاض بٹ، ملک فیروز دین، شبیر باجوہ، ارشاد حسین کاظمی، عنایت علی، سیف الاسلام، نورین بٹ، قاسم مظہر، اختر حسن خان، خاقان خان، علمدار حسین رضوی، محمد علی بخاری، طارق بن سعد، فہیم الدین، ارباز خان، شاہین بٹ۔ ملتان سے محمد طارق (سورج میانی) محمد افتخار، مجید احمد جائی، احمد جاوید سرکانی، زہیب بٹ، راحیل اختر، نوشین بنت احمر، منصور علی، قاسم جان، علی خان قلی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، سیف الرحمن خان۔ راولپنڈی سے ندیم احمد مغل، ڈاکٹر سعادت علی خان، طارق جاوید۔ پشاور سے سردار موہن سنگھ، کاشف محمود، دردانہ جان، عنایت علی حسن زئی، اشرف عباسی، نعمت خان، کاظم بنگش، زید علی طوری۔ پاراچنار سے اشرف عباس۔ اٹک سے جنید احمد خان، نورالنہار۔ بدین سے سید ایس ڈی ساغر، ڈاکٹر رمضان کھتری۔ ہارون آباد سے شکیل الرحمن۔ میرپور خاص سے عبیرہ صنوبر، راحیل اختر، محمد علی ملک، تھری لولکھ، نوشین ملک، افتخار حسین، عباس قائم خانی، فرقان محمد، سلیم خاص خیلی، فرمان اللہ ساقی۔ لڈن وہاڑی سے منشی محمد عزیز مئے، سعید احمد چوہان۔ شکارپور سے فرحت عباسی۔ ڈی جی خان سے زوہیب شاکر، زنوبیہ اختر، خادم حسین، برہان الدین شاکر۔ جام شورو سے منصور احمد (کوثر مما)۔ سکھر سے عماد مسعود، منور سلیم، ناصرہ ممتاز۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، کلیم الدین، شگفتہ اکبر، نثار الدین۔ حیدرآباد سے ماہ رخ (لطیف آباد)، ثناء اللہ، توقیر حسن زیدی، نوشین فاطمہ، فرحت اقبال، اقبال جاوید، حیات فاطمہ، پرویز سید، دلبر جان، عباس فتح علی، نیازی احمد عباس، نرگس علی، مریم کاشف، علی سید، تحریم فاطمہ، نصرت عباسی، ایاز جوکھیو، فرزانہ رحمن۔ سیالکوٹ سے زید شہزاد خواجہ۔ کالاباغ سے عبدالخالق۔۔ بہاؤ لنگر سے معظم علی (چشتیاں)۔ اوکاڑہ سے اظہر الدین، سعید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جبیں فلک، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ اٹک سے خالد چودھری، زبیر اللہ خان، فیض اختر، ثنا جبران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت فاطمہ ملک، سرفراز گل، ثناء اللہ، فرحت بابر زمان، سعید بھٹی، نثار فراز، سید اختر، سعید خان، شیخ ثنا، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، خالد جاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم، محمد صدیق ستری۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، بازخ بخاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میرپور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز۔ میانوالی سے احمد علی فوتی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان اشرفی، عبدالخالق (کالاباغ)۔ بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منگیرا، زبیر شاہ، تقی بنگش۔ ٹنڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چوٹالہ، ناصر بھگیو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، نثار علی، فہیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ گولارچی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے حسن بیگ، فہیم اللہ فاروقی۔ نوشہرہ سے فضل محمد۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسن، صفدر حسن، خالد خان، ناصر انجم، ابرار حسن زئی۔ مظفر گڑھ سے رانا محمد سجاد (زاں شہر)۔ منڈی بہاؤالدین سے سیف اللہ، عطا محمد بٹ، کوثر تسنیم، کاشانہ قریشی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے جاوید مسیح، جمیع مسیح، نادرہ نیازی، رخسانہ نیازی۔ ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی، کاشان محمد خان، محبوب رند، حسن کمال۔ بھکر سے محمد عارف قریشی، غیاث محمد، بتول انصاری، زہیب محمد۔ جھنگ سے عاصم سہیل، نادرا انصاری، انیس اقبال، حسن ضیا، کامل اختر۔ شادی پور سے عاصم سہیل، ثنا احمد۔ تلہ گنگ سے اختر عباس، شعیب احمد۔ چکوال سے عارف بٹ، زاہد ترمذی، حسن علی سید، عارف انام۔ میرپور اے کے سے کاظم علی، اشرف حجاب علی، شگفتہ بھٹی۔ خان بیلہ سے یاسین سرفراز، شگفتہ آپا، نارووال سے انعام احسن کامی۔ میانوالی سے ایاز علی رند، تحریم فاطمہ، خیر الدین کھر۔ ٹنڈو آدم سے خالد خان چوٹالہ، نیاز عباس۔ کمالیہ سے ذیشان مجاہد۔ لیہ سے شجاعت خان۔ سکھر سے محمد اسلام بھٹی، حافظ محمد تقی، احسان اسلام بھٹو۔ ڈی آئی خان سے نازش سلطان۔ جھنگ سے انیس احمد جاوید۔ فیصل آباد سے دلاور حسن۔ بدین سے عباس علی ساند۔ شیخوپورہ سے سید امتیاز حسین، صدیق الاسلام، حکیم اللہ خان، محمد سعید، فریال حسن۔

بیرون ملک سے احمد توحید، منعم اشرف، نعمان اشرف (دبئی، یو اے ای)، عباس علی دانہ والا (مانچسٹر)، عارف امتیاز (جاپان)۔

پتھر لوگ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم
انسان کو بحیثیت اشرف المخلوقات جنم دیا گیا مگر اب وہ پستی کے آخری درجے تک پہنچ چکا ہے۔ آنحضرتؐ کا ظہور صرف اور صرف اس لیے ہوا تھا کہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر لے آئیں۔ وہ معاشرہ جو ظلم و جور سے بھر گیا تھا اسے انسانیت کا درس یاد کرائیں۔ ہم وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو امتِ محمدؐ میں پیدا ہوئے مگر دیکھا یہ جارہا ہے کہ ہم میں اسلام باقی نہیں رہا۔ صلح رحمی کی حضورؐ نے تاکید کی مگر ہم ظلم و جبر کی انتہا پر پہنچ گئے ہیں۔ ثنا کے سسرالیوں کا رویہ ملاحظہ کریں کیا یہ مسلمان کہلانے کے حقدار ہیں؟

مسز جاوید
(کراچی)

جب میں نے اپنے گھر کو وومین ہاسٹل میں بدلنے کا فیصلہ کیا تو وہ میری زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ میرے شوہر میرا ساتھ چھوڑ کر دنیا سے جا چکے تھے اور میری دو چھوٹی بچیاں تھیں۔ جاوید سے میری شادی اس وقت ہوئی تھی جب میں صرف سولہ سال کی تھی اور جاوید مجھ سے پورے بیس سال بڑے تھے۔ اس بے جوڑ شادی کی واحد وجہ میرے گھر والوں کی غربت اور جاوید کا پیسا تھا۔ جاوید پراپرٹی کا کام کرتے تھے اور ان کا اپنا مکان تھا۔ اکیلے آدمی تھے اور آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ ایک شادی پہلے بھی کی تھی مگر وہ ناکام رہی اور بیوی طلاق لے کر چلی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ حالانکہ صحت مند اور جوان تھے پھر پیسا بھی تھا۔ خاصا بعد میں جا کر انہیں دوبارہ شادی کا خیال آیا۔ اس کے لیے بھی ان کے عزیز ترین دوست سلیم بھائی نے انہیں راضی کیا۔ انہوں نے ایک رشتے کرانے والی عورت سے بات کی اور اتفاق سے اس کا ہمارے گھر بھی آنا جانا تھا۔

میرے چار بہن بھائی تھے، دو مجھ سے بڑی بہنیں اور دو مجھ سے چھوٹے بھائی۔ ہمارا لائنز ایریا میں چھوٹا سا مگر اپنا مکان تھا۔ بس یہی ایک سہولت تھی جو ہمیں میسر تھی۔ اماں ابا نے کسی نہ کسی طرح دونوں بہنوں کی شادی کر دی تھی۔ حالانکہ وہ شکل صورت کی اچھی تھیں مگر غربت کی وجہ سے انہیں معمولی رشتے ملے۔ میرا خیال تھا کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ میٹرک کرتے ہی اماں نے گھر بٹھا لیا تھا کہ اب مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے پڑھنے کا شوق تھا اور میں نے بہت اچھے نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا، اس وقت میں پندرہ سال کی تھی۔ اب اماں میرے رشتے کی تلاش میں تھیں اور انہوں نے اسی عورت سے کہہ رکھا تھا کہ وہ میرے لیے کوئی رشتہ دیکھے۔ اس نے چند ایک رشتے بتائے جو ہم سے بھی گئے گزرے تھے۔ اماں دو بیٹیوں کو اپنے جیسی حالات کی چکی میں پستے دیکھ کر پچھتا رہی تھیں اور میری شادی ذرا دیکھ بھال کر کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے وہ رشتے مسترد کر دیئے گئے۔ مگر جب جاوید کا رشتہ آیا اور عورت نے پہلے تو ان کے گھر اور پیسے کا نقشہ کھینچا۔ جب اماں خوش ہو گئیں تو تصویر دکھائی۔ اماں کھٹک گئیں۔

''اے لڑکے کی عمر زیادہ لگ رہی ہے۔''

''زیادہ نہیں ہے۔'' عورت نے چالاکی سے کہا۔ ''پھر مرد تو ساٹھا پاٹھا ہوتا ہے۔ یہ دیکھو تمہاری بیٹی خوش

رہے گی۔ آگے پیچھے کوئی نہیں، سسرال کی جھنجھٹ سے محفوظ رہے گی۔ اپنا گھر اور کھلا پیسا ہے۔''

اماں ابھی تک عمر کے معاملے میں فکر مند تھیں۔ ''پھر بھی لڑکے کی عمر تو پینتیس لگ رہی ہے میری رابعہ ابھی سولہ کی بھی نہیں ہوئی ہے۔''

''دیکھ صبیحہ، لڑکی زیادہ عمر کی لگتی دیر نہیں لگاتی ہے۔ اگر فرق زیادہ ہے تو ابھی لگے گا۔ چند برس بعد میاں بیوی پاس پاس کے لگنے لگتے ہیں۔ مرد تو پچاس سال کا ہو کر بھی بوڑھا نہیں لگتا اور عورت چالیس سال میں ڈھے جاتی ہے۔ میری مانو تو غور کرلو۔ ایسے رشتے بار بار نہیں آتے ہیں۔ ابھی بات میرے ہاتھ میں ہے میں نے اسے کوئی اور رشتہ نہیں بتایا ہے حالانکہ میرے پاس اس کے لحاظ سے کئی رشتے ہیں مگر میں چاہتی ہوں وہ اس گھر سے لڑکی لے کر جائے۔ آدمی بہت اچھا ہے۔ ابھی تمہارا بوجھ ہلکا نہیں کرے گا بعد میں بھی تمہارے کام آئے گا۔''

اماں نے ابا سے بات کی اور جاوید کا بتایا تو ابا سوچ میں پڑ گئے۔ انہوں نے اماں سے کہا۔ ''دوسرے جو رشتے آئے وہ کون سے کم عمر لڑکے تھے۔ ایک اٹھائیس سال کا بتا رہا تھا اور دیکھنے میں تیس بتیس کا لگتا تھا دوسرا ابھی ستائیس سے کم نہیں تھا۔ ہماری قوم میں لڑکوں کی شادی دیر سے کرنے کا رواج ہے اور لڑکی کی شادی کمسنی میں کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اور خود کو دیکھ لو تم سے پورے بارہ برس بڑا ہوں۔''

اماں نے ابا کو تصویر دکھائی۔ ابا نے تحقیق کرنے کو کہا۔ چند دن بعد انہوں نے اماں کو آ کر بتایا۔ ''لڑکے کا ادھر پی سی ایچ ایس میں اپنا بڑا سا مکان ہے۔ کسی کے ساتھ شراکت میں اسٹیٹ ایجنسی چلا رہا ہے اور اچھا کماتا ہے۔ گاڑی بھی ہے۔ صحت اور کاٹھی بھی ٹھیک ٹھاک ہے پر عمر چھتیس ہے رابعہ سے پورے بیس سال بڑا ہے۔''

جاوید کا بیس سال بڑا ہونا ہی کڑوا گھونٹ بن گیا تھا جو اماں ابا سے نگلا نہیں جا رہا تھا اور مجھے ان باتوں کا پتا ہی نہیں تھا کیونکہ میں جوان ہونے کے باوجود شادی جیسی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ اس لیے جب اچانک ہی اماں ابا نے فیصلہ کیا اور مجھے مطلع کیا کہ میری شادی کی جا رہی ہے تو میرے لیے یہ خبر غیر متوقع تھی۔ اگر میں ذرا سن گن رکھتی تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ گھر میں میرے حوالے سے کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ بہر حال شادی ہونی تو تھی کہ اماں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ جلد میری شادی کر دیں گی۔ اس لیے مجھے زیادہ دھچکا بھی نہیں لگا اور میں جلد نارمل ہو گئی البتہ جب مجھے پتا چلا کہ جاوید کی عمر چھتیس برس ہے تو میں نے اماں سے کہا۔ ''کیا ابا کی عمر کے آدمی سے شادی کر رہی ہو میری؟''

''زیادہ عمر کا ہے لیکن پیسے والا ہے تو عیش کرے گی۔''

پیسا ہماری زندگی کا کمزور پہلو تھا۔ اگرچہ ایسا بھی
نہیں تھا کہ ہم لالچ کے مارے تھے۔ ابا محنت کر کے کماتے
تھے۔ انہوں کبھی غلط طریقے سے نہیں کمایا۔ ہماری زندگی
میں ایک رکھ رکھاؤ اور عزت نفس کا احساس تھا۔ اس کے
باوجود ہر شخص کی طرح ہماری خواہش تھی کہ اچھی زندگی
گزاریں۔ بہت کھلا پیسا نہ سہی مگر کچھ فراغت تو ملے۔ اس
لیے جب اماں نے بتایا کہ جاوید بہت پیسے والے ہیں تو مجھے
خوشی ہوئی اور ان کی زیادہ عمر کا جو شکوہ اماں ابا سے تھا وہ جاتا
رہا۔ جاوید کو میں پسند آئی۔ اگرچہ اتنی خوب صورت نہیں
تھی۔ گندمی رنگ اور کسی قدر گول سے نقوش تھے۔ قد
مناسب تھا اور جسم چھریرہ اس لیے اپنی عمر سے اور بھی کم لگتی
تھی۔ پھر کمسنی کی دل کشی بھی تھی۔ جاوید اتنے فریفتہ ہوئے
کہ شادی سے پہلے ہی رشتہ طے ہونے کے بعد ان کی طرف
سے میرے لیے تحفے آنا شروع ہو گئے۔

کپڑے، جیولری، میک اپ، جوتے اور دوسری
ڈھیروں چیزیں جو انہوں نے چند مہینے کے اندر بھیج دی
تھیں۔ پھر میں بیاہ کر ان کے گھر آ گئی۔ شادی کی پہلی رات
انہوں نے اتنی محبت اور نرمی کا مظاہرہ کیا کہ میں اپنی قسمت
پر رشک کرنے لگی۔ سچی بات ہے کہ جاوید عمر کے زیادہ تھے
مگر نقوش اور جسامت کے لحاظ سے خوبرو تھے۔ پہنا ہوا ان
پر اچھا لگتا تھا۔ مزاج کے بہت اچھے تھے۔ بہت دھیمے اور
شائستہ انداز میں بات کرتے تھے۔ اگرچہ اسٹیٹ ایجنسی کا
کام کرتے تھے مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انہوں نے سول
انجینئرنگ کی ہوئی تھی۔ بے شک شادی کے وقت میری اتنی
عمر نہیں تھی مگر مجھے ان کے مقابلے میں اپنی کم علمی کا احساس
تھا۔ جب میں اگلے روز اماں ابا کے گھر گئی اور جاوید کی بے
پناہ تعریف کی تو وہ بھی اپنے انتخاب پر خوش ہو گئے اور ان
کے دلوں میں جو ذرا سی کھٹک تھی وہ بھی نکل گئی۔

جاوید کا مکان پرانے انداز کا مگر خاصا بڑا تھا۔ کوئی
چھ سو گز کے پلاٹ پر بنے اس مکان میں سات کمرے
تھے۔ چاروں طرف برآمدہ تھا اور سامنے والے حصے میں
چھوٹا سا لان تھا۔ دو طرف چھوٹی گلیاں تھیں اور عقب میں
چھوٹا سا صحن تھا۔ پرانی ساخت اور تعمیر ہونے کے باوجود
اس کا اسٹرکچر بہت مضبوط تھا۔ مین روڈ سے ایک گلی چھوڑ کر
اندر کی طرف تھا۔ اس لیے ٹریفک کا شور سنائی نہیں دیتا تھا
مگر آدمی کو چند قدم کے فاصلے پر ہر طرح کی ٹرانسپورٹ مل
جاتی۔ مارکیٹ اور ہر طرح کی دکانیں نزدیک تھیں۔ جاوید
اپنے بچپن کے دوست سلیم بھائی کے ساتھ ایجنسی چلاتے
تھے۔ دنیا میں اگر جاوید کسی کے قریب تھے تو وہ سلیم بھائی ہی
تھے۔ وہ ان کے لیے سگے بھائی جیسے تھے۔ پہلے جاوید جاب
کرتے تھے اور ان کی بہت اچھی جاب تھی مگر شادی میں
ناکامی نے انہیں اتنا ڈپریس کیا کہ انہوں نے کام میں دل
چسپی لینا چھوڑ دی اور نتیجے میں ان کی جاب چھوٹ گئی۔

اگرچہ مالی لحاظ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن
سلیم بھائی نے انہیں مصروف کرنے اور مایوسی کے حصار
سے نکالنے کے لیے زبردستی اپنے ساتھ ایجنسی میں شامل کر
لیا۔ رفتہ رفتہ جاوید کا دل بھی اس کام میں لگ گیا اور پھر
انہوں نے سلیم بھائی کا نصف بوجھ سنبھال لیا۔ یہ کام ایسا تھا
کہ ملازموں پر بھی اعتماد مشکل تھا۔ سلیم بھائی کی ایک ساکھ
تھی اور اسی لحاظ سے ان کے پرانے گاہک تھے جو زمین
جائیداد سے متعلق خرید و فروخت اور کرائے پر لینے دینے
کے حوالے سے ان سے ہی رابطہ کرتے تھے۔ کام کا بوجھ
بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے کئی بار ملازم رکھے مگر کچھ ہی
عرصے میں اپنے کونٹیکٹ بنا کر انہوں نے اپنا کام شروع کر
دیا اور ایجنسی کی آڑ میں اپنا بزنس کرنے لگے۔ جاوید کے
آنے سے انہیں اطمینان ہو گیا اور اب زیادہ کام لے سکتے
تھے اور ملازموں پر بھی نگرانی رکھ سکتے تھے کہ وہ انہیں ہی تو
نہیں کاٹ رہے ہیں؟

سلیم بھائی جاوید کا احسان مانتے تھے کہ ان کے
آنے سے ان کا بوجھ ہلکا ہوا اور جاوید سلیم بھائی کا کہ ان کی
وجہ سے لگی بندھی تنخواہ والی پابند نوکری کی بجائے اپنا کام کر
رہے تھے اور بعض اوقات تو ایک سودے میں اس سے کئی
گنا زیادہ کما لیتے تھے جتنا کہ انہیں کبھی تنخواہ ملتی تھی۔ ماہانہ
خرچ تو چھوٹے موٹے کرائے کے سودوں سے نکل آتا
تھا۔ جب پہلے مہینے بلکہ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی
انہوں نے دس ہزار میرے ہاتھ پر رکھے تو میں نے
پوچھا۔ ”یہ کیا ہے میرا جیب خرچ تو آپ دے چکے ہیں۔“

”یہ مہینے کا خرچ ہے اور ابھی مزید ملے گا۔ مگر اتنا تو
کم سے کم ملے گا۔ اب گھر کا خرچ چلانا اور فیصلے کرنا تمہاری
ذمے داری ہے۔“

میں گھبرا گئی کیونکہ میں نے آج تک گھر کے لیے دس
روپے کی چیز اپنی مرضی سے نہیں لی تھی۔ ”میں نہیں کر سکوں
گی۔“

”تم کر لوگی۔“ جاوید نے مجھے تسلی دی۔ ”اگر کوئی

مشکل ہوئی تو میں ہوں نا مجھ سے پوچھ لینا مگر یقین ہے تم بہت جلد سب خود سے کرسکو گی۔ کمانا مرد کی ذمے داری ہے اور گھر چلانا عورت کی۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے کروں۔ کچن اور گھر میں ضرورت کی تمام چیزیں تھیں۔ اس لیے میں نے آسان فیصلہ کیا کہ اخراجات سے شروع کیا۔ یعنی جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو منگوا لیتی۔ رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہوگیا کہ گھر میں کون کون سی چیزیں اور کس مقدار میں آتی ہیں۔ بل سارے جاوید خود بھرتے تھے۔ گھر میں کوئی مستقل ملازم نہیں تھا۔ البتہ کام کے لیے دو ماسیاں آتی تھیں۔ ان میں سے ایک پہلے کھانا بھی بناتی تھی۔ شادی کے بعد کچن میں نے اپنے ذمے لے لیا۔ ایک ماسی کی چھٹی کر دی۔ البتہ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ایک ماسی کو رکھ لیا۔ وہ صبح سے دوپہر تک ہوتی تھی۔ ایک دو دن میں نے اس کی صفائی دیکھی اور پھر اس پر چھوڑ دیا۔ وہ دل لگا کر کام کرتی تھی۔ اس کی تنخواہ میں اپنے پاس سے دینے لگی۔ پھر جو خرچ کرتی وہ میں نوٹ کر لیتی تھی۔ اس طرح مجھے معلوم ہوتا گیا کہ کہاں کہاں کتنا خرچ ہو رہا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے دس ہزار روپے دو آدمیوں کے لیے معقول رقم تھی۔

مگر جاوید نے ٹھیک کہا کہ وہ دس ہزار تو دیں گے اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ پہلے مہینے کے آخر میں انہوں نے مجھے بارہ ہزار پھر دیے۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ کرائے کے سودوں سے جو حاصل ہوتا ہے وہ گھر میں خرچ کرتے ہیں اور خرید و فروخت کے سودوں سے جو ملتا ہے وہ بچت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ "یہ مت سمجھو کہ ایک مہینے میں دو بار مل گئے ہیں تو زیادہ ہیں بعض اوقات دو مہینے تک بھی کوئی سودا نہیں ہوتا ہے۔ یوں آگے پیچھے کر کے حساب برابر ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے کبھی تنگی نہیں ہوئی ہے اور اب تم آئی ہو تو تمہارا مقدر بھی ساتھ آیا ہوگا۔"

جاوید نے یہ بھی ٹھیک کہا کہ میرا مقدر بھی ساتھ آیا تھا۔ میرے... آنے کے بعد ان کا مہینے میں کم سے کم ایک کرائے کا سودا تو ہوتا تھا اور اس سے حاصل ہونے والا کمیشن وہ میرے ہاتھ پر رکھتے تھے۔ وہ جس علاقے میں کام کرتے تھے وہ بہت مہنگا تھا اور کرائے کے لیے معمولی سی جگہ بھی ہزاروں کے کرائے میں جاتی تھی۔ یوں میرے پاس جمع ہونے والی رقم کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی چلی گئی

تھی۔ جب میں بیاہ کر یہاں آئی تو کچھ عرصے تو میں نے جاوید کو دیکھا کہ میرے گھر والوں سے ان کا کیا رویہ ہے اور وہ ان کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں۔ جلد مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس معاملے میں بھی ان کی فطرت بہت اچھی تھی۔ وہ میرے اماں ابا کی عزت کرتے تھے۔ باقاعدگی سے مجھے لے کر ان کے گھر جاتے اور کبھی کھانے پینے میں نخرے نہیں کیے۔ جو اماں بناتیں وہ شوق سے کھاتے اور تعریف کرتے تھے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر دال سبزی بنتی تھی۔ جاوید مرغن کے شوقین تھے اور ہمارے گھر میں پورے مہینے مشکل سے چار پانچ بار دال یا سبزی بنتی تھی۔ ورنہ عام طور چکن، مٹن اور سی فوڈ بنتا تھا۔

پھر جاوید مجھے ڈھکے چھپے انداز میں کہتے تھے کہ میں اپنے گھر والوں کا خیال رکھوں اور ان کے لیے جو ہو سکتا ہے کروں۔ سچی بات ہے جب میری جاوید سے شادی ہو رہی تھی تو مجھے خیال تھا کہ مجھے اپنے گھر والوں کے لیے کچھ کرنا ہے۔ مگر میں جاوید سے چھپ کر کچھ کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے جب جاوید نے مجھے کہا تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اور اب میں جب جاتی اماں کے ہاتھ پر چپکے سے کچھ نہ کچھ رکھ کر آتی تھی۔ میں دیکھتی تھی کہ میری بہنیں خالی ہاتھ آتی ہیں اور یہ ان کی مجبوری تھی۔ ان کا اپنا گزارا مشکل سے ہوتا تھا اماں کو کہاں سے کچھ دیتیں۔ مگر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے آنے سے اماں ابا پر بوجھ پڑتا ہے۔ اس لیے میں جاتی تو کوشش ہوتی کہ بوجھ نہ پڑے یا کم سے کم پڑے۔ اس طرح چھوٹے بھائیوں کا خیال رکھتی تھی۔

جنید مجھ سے دو سال چھوٹا تھا اور اسد اس سے دو سال چھوٹا۔ دونوں ابھی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ میں ان کے لیے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں لیتی رہتی تھی اور جب گھر جاتی تو دے آتی۔ سو دو سو روپے پاکٹ منی دے دیتی۔ وہ خوش ہو جاتے کیونکہ اماں ابا کی استطاعت نہیں تھی کہ وہ بیٹوں کو ایک حد سے زیادہ جیب خرچ دے سکتے۔ یوں میری وجہ سے میرے گھر میں کسی قدر بہتری آئی پھر جنید نے میٹرک کر لیا اور اس نے آگے پڑھنے سے انکار کیا تو جاوید نے اسے اپنے ساتھ ایجنسی میں لگا لیا۔ جنید کمیشن پر کام کرتا تھا کیونکہ ایجنسی کا اصول ہی یہی ہوتا ہے۔ پھر بھی جاوید اسے اپنی جیب سے کچھ تنخواہ بھی دیتے تھے۔ باقی ہونے والے سودوں کے کمیشن میں سے اسے ملتا تھا۔ ایک سال میں وہ اچھا خاصا کمانے لگا تھا۔ اس نے ایجنسی کے ساتھ

ساتھ اپنے علاقے میں بھی سودے پکڑنا شروع کر دیے تھے۔اس سے الگ کماتا تھا۔

مگر جنید اماں کے ہاتھ پر بہ مشکل ہی کچھ رکھتا تھا اور اپنی ساری آمدنی اپنی تحویل میں رکھتا تھا۔ میں اسے سناتی تو بے غیرتی سے ہنستا۔ایک دفعہ میں نے اسے ایسے ہی دھمکی دی کہ میں ایجنسی سے نکلوادوں گی تو وہ خفا ہوگیا اور ایجنسی چھوڑ کر بھی چلا گیا تھا۔جاوید حیران ہوئے کیونکہ ان سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔انہوں نے مجھے بتایا اور میں نے بتایا کہ میں نے اسے کیا کہا تھا تو وہ بولے۔"دیکھو تمہارے گھر کا معاملہ گھر کا ہے اسے ایجنسی کے معاملات سے مت ملاؤ۔تم نہیں جانتی ہو جنید کے ہاتھ میں کیا کیا چیزیں ہیں اور اگر وہ گیا تو ایجنسی کو نقصان ہو سکتا ہے۔"

"مجھے تو نہیں معلوم۔"

"اگر تم چاہتی ہو کہ میں اسے ایجنسی سے الگ کر دوں تو مجھے بتاؤ میں پہلے اس سے اپنی چیزیں واپس لوں گا اس کے بعد اسے نکالوں گا۔"

"میں نے تو بس ایسے ہی دھمکی دی تھی سچ مچ نکلوانے کی بات تھوڑی کی تھی۔" میں پریشان ہوگئی۔"مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس سے آپ کو بھی نقصان ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اسے ہینڈل کرلوں گا مگر اب اس سے ایجنسی کے حوالے سے کوئی بات مت کرنا۔"

"میں نہیں کروں گی۔"

اصل میں ابا کو دیکھ کر میرا دل کڑھتا تھا۔ساری عمر محنت کی تھی اور اس وقت ساٹھ کے ہوگئے تھے مگر جسم اور چہرے سے ستر کے لگنے لگے تھے۔جنید بڑا تھا اور کمانے لگا تھا تو ابا کا سہارا بننے کی بجائے الٹا ان پر بوجھ بنا ہوا تھا کیونکہ رہتا تو گھر میں تھا۔اسد پڑھ رہا تھا اسے پڑھنے کا شوق تھا۔میٹرک کے بعد اس نے کالج میں داخلہ لیا تھا اور ابھی اسے کسی قابل ہونے میں خاصا وقت تھا۔میں چاہتی تھی کہ ابا اب آرام کریں اور جنید گھر کا بوجھ اٹھائے۔وہ اٹھا بھی سکتا تھا مگر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔اسے کوئی لت بھی نہیں تھی جو پیسے اڑاتا۔بلکہ وہ خاصا کنجوس واقع ہوا تھا۔پیسوں کو وہ کیا کرتا تھا اس کا پتا اب وقت چلا جب اس نے اچانک ہی جاوید سے کہا کہ وہ ایجنسی چھوڑ کر اپنے علاقے میں ایجنسی کھول رہا ہے۔جاوید حیران ہوئے کیونکہ اس نے پہلے بھاپ بھی نہیں نکالی تھی اور جانے سے ایک دن پہلے بتایا۔

"ضرور کرو۔"انہوں نے کہا۔"اچھا ہے اپنا کام کرو گے تو زیادہ ملے گا مگر مجھے بتا دیتے تو پہلے بھی خوشی ہوتی۔"

"بس وہ سیٹ اپ بن نہیں رہا تھا اس لیے بتایا نہیں۔" جنید نے کھسیا کر کہا۔"اب بن گیا ہے تو بتا رہا ہوں۔"

جسے وہ سیٹ اپ کہہ رہا تھا وہ مکمل ایجنسی تھی جسے اس نے دکان لے کر خود ڈیکوریٹ کرایا تھا۔جاوید نے مجھے بتایا تو مجھے بھی دکھ ہوا تھا۔اس کے آنے سے جاوید کو کوئی فائدہ نہیں تھا اور جانے سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔بالکل اسی طرح اس کے نہ کمانے سے اماں ابا کو کوئی نقصان نہیں تھا اور اس کے کمانے سے ان کو فائدہ نہیں ہوا تھا۔وہ ابھی بیس برس کا ہوا تھا۔ایجنسی کھولنے کے چند مہینے بعد اس نے اماں ابا پر زور دینا شروع کر دیا کہ اس کی شادی کی جائے کیونکہ وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اپنی بیوی بچوں کا بوجھ اٹھا سکے۔میں نے اسے کہا کہ آنے والے بیوی بچوں کے ساتھ اپنے ماں باپ کا خیال کرنا چاہیے تو اس نے بے پروائی سے کہا۔"انہوں نے کون سا ہمارا خیال کر لیا جو میں ان کا خیال کروں۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔"جنید وہ ہمارے ماں باپ ہیں اور انہوں نے جو کیا ہمارے لیے ہی کیا ہے۔"

"ہاں کبھی ڈھنگ کا ایک جوڑا نہیں بنا کر دیا۔ایک وقت ڈھنگ کا کھایا نہیں اور تم لوگوں کی شادیاں کون سی ڈھنگ سے کیں۔جو آیا اسے بیٹی تھما دی۔"

"میرے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔"میں نے اسے ٹوک دیا۔"میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔"

"اور باقی دو۔"

"ان کے ساتھ ان کا نصیب ہے۔"

"تو اماں ابا کے ساتھ ان کا نصیب ہوگا۔"اس نے کہا۔"ان سے کہو میری شادی کر دیں ورنہ یہ کام میں خود بھی کر سکتا ہوں۔"

میں نے اماں ابا سے کہا اور انہوں نے بھی یہی سوچا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔جیسے ہی اماں ابا راضی ہوئے۔جنید نے مکان کی اوپری منزل بنوانا شروع کر دی۔نیچے ڈربے جیسے تین کمرے تھے ان میں وہ شادی کر کے بیوی کو نہیں رکھنا چاہتا تھا۔اس نے اوپری منزل کو بڑھا کر دو بڑے کمرے اور لاؤنج کے ساتھ خوب صورت سا کچن بنوایا۔اماں کو اس نے کبھی ایک چیز لا کر نہیں دیا تھا مگر

ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور اس نے اچھا خاصا فرنیچر لے کر ڈال دیا تھا۔ کچن میں کراکری تک لے آیا تھا۔ اس دوران میں ایک رشتہ بھی دیکھ لیا۔ جنید کی واحد شرط تھی کہ لڑکی بہت خوب صورت ہو۔ لڑکی بھی اس کے معیار کی مل گئی۔ جیسا کہ شادی سے پہلے اس کے لچھن ظاہر تھے اس نے شادی کے بعد ہم سب سے کیا اماں ابا اور اسد سے ملنا چھوڑ دیا۔ ہفتے بھر اپنی صورت نہیں دکھاتا تھا۔ باہر سے آتا تو سیدھا اوپر چلا جاتا اور وہاں سے اتر کر باہر نکل جاتا۔

اس کی بیوی شائلہ بھی اس کی حرکتوں پر حیران ہوتی اور اسے سمجھاتی تھی کہ وہ ماں باپ سے قطع تعلق نہ کرے مگر جنید پر اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے بھی نیچے جانے سے منع کرتا تھا۔ جب تک وہ گھر میں ہوتا شائلہ نیچے نہیں آسکتی تھی۔ وہ اس سے چھپ کر آتی اور اس سے چھپ کر ہی اماں ابا کے ساتھ حسن سلوک کرتی تھی۔ ہم جنید کے فلور پر جاتے تو وہ گھر سے نکل جاتا اور بے چاری شائلہ شرمندہ ہوتی تھی۔ مگر ہم اسے تسلی دیتے کہ ہم اپنے بھائی کو جانتے ہیں۔ شائلہ اچھی تھی اور ہم اس کے ساتھ اچھے تھے۔ ابا اتنے سیدھے تھے کہ انہوں نے کبھی جنید سے کہا ہی نہیں کہ وہ ماں باپ کے گھر میں رہ کر ان سے یہ سلوک کر رہا ہے۔ شاید وہ ان کی سیدھے پن کا ہی غلط فائدہ اٹھا رہا تھا۔ بہر حال اماں ابا کے گھر کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی۔ میں نے یہ کیا کہ اسد کی تعلیم کا سارا خرچ میں اٹھانے لگی تھی۔ وہ اچھے کالج میں پڑھ رہا تھا اور اس نے بہت اچھے نمبروں سے انٹر کیا۔ اس کے بعد اس نے این ای ڈی میں داخلہ لیا تھا۔

اس وقت تک میری دو بیٹیاں ہوئی تھیں۔ حمیرہ جو شادی کے دو سال بعد ہوئی تھی اور سدرہ اس سے سوا دو سال بعد ہوئی۔ جاوید حمیرہ کی پیدائش پر اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ایک لان میں باقاعدہ دعوت کا اہتمام کیا تھا اور وہیں حمیرہ کا عقیقہ ہوا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں رواج ہے لڑکیوں کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا ہے مگر جاوید کی حمیرہ میں جان تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے وہ صبح ایجنسی جاتے تو عام طور سے شام تک واپسی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی لنچ کے لیے گھر آجاتے تھے حالانکہ ایجنسی دو گلی کے بعد تھی۔ ہفتے میں تین دن لازمی انہیں واپسی میں رات ہو جاتی تھی۔ مگر حمیرہ کے بعد وہ صبح دیر سے جاتے...... لنچ میں گھر آتے اور شام کو بھی جلدی آجاتے تھے۔ اگر کہیں جانا ہوتا تو لازمی گھر آکر پہلے حمیرہ کو دیکھتے اور پھر جاتے تھے۔ پھر سدرہ ہوئی تو اس

کے ساتھ بھی انہوں نے ویسی ہی محبت کی۔ انہوں نے کبھی مجھ سے بیٹے کی بات نہیں کی۔ اگرچہ مجھے بیٹے کی آرزو تھی مگر وہ پوری نہیں ہوئی۔

☆☆☆

جاوید کی موت اتنی ناگہانی تھی کہ مجھ پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ یوں اچانک میرا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ وہ رات کو اچھے بھلے سوئے اور صبح جب حمیرہ اور سدرہ اسکول جانے سے پہلے انہیں خدا حافظ کرنے اور پیار لینے گئیں تو وہ اٹھے ہی نہیں۔ حمیرہ اور سدرہ انہیں آوازیں دیتی رہیں اور جھنجوڑتی رہیں اور پھر ان کی چیخیں سن کر میں پہنچی تو میری چیخوں پر محلے والے آگئے تھے۔ حمیرہ بارہ سال اور سدرہ دس سال کی تھیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کی ایک آواز پر بے قرار ہو جانے والا باپ ان کی چیخوں پر بھی کیوں نہیں اٹھ رہا ہے۔ جاوید کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور جسم سرد تھا۔ وہ شاید رات کسی وقت دنیا سے گزر گئے تھے اور صبح بچیوں کو اسکول کی تیاری کرانے کے لیے میں عجلت میں اٹھی تو ان پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹے ہوئے تھے۔

محلے والے آئے اور پھر میرے گھر والے آئے۔ گھر والوں میں رہا ہی کون تھا؟ اماں ابا گزر چکے تھے۔ اسد چند مہینے پہلے ہی مڈل ایسٹ جاب پر گیا تھا اور جنید پہلے کی طرح لاتعلق تھا۔ مگر وہ آگیا پھر بہنیں اور بہنوئی آئے۔ سلیم بھائی سب دیکھ رہے تھے اگرچہ سب سے برا حال ان ہی کا تھا۔ وہی جاوید کو اسپتال لے کر گئے جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ شدید ہارٹ اٹیک سے کب کے دنیا سے جا چکے تھے۔ بعد میں سلیم بھائی نے مجھے بتایا تو میں دنگ رہ گئی تھی کہ جاوید کو کبھی ہائی بلڈ پریشر کی بیماری بھی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی صحت اتنی اچھی تھی کہ انہیں معمولی نزلہ بخار بھی شاذ ہی ہوتا تھا۔ میں بہت بیمار ہوتی تھی اور کبھی کبھی ان پر رشک کرتی کہ وہ معمولی سا بیمار بھی نہیں ہوتے۔ وہ پچاس کے تھے اور چالیس کے بھی نہیں لگتے تھے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ ایک ہی بار سب جھیل لیں گے۔ ہارٹ اٹیک اتنا شدید تھا کہ وہ لمحوں میں چلے گئے۔

اب تک میں گھر دیکھتی آئی تھی۔ باہر کے معاملات کا مجھے علم نہیں تھا۔ جاوید کیا کماتے تھے اور کیسے محفوظ کرتے تھے میں اس سے بے خبر تھی۔ سوم کے بعد سلیم بھائی نے مجھے بتایا کہ جاوید کا ایک بینک اکاؤنٹ ہے جس میں وہ اپنی بچت

رکھتے تھے۔ یہ سیونگ اکاؤنٹ تھا اور اس وقت اس میں کوئی بارہ لاکھ اور چالیس ہزار روپے تھے۔ چند مہینے پہلے ہی جاوید نے گھر کے اوپر والا فلور بھی بنایا تھا۔ اس میں تین بیڈ روم اور ایک بڑا سا لاؤنج بنوایا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہم اوپر رہائش رکھ لیں گے اور نیچے والا حصہ کرائے پر دے دیں گے۔ مگر ابھی یہ پورشن مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا بی سی ایچ ایس میں ایک سو چالیس گز کا پلاٹ تھا۔ پھر جاوید کی ہنڈا سٹی کار بھی تھی۔ ایجنسی کے کاموں کے لیے وہ موٹر سائیکل استعمال کرتے تھے۔ گویا مالی لحاظ سے مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر میں پھر بھی ہراساں تھی کہ میرے سر پر چھت نہیں رہی تھی اور دو بیٹیوں کے ساتھ میں کیا کروں گی۔

میرے بہنوئیوں کو مجھ سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ بہنوں کے پاس اتنی عقل نہیں تھی کہ مجھے مشورہ دے سکتیں۔ اسد ابھی گیا تھا کوشش کے باوجود اسے چھٹی نہیں ملی۔ وہ فون پر ہی مجھے تسلی اور مشورے دے سکتا تھا۔ ویسے بھی اس نے ابھی اتنی دنیا کہاں دیکھی تھی۔ دو سال پہلے انجینئرنگ مکمل کی اور ایک سال ایک مقامی کمپنی میں جاب کر کے وہ باہر چلا گیا تھا۔ جنید پر مجھے ذرا اعتبار نہیں تھا اس نے چالاکی سے کام لیا اور مجھے مشورہ دیا کہ میں پراپرٹی فروخت کر کے پیسا انویسٹ کر دوں۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا اور اس سے کہا۔ ''اپنے مشورے اپنے پاس رکھو جو شخص ماں باپ کا نہیں ہو سکا وہ بہن کا کب ہوگا۔''

اس پر جنید کا منہ بن گیا اور وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آیا۔ البتہ شمائلہ بچوں کے ساتھ ملنے آتی رہی تھی اور ان مشکل دنوں میں اس نے مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ جاوید کے انتقال کے ایک ہفتے بعد میں نے اسے مجبور کر کے بھیجا کہ اس کے بھی چھوٹے بچے تھے اور گھر تھا جسے وہی دیکھتی تھی۔ بہنوں نے زیادہ نہیں پوچھا اور نہ ہی مجھے ان سے توقع تھی۔ ایسے میں مجھے مشورے کے لیے سب سے مناسب شخص سلیم بھائی لگے۔ جاوید ان پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ جاوید کے انتقال کے ایک مہینے بعد میں نے ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''بھابی جاوید میرا شریک تھا۔ میرے ساتھ کام کرتا اور کماتا تھا۔ بدقسمتی سے اس کاروبار میں آدمی ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ ہوتا ہے تو کمائی ہوتی ہے وہ نہیں ہوتا تو کمائی بھی نہیں ہوتی۔ جاوید نے کچھ مالی انویسٹ منٹ کی تھی میں اس کا حساب کر رہا ہوں کیونکہ یہ ہم دونوں کی انویسٹ منٹ تھی۔ کچھ دن میں اس کا حساب آپ کو دیتا ہوں۔ جہاں تک آپ کے مستقبل کا سوال ہے تو ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ کو اللہ کے فضل سے کوئی پریشانی نہیں ہے اور خدانخواستہ ہو بھی تو آپ کا یہ بھائی موجود ہے مگر مستقل آمدنی کے حوالے سے میں اچھی طرح سوچ کر آپ کو مشورہ دوں گا وہ بھی اگر میری سمجھ میں آیا ورنہ معذرت کر لوں گا۔ ویسے میرا ہر ممکن تعاون آپ کے ساتھ ہوگا۔''

شادی کے بعد پندرہ سالوں میں یہ سب سے طویل گفتگو تھی جو سلیم بھائی نے مجھ سے کی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس مزاج کے آدمی تھے۔ جاوید سے بھائیوں جیسے تعلق کے باوجود مجھے نہیں یاد کہ وہ آ کر ہمارے گھر بہت دیر بیٹھے ہوں یا کبھی جاوید کی غیر موجودگی میں آئے ہوں۔ مجھ سے ہمیشہ ایک ادب و آداب کے ساتھ مخاطب ہوتے تھے حالانکہ عمر میں اور رشتے میں مجھ سے بڑے تھے مگر کبھی نام لے کر یا تم کر کے بات نہیں کی۔ ان سے بات کر کے میری فکر کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہوا۔ جاوید سلیم بھائی کی ذہانت کی بہت تعریف کرتے تھے اس لیے جب انہوں نے کہا کہ وہ مجھے مشورہ دیں گے تو مجھے اندر سے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے بہت درست مشورہ دیں گے۔

جاوید نہیں رہے تھے لیکن دنیا کسی کے جانے سے نہیں رکتی ہے۔ زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ دو ہفتے بعد بچیوں نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ جاوید نے انہیں ایک بہت اعلیٰ درجے کے اسکول میں داخل کرایا تھا۔ حمیرہ اس وقت ساتویں درجے میں اور سدرہ پانچویں میں تھی۔ وہ زیادہ چھٹیاں نہیں کر سکتی تھیں اور ان چھٹیوں سے بھی ان کا نقصان ہوا تھا۔ مگر یہ اس نقصان کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا جو باپ کے نہ ہونے سے ہوا تھا۔ میں بھی گھر کے کاموں میں الجھ گئی۔ جس دن سلیم بھائی سے بات ہوئی اس سے اگلے دن میری بہنیں ملنے آئی تھیں اور انہوں نے مجھے دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ میری عمر ابھی اکتیس بھی نہیں ہوئی تھی اور دیکھنے میں بھی اچھی لگتی تھی۔ جاوید نے مجھے بہت سہولت اور آسائش سے رکھا تھا۔ کوئی سختی نہیں دیکھی۔ کھانا پینا بہت اچھا تھا۔ شادی کے بعد میرے قد میں چار پانچ انچ کا اضافہ ہوا تھا اور میں اب متوسط سے بہتر قد رکھتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری ہوا تھا مگر بھدا نہیں ہوا۔ میں نے اپنا خیال رکھا تھا اس لیے دیکھنے میں پچیس چھبیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

"تجھے تو آسانی سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔"

"تم دونوں کا دماغ درست نہیں ہے میری بچیوں کی عمر اب شادی کی طرف بڑھ رہی ہے اور تم مجھے شادی کرنے کا مشورہ دے رہی ہو۔"

"دیکھ تجھے اور بچیوں کو باپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

"آج کل کوئی کسی کو سہارا نہیں دیتا، ہر ایک اپنے مطلب میں پورا ہوتا ہے۔ میں اپنی اور اپنی بچیوں کی زندگی کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتی۔" میں نے صاف انکار کر دیا۔

"اچھا یہ جو سلیم ہے جاوید کا دوست اس سے شادی کر لے۔" بڑی بہن نے پھوہڑ پن سے کہا تو مجھے غصہ آگیا۔

"وہ میرے بھائی کی طرح ہیں۔ جیسے اسد اور جنید ہیں ان سے زیادہ وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ شادی شدہ اور چار بچوں کے باپ ہیں۔"

بہنیں سمجھ گئیں کہ میرا موڈ آف ہوگیا ہے اس لیے انہوں نے پھر نہیں کہا۔ مگر ان کے جانے کے بعد میں نے سوچا تو مجھے دوسری شادی کے خیال سے ہی خوف آیا تھا۔ میں نے دل میں پختہ فیصلہ کرلیا کہ میں اب ساری عمر اکیلی ہی رہوں گی۔ اللہ کے بعد میری بچیاں میرا سہارا تھیں۔ حمیرہ ابھی سے اتنی سمجھدار تھی کہ میں شادی کے وقت بھی نہیں تھی۔ مجھے بہت اچھے مشورے دیتی تھی۔ اس نے مجھے سہیلی بنایا ہوا تھا اور مجھے ہر بات بتاتی تھی۔ وہ قد کاٹھ میں جاوید پر گئی تھی مگر نقوش بہت ہی پیارے تھے اور پھر اپنی عمر سے کسی قدر بڑی لگتی تھی۔ ایک دن اس نے آکر مجھے بتایا کہ اس کے ایک مرد ٹیچر اس سے بات کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور کبھی شانے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں یہ سب اسے بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا اور میں نے دوسرے ہی دن جا کر اسکول پرنسپل سے بات کی۔ اتفاق سے اس ٹیچر کی اور بھی شکایات آرہی تھیں۔ اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔

میں نے حمیرہ کو خاص طور سے اس بارے میں سمجھایا۔ وہ خود بھی سمجھدار تھی۔ اس کے مقابلے میں سدرہ ذرا لاابالی تھی میں نے حمیرہ سے کہا کہ وہ اس کا بھی خیال رکھا کرے کہ وہ کن کے ساتھ ہوتی ہے اور لڑکیاں آپس میں کس قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ کیونکہ حمیرہ کی کلاس فیلوز نے اس قسم کی گفتگو شروع کر دی تھی جو ایک زمانے میں بیس اکیس سال کی لڑکیاں بھی نہیں کرتی تھیں۔ حمیرہ مجھے آکر بتاتی اور میں اسے سمجھاتی تھی کہ کون سی بات اچھی ہے اور کون سی بری۔ رفتہ رفتہ اس نے خود ایسی لڑکیوں سے کنارہ کشی کرلی اور ان لڑکیوں کو دوست بنایا جو اس جیسا مزاج رکھتی تھیں۔ پیسے کی طرح مجھے بچیوں کی طرف سے پریشانی نہیں تھی۔ جاوید کے بعد مجھے کچھ ڈر لگا تھا مگر پھر وہ دل سے نکل گیا۔

ہمارا گھر جواب میرے نام تھا۔ جاوید نے اپنی زندگی میں ہی یہ گھر مجھے گفٹ کر دیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے جو پلاٹ لیا تھا اور انویسٹ منٹ کی تھی وہ پرانی تاریخوں میں میرے نام گفٹ کر دی تھیں اور میں نے سلیم بھائی کی مدد سے انہیں اپنے نام منتقل کرانے کی کارروائی کر لی تھی۔ یہ سارے کام میری عدت کے دوران ہی ہو گئے تھے۔ اس دوران میں سلیم بھائی نے مشورے کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی البتہ جاوید کی جو انویسٹ منٹ ان کے ساتھ تھی اس کی ساری تفصیل مجھے مہیا کر دی۔ یہ تین الگ انویسٹ منٹ تھیں جو کورنگی انڈسٹریل ایریا کے ساتھ اوورسیز کمرشل لائن میں کی ہوئی تھی۔ جاوید کی کل انویسٹ منٹ آٹھ لاکھ کی تھی اور اتنی ہی سلیم بھائی کی بھی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بھابی یہ لانگ ٹرم انویسٹ منٹ ہے۔ اب بھی اگر میں پلاٹ فروخت کرتا ہوں تو چار پانچ لاکھ اوپر ملیں گے مگر ایک وقت آئے گا جب یہ زمین سونا ہو جائے گی ہم نے جتنا کمایا ہے اس سے کئی گنا زیادہ کما سکتے ہیں اب آپ بتائیں کیا کیا جائے۔ آپ چاہیں تو مارکیٹ ریٹ پر مجھے فروخت کر دیں یا پھر اسے مستقبل کے لیے رہنے دیں۔"

"میرا خیال ہے مستقبل کے لیے رکھنا مناسب ہے۔ جب مجھے بچیوں کی تعلیم اور شادی کے حوالے سے رقم کی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ساری انویسٹ منٹ جاوید کے نام ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے میں آپ کے نام منتقل کرا دیتا ہوں۔ ایک پلاٹ میرے نام ہے اور دوسرا جاوید کے نام ہے تیسرا میری بیگم کے نام ہے۔ میں آپ سے معاہدہ کر لیتا ہوں کہ آپ کی رقم اس پراپرٹی میں لگی ہے جب یہ فروخت ہوگی یا آپ مطالبہ کریں گی میں رقم مارکیٹ ریٹ کے حساب سے ادا کرنے کا پابند ہوں گا۔"

یوں سلیم بھائی نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ میری عدت

ختم ہوئی۔ رسم دنیا کے مطابق رشتے دار اور واقف کار ملنے آئے تھے۔ سلیم بھائی اور ماریا بھابی آئی تھیں۔ وہ رات اور دیر سے آئے تھے تب تک دوسرے لوگ جا چکے تھے۔ عدت کے بعد میں پہلی بار سلیم بھائی کے سامنے آئی ورنہ اب تک پردے میں بات کر رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''بھابی میں نے آپ کی اور بچوں کی مستقل آمدنی کے حوالے سے بہت سوچا ہے۔ میری سمجھ میں دو باتیں آئی ہیں وہ میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں آگے آپ کی مرضی ہو گی۔''

سلیم بھائی نے پہلی بات یہ کی کہ جاوید میرے اور بچوں کے لیے جو جائیداد چھوڑ کر گئے تھے اسے فروخت کرنا کسی صورت مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ پیسے کی قدر گھٹتی ہے اور جائیداد کی بڑھتی ہے۔ میں نے سلیم بھائی سے اتفاق کیا کہ میری بھی یہی سوچ تھی۔ اب اسی جائیداد سے آمدنی حاصل کرنی تھی تو انہوں نے تجویز دی۔ ''آپ گھر میں وومین ہاسٹل کھول لیں۔''

''وومین ہاسٹل۔'' میں حیران ہوئی۔ ''مگر وہ کیسے اور میں اسے چلاؤں گی کیسے؟''

''آسان کام ہے اگر آپ کے پاس دس بارہ کمرے ہیں تو آرام سے ماہانہ ساٹھ سے ستر ہزار روپے کما سکتی ہیں۔''

''لیکن کرائے پر دینا ہے تو پورا گھر دینا زیادہ مناسب رہے گا۔''

''اس میں ایک خطرہ ہے کہ کرائے دار سے آپ کی کھٹ پٹ ہو گئی تو وہ یہاں جم کر بیٹھ جائے گا۔ آپ عدالت کے چکر نہیں لگا سکتیں۔ دوسرے مکان بڑا ہے لیکن پرانی طرز کا ہے اس لیے اگر ایک ہی پارٹی کو کرائے پر دیں گی تو پچاس ہزار کرایہ بھی نہیں ملے گا۔ خطرہ وہی رہے گا۔''

''بھابی آپ اکیلی ہوتی ہیں بے شک گھر محفوظ ہے لیکن سچی بات ہے آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں آئے دن ڈاکو گھروں میں گھستے ہیں اور یہاں چوکیدار بھی نہیں ہے۔'' ماریا بھابی نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''بے شک کھڑکیاں اور دروازے محفوظ ہیں اس کے باوجود مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''ہاسٹل بن جائے گا تو یہاں رونق ہو گی۔'' سلیم بھائی نے بات آگے بڑھائی۔ ''آپ کرائے پر آنے والی خواتین کے خرچے سے چوکیدار اور ملازمائیں رکھ سکیں گے۔ آپ کا یہ خرچ بچ جائے گا۔''

ماریا بھابی نے ایک نقطہ اور اٹھایا۔ ''ایک فائدہ اور ہے کہ آپ ورکنگ وومین بن سکیں گی۔ دنیا اور لوگوں کو دیکھیں گی تو آگے بچوں کے لیے مضبوط فیصلے کر سکیں گی۔''

ان دونوں کی باتوں نے مجھے قائل کر لیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے خاصی رقم بھی خرچ کرنا پڑے گی۔''

''ہاں چند لاکھ خرچ کرنا پڑیں گے تاکہ گھر اس قابل ہو جائے۔''

خاصی سوچ بچار کے بعد میں نے سلیم بھائی کا مشورہ ماننے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ان سے کہا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ہوں اس لیے آپ ہی مجھے پورا سیٹ اپ کر کے دیں۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں میں نے صرف مشورہ نہیں دیا ہے اس پر پورا ورک بھی کیا ہے۔''

سلیم بھائی نے یہ کیا کہ اوپری فلور کے سامنے والے حصے میں چار کمرے اور ایک نشست گاہ بنوانی شروع کی۔ ان کے علاوہ ایک بڑا مشترکہ واش روم جس میں دو ٹوائلٹ اور نہانے کے لیے دو کیبن تھے۔ نشست گاہ کے ساتھ ایک درمیانہ کچن بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نچلے حصے میں تبدیلیاں شروع کیں۔ اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ آرکیٹیکٹ اور سول انجینئرز سے مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ نیچے کے سات کمروں کو نو کمروں میں بدل دیا۔ اٹیچ باتھ ختم کر دیئے اور ایک بڑا باتھ روم بنایا جس میں چار لیٹرین، تین واش بیسن اور نہانے کے لیے دو کیبن تھے۔ ایک بڑا کچن تھا جس میں کئی چولہے نصب تھے اور ایک بڑا کامن روم تھا۔ یہ کھانے، تفریح اور گپ شپ کے لیے مخصوص تھا۔ اوپر جاوید نے جو تین بیڈ رومز اور لاؤنج بنایا تھا وہ ہمارے لیے ہوتا۔

سلیم بھائی اس فیلڈ کے آدمی تھے انہوں نے تیزی سے کام کرایا اور چھ مہینے میں ہاسٹل تیار تھا۔ اس کی ایڈورٹائزنگ بھی شروع کر دی تھی۔ پوسٹر چھپوائے، کیبل پر اشتہار دیئے اور پھر نیوز پیپرز میں اشتہار دیئے۔ جس دن اس کا افتتاح تھا اسی دن تین عورتیں آ گئیں۔ اشتہاروں میں واضح کیا گیا تھا کہ عورت کا ورکنگ وومین ہونا لازمی ہے۔ اگر ایک بچہ بھی ہو تو مناسب تھا مگر دو بچوں والیوں سے معذرت تھی۔ آنے والی عورت کو لازمی اپنے کام کی جگہ

یا دفتر سے تصدیق کرانی تھی کہ وہ وہاں کام کرتی ہے۔سیکیورٹی ڈیپازٹ رکھوانا تھا۔ماہانہ کرائے کے علاوہ بلوں اور دوسرے اخراجات میں شیئر کرنا تھا۔ہاسٹل کے لیے فرنیچر بنوایا تھا۔اس میں سنگل اور ذرا بڑے بیڈز شامل تھے۔جس عورت کے ساتھ بچہ ہوتا اس کے کمرے میں بڑا بیڈ ہوتا اسی طرح دو اور تین پٹوں والی الماریاں لی تھیں۔ ایک کمرے میں ایک سے زیادہ عورت کو رکنے کی اجازت نہیں تھی۔

جو عورت رہنے کے لیے آئی میں نے اس پر واضح کر دیا کہ اسے یہاں کے اصول اور قوانین کی مکمل پابندی کرنا ہوگا۔ایک تو وہ کسی کو کمرے میں لے کر نہیں جائیں گی۔جو ملاقاتی آئے گا اس سے لاؤنج میں ملیں۔اگر رات آٹھ بجے تک نہ آئیں تو کال کر کے اطلاع دیں گی کہ وہ کب آئیں گی۔بارہ بجے کے بعد ہاسٹل کا گیٹ بند کر دیا جائے گا۔کوئی ایسا کام نہیں کریں گی جس سے دوسرے ڈسٹرب ہوں۔کامن ایریا کو پہلے آیئے کی بنیاد پر استعمال کریں گی اس میں کوئی استحقاق نہیں ہوگا۔کامن ایریا اور کچن کی صفائی کا خیال رکھیں اگر ان کی وجہ سے کوئی خرابی ہو تو اسے خود درست کریں گی۔اگر کسی ماہر سے درست کروائی تو اس کی ادائیگی کریں گی۔اگر ہاسٹل میں ہونے والے کسی نقصان کے ذمے دار کا تعین نہ ہو سکا تو نقصان سب پر تقسیم ہوگا۔ اپنے کمرے اور آس پاس کی صفائی خود کریں گی اور اگر ملازمہ سے یہ کام کرائیں گی تو اس کی ادائیگی خود کریں گی۔

یہ سارے اصول اور قوانین کرائے داری کے معاہدے میں لکھے گئے تھے۔میں نے ایڈوانس تین مہینے کا طے کیا تھا اور ایک مہینے کا کرایہ پیشگی دینا ہوتا تھا۔کیونکہ بجلی اور گیس کامن تھی۔اس لیے اگر کوئی بل آنے سے پہلے چھوڑ کر جاتا تو اسے اندازے سے ادائیگی کرنی ہوتی جو بعد میں ایڈجسٹ کر لی جاتی۔یہ سب اصول و قواعد سلیم بھائی نے طے کر دیئے تھے۔انہوں نے ہر باریکی کا خیال رکھا تھا اور ساتھ ساتھ مجھے بھی گائیڈ کرتے جا رہے تھے۔مجھے شروع میں کچھ مشکل پیش آئی مگر جلد میں نے کام سمجھ لیا اور خود سے ہر چیز دیکھنے لگی۔کام کرنے والوں سے میں نے براہ راست نمبر لے لیے تھے اور کوئی ضرورت ہوتی تو فون کر کے بلا لیتی تھی۔ایک چوکیدار رکھ لیا تھا جو صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پر آ جاتا۔رات میں وہ گیٹ کے ساتھ بنی کوٹھری میں سوتا تھا۔ رات وہ آخری عورت کے آنے کے بعد گیٹ بند کر کے سوتا

تھا۔اسے کھانا پینا ہاسٹل سے دیا جاتا تھا۔صفائی اور لانڈری کے لیے دو عورتیں رکھی تھیں۔کچن سب خود دیکھتی تھیں۔ برتن سب کے اپنے اپنے تھے البتہ پتیلیاں اور بڑی چیزیں میں نے رکھی تھیں۔

میں سب خود دیکھتی تھی اور صبح سے شام تک میری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں لیکن یہ اتنی بھی نہیں تھیں کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی۔ میں آرام بھی کرتی اور اپنی بچیوں کو وقت بھی دیتی تھی۔رات میں کچھ دیر خواتین کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرتی اور ان کے مسئلے مسائل سنتی۔اس طرح جو میں نے کہنا ہوتا تھا وہ میں اس وقت کہہ دیتی۔اسی جگہ کو میں نے بہ طور دفتر رکھا تھا اور ہاسٹل کا سارا ریکارڈ میں اوپر اپنے پاس رکھتی تھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہاں سے لے آتی تھی۔کچھ عورتوں کے پاس گاڑیاں بھی تھیں ان کے لیے سامنے والے حصے سے لان ختم کر کے پارکنگ بنا دی۔البتہ عقبی صحن میں نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔یہاں کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔میرے حصے تک جانے کا راستہ بھی اسی طرف سے تھا۔اوپری ہاسٹل تک جانے کا راستہ سامنے سے تھا اور یہ چھت تک جاتا تھا جہاں لانڈری بھی تھی۔

جب ہاسٹل کھولا تو میں کچھ گھبرا رہی تھی۔آج تک میں ہاؤس وائف تھی اور اب میں ورکنگ وومین بن رہی تھی۔مجھے اس سے پہلے جاب یا کسی کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔مگر رفتہ رفتہ میں نے سب کچھ سیکھ لیا اور کام پر حاوی ہو گئی تو مجھے مزہ آنے لگا۔بچیاں پہلے ہی بڑی تھیں اور ان کو میری ہمہ وقت دیکھ بھال کی ضرورت نہیں تھی۔حمیرہ نے تو گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا بھی شروع کر دیا تھا۔میں صرف کچن دیکھتی تھی باقی ہر کام کے لیے ملازمہ تھی۔اس لیے کام بہت کم تھا۔صبح کا ناشتا زیادہ تر ریڈی میڈ ہوتا تھا۔ دودھ، ڈبل روٹی، مکھن، انڈے اور شہد۔دوپہر میں باری باری دونوں بچیوں کی پسند کی کوئی ڈش بناتی تھی۔وہ دوپہر میں پیٹ بھر کر کھاتی تھیں اور رات میں ہلکا پھلکا کھاتی تھیں میری بھی یہی عادت تھی۔کبھی کبھی ہم باہر سے کچھ منگوا لیتے یا باہر چلے جاتے تھے۔جاوید نے مجھے ڈرائیونگ سکھا دی تھی اس لیے میں کار استعمال کرتی تھی۔

ایک سال بعد میں سلیم بھائی کی شکر گزار تھی کہ انہوں نے مجھے یہ مشورہ دیا اور پھر میری پوری مدد بھی کی۔جاوید کے بعد اکیلے رہنے سے مجھے جو سوچیں پریشان کرتی تھیں۔

اکیلے رہنے سے دم گھٹتا تھا اور فضول کے وہم آتے تھے۔ اس کام میں مگن ہو کر میں سب فراموش کر بیٹھی۔ اب فرصت بھی ملتی تو وہ زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ پھر میرا نت نئے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ ان میں ایسی چکر باز بھی تھیں کہ میں حیران ہوئی کہ عورتوں کی ایسی قسم بھی ہوتی ہے۔ پھر الٹے سیدھے دھندے کرنے والیوں نے بھی ہاسٹل کا رخ کیا۔ دکھاوے کو وہ کہیں جاب کرتی تھیں مگر ان کا اصل دھندہ یہی تھا۔ وہ دوپہر میں ہی دفتر سے آجاتیں اور شام کو بن سنور کر نکل جاتی تھیں۔ ظاہر ہے میں کسی کے آنے جانے پر ایک حد سے زیادہ پابندی نہیں لگا سکتی تھی۔ مگر ایسی عورتوں کو جلد بھانپ جاتی اور پھر ان سے مناسب طریقے سے چھٹکارا حاصل کر لیتی تھی۔ حالانکہ میں بہت دیکھ بھال اور چھان پھٹک کر کسی کو کمرا دیتی تھی اس کے باوجود چند ایک بار دھوکا کھا گئی۔ اسی طرح دنیا کی ستائی ہوئی عورتیں سب سے زیادہ آتی تھیں۔ اصل بے سہارا کم ہوتی تھیں زیادہ تعداد ان کی تھی جو سہاروں کے ہوتے ہوئے بے سہارا ہوتی تھیں۔

☆☆☆

ثنا ان میں سے ایک تھی جو سہاروں کے ہوتے بے سہارا تھی اور میرے ہاسٹل میں رہنے کے لیے آئی۔ وہ ورکنگ وومین نہیں تھی بلکہ ہاؤس وائف تھی۔ اس کا شوہر مڈل ایسٹ میں ملازمت کرتا تھا اور ابھی وہ اس قابل نہیں ہوا تھا کہ بیوی اور بچے کو اپنے پاس بلا سکے۔ اس کے گھر والے ثنا کو تنگ کرتے تھے۔ ثنا کا شوہر احمد پریشان تھا کہ واپس آئے تو کیا کرے گا اور اگر جاب کرتا ہے تو اس کی بیوی مشکل میں ہے۔ مزے کی بات ہے کہ ثنا کے سسر کا اپنا مکان تھا اور اس کے چار پورشن کر کے چار بیٹوں میں تقسیم کیے ہوئے تھے۔ یعنی ثنا کا اپنا پورشن تھا مگر وہ اکیلی تھی اور ایک بچے کے ساتھ گزارہ مشکل ہو رہا تھا۔ سسرال والوں کی طرف سے کوئی سپورٹ نہیں تھی الٹا وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے جیسے انہیں بیٹے کی غیر موجودگی میں موقع مل گیا ہو کہ وہ اس کی بیوی اور بچے سے برا سلوک کریں۔

اس کا معمولی سا کام بھی کر کے نہیں دیتے تھے اور اگر وہ خود کاموں کے لیے باہر جاتی تو اس پر برا مناتے تھے۔ وہ بے چاری رو کر رہ جاتی تھی۔ اس لیے احمد چاہتا تھا کہ وہ اسے کہیں الگ سیٹ کر دے جہاں وہ سکون سے رہ سکے۔ اس نے انٹرنیٹ پر میرے ہاسٹل کا اشتہار دیکھا اور مجھے کال کی۔ میں اس کی بات سن کر حیران ہوئی کیونکہ اس سے پہلے کبھی کسی شوہر نے مجھ سے اپنی بیوی کے لیے ہاسٹل میں کمرے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ میں نے اسے بتایا۔ ''ہاسٹل ورکنگ وومنز کے لیے ہے اور میں صرف کام کرنے والی عورتوں کو ہی کمرے دیتی ہوں۔''

''پلیز۔'' اس نے التجا کی۔ ''اصول بدلے جا سکتے ہیں۔ میری بیوی بہت مشکل میں ہے۔ یا تو میں ملازمت چھوڑ کر یہاں آجاؤں اور پاکستان میں ملازمتوں کا حال آپ کو پتا ہے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اپنی بیوی اور بچے کو یہاں بلالوں مگر اس میں مجھے کچھ وقت لگے گا۔ لیکن میں نے اسے کہیں الگ نہیں رکھا تو وہ نفسیاتی مریض ہو جائے گی اور خودکشی کر لے گی۔''

احمد کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ میں کیا کوئی بھی ہوتا تو اس پر لازمی اثر ہوتا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں سوچ کر بتاؤں گی۔ ایسا کریں آپ مجھے کل کال کریں۔''

احمد نے اگلے روز کال کرنے کا وعدہ کیا۔ میں ہاسٹل کے سارے معاملات خود ہی چلاتی مگر اب بھی کوئی مسئلہ آتا تو سلیم بھائی سے مشورہ کرتی تھی۔ ان پانچ سالوں میں، میں نے تیسری منزل بھی بنوالی تھی اور اب میرے ہاسٹل میں بائیس کمرے تھے۔ ایک عورت باورچی بھی رکھ لی تھی جو سب کے لیے تین وقت کھانا بناتی تھی۔ کھانا اب ایک ہی جگہ بنتا تھا اور کھایا جاتا۔ خرچا نکال کر میں سوا لاکھ روپے تک کی بچت کر لیتی تھی۔ سلیم بھائی نے کچھ عرصے پہلے انویسٹ منٹ سیل کر دی تھی اور ملنے والی رقم سے پی سی ایچ ایس کے پلاٹ پر تین منزلہ مکان بنا کر اسے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ ہاسٹل اور کرائے سے جو رقم آتی تھی۔ وہ میری اور بچیوں کے لیے کافی تھی اور میں ان کے مستقبل کے لیے بچت بھی کر رہی تھی۔ حمیرہ ایف ایس سی فائنل میں تھی اور اس کا ارادہ۔ پلاسٹک سرجن بننے کا تھا۔ مگر پہلے اسے ایم بی بی ایس کرنا تھا اور وہ اس کے لیے بھرپور تیاری کر رہی تھی۔ سدرہ ابھی میٹرک کر رہی تھی اور اس نے کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ اسے آگے کیا کرنا ہے؟

جب میں نے سلیم بھائی کو بتایا تو وہ بھی سن کر متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''بھابی آپ خاتون سے مل لیں اور اگر آپ کو ٹھیک لگے تو میرے خیال میں یہ نیکی کا کام ہوگا۔ اس کا اجر آپ کو اللہ ہی دے گا۔''

''وہ سلیم بھائی! یہی سوچ کر میرے دل میں بھی آرہا ہے کہ اس لڑکی کو اپنے پاس رکھ لوں۔''

"آج کل ہمارے معاشرے میں افراتفری اور لوگوں کے رویے میں بہت زیادہ بے حسی آ گئی ہے۔" وہ بولے۔ "ہر طرف ایسی ہی کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔"

"سلیم بھائی جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری دین کے اخلاقی اور معاشرتی نظام سے دوری ہے۔ ہم نے دین کو صرف چند عبادتوں کا مجموعہ سمجھ لیا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔"

میں نے احمد سے کہہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو بھیج دے۔ اس نے کہا۔ "اگر آپ راضی ہیں تو میں چند دن کے لیے خود آ رہا ہوں۔"

"میں نے راضی ہو کر ہی آپ کو کہا ہے مگر میں بتا دوں کہ اگر آپ کی بتائی بات غلط نکلی تو میں معذرت کر لوں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں میں تو ابھی آپ کو بتایا ہی نہیں ہے جب ثنا آ کر رہے گی تو وہ آپ کو خود بتا دے گی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

دونوں میاں بیوی کوئی ایک ہفتے بعد میرے ہاسٹل آئے۔ ثنا پیاری سی لڑکی تھی۔ چھوٹے قد اور ذرا بھاری جسم کی وجہ سے اوور ویٹ لگتی تھی۔ مگر اس سے اس کی دلکشی میں فرق نہیں پڑا تھا۔ بعض عورتوں پر مٹاپا اچھا لگتا ہے وہ ان میں سے ایک تھی۔ اس کا شوہر احمد حسن خوبصورت اور صورت سے مہذب نظر آنے والا آدمی تھا۔ ان کا تین سال کا بیٹا جو خاصا چلبلا ہو رہا تھا اور ماں کی گود سے نکلنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ ثنا کی صحت سے قطع نظر اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں کے گرد ایسے حلقے تھے جیسے وہ زیادہ وقت روتی رہتی ہو۔ احمد نے بتایا کہ اس کے گھر والے جاہل اور بد تہذیب قسم کے لوگ ہیں اور وہ ہر بات کو جھگڑے کی وجہ بنا لیتے ہیں حد یہ کہ ان کے ساتھ نیکی کی جائے تو وہ اس کا صلہ برائی سے دیتے ہیں۔

پھر ثنا نے بتایا کہ اس کا میکہ ہے ماں باپ ہیں۔ مگر اس کی بھابیاں اس کی آمد اور وہاں رہنا پسند نہیں کرتی ہیں ایک بار وہ کچھ عرصے کے لیے وہاں جا کر رہی تھی تو اس کی زندگی حرام ہو گئی تھی اسے طعنے تشنے سننے کو ملتے تھے۔ اس کے بیٹے کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ اپنی اور اپنے ماں باپ کی مشکلات دیکھتے ہوئے وہ واپس سسرال آ گئی تو یہاں اس سے پہلے سے بدتر سلوک کیا گیا۔ اب اسے مسلسل

جالوت

حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا ایک بادشاہ۔ عرب مورخ مسعودی کا بیان ہے کہ فلسطین میں بربر قوم آباد تھی اور یہ ان کا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام مولود تھا۔ اس نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور اردن کے علاقے میں لڑائی ہوئی۔ بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت نے اعلان کیا کہ جو کوئی جالوت کو مارے گا اسے آدھی سلطنت انعام میں دی جائے گی اور شہزادی سے نکاح کر دیا جائے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے گوپھن سے پتھر مار کر اس کو ہلاک کر دیا۔ مورخ طبری کے نزدیک وہ عاد و ثمود کی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اسرائیلیوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ تبرکات اور تابوت سکینہ بھی بنی اسرائیل سے چھین کر لے گیا تھا۔ اسلامی روایات بائبل کے مطابق ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بائبل میں اس کا نام گولیتھ (Goliath) ہے۔

مرسلہ: زارا احمد۔ کراچی

دھمکیاں مل رہی تھیں کہ اسے گھر سے نکال دیا جائے گا۔ شاید اس کے ساس سسر چاہتے تھے کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر چلی جائے۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کے بہت زیادہ اثر میں تھے اور اس کی خواہش تھی کہ ثنا والا پورشن بھی اس کے حوالے کر دیا جائے۔ میں نے کہا۔ "اگر تم وہاں سے نکل آئیں تو وہ پورشن پر ویسے ہی قبضہ کر سکتے ہیں۔"

"میں ثنا کو یہاں رکھوں گا اس کا سارا سامان وہیں رہے گا۔" احمد نے جواب دیا۔ "اپنے گھر والوں کو خبردار کر دوں گا کہ اگر مجھ سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرنا ہے تو ثنا کے سامان کو ہاتھ لگائیں۔"

بہر حال ثنا کے سسرال والے اس کے سامان یا پورشن کے ساتھ کیا کرتے ہیں یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے اتنی دیر میں محسوس کیا کہ وہ دونوں غلط بیانی نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے میں نے انہیں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اکیلی عورت کے ساتھ میں ایک کمرے کا رینٹ سات ہزار لے رہی تھی اور بچے کے ساتھ یہ آٹھ ہزار ہو جاتا مگر میں نے ثنا کے لیے رینٹ سات ہزار ہی رکھا۔ احمد نے اسی وقت ایگریمنٹ کرا کے مجھے ضروری ادائیگی کر دی اور اگلے دن ثنا اپنے ذاتی سامان کے ساتھ ہاسٹل آ گئی۔ باقی سب اس کے

کمرے میں تھا۔ احمد دو دن اور رکا اس نے مجھے اپنے کاغذات دکھائے تھے۔ وہ مڈل ایسٹ میں اپنا کاروبار سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے سیٹ ہونے اور اس قابل ہونے میں کچھ وقت لگے گا کہ وہ ثنا اور سمیر کو بلا سکے۔

آج تک ہاسٹل میں کوئی ایسی عورت نہیں رہی تھی جو ورکنگ وومین نہ ہو اس لیے پہلے سے رہنے والی خواتین اور کام کرنے والیاں حیران تھیں کہ میں نے ثنا کو کیوں رکھا۔ وہ سارا دن کمرے میں ہوتی تھی یا کبھی سمیر کو لے کر باہر نکل آتی۔ چند دن میں وہ کسی سے گھلی ملی نہیں تھی۔ بس سب سے سلام دعا کی حد تک تعلق رکھا تھا۔ یہ بات محسوس کرتے ہوئے میں نے یہ کیا کہ جب شام کو خواتین سے گپ شپ کرتی تو اسے بھی بلانے لگی۔ پہلے تو وہ خاموش بیٹھی باتیں سنتی تھی یا پھر سمیر کو دیکھتی۔ مگر رفتہ رفتہ اس نے بھی باتوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور پہلے مہینے تک اس نے کچھ خواتین سے دوستانہ تعلق بھی قائم کر لیا تھا۔ ہاسٹل میں رہنے والی عورتیں جن کے بچے تھے ان کی دیکھ بھال کے لیے میں نے ایک تجربے کار عورت رکھی تھی جو بچوں کو دیکھتی اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ وہ صبح سے شام تک ہوتی تھی۔ دن میں بچے عام طور سے کمروں سے باہر ہی ہوتے تھے۔ وہ صرف سونے کے لیے کمروں میں جاتے۔

سمیر کو بچوں کا ساتھ ملا تو وہ ان کے ساتھ مگن رہنے لگا۔ صبح ہوتے ہی کمرے سے نکل آتا تھا۔ ثنا کمرے میں اکیلی بور ہوتی تو وہ بھی باہر آجاتی کام کرنے والیوں سے گپ شپ کرتی اور کبھی کبھی ان کا ہاتھ بھی بٹاتی تھی۔ چند ایک بار وہ میرے پورشن میں بھی آئی۔ حمیرہ کی اس سے اچھی گپ شپ ہوگئی۔ ثنا کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ انیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی اور بیس سال سے پہلے وہ ماں بن گئی تھی اس لحاظ سے وہ ابھی چوبیس کی بھی نہیں تھی۔ حمیرہ اٹھارویں میں تھی تو ان کی آپس میں بننے لگی۔ وہ جب فارغ ہوتی ثنا کے پاس چلی جاتی یا اس کو بلا لیتی تھی۔ ان کی آپس میں دوستی ہوئی تو وہ اس سے دکھ سکھ شیئر کر لیتی تھی اور حمیرہ کبھی کبھی مجھے بھی بتاتی تھی۔ اس کے مطابق ثنا کے سسرالی اسے حد سے زیادہ تنگ کرتے تھے اور حساس ہونے کی وجہ سے اسے بھابیوں کا رویہ بھی اچھا نہیں لگتا تھا جو اس کے خلاف براہ راست تو کچھ نہیں کر سکتی تھیں مگر باتوں اور دیگر رویوں سے اسے اتنا زچ کرتی تھیں کہ وہ سسرال جاتے ہوئے بھی دس بار سوچتی تھی۔

اس وقت میں سوچتی تھی کہ شاید اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوتا ہوگا جیسا کہ آج کل شریف بہوؤں کے ساتھ رواج بن گیا ہے اور جو بہویں سیدھا کرنا جانتی ہیں ان سے سب ٹھیک رہتے ہیں۔ ایک مہینا گزر گیا تھا اور نہ تو ثنا کہیں گئی اور نہ ہی کوئی اس سے ملنے آیا۔ پھر ایک شام دو افراد اس سے ملنے آئے۔ ایک معمر اور متین صورت بزرگ تھے اور ایک ادھیڑ عمر تھے۔ یہ دونوں ثنا کے والد اور بھائی تھے۔ ان کو ابھی پتا چلا تھا کہ ثنا سسرال کی بجائے ہاسٹل میں تھی۔ اب تک ثنا نے کسی کو بتایا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ ایک مہینے سے میکے نہیں گئی تھی اس لیے آج اس کے باپ اور بھائی اس کے گھر گئے تو انہیں پتا چلا کہ وہ تو گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں رہ رہی ہے۔ وہ بہت حیران ہوئے تھے اور پھر ہاسٹل آئے تھے۔ ہاسٹل کے قاعدے کے مطابق یہ ملاقات صرف لاؤنج میں ہو سکتی تھی اور مجھے مناسب نہیں لگا کہ وہ لوگ اپنے معاملات سب کے سامنے ڈسکس کرنے پر مجبور ہوں اس لیے میں نے انہیں اپنے پورشن کے ڈرائنگ روم میں بلا لیا کہ وہ وہاں پرائیویسی میں بات کر سکیں۔

بعد میں ثنا نے حمیرہ کو بتایا کہ اس نے اپنے والد اور بھائی کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا کہ اس کے سسرال والے کیسے اس کا جینا حرام کر کے رکھتے ہیں اور پھر وہ میکے آتی ہے تو بھابیوں کے رویے اور طعنے سہنے پڑتے ہیں۔ اس لیے اس نے اور اس کے شوہر نے فیصلہ کیا کہ وہ ہاسٹل میں رہے گی۔ وہ یہاں بہت سکون سے تھی اور اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے باوجود ثنا کے والد اور بھائی نے اس پر بہت زور دیا کہ وہ ان کے ساتھ چلے اگر اس کے سسرال والے اسے رکھنے پر آمادہ نہیں تھے تو وہ ماں باپ کے گھر رہے۔ مگر ثنا نہیں مانی اس نے کہا۔ "اگر میں اکیلی ہوتی تو شاید دل پر جبر کر کے رہ لیتی مگر اپنے بچے کے ساتھ کسی کا غلط یا دوغلا رویہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

اس پر ثنا کے بھائی اور والد چپ ہو گئے تھے۔ وہ شریف لوگ تھے۔ اپنی گھر کی عورتوں پر دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے۔ ثنا نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے گھر بھی نہیں آئے گی وہ لوگ اس سے ملنے یہاں آجایا کریں۔ اپنے باپ اور بھائی کے جانے کے بعد وہ رو رہی تھی۔ یہاں اسے سکون تھا کوئی تنگ کرنے والا نہیں تھا اس کے باوجود یہ احساس اکثر اسے رلاتا تھا کہ وہ میکہ اور سسرال ہوتے

ہوئے بھی لاوارثوں کی طرح ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ اس کا بچہ اس سے بار بار پوچھتا کہ ہم نانا ابو اور دادا ابو کے گھر کیوں نہیں جاتے۔ اکثر صبح میں اسے دیکھتی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوتی تھیں۔ جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہو۔ میں نے کمروں میں ٹی وی کی سہولت نہیں دی تھی مگر کوئی چاہتا تو اپناٹی وی لا کر استعمال کر سکتا تھا۔ کیبل لیا ہوا تھا اس کی فیس ادا کرنی ہوتی تھی۔ ثنا کے پاس ٹی وی تھا مگر وہ لائی نہیں تھی اس کا بچہ ٹی وی کا شوقین تھا۔ حمیرہ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ جا کر اپناٹی وی لے آئے۔

''مجھے وہاں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے اب تو احمد بھی نہیں ہیں۔''

''تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے تمہارے جہیز کا ٹی وی ہے ان کا تھوڑی ہے۔''

''پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔''

حمیرہ نے مجھ سے کہا۔''امی آپ ثنا کے ساتھ اس کے سسرال چلی جائیں اسے اپناٹی وی لانا ہے۔''

میں ہچکچائی۔''کیا یہ مناسب ہوگا؟''

''امی آپ نے اس کے سسرال دعوت میں نہیں جانا ہے۔ وہ اکیلے جاتے ہوئے ڈر رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے مجھے کچھ کام ہے کل یا پرسوں جاؤں گی تو پھر ثنا کو لے جاؤں گی۔''

مجھے گلشن میں کچھ کام تھا اور ثنا کا سسرال وہاں سے پاس ہی تھا۔ میں نے اس سے کہا۔''میں تمہارے ساتھ چلوں گی مگر تم تیار رہنا۔''

''ٹھیک ہے لیکن باجی آپ میرے ساتھ اندر بھی چلیے گا۔''

''چلوں گی۔''میں نے کہا اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں کن حالات سے واسطہ پڑے گا۔ دو دن بعد میں ثنا اور سمیر کو لے کر نکلی تھی۔ سمیر خوش تھا کیونکہ وہ جب سے آیا تھا باہر گھومنے نہیں گیا تھا۔ بس ہاسٹل کے آس پاس گیا تھا۔ پہلے میں نے اپنا کام نمٹایا اور پھر ثنا کے سسرال پہنچے۔ میں حیران ہوئی کیونکہ یہ پوش علاقے میں اچھا خاصا بڑا بنگلا نما گھر تھا اور شاید آٹھ سو گز پر بنا ہوا تھا۔ اس میں پورشن الگ الگ تھے مگر داخلی دروازہ ایک ہی تھا۔ کال بیل بجانے پر اندر سے ایک نو دس سال کا بچہ نکلا اور اس نے ثنا کو دیکھ کر بدتمیزی سے کہا۔''کیوں آئی ہو؟''

ثنا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔''تمیز سے بات کرو۔''

''کون ہے؟''اندر سے کسی عورت نے جاہلانہ لہجے میں پوچھا۔

''بھگوڑی آئی ہے۔''بچے نے اس انداز میں کہا کہ میں دنگ رہ گئی۔

عورت جو شکل سے ہی سخت جاہل اور گھٹیا ذہنیت کی لگ رہی تھی دروازے تک آئی۔ اب تک بچہ دروازے میں یوں اڑا کھڑا تھا کہ کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ ثنا نے کہا۔''میں اپنے گھر آئی ہوں اور آپ کا بیٹا کس طرح بات کر رہا ہے؟''

''اپنے گھر۔''عورت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''تم اس گھر سے بھاگی ہوئی ہو اور نہ جانے کہاں منہ کالا کر رہی ہو۔ اب یہاں کیا لینے آئی ہو؟''

''آپ کا دماغ درست ہے۔''ثنا گھٹے لہجے میں بولی۔''مجھے شوہر ایک ہاسٹل میں ٹھہرا کر گیا ہے۔''

''وہ بے غیرت ہے۔''عورت بدستور اسی لہجے میں بولی۔''اسے کیا پتا وہاں اس کی بیوی سے ملنے کون کون آتا ہے۔''

ثنا کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ میں نے سوچا اور مداخلت کی۔''تم کون ہو؟''

''تو کون ہے؟''وہ بدتمیزی سے بولی۔''اس کی حمایتی بن کر آئی ہے۔''

''میں کوئی بھی ہوں یہ ثنا کا گھر ہے یا نہیں ہے۔''

''نہیں ہے۔''وہ بولی۔

''ثنا اپنے شوہر کو اسی وقت کال کرو۔''میں نے کہا۔''اس عورت نے جو بکواس کی ہے وہ میں نے اپنے موبائل میں ریکارڈ کر لی ہے وہ ابھی اپنے شوہر کو سناؤ۔''

عورت چونکی اور اس کا چہرہ سفید ہوا تھا مگر اس نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''تو سنا دے میں نے کون سا جھوٹ کہا ہے۔''

ثنا ساکت کھڑی تھی میں نے اسے ہلایا تو اسے ہوش آیا اور اس نے روتے ہوئے موبائل نکالا اور اپنے شوہر کو کال کرنے لگی۔ میرے پاس موبائل ضرور تھا مگر میں نے کوئی ریکارڈنگ نہیں کی تھی۔ یہ بات میں نے اس عورت کو ڈرانے کے لیے کی تھی جو بعد میں ثنا کی جیٹھانی ثابت ہوئی۔ اس کا نام صائمہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈر جائے گی اور ہمیں اندر جانے دے گی۔ شاید وہ ایسا ہی کرتی مگر ادھر ثنا

نے اپنے شوہر کو کال کرنا شروع کی ادھر ایک گاڑی آکر ہمارے پیچھے رکی۔ یہ پرانی کھٹارہ سی چھوٹی کار تھی مگر اس میں بیٹھے شخص کو یوں کلف لگا ہوا تھا جیسے وہ نئے ماڈل کی مرسیڈیز میں آیا ہوں۔ اس نے ناگواری سے میری کار کو دیکھا اور پھر اس کی نظر ثنا پر گئی تو وہ غراتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اس نے باقاعدہ منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا۔

''تو...... تیری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی...... اس دن تیرے باپ اور بھائی کو بے عزت کیا تھا...... آج تو آگئی۔''

میں لہجے اور عمر سے سمجھ گئی کہ وہ ثنا کا سسر تھا۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ اس اچھے علاقے کے اچھے گھر میں رہنے والا بچہ اس قدر جاہلانہ انداز میں بات کیسے کر رہا تھا۔ اس شخص کی اولاد اور اس کی اولاد کو ایسا ہی نکلنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں ثنا کا شوہر احمد کیسے مختلف نکلا تھا؟ میں سوچ رہی تھی کہ اس بار بلف کرنے کی بجائے کیوں نہ سچ مچ موبائل نکال کر اس کا وائس ریکارڈر آن کرلوں۔ ثنا نے اس کی آتش فشانی کے جواب میں منمنا کر کہا۔ ''ابو وہ میں ٹی وی لینے آئی تھی۔''

''تیرا اب اس گھر اور اس کی چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' بڈھے نے اپنی بڑی بہو کے اشارے دیکھے نہیں اور بولتا رہا۔ اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں اور اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ گلی میں کھڑا ہوا ہے آس پاس گھر والے اس کی واہیات گفتگو سن رہے ہوں گے۔ ثنا آنسو بہاتی رہی۔ اسے ہوش نہیں تھا کہ کال مل گئی ہے اور دوسری طرف سے احمد ہیلو ہیلو کر رہا ہے۔ مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری ریکارڈنگ کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور احمد نے خود سن لیا کہ اس کا باپ اس کی بیوی کو کس طرح ذلیل کر رہا تھا اور وہ بھی سر عام۔ اس کی باتیں سن کر میرا سر گھوم رہا تھا۔ نہ جانے ثنا کا اندر سے کیا حال تھا۔ اوپر سے تو لگ رہا تھا کہ وہ مر چکی ہو اور زندہ لاش کی طرح کھڑی ہو۔ سمیر چیخ چیخ کر رونے لگا تھا اور شور سن کر اندر سے دوسرے بھی نکل آئے تھے۔ ان میں ثنا کی ساس اور اس کا جیٹھ یعنی صائمہ کا شوہر بھی تھا۔

مگر کسی نے اس شخص کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں کھڑے رہنا بیکار تھا۔ میں نے ثنا کا ہاتھ گھسیٹا اور اسے لے کر کار تک آئی۔ پچھلی سیٹ پر اسے اور سمیر کو بیٹھا کر وہاں سے نکل آئی۔ جب تک میں گلی سے نکل نہیں گئی ان لوگوں کا شور شرابا سنائی دیتا رہا تھا۔ اس میں اب ساس اور جیٹھ بھی شامل ہو گئے تھے۔ ثنا نیم بے ہوش سی ہو رہی تھی اور سمیر اسے پکارتے ہوئے رو رہا تھا۔ ایک جگہ کار روک کر میں نے اسے پانی پلایا۔ اسی اثنا میں اس کے موبائل نے بیل دی اور میں نے اٹھا کر دیکھا اس پر احمد کی کال آرہی تھی۔ ثنا اس قابل نہیں تھی کہ بات کرسکتی میں نے کال ریسیو کی اور احمد کو بتایا کہ اس کے گھر والوں نے ثنا کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ کچھ اس نے سن لیا تھا اور باقی میں نے بتایا۔ وہ بے چارہ روہانسا ہو گیا۔ ''میں ان لوگوں کا کیا کروں...... میرا دل چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں۔''

''میرا خیال ہے ثنا نے یہاں آکر غلطی کی اور اسے پہلے تم سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔''

''بہت بڑی غلطی کی۔ ان لوگوں کو علم نہیں ہے کہ میں نے ثنا کو کہاں رکھا ہے ورنہ یہ آپ کے ہاسٹل پہنچ جاتے۔''

''تب تمہارے سسر کو کیسے علم ہوا؟''

''انہوں نے تو مجھے کال کرکے آپ کے ہاسٹل کا پتا لیا تھا۔''

میں نے ثنا کو دیکھا اور احمد سے کہا۔ ''تمہاری بیوی کی حالت درست نہیں ہے میں اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی ہوں۔''

''پلیز آپ زحمت کریں میں حسن بھائی کو کال کرتا ہوں۔''

حسن ثنا کا بھائی تھا جو ہاسٹل بھی آیا تھا۔ میں ثنا کو اپنی ایک واقف کار ڈاکٹر کے پاس لے گئی اس نے ثنا کا معائنہ کیا اور اسے ایک انجکشن دیا۔ ثنا ٹھیک سے حواس میں نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''اسے شدید شاک لگا ہے اگر یہ کچھ دیر میں ٹھیک نہ ہوئی تو اسے کسی اسپتال لے جانا پڑے گا۔ شاید نروس بریک ڈاؤن کا کیس ہے۔''

اس دوران میں حسن کی کال آئی اور میں نے اسے کلینک کا پتا بتایا۔ وہ آدھے گھنٹے میں آگیا مگر اس وقت تک ثنا ٹھیک ہو گئی تھی۔ وہ رو رہی تھی مگر اب شاک میں نہیں تھی۔ حسن نے اسے لے جانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا۔ میں اسے ہاسٹل لے آئی۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس نے مجھ سے کہا۔ ''باجی اگر میرے سسرال والے آئیں تو آپ ان سے کہیے گا کہ میں اپنے میکے چلی گئی ہوں۔''

''وہ وہاں سے معلوم کرلیں گے۔''

''نہیں یہ لوگ اوپر اوپر سے بہادر اور سخت بنتے ہیں۔'' ثنا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''بالکل گلی کے کتے کی طرح

جو اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے لیکن جب دوسری گلی میں جاتا ہے دم دبا لیتا ہے۔ یہ وہاں جانے کی جرأت نہیں کریں گے۔''

''تب تم بے فکر رہو وہ یہاں نہیں آسکتے اور اگر آئے تو میں نمٹ لوں گی۔ چوکیدار سے دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔''

مجھے ان لوگوں پر شدید غصہ تھا۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ لوگ اس قدر جاہل ہوں گے۔ آدمی محلے والوں کا اور آئے گئے کا خیال کر لیتا ہے۔ جب ثنا نے ان کے یہاں تک آنے کا کہا تو مجھے بھی فکر ہوئی وہ لوگ یہاں آکر تماشا کریں گے تو میری برسوں کی نیک نامی خاک میں نہ مل جائے۔ چھوٹے موٹے معاملات چلتے رہے ہیں لیکن آج تک ہاسٹل میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ بس مجھے یہ اطمینان تھا کہ انہیں اس کا جگہ کا علم نہیں ہے۔ دو تین دن تک ثنا کے ماں باپ اور بھائی اس سے ملنے کے لیے آتے رہے۔ انہوں نے کئی بار کوشش کی کہ ثنا ان کے ساتھ چلی جائے مگر اس نے انکار کیا۔ کاش کہ وہ ان کے ساتھ چلی جاتی تو وہ سب نہ ہوتا جو چند دن بعد ہوا تھا۔ ماں باپ اور بھائیوں کے آنے سے ثنا تیزی سے سنبھل گئی تھی۔

پھر میں نے اور حمیرہ نے بھی اس کی دل جوئی کی تھی۔ اکثر وہ ہمارے پورشن میں آجاتی یا حمیرہ اس کے پاس چلی جاتی تھی حالانکہ اس کے پیپر زقریب تھے اور ان دنوں وہ بہت مصروف تھی مگر پھر بھی ثنا کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ وہ ایسی سیدھی اور مظلوم لڑکی تھی کہ جس کے لیے دل میں خود بہ خود جگہ بن جاتی تھی۔ وہ ذہین اور مہذب تھی۔ جدید دور کی تمام چیزوں سے واقف تھی۔ اسے فیس بک اور واٹس اپ کا شوق تھا۔ احمد آتے ہوئے اس کے لیے جدید اسمارٹ فون لایا تھا جس سے وہ نیٹ استعمال کرتی تھی۔ میں نے ڈی ایس ایل لائن لی ہوئی تھی جس کے ساتھ وائی فائی بھی تھا۔ مگر میں نے ہاسٹل میں کسی کو وائی فائی نہیں دیا تھا۔ جب ثنا آئی اور اسے شوہر سے بات کرنے میں مسئلہ ہوا تو حمیرہ نے اسے وائی فائی پاس ورڈ دے دیا تھا۔ فون کال بہت مہنگی پڑتی تھی۔ اسکائپ اور واٹس اپ سے آسانی سے بات ہو جاتی تھی۔

اتوار والے دن عام طور سے سب دیر سے اٹھتے تھے۔ میں اور بچیاں بھی دیر تک سوتے تھے۔ مگر اس اتوار کی صبح مجھے سدرہ نے اٹھایا۔ ''ماما نیچے سے شور کی آوازیں آرہی ہیں۔''

''کیسے شور کی؟''

''پتا نہیں ماما مگر بہت سے لوگ بول رہے ہیں نیچے ہاسٹل میں۔''

میں اٹھ کر ٹیرس تک آئی تو سچ مچ نیچے سے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں دوپٹا لے کر ننگے پاؤں ہی بھاگی کیونکہ بدحواسی میں چپل بھی نہیں مل رہی تھی۔ میں نیچے آئی تو لاؤنج میں ثنا کا سسر اور اس کا جیٹھ دو پولیس والوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ ثنا ایک طرف سمیر کو گود میں دبوچے ہوئے تھی اور پاگلوں کی طرح کہہ رہی تھی۔ ''میں اپنا بچہ نہیں دوں گی... میں اپنا بچہ نہیں دوں گی۔''

''کیسے نہیں دے گی یہ ہماری اولاد ہے اسے تجھ جیسی آوارہ عورت کے پاس نہیں چھوڑ سکتے۔''

چوکیدار بھی وہاں تھا۔ میں نے پہلے اس سے پوچھا۔ ''رشید یہ سب کیا ہے یہ لوگ اندر کیسے آئے؟''

''بی بی جی میں نے روکنے کی کوشش کی مگر......'' اس نے پولیس والوں کی طرف دیکھا۔ ''یہ ان کو لے کر زبردستی اندر گھس آئے۔''

اب میں نے پولیس والوں سے پوچھا۔ ''تم اندر کیسے گھسے اور تمہارے پاس کوئی وارنٹ ہیں۔''

''ہمیں وارنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔'' ان میں سے ایک رعونت سے بولا۔ میں نے چوکیدار سے کہا۔

''سلیم بھائی کو کال کر کے اطلاع دو۔''

چوکیدار چلا گیا۔ ثنا کے سسر نے اس سے سمیر کو چھیننے کی کوشش کی اور اس نے دل خراش چیخ ماری تھی۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''یہ کیا غنڈہ گردی ہے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے ہاسٹل میں آنے کی۔''

''یہ عورت یہاں غلط دھندے کراتی ہے۔'' ثنا کے جیٹھ نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں کوئی شریف عورت نہیں رہتی ہے۔''

اس دوران میں شور شرابا سن کر جو عورتیں اپنے کمروں سے جھانک رہی تھیں مجھے دیکھ کر وہ باہر نکل آئیں اور جب انہوں نے یہ فضول بات سنی تو سب شور کرنے لگی تھیں۔ وہ پولیس والوں سے احتجاج کر رہی تھیں۔ ثنا کے سسر اور جیٹھ الگ شور مچا رہے تھے۔ سمیر رو رہا تھا۔ اس کے دادا نے بالآخر اسے ماں کی گود سے کھینچ لیا۔ ثنا دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ یہ گھٹیا اور جاہل لوگ یہاں تک

چلے آئے تھے اور وہی کیا جس سے میں ڈر رہی تھی۔ اب میرے ہاسٹل کی برسوں کی بنی ہوئی ساکھ اور نیک نامی خاک میں مل رہی تھی۔ یہ لوگ پولیس کی ناجائز مدد سے اندر گھس آئے تھے اور کھل کر غنڈہ گردی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں پولیس والوں سے احتجاج کر رہی تھی کہ وہ انہیں روکے مگر پولیس تو ان کی حمایتی بن کر آئی تھی وہ انہیں کیسے روکتی۔ اس دوران میں ثنا کہاں گئی مجھے پتا نہیں چلا۔ سمیر رو رو کر ماں کو آوازیں دے رہا تھا۔ جب مجھے خیال آیا اور میں نے آس پاس دیکھا تو ثنا نہیں تھی۔ میں اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ مگر وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ اس دوران میں سمیر کا دادا اور تایا اسے لے کر جا رہے تھے۔ میں ثنا کو بھول کر ان کے پیچھے لپکی۔

''تم لوگ بچے کو نہیں لے جا سکتے۔''

''پیچھے ہٹ۔'' ثنا کے جیٹھ نے مجھے پیچھے دھکا دیا۔

''یہ ہمارا بچہ ہے کوئی اسے ہم سے چھین نہیں سکتا ہے۔'' ثنا کا سسر بھی غرایا اس نے سمیر کو اتنا کس کر پکڑا ہوا تھا کہ اب اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''تم سے پہلے اس کی ماں کا حق ہے اگر تم اسے لے گئے تو تم پر اغوا کا کیس بنے گا۔''

''دیکھ لیں گے۔'' وہ باہر جانے لگی اور میں ان کے پیچھے تھی کہ اچانک اوپر سے کوئی دھماکے سے صحن سے پکے فرش پر گرا اور یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی کہ وہ ثنا تھی جو خون میں لت پت صحن میں گری تھی۔ میں اس کی طرف لپکی مگر اسے چھوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ اوپر سے گرنے سے اس کا سر بھی پھٹ گیا تھا اور شاید گردن ٹوٹ گئی تھی کیونکہ اس کا سر بہت زیادہ مڑا ہوا تھا۔ اس نے یقیناً تیسری منزل کی چھت سے جا کر نیچے چھلانگ لگائی تھی اور چالیس فٹ کی بلندی سے نیچے سر کے بل پکے فرش پر آ کر گری تھی۔ ثنا کی موت کا یقین آتے ہی میں رونے لگی اور پھر میرا سر چکرایا اور مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ جب تک مجھے ہوش آیا اس دوران میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے تو ثنا کا سسر، جیٹھ اور پولیس والے وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ وہ اتنے بدحواس ہوئے کہ سمیر کو بھی چھوڑ گئے تھے۔

سلیم بھائی نے چوکیدار کی کال ریسیو کرتے ہی ہاسٹل کا رخ کیا تھا۔ وہ کچھ دور رہتے تھے مگر ان کے آنے سے پہلے وہ لوگ جا چکے تھے۔ سلیم بھائی نے ایک واقف کار ڈی ایس پی کو کال کی اور اس نے مقامی تھانے کی پولیس بھیجی۔ پولیس آ گئی تھی اور ثنا کی لاش اسپتال روانہ کی جا رہی تھی۔ میں نے آنسوؤں کے ساتھ سلیم بھائی اور پولیس انسپکٹر کو سارا واقعہ سنایا۔ میں سخت جذباتی ہو رہی تھی اور میں نے انسپکٹر سے کہا۔ ''ان کے خلاف تین سو دو کی ایف آئی آر لکھوائیں۔''

''ہونی تو یہی چاہیے۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''مگر بدقسمتی سے یہ خودکشی کا کیس ہے۔''

''تو ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں ہوگا جنہوں نے ایک بے قصور لڑکی کو یوں موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''ہوگا بہت کچھ ہوگا۔'' سلیم بھائی نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں انسپکٹر صاحب سے بات کرتا ہوں اور پھر ہم ایف آئی آر بھی درج کرائیں گے۔''

''ابھی مجھے اس مظلوم لڑکی کے ماں باپ اور شوہر کو بھی اطلاع دینی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں میں یہ کام کر لوں گا آپ کونٹیکٹ نمبر دیں۔'' سلیم بھائی نے یہ مشکل بھی اپنے سر لے لی۔ وہ ان سارے مراحل سے گزرے اور شام تک ثنا کے باپ بھائی آ کر اس کی لاش لے گئے تھے۔ اسی دن سلیم بھائی نے ثنا کے سسر اور جیٹھ کے خلاف ٹریس پاس، توڑ پھوڑ، تشدد، قاتلانہ حملہ اور ہتک عزت کے دفعات کے تحت ایک ایف آئی آر درج کرا دی۔ انسپکٹر نے یقین دلایا تھا کہ ان کیسز میں انہیں سزا ہو یا نہ ہو مگر وہ ان کے لیے یہ کیسز ایسی سزا بنا دے گا کہ وہ مرتے دم تک یاد رکھیں گے۔ احمد بے چارہ بیوی کے ناگہانی انتقال کی خبر سن کر دوڑا آیا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ ایک مہینے بعد بیوی بچے کے لیے ویزا نکلوانے جا رہا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ فی الحال انہیں وزٹ ویزے پر بلوا لے گا۔ جب تک ثنا اور سمیر کو مستقل ویزا نہیں مل جاتا وہ اسی طرح اس کے پاس رہتے۔

اس واقعے کو بہت سے مہینے گزر گئے ہیں۔ سمیر کو احمد نے اپنے پاس رکھا ہے۔ وہ مڈل ایسٹ سے واپس آ گیا ہے اور یہیں کچھ کر رہا ہے۔ اس کے باپ اور بھائی عدالت میں پیشیاں بھگت رہے ہیں۔ شاید انہیں سزا ملے یا شاید نہ ملے لیکن وہ سزا جو اس دنیا کے خالق نے ان کے لیے تیار کی ہوئی ہے اس کا جلد یا بدیر انہیں سامنا کرنا پڑے گا۔

دستِ قاتل

قابلِ احترام مدیر
السلام علیکم
گو کہ یہ کیس عرصہ پہلے کا ہے۔ ان دنوں میں تھانے دار ہوا کرتا تھا اور مجرموں کی گردن ناپنے میں دن رات ایک کیے رہتا تھا۔ میں نے سینکڑوں مجرموں کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلا مگر اپنے ہی تھانے کے ایک سپاہی کو گرفتار کرتے ہوئے میں کانپ اٹھا تھا، اس لیے کہ وہ مجرم ہوتے ہوئے بھی مظلوم تھا۔

انسپکٹر(ر) محمد خان
(میرپورخاص)

مجھے بچپن ہی سے پولیس افسر بننے کا شوق تھا۔ پولیس کو لوگ آج بھی اچھا نہیں سمجھتے ہیں اور اب سے پچیس تیس سال پہلے تو بہت برا سمجھتے تھے لیکن پولیس کے اختیارات سے ہر فرد مرعوب رہتا۔

جاسوسی ناولز پڑھ پڑھ کر میرا شوق مزید سوا ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اگر لگن سچی ہو تو آرزو ضرور پوری ہوتی ہے اور میری لگن بھی سچی تھی اس لیے مجھے پولیس میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر کی ملازمت مل گئی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان کے صرف دو صوبے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان ہوا کرتے تھے۔ ایوب خان نے مارشل لا کے بعد زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور صوبہ سرحد کو ون یونٹ کا نام دے کر مغربی پاکستان کا نیا صوبہ بنا دیا تھا۔

میرا تعلق لاڑکانہ سے ہے۔ میری پہلی پوسٹنگ حیدرآباد میں ہوئی۔ میں بہت خوش تھا۔ اس وقت پولیس کی دہشت کچھ زیادہ ہی تھی لیکن میری ..... اس بات پر کم ہی لوگ یقین کریں گے کہ میں رشوت کے پیسے کو ہاتھ لگانا بھی حرام سمجھتا تھا۔

دو سال کے اندر اندر میں ترقی پا کر سب انسپکٹر ہو گیا۔ اس میں صرف اور صرف میری محنت اور کارکردگی کا دخل تھا۔ میں خوشامد اور سفارش کو بھی برا سمجھتا تھا۔

میں اس دن دفتر میں بیٹھا ہوا تھا اور ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں باہر جانے ہی والا تھا کہ دفتر کے اردلی نے مجھے ایک لفافہ لا کر دیا۔ وہ سرکاری مہر والا لفافہ تھا اور میرے لیے ہیڈ آفس سے آیا تھا۔ اس میں میرے تبادلے کے احکامات تھے۔ میرا تبادلہ دور دراز کے ایک قصبے وارہ میں کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں وارہ بہت ہی پس ماندہ علاقہ تھا۔ وہاں بجلی تو دور کی بات ہے پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں تھا۔ لوگ کئی میل دور سے پینے کا پانی لایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے میں کنویں تو تھے لیکن اس کا پانی کھارا تھا۔ وہ پینے کے قابل تو کیا کپڑے دھونے کے قابل بھی نہیں تھا۔

پولیس کے کئی افسروں نے مجھ سے کہا کہ تم آئی جی صاحب کو درخواست دو۔ ایس پی صاحب اس پر دستخط کر کے بھیج دیں گے اور تمہارا تبادلہ رک جائے گا۔ میں نے جواب دیا کہ کسی نہ کسی کو تو جانا ہی پڑے گا۔

میں نے اس تبادلے کو قبول کر لیا اور اپنا سامان باندھنے لگا۔

میرے لیے وہاں جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے وہاں ایس ایچ او بنا کر بھیجا جا رہا تھا۔ مقامی لوگ آج بھی ایس ایچ او کو صوبے دار کہتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ وہ کوئی بڑا تھانہ ہوگا۔ میرے ماتحت دو تین اے ایس آئی، کچھ ہیڈ کانسٹیبل، کچھ سپاہی اور ایک ہیڈ محرر ہوگا۔ کہیں آنے جانے کے لیے مجھے محکمے کی طرف سے جیپ ملے گی۔ چھوٹے علاقوں میں تھانے داروں کے استعمال جیسی جیپیں ہوتی تھیں۔

وہاں پہنچ کر مجھے شدید مایوسی ہوئی۔ پرانی بھدی سی ایک میز اور اس سے بھی زیادہ بوسیدہ کرسی۔ ملاقاتیوں کے لیے دو تین پرانے موڑھے رکھے ہوئے تھے اور دیوار کے ساتھ بھی ایک بینچ پڑی تھی۔ دوسرا کمرا ریکارڈ روم تھا۔ وہاں ٹوٹے ہوئے دروازوں والی دو الماریاں تھیں۔ اس میں اس سے بھی زیادہ بوسیدہ فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ وہاں کا ریکارڈ تھا۔

تھانے میں گنتی کے صرف تین سپاہی اور ایک میرا اردلی تھا جو وردی پہن کر سپاہی کی ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ ٹیلی فون تو دور کی بات ہے وہاں تو بجلی بھی نہیں تھی۔

میرا اردلی غفور بہت زندہ دل اور ہنس مکھ آدمی تھا۔ اس نے اس علاقے میں میرے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا۔ بندوبست کیا وہ خود ہی کھانا پکا لیا کرتا تھا۔ خاص طور پر وہ چائے بہت اچھی بناتا تھا۔ وہاں کی ایک بات مجھے پسند آئی۔ وہاں دودھ، گھی اور مکھن بالکل خالص ملتا تھا۔ کھانے پینے کے اخراجات کے لیے میں غفور کو پیسے دے دیا کرتا تھا، ہر چیز لانا اس کی ذمے داری تھی۔

مجھ سے پہلے یہاں علیم الدین تھانے دار تھا۔ چند ماہ قبل اس نے اپنا تبادلہ کروا لیا تھا۔ کئی ماہ تک یہ تھانا بغیر کسی تھانے کے چلتا رہا پھر یہاں میرا تبادلہ کر دیا گیا۔

''یار غفور!'' میں نے تھانے کا پرانا ریکارڈ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے یہ علاقہ پرامن ہے۔ یہاں تو کافی عرصے سے کوئی جرم ہی نہیں ہوا۔ حوالات میں ایک بھی قیدی نہیں ہے۔ ایف آئی آر کے رجسٹر میں کئی مہینے سے کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی۔''

''سائیں، جرم تو ہمیشہ ہوتے ہیں۔'' غفور نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''جب سے انسان پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ ہی جرم پیدا ہو رہے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔''

''یار تم تو مجھے پڑھے لکھے لگتے ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تھانے کا ریکارڈ تو یہ بھی بتا رہا ہے کہ یہاں گزشتہ چند سال میں صرف چوری کی چند چھوٹی موٹی وارداتیں ہوئی ہیں یا پھر ذاتی دشمنی کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے کے کیس ہیں۔ آخری کیس ایک لڑکی کی خودکشی کا ہے۔ یہ بھی ڈھائی سال پرانی بات ہے۔ اس لڑکی نے محبوب کی بے وفائی سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی تھی۔'' میں اس فائل کو اس لیے دیکھ رہا تھا کہ یہاں کے لوگوں کی نفسیات کو سمجھ سکوں۔

ہمیں ٹریننگ کے دوران یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی

علاقے کے لوگوں کی نفسیات سمجھنا ہو تو جرائم کی تعداد، ان کی نوعیت اور جرم کے طریقہ کار سے وہاں کے لوگوں کی نفسیات سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

تیسرے دن میں نے غفور سے کہا کہ میں اس علاقے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ یوں بھی تھانے میں بیکار بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ میں قصبے کا معائنہ کرلوں۔ میں نے سپاہی کو اپنے ساتھ لیا اور علاقے کا جائزہ لینے چل دیا۔

ہم سب سادہ لباس میں تھے۔ میں وردی میں جا کر لوگوں کو خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لوگوں کی دلوں میں آج بھی پولیس کا خوف ہے۔ اس وقت تک پولیس کی وردی دہشت کی علامت ہوتی تھی۔

گھومنے پھرنے کے دوران میں نے کئی باتیں شدت سے محسوس کیں۔ علاقے کے لوگ کسی ان جانے خوف میں مبتلا تھے۔ وہ آپس میں کھل کر بات نہیں کرتے تھے۔ ہر چہرہ مجھے اداس اور پریشان نظر آیا۔ لوگوں کا رویہ میرے ساتھ بھی اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی پھر یہاں غربت بہت تھی۔ میں نے سندھ کے دوسرے گاؤں اور قصبے بھی دیکھے تھے۔ غربت وہاں بھی تھی لیکن یہاں تو لوگ غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے تھے۔ نہ ان کے تن پر ڈھنگ کے کپڑے تھے، نہ پیر میں جوتے۔ مقامی باشندے نک سک سے درست تھے بلکہ قبول صورت تھے لیکن ان کے چہروں پر وہ رونق اور شادابی نہیں تھی جو گاؤں والوں کے چہروں پر غربت کے باوجود ہوتی ہے۔

غفور بھی وہاں کا فعال باشندہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''غفور ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کے لوگ کسی سے خوف زدہ ہیں۔ ایسی کیا بات ہے؟''

''سائیں! ایسا تو...... کچھ بھی نہیں ہے۔'' غفور نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کا خیال ہے سائیں۔''

مجھے ایسا لگا جیسے غفور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہو۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔ پولیس افسر ہونے کے ناتے شک و شبہ کرنا میری فطرت بن چکی تھی۔ میں نے اس معاملے میں غفور کو زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی ایسی کوئی بات اگر تھی بھی تو مجھ سے زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

☆......☆

مجھے اس علاقے میں تعینات ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے۔ اب تک وہاں چھوٹی موٹی چوریوں اور آپس کے لڑائی جھگڑوں کی وارداتیں ہوئی تھیں۔ ان وارداتوں کو میں نے صلح صفائی کرنے کے بعد ختم کر دیا تھا۔ شاید مجھ سے پہلے والے تھانے دار بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ میں یہاں آکر بےزاری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ نہ یہاں کام تھا نہ کوئی سوشل لائف تھی۔ علاقے کے لوگ مجھ سے دور دور رہتے تھے۔ دوسرے علاقوں میں تھانے دار کے پہنچتے ہی وہاں کے معزز لوگ اس سے ملاقات کرتے تھے اور اپنے تعاون کا یقین دلاتے تھے۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

چوتھے مہینے وہاں کی پُرسکون فضا میں اچانک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ایک سپاہی نے آکر مجھے اطلاع دی کہ ایک لڑکی کا قتل ہوا ہے۔

''قتل!'' میں چونک اٹھا۔ ''کہاں ہوا ہے قتل؟''

''سائیں! یہاں سے کچھ فاصلے پر درختوں کا اک جنگل ہے۔ لڑکی کا قتل وہیں ہوا ہے۔'' سپاہی نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''جائے واردات پر ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگا دو۔ چلو چل کر قتل کا معائنہ کریں۔''

اسی دن میں پہلی دفعہ اپنی وردی میں باہر نکلا۔ غفور نے میرے لیے ایک تانگے کا بندوبست کر دیا تھا۔ تانگے والا بھی باقی لوگوں کی طرح کم گو اور افسردہ سا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے ایک پرانی فلم یاد آتی تھی۔ وہ کچھ جادوئی فلم تھی۔ فلم کا ہیرو ایک علاقے میں پہنچتا ہے تو اسے وہاں ہر شخص اداس، غمگین اور پریشان نظر آتا ہے۔ وہ بہت مشکل سے ایک لڑکے کو بات کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ لڑکا ہیرو کو بتاتا ہے کہ یہاں ہر ماہ چاند کی چودھویں تاریخ کو ایک دیو آتا ہے اور وہ ایک لڑکی کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس مہینے شہزادی کی باری ہے اس لیے ہر شخص پریشان اور غمگین ہے۔

مجھے اس قصبے کا حال بھی کچھ ایسا ہی لگتا تھا۔ میں نے تانگے والے سے بھی بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے میری ہر بات کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا۔ کوئی شخص کھل کر بات ہی نہیں کرتا تھا۔

لڑکی کی لاش درختوں کے جھنڈ کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ اس کی پشت میں لمبے دستے والا چاقو پیوست تھا۔ اس قسم کے چاقو میں نے پہلے بھی دیکھے تھے۔ لڑکی کی عمر بہ مشکل سولہ، سترہ سال رہی ہوگی۔ اس کا چہرہ کبھی خوب صورت ہوگا لیکن اس وقت تکلیف اور خوف کی شدت سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر معمولی سا بوسیدہ لباس تھا۔ پیروں میں چپل بھی نہیں تھی۔ میں نے لڑکی کے پیروں کا جائزہ لیا وہ باقی عورتوں کی طرح بھدے اور کھردرے تھے۔

جس شخص نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی اسے پولیس والوں نے وہیں روک لیا تھا۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کے جسم پر میلی سی ایک بنیان اور دھوتی تھی، پیروں میں جوتے نہیں تھے۔ اس کی رنگت دھوپ میں رہنے کی وجہ سے تانبے کی طرح سرخی مائل سیاہ ہوگئی تھی۔

وہ خاصا سہما ہوا اور خوف زدہ تھا۔ مجھے دیکھ کر مزید خوف زدہ ہوگیا۔ میں نے لاش کا جائزہ لینے کے بعد اسے اپنی طرف بلایا اور پوچھا۔

''بابا نام کیا ہے تمہارا؟''

''میرا نام رمضان ہے سائیں۔ لوگ رمضو کہہ کر بلاتے ہیں۔''

''سب سے پہلے اس لڑکی کی لاش تم ہی نے دیکھی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی سائیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر آرہا تھا۔ اچانک میری نظر اس لڑکی پر پڑی۔ پہلے تو میں کچھ سمجھا نہیں پھر میں نے نزدیک جا کر دیکھا تو اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس وقت مرچکی تھی۔'' وہ اس قصبے کا پہلا شخص تھا جس نے اتنی بات کی تھی۔ مجھے وہ شخص ویسے بھی کچھ باتونی سا لگتا تھا۔

''تم اس لڑکی کو پہچانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سائیں، یہ میرے سامنے ہی پل کر جوان ہوئی ہے۔ میں اسے کیسے نہیں پہچانوں گا۔ یہ جان محمد کی بیٹی ماروی ہے۔ کچھ دن بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔ یہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہی لکڑیاں چننے آتی تھی۔ میں روز اسے دیکھتا تھا۔'' رمضو نے جواب دیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی باتونی تھا۔

گاؤں کے دوسرے لوگ بھی وہاں موجود تھے لیکن وہ کچھ فاصلے پر تھے۔ ایک عورت کچھ فاصلے پر بیٹھی بین کررہی تھی اور بہت بری طرح رورہی تھی۔

میں نے رمضو سے پوچھا۔ ''یہ عورت کون ہے؟''

''یہ ماروی کی ماں ہے سائیں۔'' رمضو نے جواب دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم ماروی کی ماں کو یہاں بلا لاؤ۔ وہ فوراً اسے لے کر میرے پاس آگیا۔ وہ مجھے دیکھ کر زوروشور سے بین کرنے لگی۔

''سائیں سرکار ہماری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں تھی۔ ہم نے تو کسی کے ساتھ برا نہیں کیا پھر ہم پر یہ ظلم کیوں ہوا...... کیوں ہوا سائیں؟''

''میں بھی یہی معلوم کرنے کی کوشش کررہا ہوں بی بی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ظلم کیوں اور کس نے کیا کیا، تم فکر مت کرو میں قاتل کو چھوڑوں گا نہیں۔''

عورت روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں شاید دوبارہ اسے بلواؤں۔

''سائیں!'' رمضو نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ پہلی واردات نہیں ہے۔ اس سے پہلے تین مہینے کے اندر اندر دو لڑکیاں اسی انداز میں قتل ہوچکی ہیں۔'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''قتل ہوچکی ہیں؟''

''جی سائیں۔'' رمضو نے جواب دیا۔ میں نے غفور سے پوچھا۔

''اس سے پہلے جو لڑکیاں قتل ہوئی ہیں ان کی رپورٹ تھانے میں درج کیوں نہیں ہے؟''

''سائیں اس وقت کوئی تھانے دار یہاں نہیں تھا پھر یہ لوگ تھانے آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ لڑکیوں کا قتل ان کی عزت کا معاملہ ہوتا ہے اس لیے ورثا نے قتل کی رپورٹ درج نہیں کروائی۔''

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ان لڑکیوں کے قتل کیوں ہوئے تھے؟''

''سائیں تو جوان لڑکیوں کے قتل کی دو وجہیں ہوتی ہیں محبت یا نفرت۔'' غفور نے پھر فلسفیانہ جواب دیا۔

''تو اس لڑکی ماروی کے سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس کا قتل محبت کی وجہ سے ہوا ہے یا نفرت کی وجہ سے؟''

''سائیں اس کیس میں تو میرا دماغ بھی کام نہیں کررہا ہے۔ ماروی کو میں بھی جانتا تھا۔ وہ بہت سیدھی سادی اور معصوم لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ محبت یا نفرت کا کوئی چکر نہیں تھا۔''

میں نے سائیکل پر ایک سپاہی کو ضلعی اسپتال بھیجا تاکہ لڑکی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جاسکے اور لڑکی کی لاش کو ایک بیل گاڑی پر ڈال کر لے آیا۔ میں نے رمضو کو ہدایت کردی تھی کہ وہ مجھ سے تھانے میں آکر ملے۔ وہ مجھے بہت کام کا آدمی معلوم ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ باتونی لوگ عموماً پولیس کے بہت کام آتے ہیں۔ میں اس سے پہلے قتل ہونے والی لڑکیوں کے بارے میں معلومات لینا چاہتا تھا۔

وعدے کے مطابق رمضو آدھے گھنٹے بعد تھانے پہنچ گیا۔ میں نے غفور سے چائے لانے کو کہا اور رمضو سے پوچھا۔ ''ہاں رمضان اب بتاؤ، تم اس سے پہلے قتل ہونے والی لڑکیوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''سائیں سب سے پہلے ریشماں کا قتل ہوا تھا اس کے

دو ماہ بعد زینت کو قتل کر دیا گیا۔ ماروی کی طرح ان کے قتل کا بھی کوئی سراغ یا ثبوت نہیں تھا۔"

"ریشماں کیسی لڑکی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"سائیں وہ بھی بہت نیک بچی تھی۔ دو ماہ بعد اس کی شادی ہونے والی تھی کہ اچانک ایک دن اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے خاندان کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی' نہ ریشماں کے ساتھ کوئی محبت وغیرہ کا چکر تھا۔" رمضو نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔

"اور زینت' اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"سائیں! زینت کو بھی اسی طرح دن دہاڑے قتل کیا گیا تھا۔ اس کے قتل کا بھی کوئی گواہ نہیں ملا۔ ماروی اور ریشماں کی طرح وہ بھی بہت اچھی لڑکی تھی۔ اس کا خاندان بھی بہت شریف ہے۔ ان لوگوں کی بھی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ زینت کی بھی ایک ماہ بعد شادی ہونے والی تھی کہ اسے قتل کر دیا گیا۔" میں بری طرح چونک اٹھا۔ تینوں قتل میں ایک بات مشترک تھی۔ ہر مقتولہ کی شادی ہونے والی تھی۔ ان کا کسی سے عشق و محبت کا چکر بھی نہیں تھا نہ کسی سے کوئی دشمنی تھی پھر ایسا کیوں ہوا؟ میں نے ذہن پر زور دیا۔ قاتل کوئی ایسا شخص تھا جو ان لڑکیوں کے جسم پر سہاگ کا جوڑا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے رمضو۔" میں نے اسے چائے پلانے کے بعد کہا۔ "تم جاؤ ضرورت پڑی تو تمہیں پھر بلا لوں گا۔"

"سو بار بلائیں سائیں۔" رمضو نے کہا۔ "میں تو خادم ہوں آپ کا۔"

میرا سر بری طرح چکرا کر رہ گیا تھا۔ ان لڑکیوں کو اس وقت قتل کیا گیا تھا جب ان کی شادی ہونے والی تھی۔ کسی ایک لڑکی کا قتل تو سمجھ میں آتا ہے لیکن تین تین لڑکیوں کا قتل، قاتل شاید کوئی نفسیاتی یا جنونی تھا۔

"غفور! تم ریشماں اور زینت کے گھر والوں کو یہاں بلا لاؤ۔ میں ان سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔" غفور نے جواب میں کچھ کہا نہیں لیکن مجھے اس کے چہرے سے اندازہ ہوا تھا کہ اسے میری بات پسند نہیں آئی ہے۔

شام تک ریشماں اور زینت کے لواحقین بھی آ گئے۔ میں نے ان لوگوں کو اپنے طور پر بہت کریدا لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ وہ یہی کہتے رہے کہ ان کی کسی سے بھی دشمنی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کی لڑکیوں کا کسی بھی لڑکے سے کوئی چکر نہیں تھا۔ ویسے بھی ایسی باتیں چھپی نہیں رہ سکتیں۔

میں نے پوچھ گچھ کرنے کے بعد انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ دن بھر دماغ کھپانے کے بعد بھی مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے غفور سے پھر چائے کی فرمائش کر دی۔

غفور چائے لے کر آیا تو ہنس کر بولا۔ "سائیں آپ کو یہ شکایت تھی کہ یہاں کوئی کام نہیں ہے۔"

"ہاں غفور۔" میں نے کہا۔ "اب تو کام کرنے کا مزہ آ رہا ہے۔" میں نے کہنے کو تو غفور سے کہہ دیا تھا لیکن مجھے اس کیس کا کوئی سرا ہی نظر نہیں آ رہا تھا تو مزہ کیا خاک آتا۔

ماروی کو قتل ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے لیکن اب تک بات وہیں تھی۔

میں آپ کو یہ بتانا تو بھول گیا تھا کہ مجھے محکمے کی طرف سے تھانے کے نزدیک ہی ایک مکان ملا ہوا تھا۔ پہلے تو میرے سارے کام غفور کرتا تھا پھر وہ میرے پاس دین محمد کو لے کر آ گیا اور بولا کہ سائیں، بابا بہت غریب آدمی ہے اس کے پاس رہنے کو ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ اس کا کچا گھر تھا پچھلی برسات میں بہہ گیا۔ بابا ایک جوان بیٹی کا باپ ہے۔ آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کی بیٹی آپ کا کھانا بھی بنائے گی اور بابا آپ کے دوسرے کام بھی کر دے گا۔ وہ صرف کھانے اور کپڑے پر یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی لیکن بابا کی غربت دیکھتے ہوئے میں نے اسے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔

قتل کے چھٹے دن کی بات ہے ایک آدمی تھانے پر اطلاع لے کر آیا کہ ایک اور لڑکی کو شدید زخمی کر دیا گیا ہے۔ اس کا بچنا مشکل ہے۔

"لڑکی کہاں ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ قصبے کے حکیم کے دواخانے میں ہے اس کے ماں باپ اسے وہیں لے گئے ہیں۔" میں بھاگا بھاگا وہاں پہنچا۔ لڑکی بہت بری طرح زخمی تھی اور اس کا بچنا محال تھا۔ حکیم نے اس کی مرہم پٹی تو کر دی تھی لیکن اس کا خون بہت ضائع ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی ہوش میں تھی اور اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔

"اس نے کچھ بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سائیں۔" لڑکی کے باپ نے جواب دیا۔

"تم ذرا باہر جاؤ۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ باپ

کے جانے کے بعد میں نے لڑکی سے پوچھا۔ ''تم نے حملہ آور کا چہرہ دیکھا تھا؟ اس نے تمہیں کیوں مارا؟'' میں نے پوچھا۔ لڑکی کا سانس اکھڑ گیا اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن بول نہ سکی اور اس نے دم توڑ دیا۔ لڑکی یعنی کہ ماں باپ اسے لے جانا چاہتے تھے لیکن میں اس کا پوسٹ مارٹم کروانا چاہتا تھا۔ وہ میری خوشامدیں کرنے لگے لیکن میں نے غفور کو تھانے بھیج کر دو سپاہی بلوا لیے اور لڑکی کی لاش کو اسپتال روانہ کر دیا۔

تیسرے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ رپورٹ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ قتل سے پہلے لڑکی کی عزت پامال کی گئی تھی۔ ماروی کے کیس میں ایسا نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ قتل دو مختلف افراد نے کیے ہیں۔ میں مزید الجھ گیا۔

گاؤں کے چند لڑکوں پر میری نظر تھی۔ ان میں قدر مشترک یہ تھی کہ وہ سب کے سب نکمے تھے جوان ہونے کے باوجود کوئی کام کاج نہیں کرتے تھے اور آتی جاتی لڑکیوں کو چھیڑنا ان کا مشغلہ تھا۔

مشتبہ لوگوں میں تین تو کم سن تھے لیکن ایک لڑکا سردار پختہ عمر کا تھا۔ میری ان لوگوں پر گہری نظر تھی۔ جو لڑکی زخمی حالت میں ملی تھی اس کا نام جینو تھا۔ اس کا قتل بھی مختلف طریقے سے ہوا تھا۔ اسے سر پر کوئی بھاری اور کند چیز مار کر قتل کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے سب لڑکیوں کو چاقو کے وار سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ماروی کے قتل کے وقت تو قاتل نے اتنا زبردست وار کیا تھا کہ اس کا چاقو اندر تک دھنس گیا تھا اور اس سے نکالا بھی نہیں گیا تھا۔ چاقو پر قاتل کی انگلیوں کے نشان بھی ملے تھے لیکن ان نشانات کا کوئی سابقہ ریکارڈ پولیس کے پاس نہیں تھا۔ بس اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ قاتل کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی پور کٹی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے طور پر تحقیقات کیں سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس کیس میں دانتوں پسینا آ گیا۔ قاتل کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر کئی مہینے گزر گئے قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ میری عادت تھی کہ میں شام کو سائیکل لے کر علاقے کے گشت پر نکل جاتا تھا۔ میں حسب معمول علاقہ گشت پر تھا کہ مجھے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی پھر کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔

''لالی رک جا ورنہ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میں نے سائیکل ایک طرف پھینکی اور درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھا جہاں سے آوازیں آ رہی تھیں۔

مجھے اندھیرے میں کوئی بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی لڑکی یا عورت ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک مرد چیختا ہوا بھاگ رہا تھا۔

''لالی رک جا ورنہ......'' پھر اس نے دوڑ کر لڑکی کو دبوچ لیا۔ میں نے اچانک اپنا سروس ریوالور نکالا اور ڈپٹ کر بولا۔

''خبردار بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ تمہیں پولیس نے گھیر لیا ہے۔''

لڑکی اس کی گرفت سے چھوٹ کر بھاگتی ہوئی میری طرف آئی۔ اس شخص نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک ہی جست میں اسے دبوچ لیا۔ وہ سردار تھا۔ وہ سردار جس پر پہلے سے شبہ تھا۔

میری چند لاتوں اور گھونسوں کے بعد اس نے جینو کے قتل کا اعتراف کر لیا۔ میرے جرح کرنے پر اس نے بتایا کہ قتل کی تین وارداتیں ہو چکی تھیں۔ میں نے سوچا کہ میں لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی عزت پامال کروں گا تو وہ کوئی مزاحمت نہیں کریں گی۔ جینو نے نہ صرف مزاحمت کی بلکہ میرا چہرہ بھی دیکھ لیا۔ مجبوراً میں نے اسے قتل کر دیا۔ وہ قتل بھی اسی نامعلوم قاتل کے کھاتے میں لکھ دیا گیا۔ لالی مجھے اتفاق سے ابھی گلی میں مل گئی تھی جو بالکل سنسان تھی۔ میں نے اسے منہ پر ڈھاٹا باندھا اور لالی کو زبردستی اٹھا کر درختوں کے جھنڈ میں لے گیا لیکن یہ ہاتھ چھڑا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے میرا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

سردار کا بیان لے کر میں نے لالی کا بھی بیان لیا اور سردار کو گرفتار کر کے ضلعی ہیڈ کوارٹر کی حوالات میں بھجوا دیا لیکن ماروی اور بقیہ دو لڑکیوں کا قاتل اب بھی میرے لیے معما بنا ہوا تھا۔

میں اس دن گھر پہنچا تو بابا دین محمد نے میرا بستر بچھا دیا تھا۔ اس کی بیٹی مومل اس کے نزدیک کھڑی تھی۔ میں نے اس دن پہلی دفعہ بابا کی بیٹی کو دیکھا تھا۔ اس کا حسن دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بابا سے پوچھا۔ ''بابا تم نے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کی اب تک؟''

''سائیں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے میرا دل تو ہے پھر سائیں میں غریب آدمی ہوں میری بیٹی سے شادی کون کرے گا؟''

میں سوچنے لگا غربت بھی کیا چیز ہے۔ یہی لڑکی اگر دولت مند ہوتی تو اس کے بڑے امیدوار ہوتے۔ دوسرے دن میں تھانے میں بیٹھا تھا۔ غفور میرے لیے چائے لے کر آیا تو مجھے اچانک مول کا خیال آ گیا میں نے غفور سے کہا۔

''غفور تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''بس سائیں کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم نے بابا دین محمد کی بیٹی کو دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس کے بارے میں کیا خیال ہے' کیا تم اس سے شادی کرو گے؟''

''سائیں وہ اچھی لڑکی ہے۔ آپ کا حکم ہے تو میں شادی کروں گا۔'' غفور نے بے دلی سے جواب دیا۔ میں نے سوچا ابھی تو بے دلی سے شادی کرلے گا پھر اسے موّل پسند آجائے گی۔

میں نے جا کر دین محمد سے غفور کے بارے میں بات کی تو وہ بولا۔ ''سائیں اگر غفور راضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اسی وقت موّل اندر آ گئی۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں عجیب سا شکوہ تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''سائیں...... وہ آپ نے میری...... شادی کی بات کی ہے...... غفور سے...... میں اس بڈھے سے شادی نہیں کروں گی۔'' یہ کہہ کر وہ جھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔

مجھے بھی خیال آیا کہ میں یہ کیا ظلم کرنے جا رہا تھا غفور پختہ عمر کا مرد تھا۔ وہ موّل سے کم از کم بیس سال تو بڑا ہوگا۔

میں نے بابا دین محمد سے کہہ دیا کہ غفور اس شادی پر راضی نہیں ہے پھر میں نے غفور سے بھی کہا کہ بابا کی بیٹی اس شادی پر راضی نہیں ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے غفور کے چہرے پر شدید غصے کے تاثرات دکھائی دیے پھر اس نے فوراً خود پر قابو پالیا۔

اس دن میں حسبِ معمول تھانے میں بیٹھا تھا اور غفور چائے بنا رہا تھا۔ وہ چائے لے کر آیا تو اس کا پاؤں نہ جانے کس چیز میں الجھا کہ وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے پکڑنے کے لیے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا پھر دونوں ہاتھ میز پر لگا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں بری طرح چونک اٹھا۔ میں نے جھپٹ کر اپنا سروس ریوالور نکالا اور غفور کی کن پٹی پر رکھ دیا۔ غفور نے حیرت سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

''غفور میں تمہیں ریشماں، زینت اور ماروی کے قتل میں گرفتار کر رہا ہوں۔''

''سائیں...... مجھے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں تمہیں ذرا اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھو۔''

وہ گڑبڑا کر رہ گیا میں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی پھر غفور نے اقرار جرم کرلیا کیونکہ جس چاقو سے ماروی کو قتل کیا گیا تھا اس پر غفور کی انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔

میں نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ریشماں، زینت اور ماروی کے بڑوں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ گھر کے تمام افراد اس میں زندہ جل گئے تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ غفور کے بڑے بھائی نے ان کے خاندان کی ایک لڑکی سے محبت کی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ تینوں لڑکیوں کے باپ آپس میں قریبی رشتے دار بھی ہیں۔ وہ اس وقت گاؤں سے باہر تھا۔ اس لیے بچ گیا۔ میری ایک بہن سہیلی کے گھر میں تھی وہ جلنے سے بچ گئی تھی لیکن اسے ان لوگوں نے بعد میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں اس وقت تک پولیس میں ملازمت کر چکا تھا۔ میں واپس آیا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میری بہن کی دو ہفتے بعد شادی ہونے والی تھی۔ میں انتقام کی آگ میں جلتا رہا اور موقع کے انتظار میں رہا۔ میں نے ان کی بیٹیوں کو اس وقت موت کے گھاٹ اتارا جب ان کی شادیاں ہونے والی تھیں۔ اس کے بعد گاؤں میں ایک بڑی واردات اور ہوتی جس میں ان تینوں کے گھروں کو آگ لگا کر بھسم کر دیتا لیکن آپ نے میرا انتقام پورا نہ ہونے دیا۔

میں نے غفور کا بیان لیا اور اسے گرفتار کر کے ضلعی ہیڈ کوارٹر کی حوالات میں بھیج دیا۔ یوں گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ میں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

اس کے بعد میرا ٹرانسفر کراچی ہو گیا تھا۔ مختلف تھانوں میں رہ کر میں نے اپنی ملازمت پوری کی اور اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں اب تو میرے بچوں کے بھی بچے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میری بیوی کون ہے؟ میری بیوی بابا دین محمد کی بیٹی ہے وہ بوڑھی ہو گئی ہے لیکن مجھے آج بھی اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی وہی شکوہ نظر آتا ہے جو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب میں اس کی شادی غفور سے کروا رہا تھا۔

اندازِ بیاں

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
مجرم خواہ کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو وہ کہیں نہ کہیں چوک جاتا ہے اگر تفتیش کار باریک بینی سے حالات و واقعات کا تجزیہ کرے تو مجرم کی گردن تک اس کا ہاتھ بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔ انسپکٹر فراز اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں مگر ان کا یہ کیس بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان کی حاضر دماغی نے کس طرح مجرم کو بے نقاب کیا، کیا ایسا زیرک انسپکٹر ہر تھانے میں موجود نہیں ہونا چاہیے؟

آصفہ ضیاء احمد
(حیدر آباد)

خان دلدار کا غائبانہ تعارف انسپکٹر فراز سے تھانہ انچارج علی احمد نے کروایا تھا۔ انسپکٹر فراز کی تعیناتی حال ہی میں اس علاقے کے تھانے میں ہوئی تھی۔ وہ غیر معمولی سوجھ بوجھ کا حامل اور انتہائی قابل انسپکٹر تھا۔ ڈیوٹی اور ڈسپلن کا سخت پابند اور قانون کا احترام کرنے والا۔ اس کے علاقے میں مجرمانہ سرگرمیوں کی تعداد نسبتاً کم تھیں۔ جن مجرموں کا اس سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ وہ اس کا نام سن کر ہی کانپتے تھے۔ فراز نے چارج سنبھالتے ہی نہ صرف ہر فائل پر نظرثانی کی

بلکہ کئی کیسز بھی ری اوپن کروائے۔

جانچ پڑتال کے دوران علی احمد تمام کوائف سے بمع تفصیلات انسپکٹر فراز کو آگاہ کرتا رہا۔ گردونواح میں ہونے والے جرائم، قتل و غارت گری اور دہشت انگیزی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ ''سر کہتے ہیں کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔ میں بھی یہی کہوں گا کہ واقعی قانون اندھا گونگا بہرا ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے چور اچکوں کے لیے تو قانون فوراً سزائیں تجویز کرتا ہے۔ پیٹ کا دوزخ بجھانے کے لیے یہ اگر نانبائی کی دکان سے روٹی بھی چراتے ہیں تو ان کو فوراً گرفتار کرلیا جاتا ہے لیکن بڑے بڑے جغادری مگرمچھ دھڑلے سے ہر جرم ہر گناہ کررہے ہیں لیکن قانون اور پولیس ان کے گھروں کی لونڈی ہے۔ ان پر کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا کیوں کہ ان کے اپنے ہاتھ اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ ہمارا قانون ان کے سامنے سرنگوں ہوجاتا ہے۔''

انسپکٹر فراز نے گہری نظروں سے علی احمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''علی، تم کیا سمجھتے ہو۔ گناہ کی ناؤ ہمیشہ تیرتی ہے۔ نہیں میرے دوست ایسا نہیں ہے۔ دنیا کا قانون بھلا ہی ایسے لوگوں کے سامنے بے بس اور مجبور ہوجائے لیکن قانونِ قدرت جب انہیں اپنے گھیرے میں لیتا ہے تو ایسے لوگوں پر زمین تنگ کردی جاتی ہے۔ یہ میرا ایمان ہے۔''

فراز کے نکتۂ نظر سے تھانہ انچارج علی احمد بالکل بھی متفق نہیں تھا۔ اس کی خفیف سی مسکراہٹ میں طنز و استہزاد صاف جھلک رہا تھا۔ انسپکٹر فراز نے فوراً بھانپ لیا کہ علی احمد اس کی باتوں کو دیوانے کی بڑ سمجھ رہا ہے۔ اس لیے اس نے بھی خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا لیکن دل میں اس نے ٹھان لی تھی کہ مناسب وقت پر وہ علی احمد کو ضرور قائل کرے گا اور اپنی بات کی صداقت کو منوائے گا۔ اس کے بعد وہ پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ سامنے رکھی ہوئی فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔

علی احمد سمجھ گیا کہ اب اسے اٹھ جانا چاہیے کیوں کہ اسے علم تھا کہ فراز جب اپنے کام میں غرق ہوتا ہے تو کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس لیے وہ وہاں سے فوراً اٹھ گیا اور اپنی سیٹ پر آکر سکون کی سانس لی لیکن چند ہی منٹ گزرے تھے کہ اردلی نے دوبارہ انسپکٹر فراز کا سلام دیا۔ علی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور دوبارہ فراز کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ضروری پوچھ گچھ کے بعد اس نے علی سے استفسار کیا۔ ''تم اس علاقے میں کسی خان دلدار کو جانتے ہو؟''

علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی سر بہت اچھی طرح یہاں کی معزز ترین شخصیت میں اس کا شمار ہے لیکن...... لیکن......'' کہہ کر اچانک علی نے اپنی زبان روک لی اور پُرخیال انداز میں انسپکٹر فراز کو دیکھا اور بولا۔ ''سر ان کے متعلق آپ کے اسسٹنٹ اکرام اللہ صاحب زیادہ بہتر طور پر بتا سکتے ہیں کیوں کہ ان کی خان فیملی سے کافی صاحب سلامت ہے۔''

فراز نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواباً کہا۔ ''اس لیے تو تم سے اس شخص کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اگر اکرام اللہ سے استفسار کرتا تو وہ یقیناً اس کی شان میں قصیدے پڑھنا شروع کردیتا۔ اکرام کو میں نے ایک ضروری وزٹ پر بھیجا ہے تاکہ تم سے کچھ اہم معاملات پر گفتگو کرسکوں۔ ہاں اب بتاؤ خان دلدار کے بارے میں۔''

علی احمد نے جو کچھ فراز کے گوش گزار کیا اس کا لب لباب یہ تھا کہ خان دلدار کا تعلق اس علاقے کے ملحقہ دیہات سے تھا۔ کئی ایکڑ زمینوں کا مالک تھا۔ تعلیم یافتہ بھی تھا اس لیے اکلوتے بیٹے خان داراب کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی چونکہ خان داراب فارن ریٹرن ڈاکٹر تھا اس لیے اس نے گاؤں کی رہائش کو خیرباد کہہ کر شہری علاقے میں اپنی پریکٹس کا آغاز کیا اور یہیں اپنی پسند سے ایک لیڈی ڈاکٹر سے شادی بھی کرلی۔ خان دلدار اور اس کی بیوی کو اکلوتے بیٹے سے جدائی گوارا نہیں تھی۔ اس لیے سارا خاندان ہی یہاں شفٹ ہوگیا اور پھر شہر کی گہما گہمی چہل پہل ایسی راس آئی کہ گاؤں میں زمینوں کا کرتا دھرتا تھا خان داراب نے اپنے کزن کو بنایا اور بیٹے بہو کے ساتھ مستقل رہائش شہر میں اختیار کرلی۔ آدمی زمانہ ساز اور موقع شناس تھا۔ شہر میں ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس شروع کیا اور معجزاتی طور پر بڑھتا چلا گیا۔ گاؤں اس کے اور اس کے خاندان والوں کے لیے بھولی بسری یاد بن گیا۔ زمینوں کا حساب کتاب دیکھنے کبھی جاتا بھی ہے تو فوراً الٹے پاؤں واپس آجاتا ہے۔ اپنی دولت کو فروغ دینے کے لیے دونوں باپ بیٹے یعنی خان دلدار اور خان داراب نے ناجائز دونوں راستے اپنائے۔ لقمۂ حرام کے ترتر ذائقے ایسے بھائے کہ حلال روزی کے ہجے بھی بھول گئے۔ بظاہر خان دلدار ایکسپورٹر امپورٹر ہے لیکن درپردہ وہ بہت بڑا اسمگلر ہے اسی طرح اس

کا بیٹا داراب ڈاکٹر ہے لیکن انسانی اعضا فروخت کرنے والے کسی گروہ سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے اور ڈاکٹر داراب کی بیوی ڈاکٹر نغمہ بحیثیت گائنا لوجسٹ کام کرتی ہے۔ شروع میں اس کی پریکٹس نہ ہونے کے برابر تھی لیکن تیز و طرار عورت ہے۔ اس لیے ایسا راستہ تلاش کیا کہ ہُن برسنے لگا اور پھر......

انسپکٹر فراز نے فوراً علی احمد کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔ ''ایسا کون سا راستہ تلاش کرلیا؟''

علی احمد نے قدرے تیز اور تلخ لہجے میں کہا۔ ''سر معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور فحاشی کی وجہ سے کنواری لڑکیاں اپنا گناہ چھپانے کے لیے کسی ایسی دائی یا لیڈی ڈاکٹر کی تلاش میں ہوتی ہیں جو خاموشی سے انہیں گناہ کے اس بوجھ سے آزاد کردے۔ اس کام کو لیے ڈاکٹر نغمہ منہ مانگی رقم وصول کرتی ہے نغمہ کے اس کاروبار کو اس لیے بھی توسیع ملی کہ اس نے دو چار خرانٹ قسم کی دائیوں کو بھی رابطے میں رکھا ہے جو اس قسم کے کیسز کی بو سونگھتی پھرتی ہیں اور کیس ملنے پر دونوں پارٹیوں کا رابطہ کروا کر اپنا کمیشن کھرا کرتی ہیں اور پھر دوسرے شکار کی تلاش میں نکل جاتی ہیں۔''

سب کچھ سننے کے بعد فراز نے ایک لمبی ''ہوں'' کی۔ اس کی آنکھوں میں تردد اور تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ پیشانی کی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ بہت مشکل سے وہ اپنے آپ کو کنٹرول کر رہا ہے۔ اس کے اندر ایک جنگ ایک طوفان برپا تھا۔ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ پھر متفکر ہوا۔ ''اتنا سب ہونے کے بعد وہ قانون کے شکنجے میں کیوں نہیں آیا۔''

علی احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہی تو میں آپ سے تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا کہ سارے قوانین، قواعد و ضوابط صرف غریبوں کے لیے ہیں۔ امیروں اور دولت مندوں کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ پیسا ان کے ہر جرم کو یوں ڈھانپ لیتا ہے جیسے ماں اپنے بچے کو اپنی آغوش میں چھپا لیتی ہے۔ اس خاندان کے کالے کرتوت سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اس کے باوجود معاشرے میں نہایت عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ بلکہ آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں کیوں کہ ہمیشہ خیر خیرات، عطیات اور رفاہ عامہ کے لیے اپنے خزانوں کا منہ کھول دیتے ہیں۔''

فراز نے طعن آمیز لہجے میں کہا۔ ''رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی سمجھتے ہیں ہم جو دو سخا کے دریا بہا رہے ہیں اس سے خوش ہوکر اللہ تعالیٰ ساری خطاؤں کو بخش دے گا۔ حرام خور کہیں کے۔'' یہ کہتے ہوئے فراز نے اپنی کرسی چھوڑ دی اور علی احمد بھی ریمانڈ روم کی طرف بڑھ گیا لیکن اس کی سوچوں کا محور فراز تھا۔ اس ظلمتِ شب میں وہ اسے مینارۂ نور لگ رہا تھا۔

☆......☆

ڈیوٹی مکمل کر کے فراز بستر پر دراز ہی ہوا تھا کہ اسے اس کے اسسٹنٹ اکرام اللہ نے خبر دی کہ خان دلدار کے جواں سال پوتے کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اثر و رسوخ والا بندہ ہے۔ اوپر تک سب کو ہلا کر رکھ دے گا۔ پلیز آپ تھانے آجائیں تو بہتر ہوگا۔ فراز نے ابھی آرہا ہوں کہتے ہوئے فون بند کردیا۔ اکرام اللہ نے فراز سے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا کیوں کہ جیسے ہی فراز نے گھر سے باہر قدم رکھا متعلقہ ڈی ایس پی کا فون آگیا کہ خان دلدار کے پوتے کے کیس میں کسی بھی قسم کی غفلت نہ برتی جائے۔ فراز نے نہایت مناسب اور معقول انداز میں مختصراً جواب دیا۔ ''یس سر۔'' اور پھر سلسلہ منقطع ہوگیا۔

تھانے میں ایک قیامت صغریٰ برپا تھی۔ خان دلدار اس کے لواحقین اور ہمدرد پولیس والوں سے یوں الجھ رہے تھے جیسے اس کے پوتے خان شمشاد کو پولیس نے اغوا کر کے اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ انسپکٹر فراز کو دیکھتے ہی خان دلدار تنتنا کر کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ کسی کو تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ خان دلدار نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب یہ کیا ہو رہا ہے آپ کے علاقے میں۔ مجھے اپنا پوتا زندہ سلامت چاہیے اور بہت جلد بازیابی چاہیے۔'' اس کا لہجہ انتہائی طیش آمیز اور اکھڑا ہوا تھا۔ اس کا رویہ اور لب لہجہ دیکھ کر اس کے ساتھ آنے والے بھی شیر ہو گئے۔ فراز نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے ان کو اپنے قابو میں کیا اور پھر خان دلدار جیسے چنگھاڑتے ہوئے ہاتھی کا مہاوت بن کر اسے بھی صحیح راستے پر گامزن کیا۔ اب وہ دائرۂ تہذیب میں رہ کر پولیس والوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ ضروری کارروائی کے بعد فراز نے انہیں نہ صرف ہمت و حوصلہ دیا بلکہ پولیس کی بھرپور مدد کا یقین بھی دلایا۔ فراز کے دلاسے تسلی سے خان دلدار کے اضطراب اور بے چینی میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ جب وہ وہاں سے رخصت ہوا تو پُرامید تھا کہ جلد یا بدیر اس کا پوتا خان شمشاد ضرور

بازیاب کروالیا جائے گا۔

☆......☆

دوسری صبح انتہائی چمکیلی اور فرحت بخش تھی لیکن خان فیملی کے لیے نہیں۔ انسپکٹر فراز جب اپنے اسسٹنٹ اکرام اللہ کے ساتھ خان دلدار کی رہائش گاہ پہنچا تو وہاں سوگواریت اور اداسی کا راج تھا بلکہ گھر پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ فراز نے پہلی ہی نظر میں ان کی طرز رہائش ان کے لباس انداز و اطوار نشست و برخاست سے اندازہ لگا لیا کہ خان دلدار کا خاندان شہر کے گنے چنے دولت مندوں میں سے ایک ہے۔ ان دونوں کا استقبال ڈاکٹر خان داراب نے کیا۔ داراب بھی اپنے باپ ہی کا عکس تھا۔ تنومند، طویل القامت، آنکھیں گہری سرخ جیسے خون کبوتر، چہرے پر جاہ و حشمت کا جلال اور تکبر لیکن اس وقت گھر کے ہر فرد کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دکھ اور غم کے سائے لہرا رہے تھے۔ خاص طور سے ماں اور دادی کا برا حال تھا۔ انسپکٹر فراز نے اپنی تفتیش کا آغاز ڈاکٹر داراب سے کیا۔ پوچھ گچھ کے دوران ہی اسے پتا چلا کہ شمشاد یونی ورسٹی کے آخری سال میں تھا۔ حلقۂ احباب کافی وسیع تھا۔ اغوا والے دن اپنے کچھ دوستوں کو ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔ کھانے کے بعد رات ساڑھے نو بجے دوستوں کے ہمراہ چہل قدمی کے لیے گھر سے نکلا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ چند حملہ آوروں نے اچانک ان سب کو نرغے میں لے کر شمشاد کو گھسیٹا اور قریب کھڑی کار میں دھکیلا اور پھر یہ جا وہ جا۔ سارے دوست بھی بری طرح بوکھلا گئے کہ یکایک یہ کیا ہو گیا۔ سڑک پر اس وقت راہ گیروں کی بھی آمد و رفت تھی۔ ٹریفک بھی تھا لیکن ہڑبونگ افراتفری میں کوئی کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ سب آناً فاناً ہو گیا۔ ڈاکٹر داراب کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی آواز بری طرح بھرا گئی تھی۔

خان دلدار نے بیٹے کی پشت تھپتھپائی اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب ہونی ہو کر رہتی ہے لیکن میری آپ سے درخواست ہے۔ میرے پوتے کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالیں۔ اسی بچے سے آگے میری نسل چلے گی۔ ورنہ......''
بوڑھے خان کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔

وہاں پر موجود ہر ایک کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ فراز نے یکے بعد سب کے بیانات لیے۔ لواحقین اور عزیز و اقارب کا جو جمگھٹا تھا۔ انہیں بھی دائرہ تفتیش میں شامل کیا گھر کے نوکر چاکر ملازمین سے بھی سوالات کیے گئے لیکن کوئی اطمینان بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ شمشاد کے ان دوستوں سے بھی بات کی جو اغوا کے وقت اس کے ساتھ تھے۔ اس کے پروفیسرز اور کلاس فیلوز سے بھی رابطہ کیا لیکن سوائے ناامیدی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ فراز پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میڈیا نے الگ شور مچا رکھا تھا۔

پولیس نے بھی فراز کی قیادت میں اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ اکرام اللہ شمشاد کی فائل تیار کر چکا تھا اور اس وقت دفتر میں فراز اسی کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ علی احمد نے استفسار کیا۔ ''سر کوئی کلیو ملا؟''

فراز نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ''نہیں اس میں تو سوائے بنیادی معلومات کے کچھ نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ فائل اور میز پر بکھرے ہوئے سارے کاغذات اٹھا کر ٹرے میں رکھے ہی تھے کہ فون چیخ اٹھا۔ فراز نے فون اٹھا کر ہیلو کہا اور دوسری جانب سے خان دلدار کی آواز آئی۔ ''انسپکٹر صاحب تیسرا دن ہے میرے پوتے کو غائب ہوئے۔ آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے خالی خولی باتیں ہی کیے جا رہے ہیں جب کہو تو آپ ہمیں طفل تسلیاں دے کر منہ بند کر دیتے ہیں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے آپ کے علاقے میں۔''

فراز کا بھی پارہ چڑھ گیا وہ کوئی کرارا سا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ فون پر آواز بدل گئی۔ ڈاکٹر داراب کی آواز سماعت سے ٹکرائی وہ کہہ رہا تھا۔ ''انسپکٹر صاحب شمشاد کے اغوا کی وجہ سے بابا بری طرح ذہنی طور پر منتشر ہو گئے ہیں۔ آپ پلیز ان کی باتوں کا برا نہ مانیے گا۔'' فراز کا سارا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے نہایت خوش دلی سے جواباً کہا۔ ''نہیں نہیں کوئی بات نہیں اس قسم کے حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ویسے ڈاکٹر صاحب مجھے ایک بات بتائیے۔ شمشاد کے اغوا کے بعد آپ کے پاس کوئی کال کوئی پیغام آیا ہے؟''

ڈاکٹر داراب فوراً بولا۔ ''نہیں جناب نہ کوئی کال نہ کوئی میسیج، بلکہ میں اور بابا تو منتظر ہیں کہ اغوا کنندگان جو بھی ڈیمانڈ رکھیں گے ہم پوری کر دیں گے۔ بس ہمیں ہمارا بچہ مل جائے کیوں کہ میں اور بابا تو مرد ہیں۔ سسک رہے ہیں۔ جب کہ میری والدہ، بیوی اور میری بیٹی کی حالت انتہائی دگرگوں ہے۔''

فراز نے ڈاکٹر داراب کو ہمت حوصلے کی تلقین کی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ دفتر سے نکل کر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور اب وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ گھر پر بھی

اس کا ذہن شماد والے کیس میں ہی الجھا رہا۔ اسے ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ملی تھی لیکن وہ اُمید کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

دوسرے دن فراز اپنی ٹیم کے ساتھ اس کیس کے سلسلے میں میٹنگ کر رہا تھا۔ مشکوک لوگوں کی فہرست تیار کرنے کے بعد اس نے تحکمانہ لہجے میں اکرام اللہ سے کہا۔ ''اکرام آج اس جگہ چلتے ہیں جہاں شمشاد اغوا ہوا ہے۔''

''اوکے سر۔'' کہتا ہوا اکرام اللہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ جگہ خان ہاؤس سے قریب ہی تھی۔ بہت زیادہ مصروف راستہ نہیں تھا لیکن مکمل طور پر سنسان بھی نہیں تھا۔ بس ہلکا پھلکا ٹریفک تھا۔ اکرام اللہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے وقوعے پر گاڑی روکی۔ وہ اور فراز اترے۔ سرسری نظروں سے گرد و نواح کا جائزہ لیا اور پھر گاڑی میں آبیٹھے۔ فراز کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اکرام اللہ نے آہستہ سے کہا۔ ''سراب کہاں جانا ہے۔'' لیکن فراز اپنی سوچوں اور خیالوں میں اس طرح غلطاں و پیچاں تھا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اکرام اللہ نے چند لمحے توقف کے بعد پھر کہا۔ ''سراب کہاں چلیے گا۔''

فراز چونکا اور خفت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''تم نے مجھ سے کچھ کہا۔''

اکرام اللہ نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور کہا۔ ''جی میں پوچھ رہا ہوں کہ اب ہماری اگلی منزل کون سی ہے۔''

فراز نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا۔ ''خان داراب کی طرف ہی چلتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی سرا ہاتھ لگ جائے۔''

اکرام اللہ نے گاڑی آگے بڑھائی۔ چند منٹ میں ہی وہ خان ہاؤس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر داراب انہیں لان میں ہی مل گیا۔ فراز اور اکرام اللہ کو دیکھ کر وہ آگے بڑھا۔ ہاتھ ملایا اور پھر لان میں بچھی ہوئی کرسیوں پر براجمان ہوگئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد فراز نے ڈاکٹر داراب کو مخاطب کر کے ایک ہوائی تیر چھوڑا۔ ''ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ آپ کا بیٹا جوان بھی ہے اور دولت مند بھی۔ ایسے لڑکوں کے ارد گرد لڑکیاں مکھیوں کی طرح بھنبھناتی ہیں۔ کہیں آپ کے بیٹے کے اغوا کے پیچھے بھی تو کسی عورت کا ہاتھ نہیں۔''

ڈاکٹر داراب نے فراز کا سوال سن کر آنکھیں جھپکائیں اور کہا۔ ''انسپکٹر صاحب اگر اس کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ ہے تو کم از کم میرے علم میں نہیں۔ میں اپنی بیوی اور بیٹی سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ تب ہی آپ کے اس سوال کا جواب دے سکوں گا۔''

فراز نے فوراً دوسرا سوال کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب، میں نے سنا ہے کہ آپ کے والد بھی سیاست میں آنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے والد کا کوئی سیاسی حریف ہو اور اس نے یہ ضرب لگائی ہو۔''

ڈاکٹر داراب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ چہرے کی پژمردگی اور بڑھ گئی۔ اداس اور غمگین لہجے میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب بابا کے ایک نہیں بلکہ ہزاروں دشمن ہیں۔ چند ایک جو میرے ذہن میں ہیں ان کے نام تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔ باقی اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو تو آپ بابا سے ہی کریں تو بہتر ہے۔''

ابھی فراز کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اکرام اللہ کا سیل فون گنگنا اٹھا اس نے بات کی اور پھر فراز سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''سر تھانے سے کال ہے۔ میرا پوچھ رہے تھے۔''

''اگر جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ گاڑی بھی لیتے جانا میں ٹیکسی سے آجاؤں گا۔''

''جی شکریہ۔'' کہہ کر اس نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

فراز نے دوبارہ گفت و شنید کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ اس نے اگلا سوال کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب ایک بات اور بتائیے۔ آپ اور آپ کی مسز دونوں میڈیکل لائن میں ہیں۔ یقیناً یہاں بھی چار دوست ہوں گے تو چار دشمن بھی ہوں گے۔ آپ کو جو بندہ بھی مشکوک لگے آپ ان کے نام بغیر کسی جھجک کے بتائیں تاکہ ہمارے کام میں آسانی ہو۔''

داراب کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا۔ ''دیکھیے پیشہ وارانہ رقابت کسی فیلڈ میں نہیں ہوتی۔ میری اور نغمہ کی چپقلش جن جن لوگوں سے چلتی ہے۔ میں ان کی فہرست بنا کر آج ہی آپ تک پہنچا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہہ کر فراز نے اپنی نشست چھوڑی اور کھڑا ہوگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے تو ڈاکٹر داراب نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''ارے گاڑی تو آپ نے بھجوا دی۔'' پھر اس نے اپنے ڈرائیور کو آواز دی۔ ''شیرے صاحب کو تھانے تک چھوڑ کر آؤ۔''

فراز انکار ہی کرتا رہ گیا۔ لیکن داراب نے ایک نہ سنی۔ ڈرائیور نے فوراً گاڑی کا دروازہ کھولا اور فراز سے

کہا۔ ''تشریف رکھیے صاحب۔'' فراز علی عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شیرے نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ بھوی ٹریفک کی وجہ سے رکنا پڑا۔ فراز وقت گزاری کے لیے ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے نہایت نرم لہجے میں استفسار کیا۔ ''تمہارے مالک تمہیں شیرا کہہ کر پکارتے ہیں ویسے تمہارا اصل نام کیا ہے؟''

ڈرائیور نے بوکھلا کے مدھم لہجے میں کہا۔ ''جی صاب شیر خان نام ہے میرا۔ مجھے شیر خان کہتے ہیں۔''

فراز اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو تم سے نام پوچھا تھا لیکن تم یوں گڑبڑا گئے جیسے میں نے کوئی انہونی بات سنا دی۔''

اس بار شیرا نے ذرا سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''جی صاب جی میرے لیے تو انہونی ہی ہے۔ بڑے لوگ تو ہمیشہ غریب لوگوں سے جھڑکیوں سے ہی بات کرتے ہیں۔ ہمارے مالک لوگ بھی پہلے ہمیں گالیاں دیتے ہیں پھر حکم۔ آپ سے بات کی تو بہت اچھا لگا۔'' ڈرائیور کی بات سن کر فراز کو احساس ہوا کہ خان دلدار کے خاندان کا رویہ اپنے ملازمین کے ساتھ صحیح نہیں ہو سکتا ہے، کسی نوکر نے ہی انتقامی کارروائی کی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی فراز نے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ ''شیر خاں تم اسی شہر کے رہنے والے ہو۔''

شیر خاں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں صاب جی میں ایبٹ آباد کا رہنے والا ہوں۔ کام کی تلاش میں یہاں آیا تو ایک دوست نے بڑے خاں صاب سے ملوایا اور انہوں نے یہ نوکری دے دی۔''

فراز نے ہنکارا ابھرا اور اگلا سوال کیا۔ ''اس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے؟'' ڈرائیور شیر خاں نے فراز کے لہجے کی نرمی سے حوصلہ پا کر پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''ارے صاب کئی جگہ کام کیا۔ کہیں من نہیں لگا تو خود ہی روزی پر لات مار دی۔ کہیں مالکوں نے بھگا دیا۔ ایک بات بتاؤں میں آپ کو اپنے گاؤں میں ہم نے نوٹنکی میں بھی کام کیا۔ لوگ ہمارا گیت سنگیت اور ناچنا گانا طرح طرح کی آوازیں نکالنا۔ اس سے اتنے خوش ہوتے تھے کہ ہم پر خوب پیسا نچھاور کرتے۔ دوستوں کے کہنے پر لاہور کی فلم نگری کا بھی دروازہ کھٹکھٹایا لیکن دال نہیں گلی۔''

فراز اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''واہ بھئی شیرا تم تو چھپے رستم نکلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بڑے فنکار ہو۔ کبھی فرصت ملی تو تمہارے فن سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔''

فراز کی زبان سے تعریفی جملے سن کر شیرا کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے مسرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''ارے صاب اگر ہم ممبئی فلم انڈسٹری چلے جاتے نا تو شاہ رخ خان، عامر خان اور سلمان خان کے ساتھ شیر خان بھی کھڑا ہوتا اور یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ممبئی کی فلم نگری میں جب بھی خانز کا دور آیا انہوں نے سب کی چھٹی کروا دی۔ جیسے اپنے یوسف خان (دلیپ کمار) امجد خاں اور اب یہ تین خان ابھی تک چھائے ہوئے ہیں۔ شیر خان چلا جاتا تو ان کی بھی بولتی بند کروا دیتا۔''

فراز اس کی باتوں پر دل کھول کر ہنس رہا تھا اور شیر نہال ہو رہا تھا۔ جیسے ہی راستہ صاف ہوا۔ شیرا نے گاڑی آگے بڑھائی۔ پلک جھپکتے ہی اس نے فراز کو اس کی منزل پر پہنچا دیا۔ شیرا نے گاڑی روک کر فراز کے لیے کار کا دروازہ کھولا اور نہایت انکساری سے کہا۔ ''صاب جی آپ ہم کو بہت اچھے لگے۔ بہت ہی اچھے لگے صاب جی۔'' فراز نے اس کی پشت تھپتھپائی اور آگے بڑھ گیا۔

☆......☆

نصف رات بیت چکی تھی کہ یکایک فراز گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا اس کا موبائل اپنی مخصوص دھن بجا رہا تھا۔ فراز نے ایک طویل انگڑائی لی اور بھاری آواز میں ہیلو کی۔ جواب میں ڈاکٹر داراب کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ فراز فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ غنودگی ہوا ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر داراب وحشت زدہ لہجے میں پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔ ''انسپکٹر فراز آپ کا شک سچ نکلا؟''

فراز نے تجسس آمیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیسا شک۔''

ڈاکٹر داراب نے کہا۔ ''آپ نے کہا تھا نا کہ شمشاد کے اغوا میں کسی عورت کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ ابھی کچھ دیر قبل میرے اور بابا کے سیل فون پر کسی عورت نے کال کر کے یہ کہا کہ ہمارا ڈیڑھ کروڑ کا مطالبہ ہے۔ تمہارا بیٹا زندہ سلامت تم تک پہنچ جائے گا۔ اگر تیار ہو تو جگہ کا تعین کر کے کل مطلع کر دیا جائے گا لیکن ایک شرط یہ رکھی ہے کہ پولیس سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ بابا تو کہہ رہے ہیں کہ وہ عورت جو تاوان مانگ رہی ہے۔ بغیر پس و پیش کیے اسے دے کر جان چھڑاؤ۔ کیوں کہ شمشاد کی زندگی کا سوال ہے۔ انہوں نے مجھے آپ سے بات

کرنے کے لیے بھی منع کیا تھا لیکن میں نے آپ سے چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔'' ڈاکٹر داراب کے لہجے میں خوف اور ڈر کا عنصر غالب تھا۔

فراز اب پوری طرح جاگ گیا تھا۔ نیند کا خمار مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر داراب کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب آپ مجھے صرف دو دن کی مہلت اور دیں۔ پولیس اپنی کارروائی کر رہی ہے۔ ہم لوگ غافل نہیں ہیں۔ آپ کے لیے ڈیڑھ کروڑ دینا کوئی مشکل نہیں ہے لیکن اس طرح مجرموں کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے اور پھر......''

ڈاکٹر داراب نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن جناب میرا بیٹا شمشاد......''

فراز نے ایک گہری سانس لی اور مطمئن لہجے میں بولا۔ ''کچھ نہیں ہوگا آپ کے بیٹے کو۔ انشاءاللہ بہت جلد بازیاب کروالیا جائے گا۔ اب آپ آرام کریں اور جیسے ہی دوسری کال آئے آپ مجھ سے رابطہ کریں۔''

''جی بہتر۔'' ڈاکٹر داراب نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ فراز شمشاد اغوا کیس کے بارے میں ہی سوچتے سوچتے دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆......☆

اغوا کنندگان کی دوسری کال بھی رات ہی میں آئی۔ ٹائم ضرور آگے پیچھے تھا لیکن کافی گہری رات ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر داراب نے فوراً فراز کو مطلع کیا۔ فراز کے چہرے پر غور و فکر کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا ذہن ایک نکتے پر آکر اٹک گیا تھا کہ کال ہمیشہ رات ہی میں کیوں آتی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈاکٹر داراب کا نمبر پنچ کیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب آج صبح آپ اور آپ کے والد میرے پاس تشریف لائیں۔ کچھ اہم گفتگو کرنی ہے۔'' ڈاکٹر داراب فوراً راضی ہو گیا۔ فراز نے موبائل آف کیا اور کرسی پر بیٹھ کر سوچوں میں گم ہو گیا۔

پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں انسپکٹر فراز، خان دلدار اور ڈاکٹر داراب دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔ خان دلدار نہایت جارحانہ انداز میں فراز سے کہہ رہا تھا۔ ''آفیسر بہت ہو چکا۔ اب ہم تمہاری کوئی بات نہیں مانیں گے۔ آخر حد ہوتی ہے ہمارا اکلوتا وارث، ہمارا بچہ، ہمارا شمشاد وہاں کس حال میں ہے جنہوں

نے اسے اغوا کیا ہے کیا وہ اس کی مہمان نوازی اور خاطر داری کر رہے ہوں گے۔ بھاڑ میں گئے ڈیڑھ کروڑ ہمیں اپنا بچہ چاہیے۔ اب ہم تمہاری ایک نہیں سنیں گے۔''

اس بات پر فراز نے بھی اپنی کرسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہایت درشت اور تیز لہجے میں کہا۔ ''بزرگوار پولیس اسٹیشن میں ایک پولیس آفیسر کے سامنے بیٹھ کر آپ مجرموں کی پشت پناہی کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ قانون کے یکدم خلاف ہے۔'' خان دلدار کو فوراً سانپ سونگھ گیا۔ اب اس کی بولتی بند تھی۔ فراز ڈاکٹر داراب سے باتیں کرتا رہا۔ جب دونوں باپ بیٹے واپس جانے کے لیے اٹھنے لگے تو فراز نے فوراً ڈاکٹر داراب سے کہا۔ ''آپ اپنا موبائل اور اپنے والد کا موبائل میرے پاس ہی چھوڑ جائیں۔ انشاء اللہ کام ہونے کے فوراً بعد بحفاظت آپ کو مل جائیں گے اور آج کی یہ ہماری میٹنگ صیغۂ راز میں رہنی چاہیے۔ اس بات کا علم بھی کسی کو نہ ہونے پائے کہ آپ دونوں کے سیل فون میرے پاس ہیں۔ آپ دونوں کسی اور سم سے اپنا کام چلائیں۔ امکان ہے کل صبح تک آپ کے موبائل آپ کو واپس مل جائیں گے۔''

دونوں باپ بیٹے نے بلاچوں وچرا فراز کی بات مان لی اور اپنی اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے سیل فون فراز کی میز پر تھے۔

فراز اپنے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ نیند کو بھگانے کی خاطر اس وقت وہ مطالعے میں غرق تھا۔ پھر بھی نیند ستاتی تو وہ دو گھونٹ پانی پی کر سنبھل کر بیٹھ جاتا۔ خان دارا اور داراب کے سیل فون اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ نظریں بار بار وال کلاک پر جاتیں اور لوٹ آتیں۔ رات ڈھائی بجے کا عمل ہو گا جب ڈاکٹر داراب کا موبائل بول اٹھا۔ فراز نے نہایت پھرتی کے ساتھ موبائل اٹھا کر کال ریسیو کی اور بھرائی ہوئی آواز میں ہیلو کہتے ہوئے کھانسنے لگا۔ جواب میں کسی عورت کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''آپ نے ہماری ڈیمانڈ منظور کر لی یا نہیں۔ جلدی سے بتایئے ہماری مانگ پوری کر رہے ہیں نا یا......'' فراز کو خفیف سا کھانسی کا دورہ اٹھا اور اس نے جلدی سے کہا۔ ''جی جی کر رہے ہیں۔''

اس بار عورت کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔ ''تو پھر ٹھیک ہے کل آپ کو مقررہ جگہ کا نقشہ اور پتا سمجھا دیا جائے گا۔ بس آپ تیار ہیں۔ رائٹ کل جگہ کا تعین کر کے سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ بالکل ریڈی رہنا۔'' فراز نے جواب میں ہوں۔ ہوں کی گردان جاری رکھی۔

چند لمحے توقف کے بعد عورت نے ذرا سخت اور شاکی لہجے میں کہا۔ میرے منع کرنے کے باوجود آپ کل پولیس اسٹیشن گئے جب کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پولیس کے کانوں میں بھنک نہ پڑے۔ سختی سے ممانعت کی تھی کہ پولیس سے رابطہ نہیں رکھنا۔ لیکن کل آپ وہاں گئے۔ پولیس سے ساز باز جاری ہے آپ لوگوں کی۔ اب آیندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ کہہ دیا آگے ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ فراز نے دبی دبی آواز میں سوری کہا اور پھر کھانسنے لگا۔

عورت موبائل آف کر چکی تھی۔ فراز نے ایک دبی ہوئی سانس خارج کی اور سوچوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ یہ تو اسے اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ مجرم اپنی جگہ پوری طرح چوکنا ہے۔ اسے پل پل کی رپورٹ مل رہی ہے۔ جہاں سے کال کی گئی تھی وہ علاقہ بھی گرفت میں نہ آسکا تھا۔ کیوں کہ کال ایک کسی کے چھینے ہوئے موبائل سے کی گئی تھی۔

فراز صبح تک جاگتا رہا۔ اس کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ فریش ہونے کے بعد وہ لان میں چلا گیا۔ صبح کی ٹھنڈی اور پُرکیف ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ ملازم چائے لے آیا تھا۔ لان چیئر پر بیٹھ کر وہ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ چائے پیتے ہوئے بھی وہ خیالوں میں غرق تھا۔ اچانک اسے ایک جھٹکا سا لگا اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ''اوہ اس نہج پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' چائے کا کپ رکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ حالانکہ کپ میں ابھی چائے باقی تھی لیکن وہ سب چھوڑ چھاڑ کر تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں داخل ہوا اور فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ اندرونی جوش و جذبے سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے منزل خود چل کر اس کے قریب آگئی ہے۔

اپنے وقت پر تیار ہو کر وہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو اکرام اللہ بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ فراز نے جاتے ہی استفسار کیا۔ ''اکرام تم تیار ہونا۔ آج ہمیں مجرموں کو گھیرنے کے لیے پولیس نفری کی بھی ضرورت پڑے گی۔''

اکرام اللہ فوراً بولا۔ ''سر ابھی اس وقت!''

فراز نے جواباً کہا۔ ''نہیں ابھی نہیں۔ ابھی فی الوقت تو میں اور تم خان ہاؤس چل رہے ہیں بعد میں جیسی صورت حال پیش آئے گی اسی کے مطابق ہم اپنا پروگرام ترتیب

دیں گے۔''

اکرام اللہ نے اثبات میں گرد ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی سر جیسا آپ کا حکم۔'' تھوڑی دیر بعد دونوں وہاں سے نکل گئے۔ خان ہاؤس میں بھی کچھ لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور کچھ جاگ چکے تھے۔ بہر حال گھر میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ فراز اور اکرام اللہ کے پہنچتے ہی خان دلدار اور ڈاکٹر داراب ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ بعد سلام کلام کا آغاز ہوا۔ فراز نے بغیر کسی تمہید کے پہلا سوال کیا۔ ''ڈاکٹر داراب میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہر بات کو پوشیدہ رکھا جائے۔ اس کے باوجود آپ نے ہم لوگوں کی خفیہ میٹنگ کے بارے میں دوسروں کو بھی بتا دیا۔''

داراب نے گھبرا کر روہانسی آواز میں کہا۔ ''نہیں انسپکٹر صاحب یہ بات بالکل غلط ہے۔ آپ یقین کیجیے۔ یہ بات صرف ہم تینوں کے درمیان ہے۔ کسی اور کو تو اس کی خبر ہی نہیں۔''

فراز نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ''نہیں جناب کسی چوتھے کو بھی اس کی خبر ہے۔ کوئی تو مخبر ہے جو اس عورت کو یہاں کی رتی رتی کی خبر دے رہا ہے۔ کل آپ کا ڈرائیور کون تھا جو آپ دونوں کو میرے پاس لایا تھا۔''

ڈاکٹر داراب نے فوراً کہا۔ ''شیرا لے کر گیا تھا ہمیں۔''

فراز نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''بلائیے اسے۔''

شیرا گاڑی کی صفائی کر رہا تھا۔ مالک کے حکم پر فوراً دوڑا چلا آیا فراز کو نہایت گرم جوشی سے سلام کر کے خان دلدار کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔

فراز تن کر شیرا کے سامنے جا کھڑا ہوا اور خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دہاڑا۔ ''بتا کہاں چھپا رکھا ہے لڑکے کو۔''

شیرا کے پسینے چھوٹ گئے وہ لرزہ براندام تھا۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کپکپا رہی تھیں۔ بمشکل اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''صاب جی آپ کو کوئی نہیں ملا تو خانہ پری کے لیے میری ہی گردن ناپ رہے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔'' مجھے کیا معلوم چھوٹے صاب جی کو کس نے اغوا کیا۔ چھوٹے صاب دنیا کے کس کونے میں ہیں ہمیں کیا معلوم انہیں کس نے اغوا کیا ہے ہمیں کیا خبر۔''

فراز نے اس کی گردن دبوچی۔ شیرا اس کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

خان دلدار، ڈاکٹر داراب اور اکرام اللہ فرط استعجاب سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ تینوں کی زبانیں بند تھیں اور وہ مجسم حیرت بنے کبھی فراز کو اور کبھی شیرا کو تک رہے تھے۔ جب کہ شیرا ہذیانی انداز میں ابھی بھی بولے جا رہا تھا۔ خان دلدار نے تحیر زدہ آواز میں فراز سے کہا۔ ''انسپکٹر فون پر جو آواز ہم سنتے تھے وہ آواز نسوانی تھی۔ شمشاد کی کڈنیپر یقیناً کوئی عورت ہے۔

خان دلدار کی بات سن کر فراز کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسم نمودار ہوا اور اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ وہ آواز ابھی سنواتا ہوں آپ کو۔ فراز نے پوری قوت سے بھرپور طمانچہ شیرا کے گال پر رسید کیا۔ شیرا کی آنکھوں کے آگے رنگ برنگی ستارے ناچنے لگے۔ وہ زمین بوس ہو چکا تھا۔ فراز نے گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا اور طیش آمیز تلخی کے ساتھ غرا کر کہا۔ ''کہاں چھپا رکھا ہے شمشاد کو جلدی بتا اگر ذرا سا بھی جھوٹ بولا تیرا حشر کر دوں گا۔''

ٹھیک ٹھاک جسمانی ٹوٹ پھوٹ کے بعد وہ فوراً ہی زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اس ٹھکانے کی بھی نشاندہی کر دی جہاں شمشاد مقید تھا۔ خان دلدار نے دوبارہ اپنا سوال دوہرایا۔ ''آخر وہ عورت کون تھی جو مجھ سے اور میرے بیٹے سے بات کرتی تھی۔''

فراز نے جواباً کہا۔ ''آپ سے میں کہہ رہا ہوں نا کہ وہ سریلی آواز ابھی سنواتا ہوں۔'' پھر وہ شیرا سے مخاطب ہوا اور کہا۔ ''ہاں بس اب جلدی سے شروع ہو جا۔ تیری اس صلاحیت کا انہیں بھی تو پتا چلے۔ بس اب جلدی کر ورنہ مار مار کر بھرکس بنا دوں گا۔''

شیرا زار و قطار رو رہا تھا۔ فراز کی دھمکی پر وہ مزید خوف زدہ ہو گیا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''انسپکٹر صاحب آپ نے میرا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔''

خان دلدار، ڈاکٹر داراب اور اکرام اللہ ایسے اچھلے جیسے انہیں برقی جھٹکا لگا ہے۔ کیوں کہ شیرا کی آواز اب مردانہ نہیں بلکہ مکمل طور پر زنانہ تھی۔ خان دلدار نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بمشکل کہا۔ ''بالکل بالکل یہی آواز یہی لب ولہجہ سب کچھ یہی۔''

پھر فراز کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے متنفر ہوئے۔ ''آفیسر تم نے کس طرح جانا کہ شیرا مجرم ہے اور عورت کی آواز بنا کر یہی ہم سے بات کر رہا ہے۔ ہم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔''

ڈاکٹر داراب نے بھی باپ کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ درست کہہ رہے ہیں بابا۔ یہ عرصہ دراز سے ہمارے پاس کام کر رہا ہے اور اس کی ایمانداری کے تو ہم لوگ قصیدے پڑھتے تھے۔ اس نے کبھی ہماری کسی چیز پر بری نظر نہیں ڈالی۔ پھر شک شبہ ہوتا تو کیسے۔“ اور پھر فراز نے فوراً خان داراب کا جملہ اچک لیا اور کہا۔

”خان صاحب آپ کے اور آپ کے خاندان پر اپنا اچھا امیج قائم کرنے کے لیے اس نے ساری ناٹک بازی کی۔ ایسا تاثر دیا کہ اس سے اچھا ملازم آپ کو ملے گا ہی نہیں۔“

ان لوگوں کی گفتگو سن کر شیرا کے آنسو اور تیزی سے بہنے شروع ہو گئے۔ وہ سر جھکائے نادم شرمسار کھڑا تھا۔

”اکرام اللہ ہتھکڑی لگاؤ اسے۔“ فراز نے اونچی آواز میں کہا۔

فراز، شیرا سے سب اگلوا چکا تھا۔ شیرا نے ایک ہی جھٹکے میں بتا دیا تھا کہ اغوا کنندگان میں اس کے چچازاد بھائی بھی شامل ہیں۔ منصوبے کا ماسٹر مائنڈ شیرا تھا اور سارا کام اس کی ہدایت پر ہوا تھا۔

شیرا کو پولیس وین میں بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر داراب نے استفہامیہ نظروں سے فراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انسپکٹر فراز ایک بات بتائیے آپ کو اس پر کس طرح شک ہوا کہ یہی شمشاد کا کڈنیپر ہے؟“

فراز نے صوفے سے ٹیک لگا کر دبی ہوئی سانس خارج کی اور اپنے مخصوص لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”اپنے اندازِ گفتگو کی وجہ سے یہ گرفت میں آیا۔ ورنہ شاید ہم ابھی تک ٹاکم ٹوئیاں مار رہے ہوتے۔ دراصل اس کا اندازِ بیاں اور لوگوں سے مختلف اور منفرد ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب آپ نے شیرا کو حکم دیا کہ وہ مجھے پولیس اسٹیشن کی عمارت تک چھوڑ آئے۔ راستے میں ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ اسی دوران اس کی باتیں سماعت کو کچھ عجیب سی لگیں۔ مثلاً وہ جو بھی کہتا اسے دہراتا ضرور۔ جب بات شروع کرتا تو لہجہ مدھم اور ہلکا ہوتا اور جب ان جملوں کو ریپیٹ کرتا تو آواز قدرے تیز ہو جاتی۔ ہاں البتہ الفاظ میں ردوبدل ہو جاتی لیکن معانی و مطالب وہی ہوتا جو کہ یہ پہلے بول چکا ہوتا۔ اندازِ بیاں کی اس خوبی یا خامی کی وجہ سے ہی یہ گرفتار ہوا ہے۔ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت بھی نہیں تھا لیکن میرا ایک ہی تکا تھا کہ اس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ جب اس کی کال آپ کے موبائل پر مجھے موصول ہوئی تو یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک پولیس والے سے مخاطب ہے۔ میں چونکہ اس سے ایک دن پہلے ہی مل چکا تھا۔ کافی دیر تک ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے اور اس کا مخصوص طرزِ گفتگو میری سماعت میں محفوظ تھا۔ جیسے ہی اس نے مجھ سے کلام کیا میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا کہ یہ آواز یہ لب ولہجہ میں نے کب اور کہاں سنا ہے۔ چونکہ واقعہ تازہ تھا اس لیے زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ مجھے فوراً یاد آگیا کہ یہ اندازِ گفتگو شیرا کا ہے لیکن آواز نسوانی تھی اس لیے میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ بہت غور و فکر کے بعد ایکا ایکی مجھے اس کی کہی ہوئی ایک بات یاد آگئی کہ یہ نقالی اور طرح طرح کی آوازیں بنانے میں ماہر ہے۔ نوٹنکی میں کام بھی کر چکا ہے۔ آج صبح ہی یہ بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے فوراً پروگرام ترتیب دیا۔ میں نے اکرام اللہ کو فون کیا اور ہم دونوں ادھر چلے آئے۔ میں نے جو سوچا تھا وہ غلط بھی نہیں تھا۔ یہاں آتے ہی اس کی تصدیق ہو گئی۔ چند گھنٹے بعد پولیس نفری کو ساتھ لے کر فراز نے شمشاد کو بھی بازیاب کروالیا۔ شیرا، اس کے بھائی اور سنگی ساتھیوں نے شمشاد کو ایک دور افتادہ فارم ہاؤس کی عمارت میں رکھ چھوڑا تھا۔ عمارت کے آس پاس کھیتوں کے سلسلے تھے۔ جب پولیس شمشاد تک پہنچی تو وہ ملگجے اندھیرے میں سکڑا سہما بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے پر موت کی زردی تھی۔ وہ بری طرح خوف و ہراس کا شکار تھا۔ خان دلدار کے پوتے سے ملنے کے بعد مسرت آمیز لہجے میں فراز سے کہا۔ ”انسپکٹر آپ کی غیر معمولی سوجھ بوجھ کی وجہ سے آج ہمارا بچہ ہمارے سامنے ہے۔ ورنہ ان سے کیا بعید تھی۔ یہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔“

فراز نے مسکرا کر کہا۔ نہیں جناب یہ اسے کوئی گزند نہ پہنچاتے کیوں کہ ان کا مقصد صرف آپ سے پیسا حاصل کرنا تھا۔ آپ انہیں پیسے دیتے اور یہ شمشاد کو آپ کے حوالے کر دیتے اور جہاں تک میرا خیال ہے شیرا کو کسی خاص ضرورت کے تحت پیسے چاہیے تھے۔ ورنہ آپ کہہ رہے ہیں کہ اس نے کبھی آپ کی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر داراب فوراً بول اٹھا۔ ”انسپکٹر صاحب مجھے تو ابھی بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ سب کیا دھرا شیرا کا ہے۔“
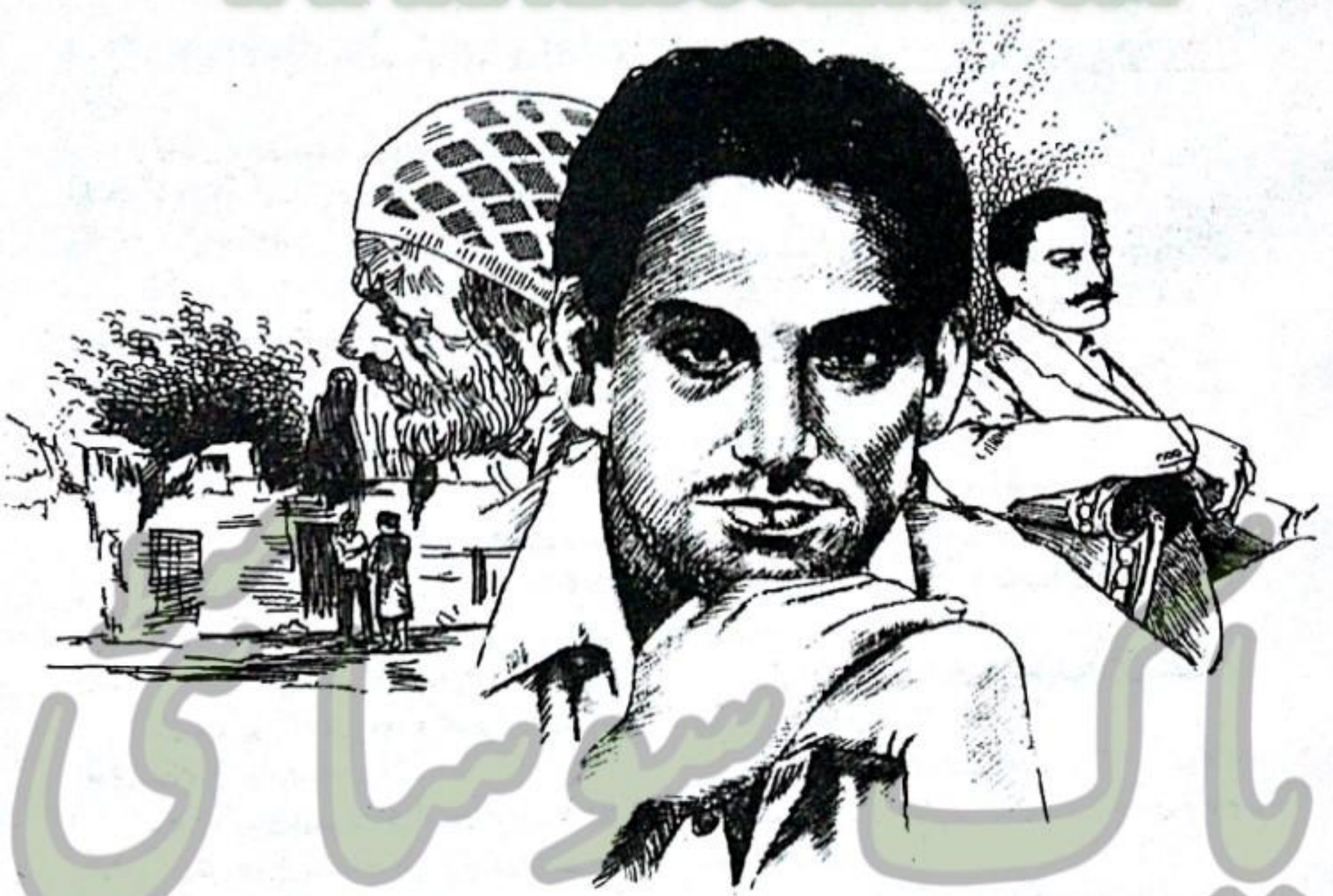
آدھا سچ

جناب معراج رسول
السلام علیکم
ایک پرانی کہانی جو ہمارے آپ کے اس دنیا میں آنے سے کئی سو سال قبل لکھی گئی ہے اس کو سامنے رکھ کر میں اپنے حالات لکھ رہا ہوں۔ اگر پسند آئے تو ضرور شائع کریں۔

محمد احسان
(لاہور)

میں نے ایک بار الف لیلہ کی ایک کہانی کو آج کے تناظر میں لکھنے کی کوشش کی تھی۔
مجھے خوشی ہے کہ لوگوں نے اس کہانی کو پسند کیا تھا۔
اب پیش ہے الف لیلہ کی دوسری کہانی۔ یہ کہانی بذاتِ خود اتنی دلچسپ ہے کہ اس میں کسی قسم کی ترمیم یا اضافے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔
لیکن میں نے اپنے طور پر اس کہانی کو ماڈرن انداز میں عملی طور پر لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے پہلے آپ

ذرا اصل کہانی کو پڑھ لیں۔ پیش ہے الف لیلہ کی دوسری کہانی۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ بغداد کے ایک نوجوان تاجر کو ایک دوشیزہ پسند آگئی۔ اس نے ایک بڑھیا کے توسط سے اپنا پیغام اس دوشیزہ کو بھیجا۔

دوشیزہ نے پیغام قبول کرتے ہوئے اس نوجوان کو جمعہ کی نماز کے بعد ملاقات کی دعوت دے دی۔ اب یہ نوجوان حجامت بنوانے کے لیے کسی حجام کی تلاش میں ہے۔ اس کا ملازم ایک حجام کو لے کر آگیا۔ یہ دیکھیں کہ وہ نوجوان کیا سناتا ہے۔

حجام نے آتے ہی مجھے سلام کیا۔ دعائیں دے کر پوچھا۔ ''آپ بال کٹوانا چاہتے ہیں یا خط بنوانے کا ارادہ ہے۔'' پھر بولا۔ ''جمعہ کے دن بال کٹوانا ستر بیماریوں کو دور کرتا ہے اور خط بنوانا بیماریوں کو دعوت دیتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم اس وعظ و نصیحت کو رہنے دو اور جلدی سے میری حجامت بنادو۔''

یہ حجام نافرمان بات سنتے ہی آلات نجم...... نکال کر عین صحن میں سورج کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ چند منٹ سوچ کر بولا۔ ''ستارہ مریخ اس وقت سات درجے اور چھ دقیقے پر ہے۔ یہ ساعت حجامت کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ستارے اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کسی نیک آدمی کے پاس جارہے ہیں مگر اس سے ملنے کے بعد مصیبت و تکلیف کا سامنا کرنا ہوگا۔''

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''بکواس نہ کرو۔ جس کام کے لیے بلائے گئے ہو وہ کرو۔''

بدبخت بولا۔ ''آپ کو کون سا کام درپیش ہے۔ تفصیل سے بیان کریں۔ صحیح اور اچھا مشورہ دوں گا۔''

میں نے اسے بکواس سے روکا تو بولا۔ ''صاحب آپ مجھے بکواس کہتے ہیں۔ بکواس اور بے ہودہ تو میرے بھائی ہیں ان کی وجہ سے لوگوں نے میرا نام ہی ساعت رکھ دیا ہے۔''

پھر یہ بدبخت اپنے بھائیوں کے نام سنانے لگا۔ عجیب و غریب نام تھے۔ بقبوتی، بک بک، اکلوذ، اروناجانے کیا کیا۔

میں اس سے تنگ آگیا۔ میں نے غلام سے کہا۔ ''اسے دینار دے کر رخصت کرو۔ یہ میرا وقت ضائع کررہا ہے۔''

وہ بولا۔ ''حضرت خدمت کیے بغیر تو میں نہیں جاؤں گا۔ آپ نے مجھے پہچانا، میری قدر کی، میں کچھ نہیں مانگتا۔ مفت خدمت کروں گا۔ آپ کے والد محترم کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔''

میں اس کی مزید بکواس سے تنگ آکر مشتعل ہوا تو بولا۔ ''آپ ناراض نہ ہوں۔ آپ کے والد تو میرے مشورے کے بغیر کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے یاد رکھیں اس وقت تمام دنیا میں مجھ سے بڑھ کر آپ کسی کو اپنا ہمدرد اور مخلص نہ پائیں گے۔''

میں اس کی بکواس سے تنگ آکر بولا۔ ''دیکھ تجھے حجامت بنانی ہے تو بنا ورنہ چلا جا۔''

بالآخر اس نامراد نے استرا نکالا اور پتھر پر تیز کرنے لگا۔ ایک گھنٹا بکواس میں ضائع کر کے حجامت بنانے لگا۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اب اس سے نجات ملنے والی ہے۔

ابھی آدھی حجامت کر ہی پایا تھا کہ بدقسمتی سے میں نے کہہ دیا۔ ''جلدی کرو۔''

یہ الفاظ سنتے ہی اس نے ہاتھ روک دیا اور کہنے لگا۔ ''صاحب آپ نے بزرگوں کا قول نہیں سنا کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔''

بس اسے موقع مل گیا۔ پون گھنٹے وہ اس موضوع پر حجامت کا کام روک کر بکواس کرتا رہا۔ جب میں نے اسے پھر غصے سے ڈانٹا تو وہ ایک بار پھر آلاتِ نجوم لے کر ستاروں کی چال دیکھنے صحن میں چلا گیا۔

اس اقتباس سے آپ نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس حجام نے اس نوجوان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ حجامت تو ایک طرف اس کی محبوبہ بھی اس کے ہاتھ سے چلی گئی۔

اب اس اقتباس کے بعد موجودہ دور کی الف لیلہ کی طرف آجائیں۔

یہ کہانی میری ہے۔

میں ایک ناکام انسان ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ نوکری کی تلاش میں گھوم گھوم کر تھک چکا تھا۔ اوپر سے کرائے کا مکان اور اس کے ساتھ قرض خواہ۔

زندگی عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔

میرے دکھ کیا کم تھے کہ مجھے ایک دن مکرم صاحب مل گئے۔

میں نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ایک زمانے میں وہ میرے استاد ہوا کرتے تھے۔ کیا شاندار انسان تھے۔

ایسے علم دوست تو بہت کم ہوا کرتے ہیں۔

ان میں بہت تبدیلی آچکی تھی۔ جیسے وقت نے انہیں

نچوڑ کر رکھ دیا ہو۔ خستہ حال، بوسیدہ لباس ان کو دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔

میں نے ان کے پاس جا کر انہیں سلام کیا۔ پھر جب اپنا تعارف کروایا، پرانے حوالے دیے تو انہوں نے فوراً پہچان لیا۔ گلے لگا کر بہت دیر تک دعائیں دیتے رہے۔

''سر! آپ کیسے ہو گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔''یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''ٹھیک تو ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں سر! آپ ٹھیک نہیں ہیں۔'' میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔''آئیں میرے ساتھ۔''

''کہاں...... کہاں لے جاؤ گے؟''

''سامنے ہوٹل ہے سر۔'' میں نے کہا۔''آ جائیں۔''

وہ بہت جھجکتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑے۔ میں انہیں اپنے ساتھ سامنے والے ہوٹل میں لے آیا۔

''تشریف رکھیں سر۔''

''بیٹے افسوس ہے کہ میں اس وقت بہت ٹوٹا ہوا ہوں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولے۔

''میں نہیں سمجھا سر۔''

''مطلب یہ کہ تم میرے شاگرد رہ چکے ہو۔ میرے بیٹے کی طرح ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ میں تمہیں ہوٹل میں لے کر آتا لیکن تم لے آئے ہو۔''

''سر پلیز ایسی باتیں نہ کریں۔ شرمندہ نہ کریں مجھے۔ میں کس قابل ہوں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔''

وہ خاموش رہے۔

میں نے صرف چائے کا سوچا تھا لیکن ان کی کیفیت دیکھ کر ان کے لیے تو کھانا بھی منگوا دیا۔ پھر چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنے بارے میں بتایا۔

''یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ حالانکہ میری پینشن بہت کم تھی۔ صرف سات ہزار ملتے تھے لیکن ان سات ہزار میں آرام سے گزر ہو جاتی تھی۔ حالانکہ وہ زمانہ فوجی آمر کا تھا۔ یعنی جمہوریت پسند جس کو آمر کہتے ہیں لیکن مہنگائی کا یہ حال نہیں تھا۔ جو آج ہے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اس ملک میں جمہوریت کی لہر آ گئی۔ یہاں میں ہمیشہ ایک نظریاتی انسان رہا ہوں۔ میرے نزدیک انسان کا مستقبل صرف جمہوری نظام ہی ہے۔ اس لیے میں نے جمہوریت کی خاطر خود بھی ووٹ دیا اور اپنے خاندان والوں کو بھی ووٹ ڈالنے پر رضامند کر لیا۔''

''یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا سر۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بہت اچھا۔'' ان کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔''پھر بیٹے یہ ہوا کہ جمہوریت آ گئی اور اس کے ساتھ ہی مہنگائی نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سات ہزار سات سو کے برابر ہو گئے۔ ایک زمانہ تھا کہ میں جب اپنی گلی میں بہتا ہوا گٹر دیکھتا تو شکایت لے کر پہنچ جاتا اور راتوں رات صفائی ہو جاتی۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دنوں کے بعد جب جمہوریت اپنے پاؤں مضبوطی سے جما لے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن پتا یہ چلا کہ ہم تو اور خرابی کی طرف جا رہے ہیں۔''

میں خاموشی سے ان کی بچی باتیں سن رہا تھا۔

انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔''میاں تم نے جمہوریت کی تعریف تو سنی ہو گی۔ عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے عوام کے لیے۔''

''بس جناب یہ تو بہت پرانی تعریف ہے۔''

''لیکن بیٹے میری بات یاد رکھو۔ آج کی تعریف یہ ہے عوام کا ڈنڈا، عوام کے ہاتھوں عوام کی کمر پر۔''

''واہ یہ تو آپ نے بہت مناسب تعریف فرما دی سر۔''

''ہاں بیٹے۔ یہی تعریف ہے اور یہی سچ ہے۔''

''سر آپ کے بیٹے میرا مطلب ہے کوئی بیٹا تو ہو گا۔''

''نہیں میری صرف دو بیٹیاں ہیں۔'' انہوں نے بتایا۔

''اگر میرا بیٹا بھی ہوتا تو کیا ہوتا۔ کیا اس کو جاب مل جاتی۔''

''نہیں جمہوریت کا یہی تو پہلو ہے کہ یہاں جاب صرف اس کو ملتی ہے جو کسی وزیر مشیر کا رشتے دار ہو اور اس طرز میں کم از کم پندرہ سولہ سو کے قریب وزیر اور مشیر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے خاندان والوں اور دوستوں کی تعداد کا اندازہ لگا لو۔ پھر سوچو کہ ان کے بعد عام لوگوں کے لیے آسامیاں کہاں رہ جاتی ہیں۔''

میں ان کی باتیں سن کر پریشان ہونے لگا تھا۔''لیکن سر جمہوریت تو بہت سے ملکوں میں بہت کامیابی کے ساتھ رائج ہے۔''

''ہاں ان ملکوں میں جہاں کا معاشرہ کلچرڈ ہے۔ جہاں کے لوگ کلچرڈ ہیں۔ ہمارے یہاں کی جمہوریت کے لیے علامہ اقبال بہت پہلے کہہ گئے ہیں۔ جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں۔ بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔''

''سمجھ گئے میری بات! یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص اس کے لیے کتنے ووٹ لے کر آتا ہے۔ بس اس کی

بڑی پرائی ہوتی ہے۔ انسان کا درق نہیں دیکھا جاتا۔ اس کی گنتی دیکھی جاتی ہے۔"

"یہ المیہ تو ہے سر۔" میں نے کہا۔ "آپ حکم دیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"کچھ نہیں۔ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو۔" وہ تلخ ہو کر بولے۔ "میرا تو خیال ہے کہ خود تمہارے حالات ہی مناسب نہیں ہیں۔"

"یس سر! لیکن اب میں نے اپنے حالات درست کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"وہ کس طرح۔"

"میرا ایک دوست ایم این اے ہو گیا ہے سر۔" میں نے بتایا۔ "میں آج تک اس کے پاس نہیں گیا لیکن اب ضرور جاؤں گا۔ آپ بتائیں سر۔ فوری طور پر آپ کو کیا کیا پریشانی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم صرف اپنا وقت برباد کرو گے۔ کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

"ہو گا سر ضرور ہو گا۔" میں نے کہا۔ "آپ بتائیں تو سہی۔"

"دیکھو میاں پہلی بات تو یہ ہے کہ میری پینشن کی رقم میں اگر کچھ اضافہ ہو جائے تو بہتر ہو گا۔" انہوں نے کہا۔ "مہنگائی صرف میری خاطر تو کنٹرول نہیں کی جائے گی۔ تو کم از کم پینشن کی رقم ہی بڑھ جائے۔"

"چلیں میں یہ بات کر کے دیکھتا ہوں اور دوسرا حکم سر۔"

"بیٹے ہمارے علاقے میں ایک غنڈہ ہے بہت بااثر۔" انہوں نے بتایا۔ "وہ کم بخت میری بچیوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے اگر اس سے جان چھوٹ جائے تو بہت اچھا ہو۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے اور تیسرا حکم۔"

"تیسرا کام یہ ہے کہ میرے گھر کے سامنے سے گٹر لائن بہہ رہی ہے وہ اگر ٹھیک ہو جائے تو ہم سکون کا سانس لیں۔"

"یہ بھی کوئی کام ہے سر، یہ بھی ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں ایک کام اور ہے میں شوگر کا مریض ہوں۔ ایک خاص دوا استعمال کرتا تھا۔ اس سے بیماری کنٹرول میں رہتی تھی لیکن اب وہی کمپنی وہ دوا دو نمبر کی بنانے لگی ہے۔ اس کمپنی سے کہا جائے کہ خدا کے لیے مریضوں کو دوائی تو صحیح دو۔"

"یہ بھی ہو جائے گا سر، آپ مجھے کمپنی اور دوا کا نام لکھ کر دے دیں۔"

انہوں نے کمپنی اور دوا کا نام لکھ کر دے دیے۔ "ہاں ایک بات اور بھی ہے۔"

"وہ بھی فرما دیں سر۔"

"میرا مکان بوسیدہ ہو چکا ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔ نہ جانے کس وقت اس کی دیواریں گر جائیں۔ اس کی چھت بیٹھ جائے۔ تو کوئی ایسا راستہ نکل آئے گا کہ حکومت میرے اس بوسیدہ مکان کی مرمت کروا دے۔"

"یہ بھی کوئی اتنی خاص بات نہیں ہے سر۔" میں نے کہا۔ "وہ ایم این اے چاہے گا تو یہ سب ہو جائے گا۔"

"ہاں تم سے مل کر بہت ڈھارس بندھی ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔"

"چلیں میں آپ کو آپ کے گھر تک پہنچا آؤں۔"

☆......☆

آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ابھی تک اس کہانی میں الف لیلہ والی بات کہاں آئی ہے۔

تو الف لیلہ وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ جب میں اپنے ایم این اے دوست سے ملنے گیا ہوں لیکن اس سے پہلے پس منظر بتانا ضروری تھا۔ ورنہ کہانی آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اب آپ اس ایم این اے کو حجام سمجھ لیں اور مجھے وہ نوجوان جس کو اپنی حجامت بنوانی تھی۔

میں جس وقت وہاں پہنچا اس وقت اس کے پاس کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ موصوف نے بڑی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا تھا۔ "آؤ بھائی آؤ۔ خیر سے تو ہو۔"

"جی جناب بالکل خیریت سے ہوں۔" میں نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ "میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ بھی سن لیتے ہیں۔ پہلے ان لوگوں سے بات کر لوں۔ ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ ارسطو نے جب خلیفہ ہارون رشید سے ملاقات کی۔"

اس وقت میں بول پڑا۔ "جناب ہارون رشید کے زمانے میں ارسطو کہاں تھا۔ وہ تو بہت پہلے گزر چکا تھا۔"

موصوف نے بہت ناگواری سے میری طرف دیکھا۔ پھر ان لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ "کیوں بھائیو، خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں ارسطو تھا یا نہیں تھا۔"

''سر جی جب آپ کہہ رہے ہیں کہ ارسطو ہارون رشید کے زمانے میں تھا تو ضرور ہوگا۔''

''تم لوگ بھی اس بات کو مانتے ہو یا نہیں۔''

''بالکل جناب بالکل مانتے ہیں۔''

''دیکھا۔'' اس نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔''سب ہی یہ کہہ رہے ہیں اور تم بالکل الگ کہانی سنا رہے ہو۔''

''جناب جو میں کہہ رہا ہوں وہی درست ہے۔'' میں اپنی بات پر قائم رہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب اس کمرے کے چھ آدمی ایک طرف ہیں تو تمہاری بات کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ افسوس تو یہی ہے کہ تم لوگوں نے ابھی جمہوریت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔''

''اب سمجھ میں آگئی ہے جناب، آپ جو کہہ رہے ہیں وہی درست ہے۔''

''خیر یہ بتاؤ کس کام سے آئے ہو۔'' اس کے لہجے میں ابھی تک ناگواری تھی۔

''جناب یہ معاملہ ایک استاد کا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''بہت مشہور استاد ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں ان کے۔''

''اوہ۔'' وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔''اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کو کہہ دیں وہ اس کو ووٹ دے گا۔''

''نہیں جناب، ایسا نہیں ہے۔ وہ بے چارے تو ایک عرصہ ہوا ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اب کہاں ان کے شاگرد۔''

''اوہ۔'' موصوف نے بہت برا سا منہ بنالیا۔''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کام کے آدمی نہیں ہیں۔ خیر کہو ان کے ساتھ کیا پرابلم ہوگئی؟''

''جناب! وہ استاد ایک غریب آدمی ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی پینشن کی رقم میں اضافہ کیا جائے۔''

''بہت خوب! جمہوریت کا تو فائدہ ہی یہی ہے کہ ہر کام آئین کی حد میں رہ کر کیا جائے۔ مثال کے طور پر آئین کی دفعہ نمبر 18 ب کے تحت استاد کا معاملہ خواتین استانیوں سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ جب کہ خواتین استانیوں کا معاملہ شق نمبر ب ج کے تحت یہی دفعہ نمبر اٹھارہ میں آتا ہے اور اس کے ساتھ ہی جب اس پر دفعہ نمبر چونسٹھ کا اطلاق ہوتا ہے تو پھر انیسویں شق کا مطلب ذیلی دفعہ م اور ن کام آتی ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سب اس کی تعریف میں واہ وا کرنے لگے تھے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔''جناب! یہی تو کمال ہے جمہوریت کا کہ کوئی بات آئین سے ہٹ کر نہیں ہوتی۔''

''ہمیں ہر حال میں جمہوریت کو بچانا ہوگا۔'' اس نے کہا۔''اگر استاد ساٹھ برس سے زیادہ کا ہے تو دفعہ نمبر 72 ب کا اطلاق ہوگا اور شق نمبر 56 ج کی روشنی میں اس کا کیس دیکھا جائے گا۔''

''جناب اب جس روشنی میں چاہیں دیکھیں لیکن ان کی مدد فرمائیں۔'' میں نے کہا۔

''یہی تو حسن ہے جمہوریت کا، اس میں کسی کام میں جلدی نہیں کی جاتی۔ بلکہ آئین کو سامنے رکھ کر فیصلے کیے جاتے ہیں۔'' اس نے کہا۔''جیسے دفعہ نمبر سولہ ک اور گ میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص پینشن کی کمی کا رونا روتا ہے تو آئین کی شق نمبر اٹھہتر اور اسی کے ذیلی دفعات ل اور س کے تحت اس کا کیس سن کر دفعہ نمبر 45 اور 47 لاگو کر دیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے دفعہ نمبر چھ اور سات کو بھی دیکھنا ہوگا جس کی ذیلی دفعات ط اور ظ ہیں۔''

''واہ وا جناب! واہ وا۔'' لوگوں نے پھر تعریف شروع کردی۔

''جناب یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ان کے مسئلے کا کیا ہوگا۔''

''بھائی جمہوریت میں مسئلہ یہ نہیں آئین پر غور کیا جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔''اب تمہارے استاد کے معاملے کا تعلق دفعہ نمبر 29 اور 30 سے ہے۔ جس پر ذیلی دفعات ش اور ق کا اطلاق ہوتا ہے۔ جب کہ دفعہ نمبر سترہ ج کا بھی اس وقت اطلاق رہتا ہے۔ جب ذیلی دفعات ک اور ی کوئی راستہ نہ دکھا سکیں۔'' ایک بار پھر واہ واہ ہونے لگی۔

میں نے کہا۔''جناب لعنت بھیجیں ان کے پینشن پر۔ ان کا دوسرا پرابلم یہ ہے کہ ان کی گلی کے گٹر ابلتے رہتے ہیں اور بے چارے کا مکان ہر وقت گندگی میں ڈوبا رہتا ہے۔''

''ہاں یہ معاملہ سمجھ میں آتا ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔''اس کے لیے تین دفعات آتی ہیں۔ اٹھارہ، انیس اور نوے ج۔ لیکن نوے ج اس وقت لاگو ہوتا ہے جب دفعہ نمبر چالیس اور اکتالیس کوئی راستہ نہ دکھا سکیں اور جب یہ دونوں دفعات کوئی حل بتانے میں ناکام ہو جائیں تو پھر اس دفعہ کی ذیلی شق غ سے کام لیا جاتا ہے۔''

ایک بار پھر سب واہ وا کرنے لگے۔ جمہوریت سر چڑھ کر بول رہی تھی۔

"جناب! یہ سب اپنی جگہ درست ہے لیکن ہونا کیا ہے۔ آپ کسی سے بھی کہہ دیں تو اس گلی کی صفائی ہو جائے گی۔"

"ہاں ایسا ہی ہوگا لیکن اس کے لیے ایک کمیٹی بنانی ہوگی۔ جو آئین کی دفعہ نمبر چھبیس اور ستائیس کے تحت ہوگی۔ پھر وہ کمیٹی تین آدمیوں کی ذیلی کمیٹی بنائے گی۔ ان میں سے ایک آدمی دفعہ نمبر اٹھارہ الف کے تحت مقرر ہوگا۔ دوسرا آدمی سترہ ل کے تحت چنا جائے گا جب کہ تیسرا آدمی پندرہ ب کے تحت ہوگا۔ اب یہ تینوں مل کر ستائیس ج کے تحت کچھ دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کریں گے اور وہ دوسرے لوگ دفعات نمبر......"

وہ بولتا رہا لوگ تعریف کرتے رہے اور میں سنتا رہا۔ لیکن اتنی ساری جمہوریت کے دوران میں میری سمجھ میں یہ نہیں آسکا کہ بے چارے ماسٹر صاحب کی گلی کے گٹر کا کیا بنے گا۔

"اب تو تمہاری سمجھ میں آ گیا نا کہ اس گلی میں بہنے والے گٹر کا کیا ہوگا۔" اس نے پوچھا۔

"جی جناب، سمجھ میں آ گیا۔" میں نے بے زار ہو کر جواب دیا۔

"یہی تو جمہوریت کا حسن ہے کہ یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔" اس نے کہا۔ "ورنہ آمریت کے دور میں تو دفعہ نمبر اکتیس، بیالیس اور پینتالیس سمجھ میں نہیں آتی تھی یا ہمارے حکمران سمجھانا نہیں چاہتے تھے۔"

اس نے ایک بار پھر آئین اور مختلف دفعات کی گردان شروع کردی۔ جو بہت دیر تک جاری رہی تھی۔ جب کہ میرا یہ حال تھا کہ میں سب پر لعنت بھیج کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن بری طرح گھرا ہوا بیٹھا تھا۔ بھاگنے کا راستہ بھی نہیں تھا میرے پاس۔

"بھائی کوئی اور مسئلہ ہو تو بتاؤ۔" اس نے پوچھا۔ "میں آئین کی روشنی میں اسے حل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"جناب ایک اور مسئلہ ہے۔"

"بتاؤ بتاؤ۔ جب آئے ہو تو سارے کام کراتے جاؤ۔ بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔"

"جناب بے چارے استاد صاحب کا مکان بہت خستہ ہو چکا ہے۔ کسی وقت بھی اس کی دیواریں گر سکتی ہیں اور کوئی بڑا حادثہ ہو سکتا ہے۔"

"اوہو یہ تو واقعی خطرناک بات ہے۔" اس نے تشویش ظاہر کی۔ "اس مسئلے میں ہمیں آئین کی شق نمبر......"

"جناب عالی!" میں نے جھلا کر اسے ٹوک دیا۔ "اس معاملے میں آئین کی دفعات وغیرہ سے کام نہ لیں۔ یہ ایک خطرناک صورتِ حال ہے۔ اس بے چارے کے مکان کو بچانے کی کوشش کریں۔"

"کیا کہنے ہیں اس لیے تو میں جمہوریت کا عاشق ہوں کہ اس میں ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ جیسے دیواروں کا گرنا ہے، تو آئین کی شق نمبر 75 ب اور 76 الف میں صاف صاف لکھا ہے کہ جب دیواریں گرنے لگیں تو پھر نوے س اور ایک نوے م کا اضافہ کردیا جائے۔"

"واہ سر جی وا۔" پھر کسی نے تعریف کی۔

اس نے پھر فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔

"اب دیکھنا یہی ہے کہ جب دفعہ نمبر بارہ س اور تیرہ د کا اطلاق ہوتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے اس سلسلے میں۔"

اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

وہ میرے ایک جاننے والے کا فون تھا۔ وہ اتفاق سے اسی گلی میں رہتا تھا۔ جس گلی میں ماسٹر صاحب کا مکان تھا۔ وہ مجھے اطلاع دے رہا تھا۔ "ارے احسان بھائی تمہارے جو ماسٹر صاحب ہیں نا ان کے ساتھ بہت برا ہوا بھائی۔"

"کیا ہوا جلدی بتاؤ۔"

"ان کے مکان کی دیواریں اور چھتیں گر پڑیں۔ پورا خاندان دب کر مر گیا۔"

"اوہ خدا! یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ہاں بھائی بہت برا ہوا۔"

میں نے موبائل آف کر کے ایم این اے صاحب کی طرف دیکھا۔ "جناب اب ماسٹر صاحب کے سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب نہ تو وہ رہے نہ ان کا خاندان رہا۔ ان کے گھر کی دیواریں اور چھتیں گر گئیں اور سب کے سب دب کر مر گئے۔"

"اوہو، یہ تو بہت برا ہوا۔ لیکن دوسری طرف یہ تو دیکھو کہ جمہوریت کی لاج رہ گئی۔ جب کہ آئین کی دفعہ نمبر سترہ اور چون ب کے تحت......"

وہ بولتے رہے اور میں اس مکان سے باہر آ گیا۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ جب دیواریں اور چھتیں ہی نہیں رہیں گی جب لوگ ہی نہیں رہیں گے تو پھر......

خدا کرے کہ آپ اس کہانی سے کچھ نہ سمجھے ہوں۔ اگر سمجھ ہی گئے ہوں تو خاموش رہیں۔ ورنہ آئین کی دفعہ نمبر اکتالیس ج کے تحت آپ کو سزا بھی ہو سکتی ہے۔

کینگرو

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
میرے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ ہوا ہے جسے مزید دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے اور اسے آپ کی خدمت میں پیش کردیا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ اسے بنائی ہوئی کہانی سمجھیں لیکن ایسا ہے نہیں، صاف کہہ دوں کہ 50 فیصد باتیں سو فیصد سچی ہیں۔

حمید
(حیدرآباد)

خدا کے لیے کوئی مجھے اس مشکل کا حل بتا دے۔ میری پریشانیاں ختم ہونے والی ہیں بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے اور اس ایک آنچ کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں بلکہ کچھ سے کچھ ہوکر رہ گیا ہوں۔

پہلے تو اپنی پریشانیاں بتا دوں۔ سب سے پہلی پریشانی تو بے روزگاری ہے۔ میں اچھا خاصہ پڑھا لکھا شخص ہوں لیکن نہ جانے میرے نصیب میں بے روزگاری کیوں لکھ دی گئی ہے۔

جاب ملتی ہے لیکن دو چار مہینوں کے بعد کسی نہ کسی بہانے ختم ہو جاتی ہے اور میں پہلے کی طرح بے روزگار رہ جاتا ہوں۔

فلیٹ چونکہ اپنا ہے۔ اس لیے در در کی ٹھوکریں نہیں کھانی پڑتیں۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھا رہتا ہوں اور میری دوسری پریشانی ہے میری محبت۔

یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں نے ایک ایسی لڑکی سے محبت کر لی جو آج کے دور میں بھی محبت کے قدیم رسم و رواج کی قائل ہے۔

جیسے موبائل پر بات نہ کرنا۔ راستے میں رک کر بات کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ یاد رکھو ہم دونوں ہوٹلنگ وغیرہ نہیں کیا کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کا ہدایات نامہ برائے محبت اس نے پہلی ہی ملاقات میں میرے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔ باقاعدہ تحریری ہدایت نامہ تھا۔

''خدا کی بندی تو پھر صاف صاف یہ کہہ دو کہ میں تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اگر تم نہیں ملے تو چوڑیاں پیس کر کھالوں گی۔''

''پتا نہیں۔ کیسی محبت ہے۔ میں نے آج تک تمہارا پورا چہرہ نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''صرف تمہاری آواز اور تمہاری نقاب پر گزارا کر رہا ہوں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ میری آنکھیں تو کھلی رہتی ہیں نا۔''

''ہاں یہی تو بات ہے۔ ان ہی آنکھوں نے تو اس حال کو پہنچا دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری آنکھوں میں جو ڈوبا ہوں تو اب تک باہر نہیں آسکا ہوں۔''

میں نے اس کی آنکھیں کتابوں کی ایک دکان میں دیکھی تھیں۔ میں وہاں کوئی کتاب خریدنے گیا تھا۔ ذائقہ بھی کچھ لینے گئی تھی۔ (آپ اس کے نام پر حیران نہ ہوں، اس لڑکی کا نام ذائقہ ہی ہے)۔

جب اس دور میں لڑکے اور لڑکیوں کے بے شمار بے ڈھنگے نام ہو سکتے ہیں تو ذائقہ میں کیا برائی ہے۔ خیر تو کتابوں کی ایک قطار کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور میں ان آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

''کیا بلا تھی نگاہ ہوش ربا ساقی کی۔ اٹھ گئی آنکھ تو کوسوں کوئی ہوشیار نہ تھا۔''

واقعی بہت خوب صورت آنکھیں تھیں۔ اپنے اندر سوچنے کی طاقت تھی ان آنکھوں میں۔ اس نے جیسے مجھ پر سحر طاری کر دیا تھا۔

وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتی رہی تھی اور یہ چند لمحے میرے لیے متاعِ حیات بن کر رہ گئے تھے۔ میں ان آنکھوں کے انتظار میں بک اسٹال سے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ بھی باہر آئی اور میں کسی سحر زدہ کے انداز میں اس کا تعاقب کرتا رہا۔ پتا چلا کہ اس کا گھر میرے فلیٹ کی بلڈنگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بلکہ ایک ہی محلّہ تھا۔

اپنے گیٹ پر پہنچ کر اس نے اس انداز سے مڑ کر میری طرف دیکھا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

پھر وہ مسکراتی ہوئی اپنے گیٹ میں داخل ہو گئی۔

آپ یقین کریں اگرچہ وہ مکمل پردے میں تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس کی مسکراہٹ محسوس کر لی تھی۔ کیوں کہ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

یہ بہت حوصلہ افزائی کی بات تھی۔

سب کچھ عام طور پر ہمیں یاد ہی ہوا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر بالکل پہلی بار کس خوب صورت آنکھوں نے مجھے بھرپور انداز سے دیکھا تھا۔ پہلی بار میں نے دلِ ناداں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کس کا تعاقب کیا تھا اور پہلی بار کس نے اپنی خفیہ مسکراہٹ سے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ میں اس کی مسکراہٹ کو خفیہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کا چہرہ تو چھپا ہوا تھا۔

مختصر یہ کہ اس سے ایک بار اور ڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے اسے نقاب کے باوجود اس لیے پہچان لیا کہ اس کی آنکھیں میرے وجود میں اتر سی گئی تھیں۔

تیسری بار بھی ملاقات ہوئی اور اس بار یہ ملاقات ذرا طویل رہی۔ گویا یہ سلسلہ اسی طرح بڑھتا چلا گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ ایک بار ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے اپنے چہرے سے نقاب بھی ہٹا دی تھی۔

واہ وا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس کی آنکھوں کو خوب صورت کہوں یا اس کے چہرے کو۔ وہ ہر لحاظ سے ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

''اس دن اس نے اپنا نام بھی بتایا تھا۔ ذائقہ خاتون۔''

''ذائقہ!'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف

دیکھا۔ ”یہ کیسا نام ہے ذائقہ!“

”میری امی کے ہاتھوں میں بہت ذائقہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ جو بھی بنا کر سامنے رکھ دیں بس مزہ آجاتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس سے نام کا کیا تعلق!“

”وہی تو بتا رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میرے ابو نے شادی کے بعد امی سے کہا تھا کہ تمہارے ہاتھوں میں اتنا ذائقہ ہے کہ تمہارا نام ہی ذائقہ ہونا چاہیے تھا۔ اس پر اس نے کہا کوئی بات نہیں ہم ذائقہ اپنی بیٹی کا نام رکھ دیں گے۔ تو اس طرح میں ذائقہ ہو گئی۔“

”واقعی تم بہت زیادہ ذائقہ ہو۔“ میں نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اب رہنے دیں۔“ وہ شرما گئی۔ ”ہاں! ایک بات اور سن لیں، آپ نے پہلی اور آخری بار میرا چہرہ دیکھا ہے۔ اس کے بعد آپ کو میرا چہرہ دکھائی نہیں دے گا۔“

”کیا مطلب! کیوں دکھائی نہیں دے گا۔“

”میں ایک پردہ دار لڑکی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اور محبت کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہر طرح سے فری ہو جاؤں۔ آپ کی خواہش پر میں نے اپنا چہرہ آپ کو دکھا دیا ہے۔ آئندہ سے ضدمت کیجیے گا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایک دوسرے سے مل بھی نہیں سکتے؟“

”نہیں نہیں کیوں نہیں مل سکتے۔ ہم ملتے رہا کریں گے میرا ایک کزن ہے۔ میں اس کو تیار کرلوں گی۔ وہ آپ کا خط مجھ تک پہنچا دیا کرے گا اور میرا خط آپ کو دے دے گا۔“

”کیا مطلب! یعنی ہمارے درمیان خط و کتابت ہوا کرے گی جس طرح اب سے پچاس سال پہلے ہوا کرتی تھی۔“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”ہاں! یہ رابطے کا بہت اچھا طریقہ ہے۔“

”آج کل کے زمانے میں موبائل پر باتیں ہوتی ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”جو کہنا ہو جو سننا ہو موبائل پر بات کرلو۔“

”میں نے بتایا نا کہ ہمارا گھرانہ بہت پردے والا ہے۔ ہم بہت دین دار لوگ ہیں۔ ہم موبائل نہیں رکھتے۔“

”یہ تو بہت مصیبت ہے۔“

”کوئی مصیبت نہیں۔ آپ عبدالرحیم کو خط دے دیا کریں۔ وہ مجھ تک پہنچا دے گا۔“

”کون ہے یہ عبدالرحیم۔“

”وہی میرا کزن۔“ اس نے بتایا۔ ”میرے محلے میں ایک کریانہ اسٹور ہے۔ گل بکاؤلی کریانہ اسٹور نام ہے۔ عبدالرحیم آپ کو وہیں مل جائے گا۔“

”یہ تمہارا عبدالرحیم وہاں کیا کرتا ہے؟“

”اسٹور چلاتا ہے۔ مالک ہے اسٹور کا۔“ اس نے بتایا۔

”خدا کی پناہ کیا عمر ہوگی تمہارے عبدالرحیم کی۔“

”یہی کوئی تیس پینتیس برس۔“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ تیس پینتیس برس کے بندے کو میں لو لیٹر دیا کروں گا۔“

”میں نے بتایا نا کہ میرا گھرانہ بہت مذہبی ہے۔ میرے خاندان کی ہر لڑکی اسی طرح خط و کتابت کرتی ہے۔ عبدالرحیم بھائی ہر ایک کے کام آتے ہیں۔“

”واہ کیا زبردست مذہبی گھرانہ ہے تمہارا۔“ میں نے جل کر کہا۔ ”ارے اگر تمہارے اس کزن نے تمہیں بلیک میل کرنا شروع کردیا تو پھر کیا ہوگا۔“

”اب تک تو ایسا نہیں ہوا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”کیا مطلب! کیا پہلے بھی تم اس قسم کی حرکت کر چکی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ لیں، آج کل کے زمانے میں یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ ہر لڑکی اپنے پاس دو چار آپشن تو ضرور رکھتی ہے اور نہیں اور سہی......اور نہیں اور سہی۔“

اس کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ٹھکانے لگ گئے تھے۔ اس کے باوجود میں اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس کو حاصل کرلینا چاہتا تھا۔ ہر حال میں۔

بہرحال اس کی بے باک اور حیرت انگیز باتوں کے باوجود میں اسے ہر حال میں حاصل کرلینا چاہتا تھا۔ یعنی میرے ساتھ دو پریشانیاں تھیں۔ نمبر ایک بے روزگاری اور نمبر دو ذائقہ خاتون کو حاصل کرنا۔

یہی دو مسائل تھے جو مجھے انگوٹھے والے بابا کے پاس لے گئے تھے۔

انگوٹھے والے بابا کا پورے شہر میں شہرہ تھا۔ کہتے تھے کہ ان کے پاس جو جاتا تھا اس کی پریشانی ختم ہو جاتی تھی۔ انہیں انگوٹھے والے بابا اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ ہر وقت انگوٹھے چوستے رہتے تھے۔ (اس انگوٹھے کا بیان بعد میں آئے گا)۔

میں جب انگوٹھے والے بابا کے پاس پہنچا تو وہ اس وقت اپنے عقیدت مندوں کو اپنی معرفت کا حال بتا رہے تھے۔

”تو ہوا یہ کہ وہ کم بخت پری اس ناچیز، فقیر کے

سامنے اپنی پوری ناز و ادا کے ساتھ آکر کھڑی ہوگئی۔'' انگوٹھے والے بابا نے فرمایا۔

''سرکار! کیا وہ سچ مچ کی پری تھی؟'' سامنے بیٹھے ہوئے ایک بدعقیدہ شخص نے پوچھا۔

انگوٹھے والے بابا نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کوئی داستان سنا رہا ہوں۔''

''نہیں جناب غلطی ہوگئی۔'' وہ آدمی سہم کر بولا۔

انگوٹھے والے بابا کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی داستان سنانی بند کردی۔ ''اب آپ حضرات جاسکتے ہیں۔''

سب ہی چلے گئے سوائے میرے۔ کیوں کہ میں عقیدت مند نہیں، ضرورت مند تھا۔

''ہاں کہو۔'' بابا نے میری طرف دیکھا۔

''سرکار میں اپنے دو مسائل لے کر حاضر ہوا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو یہ کہو کہ ضرورت مند ہو۔''

''جی سرکار! ضرورت مند ہی ہوں۔''

''یہ لو انگوٹھا۔'' بابا نے اپنا غلیظ سا انگوٹھا میری طرف بڑھا دیا۔

''کیا کرنا ہے جناب اس انگوٹھے کا۔''

''کیا تمہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہاں آنے والا ضرورت مند میرا انگوٹھا چوستا ہے۔'' بابا نے کہا۔ ''اور خیر و برکت کے دھارے اس انگوٹھے سے نکل کر اس کے جسم میں اتر جاتے ہیں۔''

''نہیں جناب کسی نے نہیں بتایا۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ خود ہی اپنا انگوٹھا چوستے رہتے ہوں گے۔''

''کم علمی ہے تمہاری۔'' بابا نے کہا۔ ''میں انگوٹھے والا بابا اس لیے ہوں کہ ضرورت مند میرا انگوٹھا چوستے ہیں۔ لو انگوٹھا۔''

مجبوراً بابا کا غلیظ بدبودار انگوٹھا چوسنا پڑ گیا۔ پانچ منٹ کے بعد بابا نے اپنا انگوٹھا واپس ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں اب کہو کیا مسئلہ ہے۔''

''جناب! میرا نام حمید ہے اور میرے ساتھ دو پریشانیاں ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''بے روزگاری اور محبت۔''

''سمجھ گیا۔ بے روزگاری سے محبت۔''

''بے روزگاری سے محبت نہیں جناب، ذائقہ خانم سے محبت۔'' میں نے کہا۔

''ذائقہ خانم! کیا یہ کسی ڈش کا نام ہے۔'' انگوٹھے والے بابا نے پوچھا۔

''نہیں جناب! یہ اس لڑکی کا نام ہے جس سے میں نے محبت کی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''تو کیا رکاوٹ ہے تم دونوں کے درمیان۔''

''وہ ایک مذہبی گھرانے کی حیادار لڑکی ہے سرکار۔ اس کے والدین اس کی شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''اور تم ان کے ارادوں کو ناکام بنانا چاہتے ہو۔''

''جی جناب کیوں کہ میں نے اس سے محبت کی ہے۔''

''ہوں۔'' انگوٹھے والے بابا نے ایک ہنکارہ بھرا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ''دراصل ستارہ دو میزان عقرب ہے اور مریخ کو اس کے حصار سے باہر نکلنا ہوگا۔''

''میں ایک غریب آدمی ہوں جناب۔ میں مریخ کو اس کے حصار سے باہر کیسے نکال سکتا ہوں۔''

''یہ کام تمہارا نہیں، میرا ہے۔'' بابا مسکرا دیے۔ ''تم تو صرف دس ہزار روپے لا کر دے دو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔''

''نوکری مل جائے تو پہلی تنخواہ آپ کے حوالے کردوں گا۔''

''روحانی معاملات میں ادھار نہیں چلتا۔'' بابا ناراض ہوگئے تھے۔ ''تم جاسکتے ہو۔''

اس وقت ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ ''سرکار آپ کی نظر عنایت سے میرا کام بن گیا۔'' اس نے وہ ڈبہ بابا کے سامنے رکھ دیا۔

''ہوں۔'' بابا مسکرا دیئے۔ ''مبارک ہو۔''

''سرکار! اگلے مہینے ہماری شادی ہونے والی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حمیدہ کے ظالم ماں باپ اس شادی کے لیے راضی ہوجائیں گے۔''

''کیوں نہیں راضی ہوتے۔'' بابا غصے سے بولے۔ ''اگر میرے تعویذات میں اثر نہ ہو تو پھر میں زہر پی کر مر جانا پسند کروں گا۔''

نوجوان نے بڑی عقیدت سے بابا کا انگوٹھا اپنے منہ میں دبا لیا۔ کچھ دیر تک انگوٹھا چوس لینے کے بعد اس نے اپنی جیب سے کچھ روپے نکال کر بابا کے سامنے رکھ دیئے۔ ''یہ لیں سرکار۔ بقایا رقم لیتا آیا ہوں۔''

"ان کو اس طرف رکھ دو۔" بابا نے ایک جانب اشارہ کیا۔

نوجوان نے ان کی بتائی ہوئی جگہ پر نوٹ رکھ دیے اور بابا کی تعریفوں کے پل باندھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بابا نے میری طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے تم ابھی تک یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ گئے کیوں نہیں۔"

"سرکار اب تو میں آپ کا در چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"دیکھو میاں۔" بابا کچھ دیر تک مجھے دیکھنے کے بعد بولے۔ "تم نے اس بات کا اندازہ کرلیا ہوگا کہ میں مکار نہیں ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ توبہ توبہ۔ ہم فقیروں کو پیسوں سے کیا لینا دینا یا کوئی پیسے لے کر آیا تو میں نے کہا نہیں میں پیسوں کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ میں اس قسم کی مکاری نہیں کرتا۔ میں برملا کہتا ہوں کہ میں اپنا معاوضہ لیتا ہوں اور برملا کہتا ہوں کہ ضرورت مند کا کام بھی ہوجاتا ہے۔"

"سمجھ گیا جناب، بالکل سمجھ گیا۔ اب تو میں کہیں نہ کہیں سے دس ہزار لے کر آجاؤں گا۔"

"بس تو پھر جلدی سے رقم لے آؤ۔ تاکہ میں مریخ کو اس کے حصار سے نکالنے کی کوشش کروں۔"

"سرکار اگر یہ مریخ اپنے حصار سے باہر نہیں نکلا تو پھر کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"کیسے نہیں نکلے گا۔" بابا کو جلال آگیا۔ "میں اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔"

"بس سرکار تو پھر میں دو تین دنوں میں حاضر ہورہا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے پیسوں کے حصول کی کوششیں شروع کردیں۔

اس دور میں کسی سے پیسے لینے کا اپنا ایک طریقہ ہوا کرتا ہے۔ یہ بہت ہوشیاری کا کام ہے۔ کبھی ظاہر نہ کریں کہ آپ کو پیسوں کی ضرورت ہے، پھر کوئی ایک پائی نہیں دے گا۔

ہمیشہ یہی ظاہر کرتے رہو کہ آپ کے پاس بہت پیسے ہیں لیکن بینک میں ہیں اور بینک کا ٹائم ختم ہوگیا ہے۔ یا آپ نے اے ٹی ایم کا جھنجٹ نہیں پالا اس میں خوامخواہ خرچ بڑھ جاتا ہے۔

آپ نے خود دیکھا یا سنا ہوگا کہ بینک اس کو پیسے دیتا ہے جس کے پاس پہلے سے پیسے ہوں۔ ضرورت مند کو کبھی نہیں دیتا۔

یقین نہ ہو تو ضرورت مند بن کر کسی بینک میں چلے جاؤ۔ مجال ہے جو آپ کو سو روپوں کا قرض بھی مل جائے۔

پھر تو میں یہ بتا رہا ہوں کہ میں نے اس حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے دو دنوں میں دس ہزار جمع کرلیے۔

اس سلسلے میں ایک کام کی بات اور نوٹ کرلیں۔ کبھی کسی سے ایک ساتھ دس بیس ہزار نہ مانگ بیٹھیں۔ ورنہ کوئی نہیں دے گا۔ قطرہ قطرہ کرکے دریا بنالیں۔

جیسے کسی سے پانچ سو مانگ لیں۔ کسی سے ہزار لے لیں۔ کسی سے دو ہزار لے لیں وغیرہ۔ ایک بات اور میں یہ ٹپس اس لیے دے رہا ہوں کہ مجھ جیسے بہت ضرورت مند ہوں گے۔

اگر آپ کو سو روپوں کی ضرورت ہے تو راؤنڈ فیگر میں کبھی نہ مانگیں۔ بلکہ ایک سو پندرہ یا بارہ روپے مانگیں۔ پھر وہ یہ سمجھے گا کہ آپ کو واقعی سودا وغیرہ لینا ہے اور ایک سو بارہ روپے کم پڑ رہے ہوں گے۔ اس طرح وہ ایک سو بارہ نہ سہی سو تو دے ہی دے گا۔

بہرحال ان ہی سنہری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے میں نے دو دنوں میں دس ہزار اکٹھے کرلیے اور انگوٹھے والے بابا کے پاس پہنچ گیا۔

وہ اس وقت بھی اپنے عقیدت مندوں کو اپنی ایک کہانی سنا رہے تھے۔

"تو بھائیو افلاطوس نے مجھے میدان میں کشتی لڑنے کا چیلنج دے دیا اس نے کہا کہ دیکھو۔ میں روحانی طور پر تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیونکہ تمہارا علم مجھ سے زیادہ ہے لیکن جسمانی طور پر میں تم سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ دو منٹ میں تمہارا کچومر نکال دوں گا۔"

"سرکار یہ افلاطوس کون تھا۔" کسی نے دریافت کیا۔

"میں شاید فلاقوس دیو کے بارے میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں۔"

"جی ہاں سرکار، آپ نے بتایا تھا۔"

"تو یہ افلاطوس اسی فلاقوس کا بہنوئی تھا۔"

عقیدت مندوں نے گردنیں جھکا دیں۔ میں اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا کہ میں کتنی صحیح جگہ اپنی تمنا لے کر پہنچا ہوں۔

انگوٹھے والے بابا کچھ دیر تک اپنی کہانیاں سناتے رہے۔ اس کے بعد میری طرف دیکھ کر مجلس برخواست کرنے کا اشارہ کیا۔

اب کمرے میں صرف میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ بابا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''ہاں بھائی! اب کھو اب کیوں آنا ہوا۔''

''سرکار وہ دس ہزار روپے لے کر آ گیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے۔'' بابا نے کہا۔ ''یہ تم نے اپنی بھلائی کے لیے کیا ہے۔ لاؤ، ادھر دو۔''

میں نے دس ہزار ان کی طرف بڑھا دیے۔ نوٹوں کو ایک جیب میں رکھ لینے کے بعد بابا نے صندوقچے سے ایک عدد تعویذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو تعویذ، دھونی دے کر اسے اپنے گلے میں پہن لینا لیکن اس تعویذ کو کینگرو کی کھال میں لپیٹ کر پہننا ہے۔''

''کینگرو کی کھال میں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں کینگرو کی کھال میں۔''

''لیکن سرکار یہ کینگرو کی کھال میں کہاں سے لاؤں گا۔''

''اب کیا یہ بھی میں ہی بتاؤں گا۔'' بابا ناراض ہونے لگے تھے۔ ''ہاں کینگرو کی کھال کے بعد اگر اس کا اثر نہ ہو تو پھر تم میرا گریبان پکڑ سکتے ہو۔ سو فی صد کام ہو جائے گا۔ اب یہ کھال چاہے تم کہیں سے بھی لاؤ۔ یہ تمہارا کام ہے۔''

''ٹھیک ہے سرکار، میں کوشش کروں گا۔''

''شاباش۔'' بابا مسکرا دیے۔ ''لگن سچی ہو تو انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ اب جاؤ میری ریاضت کا وقت ہو گیا ہے۔''

میں تعویذ لے کر حجرے سے باہر آ گیا۔

باہر وہی نوجوان کھڑا تھا جو میرے سامنے مٹھائی لے کر آیا تھا اور جس کی شادی طے پا گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ خود ہی میرے پاس چلا آیا تھا۔ ''مبارک ہو، شاید کامیاب ہو کر باہر آئے ہو۔'' اس نے کہا۔

''تم کو کیسے معلوم۔''

''تمہارا چہرہ بتا رہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں تو بابا کو اپنی شادی کا کارڈ دینے آیا تھا۔ پتا چلا بابا کے پاس کوئی بیٹھا ہے وہ تم نکلے۔''

''یار ایک بات بتاؤ کیا تمہیں واقعی بابا کے تعویذ سے فائدہ ہوا ہے؟''

''ہاں بھائی میں نے جب کینگرو کی کھال میں تعویذ لپیٹ کر اپنے گلے میں ڈالا تو میری تو دنیا ہی بدل گئی۔ ایسی ایسی کامیابیاں ملی ہیں کہ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔''

''لیکن تم کینگرو کی کھال لائے کہاں سے؟'' میں نے پوچھا۔

''آسٹریلیا جا کر۔'' اس نے بتایا۔

''کیا تم کھال لینے آسٹریلیا چلے گئے تھے۔'' میں نے حیرت ظاہر کی۔

''ظاہر ہے کینگرو کی کھال یہاں تو نہیں ملتی۔'' اس نے کہا۔ ''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا ہی پڑتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس چکر میں میرے سات آٹھ لاکھ روپے خرچ ہو گئے لیکن میں کامیاب بھی تو ہو گیا۔''

''میں تو غریب آدمی ہوں بھائی۔ میں کہاں سے سات آٹھ لاکھ خرچ کر سکتا ہوں۔''

''تم فکر مت کرو۔ میرے پاس تھوڑی سی کھال بچی ہوئی ہے۔ ایک پارٹی نے چالیس ہزار لگائے ہیں لیکن تمہاری حالت دیکھتے ہوئے میں تمہیں پچیس ہزار کی دے دوں گا۔''

''بھائی پچیس ہزار تو بہت زیادہ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو کینگرو بھی تو نایاب جانور ہے اگر پچیس ہزار زیادہ لگ رہے ہیں تو خود آسٹریلیا چلے جاؤ تم کو مہنگے اور سستے کا فرق معلوم ہو جائے گا۔''

''فرض کرو میں نے پچیس ہزار خرچ کر دیے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میرا کام ہو جائے گا۔''

''گارنٹی خود بابا ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ سمجھ لو کہ جس کو کینگرو کی کھال والا تعویذ دے دیا اس کا کام ہر حال میں ہو جاتا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تم وہ کھال کسی کو مت دینا میں ہی لے جاؤں گا لیکن صرف ایک ہفتے رکنا ہو گا تا کہ اتنے پیسوں کا بندوبست کر سکوں۔''

''ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رکوں گا۔ دوسری پارٹی تیار بیٹھی ہے۔'' اس نے یاددہانی کروائی۔

''فکر مت کرو صرف ایک ہفتہ دے دو مجھے۔''

میرے ذہن میں ایک اسکیم آ گئی تھی۔ یہ کمائی کا اچھا موقع تھا۔ ہمت کرے انسان تو پھر کیا نہیں ہوتا۔ کامیابی کے لیے رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ قدم بڑھاؤ ساتھیو، اس قسم کی بے شمار باتیں میرے دھیان میں آ رہی تھیں۔

چانس صرف ایک بار ملتا ہے اگر فائدہ اٹھا لیا جائے تو پھر دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہی سب سوچ کر میں دوسرے دن پھر انگوٹھے والے بابا کے پاس پہنچ گیا۔

وہ نوجوان اس وقت بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آ گیا۔ ''کیا ہوا پیسوں کا بندوبست ہو گیا۔''

''بھائی میں تم سے ایک ضروری بات پوچھنے آیا ہوں۔''

"ہاں ہاں پوچھو۔"

"تمہارے پاس کتنے تعویذوں کی کھال ہوگی۔ میرا مطلب ہے تمہارے پاس جتنی کھال ہے اس سے کتنے تعویذ بن سکتے ہیں۔"

"کم از کم ایک درجن تو بن جائیں گے۔" اس نے بتایا۔

"تو پھر ایسا کرو۔ ساری کھال مجھے دے دو۔ میں لینے کو تیار ہوں۔"

"تم کیا کرو گے۔ تمہیں تو صرف ایک تعویذ جتنی کھال چاہیے۔"

"اب یہ میرا دردسر ہے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"نہیں تو مجھے کیا اعتراض ہونا ہے۔"

"اچھا اب یہ بتاؤ کیا یہ کھال والے تعویذ، بابا سب کو دیتے ہیں۔"

"سب کو نہیں، صرف خاص خاص لوگوں کو۔" اس نے بتایا۔ "اس کے باوجود اس وقت بھی کم از کم پندرہ بیس لوگ ایسے ہیں جو اس کھال کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے اب تم مجھ سے سودا کرلو۔ میں تمہیں پچاس ہزار دوں گا اور تمہارے پاس جتنی کھال ہے وہ تم مجھے دے دو گے۔"

"صرف پچاس ہزار۔" وہ غصے سے بولا۔ "تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ ایک درجن تعویذوں کے برابر کھال کے صرف پچاس ہزار۔"

"بھائی میں غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس تو اتنی رقم بھی نہیں ہے وہ تو میں بندوبست کرکے لاؤں گا۔"

"دیکھو تمہاری اپنی زندگی تو بن ہی گئی ہے اب کم از کم ایک غریب کی زندگی بنوا دو۔ تمہارا احسان ہوگا۔ کرو مہربانی تم اہل زمیں پر۔ خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر۔"

وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "نہ جانے کیوں مجھے تم پر ترس آرہا ہے چلو سودا ہوگیا۔ ساری کھال تمہاری ہوئی۔"

"بس تو چار دن رک جاؤ۔ میں پیسوں کا بندوبست کرکے لارہا ہوں۔"

ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ ایک شخص ہمارے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ کھال والے نوجوان سے کہہ رہا تھا۔

"بھائی معاف کرنا میں دو چار دنوں کے لیے شہر سے باہر چلا

گیا تھا۔ اس لیے یہاں نہیں آسکا۔''

''خیر اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔'' کھال والے نے کہا۔ ''کھال کا سودا ہو چکا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو رقم بھی لے آیا ہوں۔''

''نہیں بھائی! زبان، زبان ہوتی ہے۔ میں نے ساری کھال ان بھائی صاحب کو دے دی ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

اب وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ ''بھائی جان! مجھے بہت ضرورت ہے۔ تھوڑی سی کھال مجھے بھی دے دیں۔''

اگر وہ کھال اس وقت میرے پاس ہوتی تو میں ضرور دے دیتا۔ لیکن ابھی وہ کھال میرے قبضے میں نہیں آئی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ''ٹھیک ہے کھال مل جائے گی لیکن آپ کو چار دنوں کے بعد آنا ہوگا۔''

''ضرور آجاؤں گا بھائی۔ ضرورت مند ہوں اور میرے دو اور جاننے والے ہیں ان کو بھی چاہیے۔''

''ہاں ہاں ان کو بھی لیتے آنا۔''

اس کے جانے کے بعد کھال والے نے مجھ سے کہا۔ ''یار تم نے تو میرے سامنے سودا بیچنا شروع کر دیا ہے۔''

''دیکھو بھائی ہمارے درمیان یہ طے ہو چکا ہے کہ میں اس کھال کا جو بھی کروں تم کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوگا۔''

''ہاں بھائی! مجھے کوئی مطلب نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم چار دنوں کے بعد پیسے لیتے آنا۔''

میں گھر واپس آگیا۔

مجھے اس کھال کی ڈیمانڈ کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ ایک درجن تعویذ کے اگر پندرہ پندرہ ہزار بھی وصول کرتا تو دو ڈھائی لاکھ مل جاتے۔ جب کہ میرے صرف پچاس ہزار خرچ ہو رہے تھے۔

لیکن سوال پھر وہی تھا کہ اتنی رقم کہاں سے لائی جائے۔

گھر آکر میں نے اپنے ان دوستوں اور رشتے داروں کی فہرست بنانا شروع کر دی۔ جن سے کچھ نہ کچھ لینے کی امید تھی۔

کسی سے ہزار، کسی سے دو ہزار، کسی سے تین ہزار، حساب لگایا تو ساٹھ ستر ہزار جمع ہو جاتے۔ بہرحال خدا کا نام لے کر میں نے دوسرے دن سے اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔

اب اس کی تفصیل کیا بتائی جائے بہرحال کہیں سے کامیابی، کہیں سے ناکامی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح پچاس ہزار اکٹھے کر ہی لیے۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی کچھ چیزیں بھی فروخت کر دی تھیں۔

میں ٹھیک پانچویں دن انگوٹھے والے بابا کے آستانے پر پہنچ گیا۔ وہ نوجوان ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر لیے میرا انتظار کر رہا تھا۔

''آؤ بھائی! میں جانتا تھا کہ تم اپنی بات کے دھنی ہو۔ ضرور آؤ گے میرے پاس۔''

''ظاہر ہے مجھے تو آنا ہی تھا۔''

''پیسے لائے ہو؟''

''ہاں لے آیا ہوں۔''

''اور کھال؟''

''شاپر میں ہے۔'' اس نے کہا۔

اس نے مجھے کھال والا شاپر دیا۔ میں نے اسے پچاس ہزار روپے دے دیے۔ وہ بھی خوش اور میں بھی خوش۔ میں نے اپنی اس کہانی کے آغاز میں لکھا تھا کہ خدا کے لیے کوئی مجھے اس مشکل کا حل بتا دے، کیا کروں میں۔

میں نے آستانے پر آنے والوں کو یہ بتا دیا کہ میرے پاس کینگرو کی کھال موجود ہے۔ جس ضرورت مند کو چاہیے مجھ سے آکر لے لے۔

لیکن کمال ہے کوئی بھی نہیں آیا۔

وہ بھی نظر نہیں آیا جس کو کھال کی شدید ضرورت تھی۔

البتہ وہ ملتا رہا جس سے میں نے کھال خریدی تھی۔ میں نے ایک دن پریشان ہو کر اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے بھائی لوگ کھال لینے کے لیے میرے پاس کیوں نہیں آرہے۔''

''کیا تمہیں نہیں معلوم؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا نہیں معلوم؟''

''بابا نے کینگرو کی کھال لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ برفانی اود بلاؤ کی کھال کا تعویذ بتانے لگے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ اب تو آپ لوگ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کس مشکل میں ہوں۔ میں وہ شاپر لیے آج بھی انگوٹھے والے بابا کے آستانے کے احاطے میں کھڑا ہوا دکھائی دے جاؤں گا۔''

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو میری اس کہانی پر یقین نہیں آیا ہو۔ لیکن آپ ذرا اطمینان سے بتائیں کیا اس معاشرے میں ایسا نہیں ہو رہا۔

کیا انگوٹھے والے بابا جیسے لوگ کینگرو اور اود بلاؤ کی کھال کے ساتھ ساتھ خود آپ کی کھال نہیں اتار رہے؟
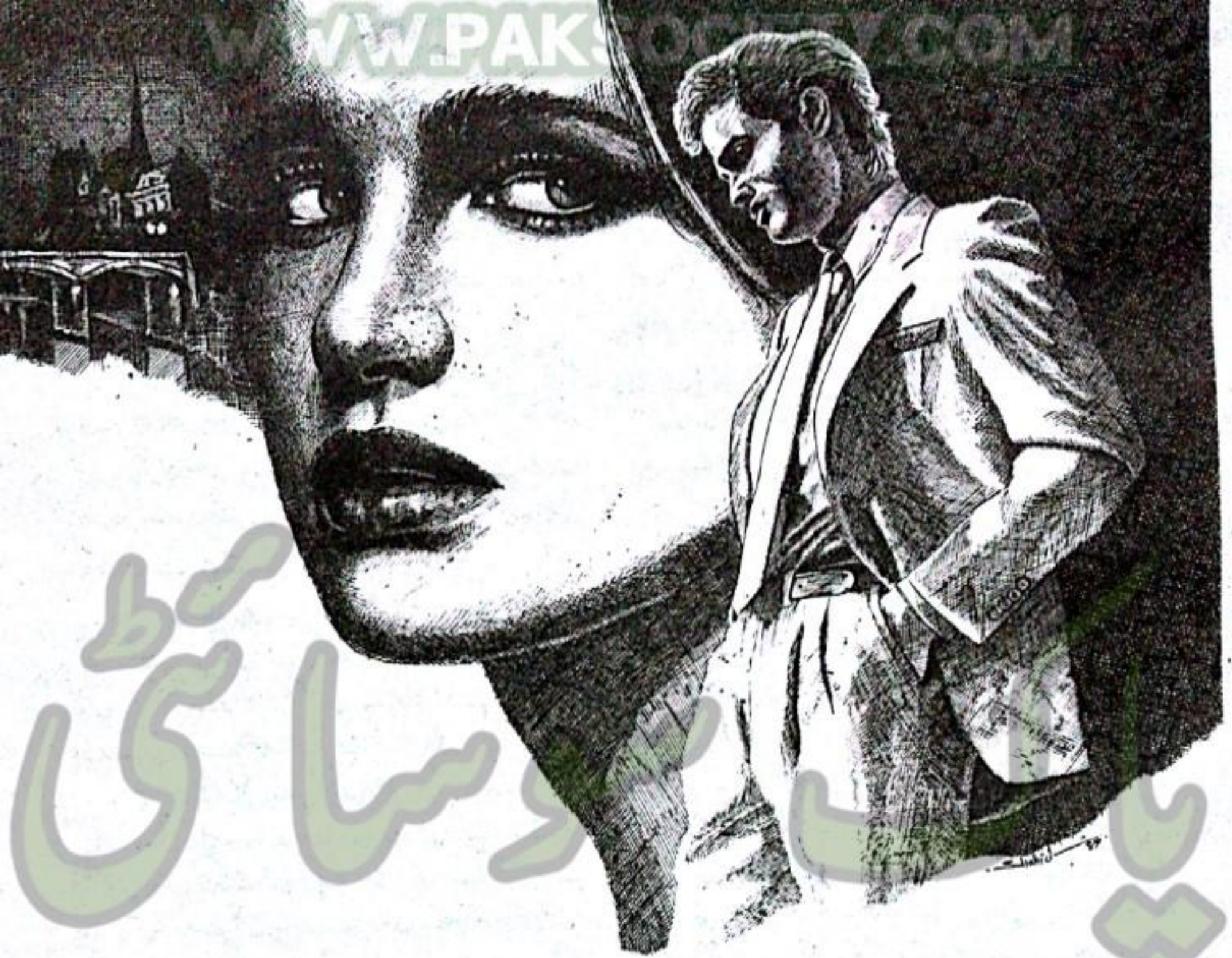
دل کے پھپھولے

محترم مدیراعلیٰ

آداب عرض

اس بار ایک اور دلچسپ روداد کے ساتھ حاضر ہوں۔ اُمید ہے کہ دیگر تحاریر کی طرح یہ تحریر بھی سرگزشت کے معیار پر پوری اترے گی۔ نفسیات کی گتھیوں میں الجھا انسان کس قدر مظلوم ہوتا ہے۔ یہی کچھ مجھے شوکت زمان میں نظر آیا ہے اور میں نے اسے تحریر میں مکمل احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ رمضان میں کراچی میں گزارنے کے لیے پاکستان آرہا ہوں۔ انشاء اللہ ملاقات ہوگی، ضرور ہوگی۔

امین بھایانی

(اٹلانٹا، امریکا)

''اکرام! ذرا جلدی سے میرے کمرے میں آؤ؟'' شاہکار جیولرز کے مینیجر احسانی نے اتنا کہہ کر انٹر کام رکھ دیا اور اپنی نشست سے پشت ٹکا کر شیشے کے کیبن کے پار منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔

اکرام کے آتے ہی احسانی بنا توقف بولا ''ابھی بیگم منیبہ شوکت کا فون آیا تھا۔ وہ ساڑھے بارہ بجے تک ڈائمنڈ رنگز دیکھنے آرہی ہیں۔ کل سوئٹزرلینڈ سے جو نئی کھیپ آئی ہے، اس میں سے کوئی دس ایک کے قریب بہت ہی خوبصورت اور

قیمتی انگوٹھیاں چمکوا کر کسی اچھے سے ڈسپلے میں سجا کر تیار کر لو۔"
اکرام کی آنکھوں میں بیزاری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ چہرے پر چھائی ہچکچاہٹ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ کا متلاشی ہے۔ اِس سے قبل وہ کچھ کہتا احسانی بول پڑا۔ "کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"
"جی وہ بس احسانی صاحب کیا عرض کروں!" اکرام قدرے جھجکتا ہوا بولا۔ "آپ تو جانتے ہی ہیں بیگم منیبہ شوکت کتنی بدتمیز اور منہ پھٹ ہے۔ جب بھی آتی ہے سارے اسٹاف کی کھڑے کھڑے بےعزتی کر دیتی ہے۔ اِتنی بدتمیزی سے بات کرتی ہے جیسے ہم اس کے زرخرید غلام ہیں۔"
احسانی کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ ابھر آئی۔
"ہاں مجھے پتا ہے لیکن منہ مانگے دام بھی تو دے جاتی ہے۔ یاد نہیں ہے پچھلی بار ڈائمنڈ نیکلیس کے بھاؤ تاؤ کیے بغیر ہی دس لاکھ دے گئی جو اسے ہم سات آٹھ لاکھ میں بھی دے دیتے۔"
اکرام کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی
"جی احسانی صاحب، درست کہہ رہے ہیں آپ۔ گلے میں نیکلیس پہن کر شیشے میں دیکھ کر اتراتے ہوئے مسلسل کہے جا رہی تھی کہ جب میں اِسے نئے ڈریس کے ساتھ پہنوں گی تو کتنی خوبصورت لگوں گی۔" اکرام کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اب قدرے طنزیہ سی ہو چلی تھی۔
"ہاں دیکھو بھلا، اسے بناء حدود قیود کے پھیلا اپنا جسم نظر نہیں آتا کیا؟" احسانی کا لہجہ طنز سے بھرا تھا۔
"وہی تو! جب وہ یہ کہہ رہی تھی میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بھلا اِس نیکلیس میں ایسا کون سا سرخاب کا پر جڑا ہے جو اسے حسین و جمیل بنا دے گا۔ اِس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ کوئی اچھا سا فٹنس سینٹر جوائن کر لے۔ دو تین سو پاؤنڈ تو کم ہو جائیں گے شاید اسی طرح کچھ بہتر لگنے لگے۔"
احسانی کے حلق سے بے اختیار قہقہہ ابل پڑا مگر اس نے فوراً اس کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا "دیکھو یہ تمہارا مسئلہ نہیں کہ وہ حسین لگتی ہے یا نہیں۔ تم تو بس اس کی ایسی ایسی تعریفیں کرنا کہ اب کی بار وہ پہلے سے بھی مہنگی انگوٹھی خرید کر لے جائے۔"
"میری تو سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ اپنی دن بدن پھیلتی صحت کی طرف کیوں توجہ نہیں دیتی۔ اسے کس بات کی کمی ہے۔ شاید اسے خود بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے پاس کتنی دولت ہے۔ اگر کوئی اچھا سلمنگ سینٹر جوائن کر لے تو چند ماہ میں کچھ کی کچھ نظر آنے لگے۔" اکرام احسانی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔
"میرے سامنے تو تم نے یہ بات کر دی ہے۔ مگر خبردار! اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کر بیٹھنا۔ اگر وہ ناراض ہو گئی تو خوامخواہ ہم سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے محروم ہو جائیں گے۔" احسانی کا لہجہ قدرے تلخ تھا۔ "چلو بس اب جاؤ۔ مجھے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ملے...... سمجھے!"
اکرام کیبن کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ پیچھے سے احسانی کی قدرے بلند آواز سنائی دی "اور ہاں تمہارا لنچ بریک ایک بجے ہوتا ہے نا۔ اگر وہ کچھ لیٹ شیٹ ہو تو لنچ پر نہ نکل جانا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ آئے تو تم وہاں موجود رہو۔ دوسرے سیلز پرسن اسے ہینڈل نہ کر سکیں گے۔" اکرام نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔
احسانی کی ہدایات کے عین مطابق اس نے ہیرے کی انگوٹھیوں کا ڈبہ نکالا۔ ایک ایک انگوٹھی کو اپنے گریبان میں لٹکتے ہیرا جانچنے کے مخصوص چھوٹے محدب عدسے کو آنکھ پر لگا کر بغور دیکھنے کے بعد کوئی دس بارہ انگوٹھیاں علیحدہ کر لیں۔ ایک سیلز پرسن کو ہدایت کی کہ وہ یہ سب انگوٹھیاں احتیاط کے ساتھ ورک شاپ میں کاریگر سے پالش کروا لے اور کسی بہت ہی اچھے ڈسپلے باکس پر لگا کر شوکیس میں سجا دے۔
ابھی ساڑھے بارہ بجنے میں کوئی گھنٹا بھر تھا۔ وہ کاموں میں ایسا الجھا کہ وقت کا احساس اس وقت ہوا جب اس کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے سیلز پرسنز نے لنچ بریک پر جانے کی اجازت طلب کی۔ اس نے شوروم کی دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی تو ایک بج رہا تھا۔ بیگم منیبہ کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا۔ خود اکرام کی آنتیں بھی مارے بھوک کے قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔
دوپہر کے دو بج گئے۔ پہلے دو سیلز پرسنز کے بعد دوسری دو خواتین سیلز پرسنز بھی اپنا اپنا لنچ بریک کر کے واپس آ چکی تھیں۔ اکرام دل ہی دل میں بیگم منیبہ کو سلواتیں سنا رہا تھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ اگر سامنے آ جائے تو وہ کھری کھری سنائے کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔ مگر وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ محض اس کی سوچ کا ذرا سا بھی اندازہ ہو جائے تو وہ احسانی سے کہہ کر اسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکلوا دے اور وہ احسانی! بیگم منیبہ کو دیکھتے ہی خوشامدی ٹٹو بن کر بیگم صاحبہ بیگم صاحبہ کہتا ہوا اِدھر اُدھر اپنی دم ہلاتا پھرتا ہے۔ اپنی وقعت بڑھانے کے چکر میں اسے نوکری سے فارغ کرنے میں لمحہ بھر کا بھی تامل نہ کرے۔

اچانک شوروم کے صدر دروازے سے بیگم منیبہ شوکت بھاری بھرکم وجود سنبھالے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اندر داخل ہوتی دکھائی دیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی اکرام اپنی بھوک اور انتظار کی کوفت بھول گیا اور اس کی جگہ ایک عجب سی بے چینی نے لے لی۔

اِس سے پہلے کہ اکرام اپنے سیکشن سے باہر آکر شوروم کے دروازے پر بیگم منیبہ کو خوش آمدید کہتا، احسانی اپنے شیشے کے کیبن سے تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور پوری بتیسی نکال کر بولا ''زہِ نصیب! بیگم صاحبہ، آپ کی آمد ہمارے شوروم کے لیے کسی اعزاز سے ہرگز کم نہیں، خوش آمدید، خوش آمدید۔''

بیگم منیبہ نے محض اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر اس کی ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلی ہوئی مسکراہٹ کا مختصراً جواب دیا اور کم و بیش اسے نظر انداز کرنے والے رویہ کے ساتھ شوروم کے اس گوشے کی جانب دھیرے دھیرے چل دی جہاں شوکیسوں میں سجے ہیرے جواہرت جڑے زیورات کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

احسانی کی نظر بیگم منیبہ کے عقب سے نمودار ہونے والے ایک مرد پر پڑی۔ ایک بار پھر اپنے چہرے پر ایک کان سے دوسرے کان کو چھوتی ہوئی مسکراہٹ سجا کر پُرجوش لہجہ میں بولا۔ ''اخاہ! تو آج شوکت زمان صاحب بھی بنفسِ نفیس تشریف لائے ہیں۔ ارے صاحب آپ کو دیکھنے کو تو ہماری آنکھیں ہی ترس گئیں۔''

احسانی کی بات سن کر اکرام چونکا ''شوکت زمان! اوہ تو یہ صاحب ہیں بیگم منیبہ کے شوہرِ نامدار۔'' منیبہ بیگم کو اپنی جانب آتے دیکھ کر آگے بڑھا اور اپنے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''مزاج بخیر، بیگم صاحبہ۔ میں تو کب سے آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔''

اکرام کی بات شاید اسے ناگوار گزری۔ چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر احسانی تیزی سے آگے بڑھا اور چہرے پر خوشامدی مسکراہٹ ثبت کرتے ہوئے بولا ''جی جی ہم سب ہی آپ کا بیتابی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے بیگم صاحبہ۔ آپ کی شخصیت ہی کچھ ایسی باغ و بہار ہے، ماشاء اللہ۔ آپ کی آمد سے ہمارے شوروم میں رونق آگئی ہے۔''

احسانی نے بات کچھ ایسے لچھے دار انداز میں کی کہ بیگم منیبہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیں۔ احسانی نے فوراً اکرام کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنی آنکھ کا گوشہ بھینچ کر متنبہ کیا کہ وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے جس سے بیگم صاحبہ کا موڈ آف ہو جائے۔ فوراً ہی اس نے ہیرے کی انگوٹھیوں والے ایک بڑے شوکیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ارے بھئی اکرام! بیگم صاحبہ کو وہ ڈائمنڈ رنگز دکھاؤ جو ہم نے بطورِ خاص ان کے لیے چندروز قبل ہی سوئٹزرلینڈ سے منگوائی ہیں۔''

احسانی مڑا اور شوکت زمان کی جانب متوجہ ہوا جو ہال میں لگے ایک انتہائی نفیس اور آرام دہ مخملی صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ ''ارے صاحب، آپ یہاں کہاں آن بیٹھے؟ کیا رِنگ پسند کرنے میں بیگم صاحبہ کی کوئی مدد نہ کیجیے گا؟''

شوکت زمان میز پر سے کوئی رسالہ اٹھا کر اسے پڑھنے کا آغاز کرنے ہی والا تھا کہ یکدم چونکا۔ پھر انتہائی نفیس انداز میں مسکراتے ہوئے قدرے دھیرے سے بولا ''احسانی صاحب، آپ تو جانتے ہی ہیں، مجھے نہ تو ہیرے جواہرات سے کوئی دلچسپی ہے، نہ ہی اِس بارے میں کسی قسم کی کوئی معلومات اب بھلا میں اس کی مدد کرتا کیا اچھا لگوں گا جو دن رات ہیرے جواہرات سے ہی کھیلتے ہوئے بڑی ہوئی ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر اپنا سر جھکا کر رسالہ میں گم ہوگیا۔

''چلیں تو پھر میں، آپ اور بیگم صاحبہ کے لیے کولڈ ڈرنکس بھجواتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر احسانی تیز تیز چلتا ہوا اپنے کیبن میں داخل ہوا اور انٹرکام اٹھا کر ہدایات جاری کرنے لگا۔

اکرام، بیگم منیبہ کو ہیرے کی انگوٹھیاں دکھا رہا تھا۔ وہ مسلسل اپنی ناک بھوں یوں اتار چڑھا رہی تھی کہ جیسے اسے کچھ پسند ہی نہ آ رہا ہو۔ اکرام کن انکھیوں سے صوفے پر بیٹھے شوکت زمان کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اِس بدمزاج، اکھڑ اور پہاڑ سی عورت کا شوہر اِس قدر نفیس، متین اور سلجھا ہوا بھی ہوسکتا ہے۔

شوکت زمان بظاہر دیکھنے میں کوئی چالیس پینتالیس کا نظر آتا تھا۔ قدرے لمبا قد، ستواں جسم، نفاست سے سنوارے گئے گھنے چمکدار سیاہ بال جن میں کن پٹیوں اور قلموں میں کہیں کہیں سفید بال اپنی جھلک دکھا رہے تھے۔ انتہائی صاف رنگت، چوڑی پیشانی پر گہری سیاہ بھوئیں، سوچ میں ڈوبی روشن سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک اور پتلے پتلے سرخ ہونٹوں کے درمیان گھنی پُروقار مونچھیں جن میں کہیں کہیں سے جھلکتے سفید بال اس کی شخصیت کے وقار میں مزید اضافے کا باعث بن رہے تھے۔ گالوں پر شیو کی تازگی اور صاف رنگت شخصیت کو مزید نکھار رہی تھی۔ قدرے گول اور آگے سے خم کھاتی تھوڑی کو اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی

شہادت والی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے تھام کر دوسرے ہاتھ سے رسالہ پکڑے ایسا پوز بنا رکھا تھا کہ دیکھنے والا اسے کوئی انٹلیکچول سمجھ بیٹھے۔ وہ اعلیٰ تراش خراش کے ایک انتہائی نفیس سے بے داغ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں سیاہ چمکدار چرمی پیشاوری چپل۔ یہ پیراہن نہ صرف اس کی دلکش شخصیت سے میل کھاتا ہوا تھا بلکہ بحیثیت مجموعی اس کی شخصیت کے وقار میں کما حقہ اضافے کا موجب بھی بن رہا تھا۔

”ارے یہ سب کیا گھٹیا چیزیں دکھا رہے ہو۔“ بیگم منیبہ کی اکھڑی ہوئی آواز نے اکرام کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

”جی بیگم صاحبہ! حیرت ہے۔ آپ کو یہ انگوٹھیاں پسند نہ آئیں۔ یہ سوئٹزرلینڈ کی سب سے بڑی ڈائمنڈ جیولری بنانے والی کمپنی سے منگوائی ہیں۔ اِن کی کوالٹی، ڈیزائن اور مہارت کی تو دنیا بھر میں مثالیں دی جاتی ہیں“ اکرام نے اسے قائل کرنے کی خاطر پیشہ وارانہ انداز میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

”تو تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یعنی بیگم منیبہ شوکت کو اچھی اور بری ڈائمنڈ جیولری کا فرق ہی نہیں پتا تم ایک معمولی سیلز پرسن، تم ہو کن ہواؤں میں، میں ساری زندگی ہیروں سے ایسے ہی کھیلتی رہی ہوں ویسے تو شاید تم نے کبھی کنچے بھی نہ کھیلے ہوں گے۔“ بیگم منیبہ غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے گرج کر بولی۔

”ارے بیگم صاحبہ، آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہی ہیں۔ میں نے محض ایک بات ہی تو کہی تھی۔“ اکرام اسے اِس قدر غصہ ہوتے دیکھ کر گھگیاتے ہوئے بولا۔

”تو اب تم مجھ پر الزام بھی لگاؤ گے کہ میں خوامخواہ تم پر ناراض ہو رہی ہوں۔“ اس نے خوامخواہ پر خاص زور دیتے ہوئے کہا۔

اکرام اس کے بگڑے تیور دیکھ کر گھبرا گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اِس بدمست عورت کو قابو کرے۔ ”بیگم صاحبہ! جی وہ میرے کہنے کا ہرگز وہ مقصد نہیں تھا جو آپ سمجھ رہی ہیں۔“

”مجھے اِس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ تمہارے کہنے کا مقصد کیا تھا اور کیا نہیں۔ میں تو تمہاری بدتمیزی پر اپ سیٹ ہو رہی ہوں کہ تم نے پہلے مجھے نا سمجھ کہا۔ پھر دھڑلے سے خوامخواہ غصہ دکھانے کا الزام بھی عائد کر دیا اور اب تو تم نے حد ہی کر دی۔ میں اتنی نا سمجھ ہوں کہ تمہاری بکواس کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ میں پوچھتی ہوں تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم بیگم منیبہ شوکت کے سامنے یوں بڑھ چڑھ کر باتیں بگھارو۔“ اب کی بار اس کا غصہ اپنے عروج پر تھا اور گول پھولا ہوا بھاری بھر کم چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

شوکت زمان صوفے سے اٹھ کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کی طرف آیا اور ہلکی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”کیا بات ہے بیگم، اِس بے چارے سے ایسی کیا خطا ہو گئی جو تم اتنا بگڑ رہی ہو؟“

”دیکھو شوکت!“ اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ ”تم میرے معاملے میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ یہ دو ٹکے کا سیلز مین خود کو سمجھتا کیا ہے۔ مجھے سمجھانے چلا ہے۔ اگر آج میں نے اِس کے ہوش ٹھکانے نہ لگا دیئے تو میرا نام بھی منیبہ بیگم نہیں۔“ وہ تو جیسے کسی کو خاطر میں لانے ہی کو تیار نہ ہو۔ شوکت زمان مزید کچھ کہے بغیر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا دوبارہ صوفے پر جا بیٹھا اور اِس سارے معاملے سے لاتعلق سا ہو کر رسالے میں گم ہو گیا۔

اکرام کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اپنے زیر نگرانی سیلز پرسن لڑکے لڑکیوں کے چہروں کی دبی دبی مسکراہٹیں دیکھ کر بے عزتی کا احساس مزید دوچند ہو رہا تھا۔

شور سن کر احسانی اپنے کمرے سے نکلا۔ اکرام کے چہرے پر اڑتی ہوائیوں اور بیگم منیبہ کا لال سرخ چہرہ دیکھ کر معاملے کی نوعیت کا کچھ کچھ اندازہ تو ہو ہی گیا۔ موقعہ کی نزاکت بھانپتے ہوئے تحکمانہ لہجہ میں اکرام سے مخاطب ہوا۔

”اکرام! کیا معاملہ ہے؟ یہ بیگم صاحبہ اِس قدر ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟“

”ارے یہ کیا بتائے گا۔ میں بتاتی ہوں احسانی تم کو۔ یہ تم نے کیسا گھٹیا سیلز مین رکھ لیا ہے؟ جسے ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے ہم جیسے معزز کسٹمرز سے بات کرنے تک کی تمیز نہیں۔ پچھلی بار بھی اِس نے مجھ سے بدتمیزی کی تھی۔ وہ تو اس روز میں ذرا جلدی میں تھی، اِس کی ٹھیک سے خبر نہ لے سکی۔ آج پہلے مجھے اچھی اور بری ڈائمنڈ جیولری پر لیکچر پلا رہا تھا۔ میں نے کچھ کہا تو لگا الٹا مجھ ہی پہ الزام لگانے کہ میں لاٹ صاحب پر خوامخواہ الزام لگا رہی ہوں اور مجھے اتنی بھی عقل نہیں کہ میں اس گھامڑ کی بکواس سمجھ سکوں۔“

اِس سے پہلے کہ اکرام اپنی صفائی میں کچھ بولتا، احسانی لجاجت بھرے لہجہ میں بولا ”ارے بیگم صاحبہ، لعنت بھیجیں اِس پر۔ آپ میرے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ میں آپ کے شایانِ شان اعلیٰ ترین ڈائمنڈ رنگز خود ذاتی طور پر دکھاؤں گا۔ اِس کم ظرف کی طرف سے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔“ پھر مڑ کر شعلہ بار نگاہوں اور کڑکتے لہجے میں اکرام

سے مخاطب ہوا۔ "جانتے بھی ہو تم کس سے بات کر رہے ہو۔ تمہیں ذرا تمیز نہیں کہ بیگم صاحبہ جیسی معزز ہستی سے کیسے بات کی جاتی ہے۔ فوراً معافی مانگو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمہیں ابھی کھڑے کھڑے نوکری سے ہی نکال دینا پڑے۔"

ایک لحظہ تو اکرام کا جی چاہا کہ وہ اسی وقت نوکری احسانی کے منہ پر دے مارے اور ان دونوں پر لعنت بھیج کر وہاں سے روانہ ہو جائے۔ لیکن فوراً ہی اسے اپنے بیوی بچوں کا خیال آیا۔ اسے یاد آیا کہ کتنی مشکلوں کے بعد تو اسے یہ نوکری ملی تھی۔ اسے اپنی پُرکشش تنخواہ اور کمیشن یاد آیا۔ ناچار آگے بڑھا تو اس کا سامنا بیگم منیبہ کی حقارت بھری نظروں سے ہوا "میں معذرت چاہتا ہوں بیگم صاحبہ اگر میری کوئی بات آپ کو ناگوار گزری ہو۔"

بیگم منیبہ نے اپنا سر جھٹک کر اس پر ایک آخری اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ ہونٹوں پر قہر آلود مسکراہٹ کے ساتھ ایک ہلکی سی ہونہہ کی آواز برآمد ہوئی اور احسانی کے ہمراہ دھیرے دھیرے اس کے کمرے کی جانب چل دی۔

ایک خاتون سیلز پرسن کی مدد سے اکرام ٹرالی میں انگوٹھیوں کے ڈبے باکس سجا کر اسے دھکیلتا احسانی کے کمرے تک لے گیا۔ دونوں نے ٹرالی سے سارے ڈبے ایک ایک کر کے احسانی کی بڑی سی میز پر سجا دیے۔

"اکرام تم یہاں میرے پاس ٹھہرو، جمیلا تم جا کر بیگم صاحبہ کے لیے ان کی پسند کے دو لارج تندوری پیزا فوراً پیزا ہٹ سے منگوا لو اور ہاں جاتے جاتے شوکت زمان صاحب سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اندر ہی آ جائیں۔" احسانی حسب عادت اپنی پوری بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"رہنے دو احسانی۔ بھلا وہ یہاں آ کر کیا کرے گا۔ اسے نہ تو ان چیزوں کی کوئی سمجھ ہے اور نہ ہی کوئی ذوق، اسے وہیں بیٹھے رہنے دو۔ وہ وہیں ٹھیک ہے!" بیگم منیبہ نے بے پروائی کے ساتھ کہا اور پھر سامنے رکھے ڈبے سے ایک انگوٹھی نکال کر انگلی میں پہن کر دیکھنے لگی۔

اکرام نے سوچا کہ شاید شوکت زمان کی حیثیت اپنی مال دار بیوی کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دولت کی لالچ میں اسے ایک موٹی آسامی جانتے ہوئے شادی کی ہو۔ ورنہ اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اتنی پُرکشش شخصیت اور مردانہ وجاہت کا مالک ہوتے ہوئے اس دس من کی دھوبن سے بیاہ رچایا۔

اکرام کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب احسانی نے ڈھیر سارے چھوٹے بڑے ہیرے جڑی ایک بھدی اور موٹی انگوٹھی بیگم منیبہ کو پکڑائی اور بولا "یہ انگوٹھی دیکھیں، جیسے صرف اور صرف آپ کی پروقار شخصیت ہی کو تو مدِ نظر رکھتے ہوئے بنائی گئی ہو۔ بخدا آپ پر بہت جچے گی۔"

بیگم منیبہ نے جیسے ہی انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈالی، احسانی نے اس کی شان میں وہ وہ قصیدے پڑھنا شروع کیے کہ اکرام تو بس دم بخود کھڑا سنتا ہی رہ گیا۔ "میں نا کہتا تھا کہ یہ انگوٹھی تو جیسے محض آپ کی دلکش شخصیت ہی کو دیکھ کر بنائی گئی ہو۔ ذرا دیکھیں تو سہی ماشاء اللہ آپ کی پہلے سے ہی پُررونق شخصیت پر اس انگوٹھی سے کیا بھرپور نکھار آ گیا ہے۔ واللہ آپ کی حسین انگلیوں میں کیسی سج رہی ہے۔ سبحان اللہ! سارے شہر میں اگر اچھی جیولری کو کوئی پرکھ سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف بیگم منیبہ ہی ہیں۔"

کچھ ہی دیر بعد بیگم منیبہ اپنے بھاری بھرکم قیمتی ڈیزائنر ہینڈ بیگ سے چیک بک نکال کر احسانی کی بتائی ہوئی رقم کا اندراج کر رہی تھی جو کہ حسبِ معمول کئی گنا زائد تھی۔ چیک کاٹ کر احسانی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "خیر میرا ارادہ تو کوئی بہت ہی مہنگی انگوٹھی خریدنے کا تھا لیکن کہتے تم سچ ہی ہو۔ یہ انگوٹھی میری شاندار پرسنیلٹی سے بہت میچ کر رہی ہے اور تم نے قیمت بھی اتنی کم بتائی کہ مجھ سے نہ نہیں کہا گیا۔"

احسانی نے چیک پکڑتے ہوئے ایک بار اسے غور سے دیکھا اور پھر ایک گہری کاروباری مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولا "جی بس ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ ہم آپ جیسے معزز کسٹمرز کو ان کے ذوق، معیار اور پسند کی جیولری مناسب داموں پر فراہم کریں۔"

احسانی ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور چپراسی ٹرالی دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ ٹرالی میں رکھا بھاپ اڑاتا پیزا اور دیگر لوازمات دیکھ کر احسانی نے فوراً اکرام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی یہ سب ڈبے یہاں سے اٹھاؤ اور میز خالی کرو۔"

اکرام نے چپراسی کی مدد سے سارے ڈبے ٹرالی میں بھرنا شروع کر دیے۔ گرما گرم پیزا کی اشتہا انگیز خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔ اکرام کو یاد آیا کہ اس نے تو ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ بے اختیار اس کی نظریں گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ وال کلاک پر ساڑھے چار بجے کا وقت بتاتی سوئیاں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ گو کہ اس سارے تماشے میں اس کی بھوک تو نہ جانے کب کی مرچکی تھی البتہ پیزا کی مہک نے

ناک کے رستے پیٹ میں ایک غبار سا بھر دیا۔ وہ انگوٹھیوں والی ٹرالی دھکیل کر تیز تیز چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہال سے گزرتے ہوئے اس کی نظر شوکت زمان پر پڑی۔ وہ ابھی تک رسالے میں ہی گم تھا۔ اکرام اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”ارے شوکت صاحب آپ یہیں تشریف فرما ہیں۔ وہاں احسانی صاحب نے بیگم صاحبہ اور آپ کے لیے بطور خاص تندوری چکن پیزا منگوایا ہوا ہے۔“

اکرام کی بات کے جواب میں شوکت زمان کچھ بولا تو نہیں البتہ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ جھلملائی اور اس نے بناء کچھ کہے اپنا سر نفی میں ہلا دیا اور پھر رسالے میں گم ہوگیا۔ اکرام کو وہ مسکراہٹ کچھ ایسی ہی محسوس ہوئی جیسے کوئی دیرینہ دوست اپنے سنگی ساتھی کی تکلیف اور دکھ کو محسوس کرتے ہوئے ازراہ ہمدردی مسکرا دے۔

کچھ دیر بعد بیگم منیبہ کمرے سے اپنا منہ ٹشو پیپر سے پونچھتی ہوئی احسانی کے ساتھ برآمد ہوئی اور شوکت زمان کی طرف دیکھے بناء ہی خارجی دروازے کی طرف دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ احسانی نے اپنے مخصوص لچھے دار انداز میں اسے الوداع کہا۔ شوکت زمان بھی اس کے پیچھے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اکرام کا جی اب کچھ کھانے کو بالکل بھی نہ چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے منگوائی اور بادل نخواستہ آنے والے گاہکوں کو ماتحت سیلز پرسنز کی مدد سے نمٹاتا رہا۔ ساڑھے سات بجے شوروم بند ہونے کا وقت ہوتے ہی سارا سامان سیف میں بند کروانے کے بعد تیر کی طرح وہاں سے باہر نکلا۔

شوروم کی حبس زدہ فضاء سے باہر آتے ہی اس نے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور کالر کا بٹن کھول کر چند گہرے گہرے سانس لیے۔ ابھی چند قدم ہی چل پایا ہوگا کہ سامنے والی فٹ پاتھ سے لگی ایک نئے ماڈل کی سیاہ لمبی سی گاڑی جس کے شیشے بھی سیاہ ہو رہے تھے کی ہیڈلائٹس ہائی بیم پر دو تین بار جلی اور بجھیں۔ اکرام نے سوچا کہ کہیں یہ اشارے اس کے لیے تو نہیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا سڑک پار کر کے گاڑی تک پہنچا تو ڈرائیور کی جانب والی کھڑکی کا خودکار شیشہ نیچے اترنے لگا۔ اکرام یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص کوئی اور نہیں شوکت زمان تھا۔

”اندر آجاؤ۔“ شوکت زمان نے محض اتنا کہہ کر بٹن دبا دیا۔ اس سے پہلے کہ اکرام کچھ کہہ پاتا شیشہ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ وہ گھوم کر آیا، دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور گاڑی چل پڑی۔

”پہلے تم مجھے اپنے گھر کا پتا بتاؤ تاکہ میں تمہیں گھر ڈراپ کردوں اور راستے میں باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ سردست میں تم سے اپنی بیوی کی جانب سے کی گئی تمام تر بدتمیزیوں کی معذرت چاہتا ہوں۔“ شوکت زمان گاڑی کے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتا ہوا قدرے نیچی مگر واضح آواز میں بولا ”مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری یہ معافی تلافی تمہارے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا مداوا نہیں ہوسکتی۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ شاید اس سے ہم دونوں کے دل کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہوجائے۔“

اکرام نے اپنے گھر کا راستہ سمجھایا اور بولا۔ ”ارے شوکت صاحب، بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”ضرورت! ہوں ہہ......“ شوکت زمان نے پہلے ضرورت پر زور دیا اور پھر ایک زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی طنزیہ آواز برآمد ہوئی۔ ”یہ سب ضرورتوں ہی کا تو کیا دھرا ہے۔ چلو تم ہی بتاؤ بھلا تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی جو تم منیبہ اور احسانی کی وہ بیہودہ گفتگویں سر جھکائے خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ میرے دوست...... سب ضرورتوں کا رچایا ہوا کھیل ہی تو ہے!“ وہ ایک لحہ کو رکا اور ایک گہری سانس لینے کے بعد اسے دھیرے دھیرے اپنی ناک سے خارج کرتے ہوئے بولا ”پہلے ضرورتوں سے ہماری شخصیت میں خلا جنم لیتا ہے۔ اس خلا کو ہم ضرورتوں سے پُر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں لیکن جوں جوں ہم اس خلا کو پُر کرتے جاتے ہیں وہ اور وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ تمہیں ایک بہت مزے کی بات بتاؤں۔ جن چیزوں سے ہم اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں، کون جانے وہ ضرورتیں ہوتی بھی ہیں یا محض دل کا بہلاوا!“

اکرام ہونقوں کی طرح سے شوکت زمان کو بس دیکھے چلا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ بے ارادہ اس کے ہونٹوں سے نکلا ”شوکت صاحب بخدا آپ کیا کہہ رہے ہیں، میری تو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا۔“

”چلو میں تمہیں بہت آسان انداز میں سمجھائے دیتا ہوں۔“ شوکت زمان نے ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ لحہ بھر اکرام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اور احسانی کیا سمجھتے ہو! منیبہ جانتی نہیں کہ تم لوگ جیولری کی دوگنی تگنی قیمت وصول کرتے ہو؟“

''اوہ!'' اکرام ایک ذہنی دھچکے سے دوچار ہوا۔ کچھ دیر توقف کے بعد بولا ''لیکن وہ تو کبھی اس بات کی شکایت نہیں کرتیں اور پھر دوبارہ واپس آ کر پہلے سے بھی مہنگی جیولری کیوں خریدتی ہیں؟''

''اپنے اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے۔'' شوکت زمان کے چہرے پر ایک پُراسراریت سی تھی۔

''یہ آپ بار بار کس خلا کا ذکر کر رہے ہیں؟'' اکرام کے لہجے اور چہرے پر حیرت تھی۔

''دیکھو اکرام، یہ منیبہ جیسے لوگ اپنی شخصیت کا کھوکھلا پن، اس کا خلا، قیمتی اشیاء مہنگے داموں خرید کر اپنی امارت کا ڈھنڈورا پیٹ کر، تو کبھی اپنے مرتبے، عہدے، علم، فن اور ہنر سے دوسروں کو بے عزت کر کے، ان کو کمتر ظاہر کر کے، انہیں نیچا دکھا کر اور ان کے منہ سے اپنے لیے تعریفی کلمات سن کر پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مہنگی چیزیں، احسانی کا خوشامدی لہجہ، شوگر کوٹڈ باتیں، اپنی تعریفیں اور تمہاری بے عزتی کر کے اسے ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اور ایسی فضول شاپنگ تو وہ روز کیا کرتی ہے۔ اس کی سنگھار میز کی درازوں میں رکھے جیولری باکسوں میں انگنت قیمتی زیورات اور وسیع وارڈراب میں بیش قیمت ڈیزائنر ملبوسات، میچنگ پرس اور جوتوں کا ایک انبار لگا ہے کہ جنہیں شاید ایک بار بھی استعمال نہ کیا گیا ہو۔''

''کیا واقعی؟'' شوکت زمان جیسے ہی وقفہ لینے کے لیے رکا اکرام بول پڑا۔

''ہاں! جنہیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے، بناء کچھ کیے، بناء ..... کسی قابلیت و اہلیت کے باپ کا اربوں کا کاروبار، روپیا پیسہ، بینک بیلنس اور جائیداد حاصل ہو جائے۔ جن کے پاس کرنے کو کوئی مثبت و تعمیری سرگرمی نہ ہو۔ جن کی سوچ سطحی سی ہو، تو بھلا وہ یہ نہ کریں تو اور کیا کریں؟''

''تو پھر آپ نے منیبہ بیگم سے شادی؟'' اکرام نے جھجکتے ہوئے سوال ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

''اپنی ذات کے ایک بہت بڑے خلا کو پُر کرنے کے لیے کی تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب......! مطلب ہی کے تو سارے رشتے ہیں یہ دوست! میں آج سے کوئی بیس برس پہلے منیبہ کے باپ گردیزی گروپ آف انڈسٹریز کے مالک عشرت گردیزی مرحوم کا پرائیوٹ سیکریٹری ہوا کرتا تھا۔ منیبہ عشرت گردیزی کی اکلوتی اولاد تھی۔ اکلوتی ہونے کے سبب وہ گردیزی صاحب کی لاڈلی اور منہ چڑھی بھی تھی۔ اس کے آگے پیچھے نوکروں کی ایک فوج ظفر موج مستعد رہا کرتی۔ لاڈ پیار نے اسے اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ وہ اسکول تک جانا گوارا نہ کرتی۔ گردیزی صاحب نے شہر کے نامور تعلیمی ماہرین کو بڑے بڑے معاوضے پر گھر آ کر اسے پڑھانے پر معمور کر رکھا تھا۔ لیکن منیبہ کو پڑھنے لکھنے سے تو جیسے اللہ واسطے کا ہی بیر تھا۔ سو اس نے اپنی تعلیم بھی ادھوری ہی چھوڑ دی۔ وہ اگر گھر سے باہر نکلتی بھی تو صرف شاپنگ کے لیے۔''

''تو پھر آپ دونوں کی شادی؟'' اکرام اس کے سانس لیتے ہی بول پڑا۔

''سمجھوتے کی شادی تھی۔''

''سمجھوتا، کیسا سمجھوتا؟''

''دولت کی تو گردیزی صاحب کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ اعلیٰ ترین حکومتی ایوانوں میں اپنے اثر و رسوخ کے سبب ان کا گروپ ہر بڑا منصوبہ اور ٹینڈر ایک اشارۂ ابرو پر حاصل کر لیا کرتا۔ ان کا بے جا لاڈ پیار اور نوکروں کی فوج منیبہ کو ایک تنکا تک اٹھانے نہ دیتی۔ اس چیز نے اسے حد درجے کاہل اور آرام پسند بنا دیا۔ جس کے نتائج اس کے جسم پر ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن اس بات کی نہ تو کبھی منیبہ اور نہ ہی خود گردیزی صاحب نے کوئی پروا کی۔ حال یہ ہو گیا کہ منیبہ گوشت کے ایک پہاڑ کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک روز گردیزی صاحب نے مجھے اپنے گھر چھٹی والے دن بلوایا۔ میں حیران تھا کہ چھٹی والے روز انہوں نے مجھے کیوں بلوایا ہے۔ اپنے معمول کے مطابق وہ چھٹی کا دن آرام اور سیر سپاٹے کے علاوہ کوئی دوسرا کام کرنا ہرگز پسند نہیں کرتے تھے۔ بہرحال جب میں وہاں پہنچا تو وہ اپنی اسٹڈی میں میرے منتظر تھے۔ مجھے اپنے سامنے بٹھا کر مخاطب ہوئے ''تمہاری تینوں بہنوں کی شادی کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھ سے یہ بات کرنے والے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی معاشی دگرگوں صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ منہ مانگے جہیز کا بندوبست نہ کر سکنے کے سبب ان کی شادیاں کرنے سے قاصر ہوں۔ میری بات سن کر کافی دیر تک وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے کچھ سوچتے رہے پھر بولے ''دیکھو شوکت میں تمہاری تینوں بہنوں کی شادیاں نہایت ہی شاندار طور پر کروا دینے کا وعدہ کرتا ہوں اگر تم میری بیٹی منیبہ سے شادی کر لو۔''

''کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ آخر گردیزی صاحب کہہ کیا

رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے ذہن میں یہ بات واضح ہوئی کہ شاید خدا نے گردیزی صاحب کی شکل میں میری مشکلات کے حل کے لیے ایک فرشتہ بھیج دیا ہے۔ منیبہ کی جسمانی حالت، اس کے منہ پھٹ، بدتمیز و بداخلاق رویے اور مجھ سے کوئی پانچ سال عمر میں بڑے ہونے سے واقف ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی کے ان مسائل جن کے حل کی اُمید میری تمام عمر کی محنت شاقہ کے بعد بھی نہ تھی۔ یوں بیٹھے بٹھائے حل ہوتے دیکھ کر فوری طور پر ہاں کردی۔ میری منیبہ سے شادی ہوجانے کے فوراً بعد ہی گردیزی صاحب نے اپنے وعدے کے عین مطابق میری تینوں بہنوں کی شادی دھوم دھام کے ساتھ کروائی کہ بس دنیا دیکھتی رہ گئی۔ یوں گردیزی صاحب نے اپنی اور اپنی بیٹی کی ذات کا خلا میری ضرورتوں کو خرید کر پُر کرلیا!''

اتنا کہہ کر شوکت زمان اپنا ایک ہاتھ اسٹیرنگ ویل سے اٹھا کر انگلیوں کی مدد سے پیشانی کو یوں رگڑنے لگا جیسے سر درد رفع کرنے کی کوشش کررہا ہو۔

''اور آپ لوگوں کے بچے؟''

''بچے! ہاں اگر ہمارے بچے ہوتے تو شاید کسی حد تک مداوا ہی ہوجاتا ہے!'' وہ قدرے دھیمے بڑبڑاتے ہوئے لہجے میں کچھ یوں بولا جیسے اکرام کے سوال کا جواب نہ دے رہا ہوں خود سے ہی ہم کلام ہو۔

''اوہ! تو آپ دونوں بے اولاد ہیں۔'' اکرام کے لہجے میں تاسف تھا۔

''دنیا بھر کے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ ہر کسی نے یہی کہا ہے کہ جب تک اس کا وزن اِس قدر غیر معمولی طور پر بھاری رہے گا وہ ماں نہ بن سکے گی۔ میری ہزار کوششوں اور منتوں کے باوجود اس نے اپنا وزن کم کرنے کی خود سے کوئی معمولی سی کوشش تک نہ کی۔ ہاں البتہ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے بھاری فیسوں کے عوض مشورے کر کے وزن گھٹانے کی ادویات اور دیگر دستیاب طریقوں کا اندھا دھند و بے تحاشہ استعمال ضرور کیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ سارا وزن بمعہ سود کے چربی کے لوتھڑوں کی صورت میں واپس اس کے جسم پر آن وارد ہوتا۔''

''شوکت صاحب اگر آپ میری بات کا برا نہ مانیں تو...... مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ جب آپ دونوں کے درمیان کچھ بھی نہیں پھر آپ اب تک منیبہ بیگم کے ساتھ کیوں ہیں۔ آپ تو مرد ہیں طلاق بھی دے سکتے ہیں؟''

''نہیں! میں اسے طلاق بھی تو نہیں دے سکتا۔''

''وہ کیوں؟''

''گردیزی صاحب نے یوں تو خود ہی اپنے لاڈ پیار سے اسے بگاڑا تھا لیکن ایک جہاندیدہ انسان ہونے کے ناطے وہ یہ بھی جانتے تھے کوئی بھی انسان ان کی سدا کی بگڑی ہوئی اولاد کے ساتھ زیادہ وقت گزار نہ سکے گا۔ اِسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ میرے پیروں میں بہت بھاری بیڑیاں پہنا گئے۔''

''بیڑیاں! کیسی بیڑیاں؟''

''گردیزی صاحب نے حق مہر تین کروڑ روپے لکھوایا۔ صرف اتنا ہی نہیں انہوں نے میرے اور میری تینوں بہنوں کے دستخط شدہ اسٹمپ پیپرز پر میری تینوں بہنوں کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات کی پائی پائی کا حساب جوڑ کر وہ رقم قرض کے طور پر ظاہر کر کے یہ شرط بھی عائد کردی کہ طلاق کی صورت میں، میری بہنیں اور میں اس رقم کی ادائیگی کے ذمہ دار قرار پائیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ نہ اِس کے پاس اتنی رقم ہوگی اور نہ ہی یہ میری بیٹی کو کبھی طلاق دینے کا سوچ بھی سکے گا۔''

شوکت زمان کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ نظر آئی ''آج سے بیس سال پہلے میں نے اپنی ذات کا خلا گردیزی صاحب کی پیشکش سے پُر کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے لگا کہ اِس ایک قربانی سے میری اور میری بہنوں کی ذات کے سارے خلا پر ہوجائیں گے۔ کاش کہ اس وقت میں گردیزی صاحب کی بجائے اوپر والے کی رحمت پر توکل رکھ کر اپنے زور بازو پر انحصار کرتے ہوئے اپنی خودی کا سودا نہ کرتا تو شاید آج صورت حال قطعاً مختلف ہوتی۔''

اچانک ایک ہلکے سے جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔ اکرام نے چونک کر دیکھا تو اس کا گھر آچکا تھا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ شوکت صاحب۔'' اکرام گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا۔

''شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے کہ آج نہ جانے کتنے برسوں بعد کسی کو اپنے دکھ میں شریک کر کے دل پر پڑے منوں بوجھ کو ہلکا محسوس کررہا ہوں۔'' اس نے ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ اکرام نے گاڑی کا دروازہ دھیرے سے بند کردیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

وہ اس وقت تک کھڑا گاڑی کو دیکھتا رہا جب تک وہ سڑک پر پھیلی دھند کے غبار میں غائب نہ ہوگئی۔ اکرام کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گاڑی شوکت زمان کو لیے کسی گہری و سیاہ خلا میں گم ہوگئی ہو۔

دلدل

محترم معراج رسول

سلام مسنون

اب تک میں صرف سرگزشت کی قاری تھی لیکن فضیلہ اور دردانہ کے حالات سننے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ میں بھی مصنفین کی قطار میں آجائوں، گو کہ اس سے پہلے بھی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں لیکن سرگزشت کے لیے یہ پہلی کوشش ہے، اس روداد میں سبق بھی ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تمام بہنوں کو اسے پڑھنا چاہیے تاکہ ان کی زندگی میں آیا طوفان بروقت رک جائے۔

مریم احتشام

(کراچی)

فضیلہ معمول کے مطابق گھر کے کام نمٹانے میں مصروف تھی۔

وہ خالص مشرقی تہذیب کے سانچوں میں پلی بڑھی تھی۔صبح سویرے اٹھنا، تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت کرنا، فجر کی نماز کے بعد صحن اور ورانڈے میں کچھ دیر چہل قدمی کرنا، پھر باورچی خانہ میں جا کر بہن بھائی کے لیے ناشتا تیار کرنا اس کے معمول میں شامل تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر احساسِ ذمہ داری

بھی بڑھ رہی تھی۔ میٹرک تک اس نے والدین کے اصرار پر اسکول جانا قبول کیا تھا پھر اس کے بعد اس نے گریجویشن تک تمام امتحانات پرائیویٹ دیے اور اچھی پوزیشن سے کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

اس کے والد سرکاری ملازم تھے۔ جس عہدے پر فائز تھے اس میں اوپر کی آمدنی کے بے شمار مواقع تھے لیکن وہ رشوت لینے دینے کو حرام سمجھتے تھے۔ والدہ کا تعلق بھی جس گھرانے سے تھا وہاں مشرقی تہذیب کا بڑا دخل تھا۔ چنانچہ یہ والدین کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ فضیلہ کے اندر احساسِ ذمہ داری کوٹ کوٹ کر بھر گئی تھی۔ وہ گھر کے کام کاج کے علاوہ والدین کی خدمت کو اپنا اولین فرض سمجھتی تھی۔

گریجویشن کے بعد والدین نے اس کی نسبت اپنی پسند سے طے کردی تھی۔ اس موقع پر والدہ نے دبی زبان میں اس کی رائے جاننے کی کوشش بھی کی تھی۔ جواب میں فضیلہ نے مسکرا کر سرِ تسلیم خم کردیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی اپنی کوئی پسند نہیں تھی۔

معمول کے مطابق اس وقت بھی جب اس کے والد ناشتا کر کے دفتر روانہ ہوگئے اور بھائی بہن اسکول اور کالج چلے گئے تو وہ اپنی والدہ کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھ گئی۔ ناشتا کرتے ہوئے اس نے وہ پرانا اخبار بھی اٹھایا جس کی ایک ایک خبر کو وہ کئی بار پڑھ چکی تھی۔ سرسری طور پر وہ عادتاً اخبار کے صفحات الٹ پلٹ رہی تھی کہ ماں کی آواز اس کی قوتِ سماعت سے ٹکرائی۔

''فضیلہ بیٹی! فواد کہہ رہا تھا کہ آج کالج سے واپسی پر اس کے ایک دو کلاس فیلو بھی ساتھ ہوں گے۔ اس کے امتحانات ہونے والے ہیں اس لیے فواد نے گروپ اسٹڈی کا پروگرام بنایا ہے اس کے دوست کھانا بھی یہیں کھائیں گے۔''

فضیلہ چائے کا گھونٹ لیتے لیتے رک گئی۔ اخبار ایک طرف ڈال کر اس نے دور پار خلاؤں میں جھانکا جہاں ایک خوب صورت جوانی کا پیکر بتدریج اس کے خیالوں میں ابھر رہا تھا۔ فضیلہ اس کے تصور ہی سے اپنے وجود کے احاطے میں کسی چھوئی موئی کے پودے کی مانند سمٹ گئی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا جب کچھ عرصہ قبل وہ چہرہ کسی جیتے جاگتے خواب کی مانند اچانک اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس روز وہ شام کو صحن کی کیاری میں لگے پودوں سے پھول اکٹھا کر کے گلدان میں لگانے کی خاطر گھر کے مختصر سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی جہاں ایک اجنبی نوجوان پہلے سے ہی موجود تھا۔

فضیلہ اس کی غیر متوقع موجودگی سے قطعاً لاعلم تھی۔ اس لیے اس کی زبان پر غیر اختیاری طور پر سوال آگیا۔ ''آپ کون؟''

نوجوان اس کی آواز سن کر مہذب انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں فضیلہ کے خوب صورت وجود پر جم کے رہ گئیں۔ پھر اس نے بڑے مہذب انداز میں اپنا تعارف بھی کرادیا۔ ''خاکسار کو شرجیل کہتے ہیں۔ میں فواد سے ملنے آیا ہوں۔''

فضیلہ سر پر دوپٹا ٹھیک کرتی الٹے قدموں دل کی دھڑکنیں سنبھالتی ڈرائنگ روم سے باہر آگئی۔ پہلی بار نظروں کا وہ غیر متوقع مگر حسین تصادم اس کے وجود میں جیسے کھب کر رہ گیا۔ تادیر وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی۔ ایک لمحے کی وہ اچانک اور غیر متوقع ملاقات فضیلہ کے اعصاب سے کسی جونک کی طرح چمٹ کر رہ گئی تھی۔

اس دن کے بعد کئی بار اس نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن لاکھ چاہنے کے باوجود وہ شرجیل کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اتنا ضرور ہوا کہ گزرتے وقت کے ساتھ شرجیل کا تصور دھندلانے لگا۔ لیکن آج جب ماں نے فواد کے دوستوں کے آنے کا ذکر کیا تو فضیلہ کے ذہن میں دبی دبی چنگاریاں پھر چٹخنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں سرائیت کرگئی۔

وہ کسی سے منسوب ہونے کے بعد اس کی امانت بن چکی تھی۔ اس امانت میں خیانت جرم تھا۔ کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی گناہ تھا۔ اس کے دل کا چور اگر پکڑا جاتا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ اس کی سہیلیاں اور گھر والے کیا سوچتے۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی جب ماں کی آواز دوبارہ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''کیا سوچ رہی ہو فضیلہ؟ پرانے اخبار میں تم نے کون سی نئی خبر پڑھ لی؟''

ماں کی آواز سن کر اس نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالا۔ جلدی سے بات کو سنبھالنے کی خاطر کہا۔ ''میں سوچ رہی تھی کہ مٹر پلاؤ اور شامی کباب تیار کرلوں۔ فواد کو مٹر پلاؤ بہت پسند ہے۔ میٹھے میں سویاں بنالوں گی۔ آپ کا کیا خیال

ہے؟"

"تم نے جو سوچا ہے وہ مناسب رہے گا۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ سویوں کی بجائے کیوڑ رکھ دیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔" ماں نے دبی دبی زبان میں کہا۔

"ایسا کیوں امی؟ سویاں تو آپ بھی بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔"

"ہاں......لیکن ہمیں اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔" ماں نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "تمہارے والد کی آمدنی اتنی نہیں کہ ہم ہاتھ کھول کر خرچ کرسکیں۔"

"چلیں......جیسی آپ کی مرضی۔" فضیلہ نے بڑے لاڈ سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ اب تو فواد بھی آخری سال میں ہے۔ دو مہینے میں نتیجہ آنے کے بعد وہ بھی ملازمت کرلے گا پھر ہم جی بھر کے خوشیاں منائیں گے۔"

جواب میں ماں نے بھی فضیلہ کی خاطر اپنے سوکھے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم سجالیا۔ کچھ دیر وہ فضیلہ کو زمانے کی اونچ نیچ کے بارے میں سمجھاتی رہیں پھر اپنے کمرے میں گئیں تو فضیلہ بھی برتن سمیٹ کر باورچی خانہ میں چلی گئی۔

دوپہر کو فواد کے دوستوں کے لیے کھانا تیار کرتے وقت اس کے ذہن میں شرجیل کا خیال دوبارہ ابھرا۔ فضیلہ کے ذہن میں ایک آرزو نے کروٹ لی۔ "اگر شرجیل بھی آگیا تو اس کا دیدار ایک بار پھر نصیب ہوجائے گا۔" دل میں ابھرنے والی اس خواہش کے احساس سے اس کا وجود سرشار ہوگیا۔ تادیر وہ خوابوں کی دنیا میں ہچکولے کھاتی رہی۔ پھر ماں نے آواز دی تو خیالات کے تانے بانے بکھر گئے۔ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی وہ 'آئی امی' کہتی ہوئی کچن سے باہر آگئی۔ ہوا کے دوش پر تعمیر کردہ تصورات کا حسین تاج محل بھی کرچی کرچی ہوگیا۔

شام کے کھانے کے وقت جب ڈرائنگ روم میں فواد کے دوست جمع ہوئے تو فضیلہ کے ذہن میں ایک بار پھر شرجیل کا تصور کروٹیں بدلنے لگا۔ اس نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "نادان لڑکی اب بھی وقت ہے شرجیل کا خیال دل سے نکال دے، ورنہ کہیں یہ راز کھل گیا تو......تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ ماں باپ کی نظروں سے گرجائے گی۔ سکھیوں میں بدنام ہوگی۔ اپنے قدموں کو لگام دے تو جس راستے پر بڑھ رہی ہے اس کے آگے دلدل ہے۔ دلدل میں ایک بار الجھی تو پھر سنبھلنے کا موقع تیرے اختیار میں نہیں رہے گا۔ اندر ہی اندر دھنستی چلی جائے گی۔ تو کسی اور کی امانت ہے۔ اس امانت میں خیانت سنگین جرم ہے اس جرم کا ارتکاب گناہ ہے۔"

فضیلہ نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا لیکن وقت کی گردش پھر اس کے آڑے آگئی۔ جب وہ ڈرائنگ روم کے ادھ کھلے دروازے کی اوٹ میں کھڑی فواد کو کھانے کی ڈشیں پکڑا رہی تھی۔ فواد ایک ڈش لے کر اندر گیا تو شرجیل دوستوں کی کسی بات پر قہقہہ لگاتا فضیلہ کی نگاہوں کی زد میں آگیا۔ اس کی نظریں یوں ہی دروازے کی سمت پلٹیں تو ایک بار پھر فضیلہ کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں۔ فضیلہ نے خود کو جلدی سے دروازے کی اوٹ میں کرلیا مگر دل کی تیز ہونے والی دھڑکنوں کو سنبھال نہ سکی۔

اس رات وہ تادیر بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ اپنے دل کو سمجھاتی رہی۔ شرجیل کے تصور سے نجات پانے کے لیے بہانے تلاش کرتی رہی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ اس نے جب پہلی بار کسی کتاب میں پہلی نظر میں محبت ہوجانے کے بارے میں پڑھا تھا تو اسے حماقت اور ذہن کا فتور سمجھ کر حقارت سے نظریں پھیر لیں تھیں لیکن آج......آج وہ خود

ممنون حسین

(23 دسمبر 1940ء...)

ممتاز تاجر اور سابق گورنر سندھ۔ وہ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ ہجرت کر کے کراچی آئے۔ انہوں نے وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی بعدازاں انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن سے ایم بی اے کی ڈگری لی۔ بنیادی طور پر ایک تاجر ہیں اور کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر وہ تجارت وصنعت کراچی کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ مسلم لیگ سندھ کے سیکریٹری فنانس کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ وہ وزیراعلیٰ کے مشیر برائے سماجی بہبود بھی رہے۔ انہوں نے جون 1999ء میں گورنر سندھ کا عہدہ سنبھالا اور اکتوبر 1999ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ان دنوں صدر پاکستان ہیں۔

مرسلہ: آصفہ بتول۔ پتوکی

اس کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔
شکار جو زخمی ہو کر پھڑ پھڑاتا ہے پھر دم توڑ دیتا ہے!
فضیلہ بھی اسی کشمکش میں مبتلا تھی جب نیند کے خمار نے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

☆......☆

وقت کا پنچھی پر پھیلائے اڑتا رہا۔ دن یونہی ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ پھر وہ وقت بھی قریب آ گیا جب فضیلہ کو بابل کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر آباد کرنے کو رخصت ہونا تھا۔

آج فضیلہ کو مایوں بیٹھنا تھا۔ پاس پڑوس کی جاننے والیاں اور فضیلہ کی سہیلیاں بھی جمع تھیں۔ فضیلہ زرد رنگ کے لباس میں ملبوس صحن میں بچھی چوکی پر گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی سب سے عزیز اور بے تکلف سہیلی دردانہ بڑے پیار سے اس کے ہاتھوں میں مہندی لگا رہی تھی۔ بے تکلف سہیلیوں کے کاٹ دار جملے بھی فضیلہ کے ارمانوں کو گدگدا رہے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر موقع کے اعتبار سے ایک گیت گونج رہا تھا۔

سجناں آئے ہیں ڈولی لائے ہیں
اب تو بڑھاؤ میری شان
تاروں سے بھر دو میری مانگ!!

گھر والے بھی خوش تھے لیکن فضیلہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ اس وقت بھی وہ نفسیاتی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ماں باپ نے جہاں اس کی بات طے کی تھی فضیلہ نے اس پر گردن جھکا کر ہاں کر دی تھی مگر دل میں شرجیل کے بس جانے کے بعد وہ اکثر سوچتی۔ ''کاش شرجیل اس کا جیون ساتھی بن جاتا۔''

اس موقع پر جب وہ خواب اور حقیقت کے درمیان ہونے والی رسہ کشی میں مبتلا تھی تو دردانہ نے مدھم لہجے میں سرگوشی کی۔ ''مسز فضیلہ سعد الدین۔ آپ اس وقت اس قدر سنجیدہ کیوں ہیں؟ کس کی یاد ستا رہی ہے؟''

''کیا بکواس کر رہی ہے؟'' فضیلہ اس جملے کی کسک محسوس کر کے ایک دم ہی برہم ہو گئی۔ دل کی دھڑکنوں میں ابال آیا تو آنسوؤں کے دو قطرے اس کی پلکوں سے ڈھلک گئے۔

''ارے پگلی...... یہ کیا؟'' دردانہ نے اپنے آنچل سے اس کی آنکھوں اور چہرے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو تجھے چھیڑ رہی تھی یونہی......''

دردانہ کی معصوم معذرت سن کر فضیلہ نے اسے بے اختیار گلے لگا لیا۔ وہ اس کی سب سے عزیز سہیلی تھی۔ وہ اسے ناراض نہیں کر سکتی تھی اور...... دل کا وہ بھید بھی نہیں بتا سکتی تھی جو طوفان بن کر اس کے وجود سے بار بار ٹکرا رہا تھا۔ شرجیل کا بھید زبان پر آتا تو پرایا ہو جاتا۔ کسی تیسرے کو سن گن مل جاتی تو وہ ماں باپ کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی۔

''فضیلہ...... میں تیری بچپن کی سہیلی ہوں۔'' دردانہ نے محبت سے فضیلہ کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہوئے سرگوشی کی ''بابل کا گھر چھوڑتے ہوئے سب ہی اداس ہو جاتے ہیں لیکن...... کل جب سعد الدین کی محبت تجھے راس آ جائے گی تو ہمیں بھول کر بھی تو یاد نہیں کرے گی۔ کیوں؟ غلط تو نہیں کہہ رہی؟''

فضیلہ نہ چاہنے کے باوجود مسکرا دی۔ اس پھیکے تبسم کی اوٹ میں بھی شرجیل کا تصور اس کے دل کے نہاں خانوں میں رہ رہ کر سر ابھار رہا تھا۔ پہلی نظر کا تصادم اس درجے حد سے گزر جائے گا اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ ہزار ہا کوششوں کے باوجود وہ شرجیل کے خیال سے چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔

ایک ہفتے تک گھر کے آنگن میں خوشیوں کے رنگ بکھرے رہے اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب وہ دلہن کا سرخ جوڑا پہن کر قرآن کے سائے تلے ماں کی دعائیں سمیٹتی اپنے گھر کی دہلیز عبور کر کے ایک نیا گھر بسانے کو رخصت ہو گئی۔

☆......☆

سعد الدین یوں تو بھلے آدمی تھے لیکن کم گو واقع ہوئے تھے۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن جب کرتے تھے تو خوش مزاجی سے کرتے تھے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ نہ صرف اپنے کام خود کرتے تھے بلکہ فرصت کے اوقات میں گھر کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

فضیلہ کی طرح انہوں نے بھی گھر والوں کی پسند سے شادی کی تھی۔ اس کا اظہار انہوں نے پہلی رات ہی کو بڑے خوب صورت انداز میں اس وقت کیا تھا جب فضیلہ پھولوں کی سیج پر سمٹی سمٹائی، گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ سعد الدین کے قدموں کی آواز کمرے کی دہلیز سے ابھر کر جیسے جیسے قریب آتی گئی فضیلہ کے دل کی دھڑکنیں بتدریج بڑھتی گئیں۔

قریب آ کر وہ فضیلہ کے پاس بیٹھ گئے۔ اس کا گھونگھٹ اٹھا کر نئی دلہن کے چمکتے دمکتے چہرے کی جھلملاتی افشاں دیکھ کر بڑے پیار سے بولے۔ ''ماشاء اللہ! میں نے

آنکھ بند کرکے جو لاٹری کھیلی تھی اس کا انعام میری توقع سے بڑھ کر نکلا۔''

شوہر کی زبانی اپنی تعریف سن کر فضیلہ چھوئی موئی کے پودے کی طرح اور سمٹ گئی۔ سعد الدین کچھ دیر فضیلہ کی تعریف کرتے رہے پھر بڑے معصوم لہجے میں بولے۔ ''آپ بھی آنکھیں کھول کر ایک نظر مجھے دیکھ لیں۔ میں آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔ یقین جانیں جب تک آپ نہ کہیں گی میں آنکھیں نہ کھولوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ بھی کھلے دل اور صاف گوئی سے اس محبت کا اظہار کردیں کہ خاکسار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

فضیلہ چکرا کر رہ گئی۔ کیا جواب دیتی۔ گردن جھکائے دل کی دھڑکنوں کا شمار کررہی تھی جب سعد الدین نے محبت بھرے لہجے میں بڑے خلوص سے کہا۔ ''آج سے آپ اس گھر کی مالکن ہیں۔ یہ بات میں صدقِ دل سے کہہ رہا ہوں۔''

فضیلہ بدستور خاموش رہی۔ سعد الدین کے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔ خلوص تھا۔ محبت تھی۔ اسی ہنسی خوشی کے ساتھ سہاگ رات بیت گئی۔

اگلے دن صبح سویرے فضیلہ تیار ہوئی اور حسبِ معمول خدا کے حضور سربسجود ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہوکر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے گڑگڑا کر کہا۔ ''میرے معبود! تو انسان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تو دلوں کے بھید سے بھی واقف ہوگا۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں ابھی تک اپنے ذہن سے شرجیل کا خیال جھٹکنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی اس لیے تیرے حضور دعا گو ہوں کہ مجھے اس تصور سے نجات دلا دے۔ اس خیال کو بھی میرے دل سے کھرچ کر نکال دے۔ جو اگر کبھی میری زبان تک آگیا تو بے گناہ ہونے کے باوجود کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ تو جو چاہتا ہے وہ ہوجاتا ہے میرے مالک۔ میں نے جس گھر کی دہلیز پر قدم رکھا ہے اسے آباد رکھنے میں میری مدد فرما۔ مجھ پر اتنا کرم کر کہ شرجیل کی یادوں سے چھٹکارا عطا فرمادے۔''

دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو فضیلہ نے دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا۔ پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا جہاں اس کی ساس موجود تھیں۔ فضیلہ نے سر جھکا کر ادب سے سلام کیا تو ساس نے بھی سینکڑوں دعائیں دے ڈالیں۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے کمرے میں سعد الدین کے ساتھ ناشتا کیا۔ پھر سسرال والوں کی دعائیں سمیٹتی رواج کے مطابق اپنے گھر آگئی جہاں حسب توقع اس کا پُرتپاک استقبال ہوا۔ سہیلیوں نے اسے گھیر کر ایسے ایسے سوال کیے کہ وہ لجا کر رہ گئی۔

دوپہر کو کھانے پر اس کے والد اور بھائی بھی موجود تھے۔ فضیلہ اس وقت کچھ سکون محسوس کررہی تھی جب فواد نے ماں سے کہا۔ ''امی! میرے دوست شرجیل کی والدہ آپ سے ملنے آنا چاہتی ہیں۔'' شرجیل کا نام سن کر فضیلہ کی تھمی تھمی دھڑکنیں دوبارہ سر ابھارنے لگیں۔

''جب چاہیں آجائیں۔ اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔'' ماں نے فواد سے کہا۔ پھر یونہی ایک سوال ان کے ہونٹوں پر آگیا۔ ''پہلے تو وہ کبھی نہیں آئیں پھر اب کس سلسلے میں......''

''ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے امی۔'' فواد نے مسکرا کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''دراصل شرجیل کی امی اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ یہاں ان کے زیادہ واقف کار نہیں ہیں اس لیے وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''چشم ما روشن دل ماشاد۔'' ماں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''شرجیل میرا بھی دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ میں اس کام میں اس کی ماں کا ہاتھ ضرور بٹاؤں گی۔''

فضیلہ نظریں جھکا کر چور بنی بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن میں وسوسے ابھرنے لگے، کئی مبہم سوالات سر اٹھانے لگے۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ شرجیل نے اسے پسند کررکھا ہو؟ لیکن جب وہ اس کی شادی میں شریک ہوچکا ہے تو اب اپنی امی کو کیوں بھیج رہا ہے؟ وہ ایسا کیوں کررہا ہے؟ کیا جان بوجھ کر وہ فضیلہ کو کچوکے لگانا چاہتا ہے؟ مگر کیوں؟''

فضیلہ جو کل رات سے قدرے پُرسکون تھی۔ دوبارہ اسی ذہنی کشمکش کا شکار ہوگئی۔ اس رات اس نے اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر اس ذہنی الجھن کے حل کے لیے التجا کی۔ اس کی دعاؤں کا اثر تھا جس نے وقتی طور پر اسے شرجیل کے تصور سے نجات دلا دی لیکن اس رات جب وہ سونے کے ارادے سے بستر پر لیٹی تو اس کے دل کی گہرائیوں میں دبا ہوا طوفان پھر سر ابھارنے لگا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی سوچیں ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں میں پرواز کررہی تھیں جب یکلخت ایک نیا خیال اس کے ذہن میں بجلی بن کر کوندا۔

کیوں نہ وہ ماں کو آمادہ کرے کہ شرجیل کی شادی دردانہ سے کرا دی جائے۔ اس خیال سے اس کے دل کی دھڑکنوں کو قدرے سکون ملا۔ اس نے سوچا کہ دردانہ اور شرجیل کی شادی ہوگئی تو وہ دردانہ سے ملنے کے بہانے شرجیل کو قریب سے دیکھ لیا کرے گی۔

ضروری تو نہیں کہ زندگی میں ہر پسندیدہ شے کو زور آوری سے جھپٹ کر اپنا لیا جائے۔ کچھ چیزوں اور لوگوں کو قریب سے دیکھ لینے کے بعد بھی خوش ہوا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ دردانہ بھی غیر نہیں تھی۔ اس کو شرجیل کا رشتہ مل گیا تو شاید وہ خوش رہے گی۔ بہت سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

ان خیالوں کے تانے بانے بنتے بنتے فضیلہ کی آنکھ لگ گئی۔ دوسری صبح وہ بیدار ہوئی تو اس نے پہلی فرصت میں شرجیل اور دردانہ کا ذکر ماں سے کیا۔

''جو خیال تمہیں آیا وہ مجھے آنا چاہیے تھا۔'' ماں نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''میں نے کبھی تمہارے اور دردانہ کے درمیان فاصلہ نہیں پیدا ہونے دیا۔ بالکل سگی بہنوں کی طرح سمجھا ہے۔''

''آپ کا دل کیا کہتا ہے۔'' فضیلہ نے ماں کا دل ٹٹولنا چاہا۔ ''کیا دردانہ کے لیے شرجیل کی امی رضا مند ہو جائیں گی؟''

''اس کا حل نکالنا میرے لیے دشوار نہیں ہوگا۔'' ماں نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ''جس دن شرجیل کی امی آئیں گی۔ میں دردانہ کو بھی کسی بہانے سے بلا لوں گی۔ میرا دل کہتا ہے شرجیل کی ماں خود ہی شرجیل کے لیے دردانہ کو پرپوز کردیں گی۔''

ماں کا جواب سن کر جیسے فضیلہ کو سکون مل گیا۔ دو دن میکے میں رہ کر وہ دوبارہ سسرال چلی گئی۔ فضیلہ کے ذہن میں رہ رہ کر دردانہ اور شرجیل کے رشتے کے طے ہونے یا نہ ہونے کا خیال گڈمڈ ہو رہا تھا۔ اس نے سسرال والوں کی دل جوئی کی خاطر ہونٹوں پر ایک تبسم ضرور سجا لیا تھا لیکن وہ محض دنیا دکھاوے کے لیے تھا۔

ایک ہفتہ اسی کشمکش و پیچ میں گزر گیا پھر اس دن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ماں نے فون کر کے اطلاع دی تھی کہ شرجیل کی ماں نے نہ صرف دردانہ کو پسند کرلیا تھا بلکہ باہمی تبادلہ خیالات کے بعد ایک ماہ بعد کی تاریخ بھی طے کردی تھی۔

''اب وہ شرجیل کو قریب سے جی بھر کر دیکھ سکے گی۔ اس سے کھل کر باتیں کر سکے گی۔'' یہ خیال فضیلہ کے تسکین قلب کے لیے بے حد خوش کن تھا۔

سعد الدین، بیوی کے اندر ہونے والی دھوپ چھاؤں کو دیکھتے رہے۔ پھر جب فضیلہ نے ماں سے فون پر گفتگو کی اور اس کے چہرے پر مسرتوں کا رنگ نکھرا تو سعد الدین نے دبی زبان میں بڑے پیار سے اسے مخاطب کیا۔ ''آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ اجازت ہے؟''

''کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہوگئی ہے؟'' فضیلہ نے شوہر کی نظروں میں دور تک جھانکا۔

''جی نہیں۔''

''پھر یہ اجازت کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ اسی انداز میں ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہیں۔'' سعد الدین نے فضیلہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''کوشش کروں گی کہ خود کو آپ کی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال سکوں لیکن...... انسان کا مزاج بھی موسموں اور رتوں کی طرح بدلتا رہتا ہے۔'' فضیلہ نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''دھوپ چھاؤں کے اس قدرتی نظام کو......''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' سعد الدین نے اس کا جملہ کاٹ کر بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ ''اس وقت آپ کی امی جان نے کیا خوش خبری سنائی تھی؟''

''وہ......وہ......'' فضیلہ ڈگمگاتے ڈگمگاتے سنبھل کر بولی۔ ''میری سب سے عزیز سہیلی دردانہ کے رشتے کی بات اس کی خواہش کے عین مطابق طے ہوگئی ہے۔''

''دردانہ بے حد باغ و بہار طبیعت کی مالک ہے۔ پہلی بار آپ کے حوالے سے مجھ سے ایسے ہی انداز میں کھل مل کر چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی جیسے آپ کی سگی بہن ہو۔''

''آپ کا اندازہ صد فیصد صحیح ہے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔''

''یہ بھی اس کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے جسے چاہا تھا اسی سے منسوب ہو رہی ہے۔ ورنہ عام طور سے ایسا نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب؟'' فضیلہ نے اپنے دل کا چور چھپانے کی خاطر شوہر کو وضاحت طلب نظر سے دیکھا۔ ''کیا آپ

کے ساتھ شادی کے معاملے میں کوئی ناانصافی ہوگئی ہے؟"
"کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔" سعد الدین نے مبہم انداز میں جواب دیا۔
"کون تھی وہ؟"
"تھی میرے تصور کی معصوم خواہش مگر......" سعد الدین نے ایک لمحے کی سنجیدگی اختیار کی پھر فضیلہ کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر کہا۔ "وہ آپ سے زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔"
"اب آپ شاید بات بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"
"جی نہیں۔" سعد الدین نے فضیلہ کی گردن میں بانہیں ڈال کر مدھم انداز میں کہا۔ "وہ محض ایک تصور تھی لیکن آپ سے زیادہ حسین نہیں تھی۔"

اسی وقت دروازے کے نزدیک کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو فضیلہ اور سعد الدین دونوں سنبھل گئے۔

وقت کا پہیا اپنے محور پر گردش کرتا رہا۔

فضیلہ نے شرجیل اور دردانہ کے بارے میں جو تجویز ماں کو دی تھی وہ پوری ہوگئی۔ شرجیل اور دردانہ کے درمیان تمام مراحل خوش اسلوبی سے طے ہوگئے۔ شرجیل کی ماں نے دردانہ کو پہلی ہی نظر میں پسند کرلیا۔ دونوں ہی خوش شکل، تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی دیگر تمام معاملات بھی باہمی رضامندی اور خوش اسلوبی سے طے پاگئے۔ فضیلہ کے گھر والوں نے تمام مسائل حل کروانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب منگنی کی تقریب میں فضیلہ اور شرجیل آمنے سامنے موجود تھے۔ اس روز فضیلہ کو پہلی بار موقع ملا تھا کہ وہ شرجیل کو نظر بھر کے دیکھ سکی تھی۔ خوشی کے اس موقع پر شرجیل کی نظریں بھی بار بار ان لڑکیوں کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اس موقع کی مناسبت سے فقرے چست کر رہی تھیں۔ ان ہی ہنگاموں کے درمیان ایک بار شرجیل اور فضیلہ کی نظریں بھی ٹکرا گئیں۔

شرجیل نے فواد کا دوست ہونے کی وجہ سے جلدی سے نظریں جھکالیں لیکن اس کی یہ ادا بھی فضیلہ کے دل میں کھب کر رہ گئی۔

دل میں دبی دبی چنگاریاں چٹخنے لگیں۔ ایک پل کو اس کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال ابھرا۔ "اگر وہ اس وقت دردانہ کی جگہ ہوتی تو شرجیل کی ہم نوا بن کر خود کو دنیا کی

سب سے خوش نصیب دلہن تصور کرتی۔ اس کا محبوب اسے مل جاتا۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر زندگی کی طویل شاہراہ پر مسکراتے۔ خوشیوں کے نغمے الاپتے۔ دو جان ایک قالب بن کر رہتے اور...... اور......"

وہ پہلا موقع تھا جب زندگی میں فضیلہ نے اپنی قریب ترین اور عزیز سہیلی کو اپنا نصیب سمجھا تھا۔ حسد کی چنگاریاں اسے جھلسانے لگیں۔ چند لمحے قبل اسے شرجیل کے قرب سے جو سکون مل رہا تھا وہ غارت ہو کر رہ گیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دے۔ لیکن اس نے خود پر قابو کرنے کی کوشش کی۔ دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی شرجیل سے دور جا کر بیٹھ گئی۔ پھر وہ منگنی کی رسم پوری ہونے سے پیشتر ہی طبیعت کی اچانک خرابی کا بہانہ کر کے شوہر کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی۔

"خیریت تو ہے؟" گھر پہنچ کر سعد الدین نے پوچھا۔ "آپ رسم ختم ہونے سے پہلے ہی اٹھ گئیں۔"

"سر درد کے سبب مجھے چکر آ رہا تھا۔" فضیلہ نے خوب صورتی سے بات بنائی پھر آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ سعد الدین نے فضیلہ کو سر درد کی گولی اور گرما گرم چائے بنا کر دی جسے فضیلہ نے زبردستی حلق سے نیچے اتار لیا۔

اس رات فضیلہ ایک پل کو بھی نہ سو سکی۔ آنکھیں موندھے خیالات کے سمندر میں غوطے کھاتی رہی۔ دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگتی رہی کہ کسی طرح وہ شرجیل کے خیالات سے چھٹکارا پالے، جو جونک کی طرح اس کے وجود سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں متعدد خیالات آ رہے تھے۔ پھر اس نے دل پر جبر کر کے ایک آخری فیصلہ کر لیا۔ شرجیل کی نظروں سے دور رہنے کا فیصلہ۔ اس فیصلے پر عمل کرنے کی صورت میں اس کو اپنی عزیز ترین سہیلی سے بھی منہ پھیرنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑتی لیکن یہی ایک واحد صورت تھی جس پر عمل کر کے وہ اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر سکتی تھی۔

خیالوں کے اس ہجوم میں اسے خود اپنے آپ سے بھی نفرت ہو رہی تھی اگر اس نے دردانہ اور شرجیل کی شادی کی تجویز ماں کو پیش نہ کی ہوتی تو یہ صورت حال بھی پیش نہ آتی جس نے اس کی ازدواجی زندگی میں ایک چنگاری کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ چنگاری بھڑک کر اگر شعلے کا روپ اختیار کرتی تو سب کچھ جل بھن کر خاک ہو جاتا۔ شوہر کے علاوہ اس کے اپنے بھی اس کی جانب سے نظریں پھیر لیتے۔ وہ

کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی...... اور......

فضیلہ نے بالآخر ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ زندگی میں اب کبھی شرجیل کے سامنے نہیں جائے گی۔ اس کی یادوں کو ہر قیمت پر دل کی گہرائیوں سے کھرچ کھرچ کر نکال دے گی۔ دردانہ کی شادی میں بھی شرکت سے انکار کر دے گی۔ خواہ اسے دردانہ کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

خیالات کے اس ہجوم میں وہ خدا سے یہ دعا کر رہی تھی کہ وہ کوئی ایسی صورت پیدا کر دے کہ وہ بدنام ہوئے بغیر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جائے۔ وہ پابندی سے نماز پڑھنے کی عادی تھی۔ ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر وہ دعائیں مانگتی تھی اور اس دن اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب سعد الدین نے دفتر سے واپسی پر اسے یہ بتایا کہ انہیں دفتر کی طرف سے کچھ عرصے کے لیے اسلام آباد جانا ہے اس خبر کو سن کر فضیلہ نے صدقِ دل سے خدا کا شکر ادا کیا۔ فرار کا یہ موقع اس کے لیے قدرت کا ایک عطیہ تھا۔ اس لیے کہ ڈیڑھ ماہ بعد ہی شرجیل اور دردانہ کی شادی تھی۔

فضیلہ نے سعد الدین کے ساتھ جانے کی ضد کی۔ جواب میں سعد الدین نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کر لے مگر فضیلہ کے بے حد اصرار پر انہیں سر جھکانا پڑا۔ فضیلہ نے گھر جا کر اپنے والدین کو اس بارے میں بتایا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ اس کی عدم شرکت دردانہ کو شدت سے محسوس ہوگی۔ فضیلہ نے ماں کو تسلی دی کہ وہ واپس آ کر دردانہ کو منا لے گی پھر اس کے بعد وہ رختِ سفر باندھ کر شوہر کے ساتھ اسلام آباد چلی گئی۔

شرجیل سے دور چلے جانے کے بعد اس نے ماضی کی تلخ یادوں کو بھلانے کے لیے خود کو گھر کے کاموں میں مصروف کر لیا۔ سعد الدین کو دفتر کی جانب سے جو کوارٹر ملا تھا وہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ سب سے الگ تھلگ ہو کر وہ شب و روز اپنے اس گھر کو سجانے سنوارنے میں مصروف رہتی۔ ایک ہفتے تک کھانا ہوٹل سے آتا رہا پھر فضیلہ نے سودا سلف منگوا کر خود ہی کھانا پکانا شروع کر دیا۔ سعد الدین جب گھر پر ہوتے تھے تو ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ایک دن دفتر سے واپسی پر انہوں نے فضیلہ سے دبی زبان میں کہا۔

"میں یہاں آڈٹ کرنے کی خاطر بھیجا گیا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ یہ کام دو تین ہفتے میں مکمل ہو جائے گا لیکن یہاں جو بدعنوانیاں سامنے آئی ہیں انہیں دیکھ کر واپسی کے وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے مرکزی دفتر کو

درخواست بھیجی تھی کہ یہ کام کسی اور کو سونپ دیا جائے لیکن افسران بالا بضد ہیں کہ مکمل رپورٹ مجھ ہی کو بنانی ہے۔ اس صورت میں مجھے آٹھ نو مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔''

''پھر آپ کو ایسی کیا جلدی ہے۔'' فضیلہ نے پوچھا۔ ''کیا گھر یاد آرہا ہے؟''

''نہیں میرے گھر والے میرے کام کی نوعیت سے واقف ہیں لیکن مجھے آپ کا خیال ہے۔'' سعدالدین کے لہجے میں اپنائیت اور پیار کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

''آپ بھول رہے ہیں کہ مجھے اب زندگی کا سفر آپ کے ساتھ ہی پورا کرنا ہے۔ شادی کے بعد لڑکیاں پرائی ہو جاتی ہیں۔'' فضیلہ نے خلوص دل سے جواب دیا۔ پھر شوہر کو چھیڑنے کی خاطر کہا۔ ''ہاں اگر آپ کا دل بھر گیا تو......''

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' سعدالدین نے گڑبڑا کر کہا اور پھر بے اختیار فضیلہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے بولے۔ ''آپ کو پالینے کے بعد تو میری زندگی مکمل ہوگئی ہے۔''

فضیلہ نے جواب میں شوہر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور ان کے شانوں پر سر رکھ کر خوابوں میں گم ہوگئی۔

شوہر کے مضبوط سہارے اور بے پایاں محبت نے فضیلہ کو سنبھلنے میں مدد کی تو وہ آہستہ آہستہ ماضی سے چھٹکارا پانے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ شرجیل کا خیال بھی دھندلانے لگا تھا جب ایک دن ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔ لفافے پر جو تحریر تھی وہ اس کے بھائی یا والد کی نہیں تھی۔ فضیلہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔ وہ خط دردانہ کا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

میری عزیز ترین فضیلہ

ہمیشہ خوش رہو، مسکراتی رہو

اُمید ہے تم بمعہ دولہا بھائی بخیر و عافیت ہوگی اور اسلام آباد کے پرفضا مقامات سے لطف اندوز ہو رہی ہوگی۔ میری یہی دعا ہے کہ زندگی میں کوئی غم کوئی پریشانی تمہارے قریب سے بھی نہ گزرے، آمین۔

مجھے اس بات کا شکوہ ہے تم نے اتنی دور جاتے ہوئے مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اپنے خطوط جو تم گھر بھیجتی رہیں اس میں بھی میرا اور شرجیل کا ذکر تک نہ کیا میں نے اس سلسلے میں لاکھ سوچنے کی کوشش کی مگر تمہاری ناراضی کا سبب نہ جان سکی۔

تم بھی سوچتی ہوگی کہ اگر تم کسی بات سے خفا تھیں تو میں نے تمہیں منانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ سچ پوچھو تو پل پل گزرتے وقت اور حالات نے مجھے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ کسی اور کے بارے میں کچھ سوچوں۔ سچ کہوں تو شرجیل سے رشتہ جوڑنے کے بعد مجھے وہ تلخ تجربات ہوئے جس نے فلسفۂ حیات کا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیا۔ شاید میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔

شادی سے پہلے سب نے سوچا تھا کہ میری اور شرجیل کی جوڑی مثالی ہوگی۔ اب بھی لوگ اور میری سہیلیاں یہی کہتی ہیں میں بھی انکار نہیں کرتی مگر معاملہ الٹا ہے۔ شرجیل نے میرے بارے میں جو شکوک و شبہات کا رویہ اختیار کر رکھا ہے شاید وہ ایک مرد کا پیدائشی حق ہوتا ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ...... ایک ایک پل جس کرب اور اذیت سے گزر رہا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ کیا تم یقین کرو گی کہ اس نے مجھے اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ مجھے اپنے قریبی رشتے داروں سے اور تمہارے گھر والوں سے تنہائی میں ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسے کٹھن وقت میں تم بھی مجھ سے کوسوں دور ہو ورنہ تم سے مل کر اپنے مقدر پر دو آنسو بہانے کا موقع مل جاتا۔

یقین جانو! یہ خط چوری چھپے لکھ رہی ہوں اگر اسے کسی طرح پوسٹ کرنے میں کامیاب ہوگئی تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔ آخر میں تمہیں اپنا سمجھ کر ایک درخواست کروں گی اگر ہوسکے تو میرے لیے موت کی دعا کرنا۔ تمہاری دعا قبول ہوگئی تو شاید مجھے اس اذیت سے چھٹکارا مل جائے جس سے میں دوچار ہوں۔

دولہا بھائی کو میرا اسلام ضرور کہنا!

تمہاری بدنصیب سہیلی

دردانہ

دردانہ کا خط فضیلہ نے کئی بار پڑھا۔ اس کی آنکھیں چھلکتی رہیں۔ اس کے تخیل کا خوب صورت ہیرو کا مجسمہ چکنا چور ہو کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اس کے دل میں ایک ہوک اٹھی پھر اس نے دردانہ کے خط کو ریزہ ریزہ کر کے نذر آتش کیا اور بستر پر نڈھال ہو کر گر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

دیر تک فضیلہ آنسو بہاتی رہی پھر اس نے وضو کیا اور خدا کے سامنے سربسجود ہو کر دردانہ کے حق میں دعائیں کرنے لگی اور خدا کا شکر بھی کہ نادانی میں اس نے شرجیل کے لیے ضد نہیں کی تھی۔ اگر کردیتی تو آج اس کا بھی یہی حشر ہوتا۔

لغزش

محترم مدیر

سلام تہنیت

اس ادارے کے تقریباً تمام پرچوں میں میری تحریر جگہ پا لیتی ہے لیکن سرگزشت انفرادیت کا حامل رسالہ ہے۔ اس کا معیار ہی الگ ہے اس لیے جیسے ہی میری ایک واقف کار نے ایک انوکھے کردار کا تذکرہ کیا میں نے معلومات جمع کر کے پورے واقعے کو قلمبند کردیا۔ اگر پسند آجائے تو کسی نزدیکی اشاعت میں شامل کرلیں۔

اسما قادری

(کراچی)

مئی کا مہینا تھا اور ہر سُو چلچلاتی دھوپ اور شدید گرمی کا راج تھا۔ ایسے میں دوپہر کے ڈیڑھ بجے کالج سے واپس آتے ہوئے میں کچھ زیادہ ہی کوفت محسوس کررہی تھی۔ بس اسٹاپ بھی گھر سے ذرا زیادہ ہی فاصلے پر تھا اس لیے اپنے محلے تک پہنچنے میں طبیعت میں اچھا خاصا چڑچڑاپن پیدا ہوگیا تھا لیکن گھر کے قریب پہنچنے پر میں نے جمی بھائی کو دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تو یکدم ہی خوش ہو اٹھی۔ جمشید عرف جمی بھائی اسی محلے میں رہائش پذیر ایک ہرفن

موٹی قسم کے آدمی تھے جو بجلی اور گیس کے آلات کی مرمت سے لے کر رنگ و روغن تک کے تمام کام یکساں مہارت سے انجام دیتے تھے اور اسی وجہ سے اکثر عدیم الفرصت رہا کرتے تھے۔ میں اس وقت انہیں دیکھ کر اس لیے خوش ہوئی تھی کہ پانی کی موٹر گزشتہ دو دن سے خراب پڑی تھی اور پانی اوپر ٹنکی میں نہ چڑھنے کی وجہ سے گھریلو امور انجام دینے میں سخت دشواری پیش آرہی تھی۔ ٹینک میں ڈول ڈال کر پانی نکالنا ایک وقت طلب اور مشکل کام تھا خصوصاً اس لیے بھی کہ گرمی کے موسم میں پانی کا استعمال بہت بڑھ جاتا ہے۔ ابھی کالج سے گھر کی طرف آتے ہوئے میں جس کوفت کا شکار تھی اس میں اس سوچ کا بھی دخل تھا کہ اتنی گرمی میں گھر پہنچ کر نہانے کے لیے پانی بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوگا اور ٹینک میں ڈول ڈال کر پانی نکالنے کی مشقت سے گزرنا پڑے گا لیکن جمی بھائی کو گھر سے باہر آتے دیکھ کر یہ فکر فوراً ہی اڑن چھو ہوگئی کیوں کہ ان کی یہاں موجودگی کا مطلب تھا کہ موٹر ٹھیک ہو چکی ہے۔

''السلام علیکم جمی بھائی۔'' کوفت دور ہوئی تو میں نے خوش گوار موڈ میں جمی بھائی کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام گڑیا۔ کیسی ہو؟ پڑھائی کیسی جارہی ہے؟'' انہوں نے شفقت سے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''فرسٹ کلاس۔'' میں نے انہیں جواب دیا اور بے تابی سے پوچھا۔ ''موٹر تو ٹھیک ہوگئی ہے نا؟''

''بالکل ٹھیک ہوگئی ہے۔ میں نے اپنے سامنے ہی پانی کی ٹینکی فل کر کے چیک بھی کرلیا ہے۔ اب تم آرام سے پانی استعمال کرو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں خوش ہوگئی اور جمی بھائی کا شکریہ ادا کیا۔ میرے شکریے کا جواب انہوں نے اپنی انکسارانہ مسکراہٹ سے دیا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ میں بھی گھر کے اندر چلی گئی۔ سامنے ہی نانی اپنے تخت پر بیٹھی تھیں۔ انہیں سلام کر کے میں ان کے ساتھ ہی تخت پر بیٹھ گئی اور جھک کر پیروں سے جوتے اتارنے لگی۔

''منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ بیٹا تب تک میں کھانا لگاتی ہوں۔ آج میں نے تمہاری پسند کے کڑی چاول بنائے ہیں۔'' نانی نے مجھے اطلاع دی تو میرا دل اپنی پسندیدہ ڈش کا نام سن کر مزید خوش ہوگیا اور میں چہک کر بولی۔

''یہ تو آپ نے زبردست کام کیا نانی لیکن کھانا ابھی نہ نکالیں، پہلے میں جی بھر کر شاور لے لوں پھر آرام سے کھانا کھائیں گے۔ دو دن سے تو ڈھنگ سے نہانا بھی نہیں ہوا۔ شکر ہے کہ آج جمی بھائی آگئے۔ ورنہ میں نے سوچ لیا تھا کہ شام میں خود ان کے گھر جاؤں گی انہیں بلانے۔''

''وہ غریب تو میرے بلاوے پر فوراً ہی پہنچ جاتا ہے لیکن بتا رہا تھا کہ دو دن سے رات دیر گئے گھر آرہا تھا اس لیے اس کی بیوی نے اس کی تھکن کے خیال سے اسے میرا پیغام دیا ہی نہیں۔ آج جیسے ہی اسے معلوم ہوا فوراً چلا آیا۔ بہت معذرت کر رہا تھا کہ دو دن ہمیں تکلیف اٹھانی پڑی۔''

نانی نے اپنے دھیمے انداز میں مجھے جمی بھائی کے تاخیر سے آنے کی وجہ بتائی۔ نانی بہت دھیمے مزاج کی خاتون تھیں اور میں ہمیشہ ان کے بہت قریب رہی تھی۔ میری امی اور افضل ماموں ان کی دو ہی اولادیں تھیں۔ امی اور ماموں کی عمروں میں تقریباً چودہ پندرہ سال کا فرق تھا اور امی بہت ہی کم عمری میں ماموں کی ناسمجھی کی عمر میں بیاہی گئی تھیں اس لیے ماموں بہن کے مقابلے میں ہم بھانجا بھانجی سے زیادہ قریب تھے۔ ہم سب ہی موقع ملنے پر بہت شوق سے نانی کے گھر رکنے آتے تھے لیکن چار سال قبل نانا کے انتقال کے بعد جب ماموں نے خواہش ظاہر کی کہ نانی کی تنہائی بانٹنے کے لیے ہم بہن بھائیوں میں سے کوئی ایک مستقلاً یہاں رک جائے۔ تو میرے سوا کوئی بھی والدین کو چھوڑ کر مستقل یہاں رکنے پر راضی نہ ہوا یوں میں چار سال سے مستقل نانی کے گھر میں رہ رہی تھی اور اس گھر کی ایک فرد بن گئی تھی۔ کالج کے بعد میرا زیادہ تر وقت نانی کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ مغرب کے بعد ماموں اپنی جاب سے واپس آجاتے تو ان کے ساتھ بھی اچھی گپ شپ رہتی۔ محلے پڑوس میں بھی نانی کی وجہ سے اچھے تعلقات قائم ہوگئے تھے اور جمشید عرف جمی بھائی بھی نانی کے اچھے پڑوسیوں میں سے ایک تھے۔ محنتی اور دیانت دار جمی بھائی کو سارا محلہ ہی بہت پسند کرتا تھا۔ وہ تھے بھی اچھے انسان محلے والوں کا ہر کام نہایت دل لگا کر بہت مناسب معاوضے پر کر ڈالتے تھے۔ محنتی اور ہنرمند آدمی ہونے کی وجہ سے ان کی آمدنی مناسب تھی لیکن وہ بے چارے گھر کے بڑے اور اکلوتے بیٹے کی حیثیت سے ذمے داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ ان کے افرادِ خانہ میں بوڑھے والدین سمیت تین عدد بہنیں اور بیوی بچے شامل تھے۔ والدین نے اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کے شوق میں کم عمری میں ان کی شادی کردی تھی اور اب وہ

شادی کے دس برس بعد پانچ عدد بچوں کے باپ تھے۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مہنگائی کے اس دور میں ایک بڑے کنبے کے کفیل پر کتنا بوجھ ہوگا لیکن شاباش ہے جمی بھائی پر کہ وہ بغیر کسی شکوے شکایت کے نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ گھر کے روز مرہ اخراجات کے علاوہ والدین کی دوائیں، بہنوں کے جہیز کی تیاری اور بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں خاصی جدوجہد کرنی پڑتی تھی اور وہ اپنے فرائض احسن طریقے سے ادا کرنے کے لیے ہر طرف ہاتھ پیر مارتے رہتے تھے۔ شریف، محنتی اور ایماندار جمی بھائی کو پورے محلے میں پسند کیا جاتا تھا۔ میری نانی بھی انہیں بہت پسند کرتی تھیں اور جمی بھائی کا ذکر اس انداز میں کرتی تھیں جیسے وہ ان کے کوئی بھانجے، بھتیجے ہوں۔ اب بھی میں نہا دھو کر تازہ دم دسترخوان پر آکر بیٹھی تو وہ کھانے کے دوران ان کی ہی باتیں کرنے لگیں۔

"بڑا اچھا اور شریف لڑکا ہے جمی۔ میری نظروں کے سامنے ہی پل کر جوان ہوا ہے۔ تمہارے افضل ماموں سے عمر میں دو چار سال ہی بڑا ہوگا لیکن والدین کی ناسمجھی کا شکار ہوگیا۔ کم عقلوں نے وقت سے پہلے ہی اس کے سر پر ذمے داریوں کا بوجھ ڈال دیا۔ پڑھنے میں اچھا تھا لیکن پانچویں کلاس سے ہی باپ کے سر پر بھوت سوار ہوگیا کہ اپنے جمی کو ہنرمند آدمی بناؤں گا بقول اس کے کاغذ کی ڈگریاں لینے والے کمانے کے لیے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں لیکن ہنرمند آدمی کبھی بھوکا نہیں رہتا۔ بچہ بے چارہ ماں باپ کا تابعدار تھا سو جت گیا مشقت کی چکی میں، اس کے ماں باپ نے دوسرا ستم یہ کیا کہ کم عمری میں شادی بھی کر ڈالی۔ پانچ بچوں کا باپ ہے جس میں سے تین بیٹیاں ہیں، تین بہنوں کو بیاہ کر فارغ ہوگا تو آگے سے اپنی تین بیٹیاں بیاہ کے لیے تیار ہوں گی۔ سچ کہوں تو کبھی کبھی بہت دل کڑھتا ہے جمی کے لیے۔ غریب کے نصیب میں بے فکری اور فراغ کا نام ہی نہیں ہے۔" نانی کھانا کم کھا رہی تھیں جمی بھائی کے حالات پر تبصرہ زیادہ کر رہی تھیں اور یہ وہ حالات تھے جن کا تذکرہ میں نانی کی زبانی اس سے قبل بھی کئی بار سن چکی تھی سو اس وقت ان کی باتوں میں دلچسپی نہیں لی اور موضوع گفتگو بدلنے کو ایک نیا شوشا چھوڑا۔ "آپ ماموں کی شادی کب کریں گی نانی! ابھی آپ ہی نے بتایا ہے کہ وہ جمی بھائی سے عمر میں دو چار برس ہی چھوٹے ہیں۔ ان سے دو چار برس بڑے جمی بھائی پانچ عدد بچوں کے باپ ہیں اور ادھر ہمارے ماموں صاحب کی تو منگنی تک نہیں ہوئی ہے۔"

مجھے اچھی طرح علم تھا کہ ہر ماں کی طرح نانی کو بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کا بہت ارمان ہے سو ان کے جذبات کو چھیڑ ڈالا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو بیٹا، افضل سے بھی میں نے دو ایک بار ذکر کیا تھا اور سرسری طور پر اس بات کا بھی احساس دلایا تھا کہ کہیں اس کے ابا کی طرح میں بھی پوتے پوتیوں کا ارمان دل میں لیے ہی مٹی میں نہ مل جاؤں لیکن وہ کہنے لگا کہ امی جی ایک امتحان اور پاس کرلوں تو پھر اس معاملے پر غور کروں گا۔ میری ترقی کے لیے یہ امتحان پاس کرنا بڑا ضروری ہے۔ اس کی بات میرے دل کو بھی لگی۔ شادی کا کیا ہے بندہ دو چار برس دیر بھی کرلے تو کچھ بگڑتا نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ شادی اس وقت کی جائے جب آدمی بیوی بچوں کو اچھی زندگی دینے کے لائق ہو ورنہ عمر شکوے شکایتوں اور جھگڑوں میں ہی گزر جاتی ہے۔"

نانی کے دل میں واقعی ساری اماؤں کی طرح ماموں کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان تو تھا لیکن اپنی طبیعت کے ٹھہراؤ کی وجہ سے وہ اس حد تک جذباتی نہیں تھیں کہ ماموں کے نقطۂ نظر کو نہ سمجھیں سو ماموں اب تک آزاد گھوم رہے تھے۔ میں جو اپنے تئیں ماموں کے خلاف ایک پیاری سی سازش کرنے جا رہی تھی۔ نانی کا جواب سن کر مزید کچھ نہ کہہ سکی اور دل لگا کر کڑی چاول کھاتے ہوئے نانی کے ہاتھ کے ذائقے کی تعریفیں کرنے لگی۔ نانی لاکھ سمجھدار سہی لیکن تعریف تو دنیا کے ہر بشر کی کمزوری ہے سو وہ بھی مسکرا کر میری کی ہوئی تعریفیں سنتی رہیں اور جمی بھائی کا ذکر بالکل غائب ہوگیا کیوں کہ اب میں نانی سے کالج میں عنقریب ہونے والے اس فنکشن کا ذکر کر رہی تھی جس میں میرا نئے لباس کے ساتھ شریک ہونا بہت ضروری تھا اور یہ لباس مجھے نانی ہی دلاتیں کہ امی نے گرمی کے لیے لان کے سوٹوں کی اچھی خاصی خریداری کروانے کے بعد اب مزید کوئی فرمائش سننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆......☆

"افضل ماموں سے کہوں گی کہ آج مجھے گھر چھوڑ آئیں۔ دو دن کی چھٹی ہے۔ یہ دو دن امی ابو اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزارلوں گی۔ بہت دن ہوگئے میرا وہاں جانا ہی نہیں ہوسکا۔ پرانی سہیلیوں کی بھی یاد آرہی ہے۔"

آج کالج میں فنکشن تھا جس میں، میں نے نانی کا دلایا ہوا خوب صورت کاٹن کا سوٹ پہن کر شرکت کی تھی۔ تقریباً سب ہی نے میرے سوٹ کی تعریف کی تھی اس لیے میرا موڈ خاصا خوشگوار تھا اور معمول سے کافی تاخیر سے کالج سے گھر لوٹتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ یہی نیا سوٹ پہن کر اپنے گھر جایا جائے تاکہ وہاں بھی بہنوں اور محلے کی پرانی سہیلیوں سے داد وصول ہو جائے۔ میرے اس خیال کو سن کر یہ گمان نہ کیا جائے کہ میں اس طرح دوسروں کو جلانے یا تپانے کا ارادہ رکھتی تھی، بات صرف اتنی ہے کہ مجھ میں اپنی تعریف سننے کا جذبہ معمول سے ذرا زیادہ ہے اس لیے میں ایسا کوئی موقع گنوانے کے لیے راضی نہیں ہوتی جب اپنی تعریف سُن سکوں۔ ابھی بھی بس اسٹاپ سے گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آرہا تھا کہ دھوپ ڈھلنے لگی ہے اس لیے قوی امکان ہے کہ محلے میں دو چار جان پہچان والیوں سے ٹاکرا ہو جائے اور وہ میرے نئے سوٹ پر داد دے سکیں۔ اچھا خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں جیسے ہی گلی میں داخل ہوئی یہ دیکھ کر چونک پڑی کہ گلی میں خاصا رش ہے۔ نظر آنے والے افراد میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ مردوں کی بھی خاصی تعداد شامل تھی۔ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ محلے میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آگیا ہے لیکن اس واقعے سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے میں کہیں رکنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ نانی کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ جب گلی میں لڑکے اور آدمی وغیرہ کھڑے ہوں تو میں وہاں رک کر کسی سے بات کروں چنانچہ میں کہیں بھی رکے بغیر سیدھی گھر کی طرف چلی گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر نانی عصر کی نماز پڑھنے میں مصروف تھیں۔ ان کے نماز سے فارغ ہونے تک میں کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے آ گئی۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی میرے چہرے پر پھونک ماری۔

''نانی یہ گلی میں رش کیوں لگا ہوا ہے؟'' پھونک مارنے کے بعد وہ جائے نماز لپیٹ کر رکھ رہی تھیں جب میں نے بے تابی سے دریافت کیا۔

''کیا بتاؤں بیٹا! وہ جو کونے والے شکیل صاحب ہیں ان کا بیٹا کہیں غائب ہو گیا ہے۔ صبح دس بجے سے اس کی ڈھونڈ مچی ہوئی ہے، پر کہیں سے کوئی پتا نہیں مل رہا۔ ماں باپ کا برا حال ہے۔ محلے والوں نے بھی اپنی طرف سے بچے کو ہر جگہ ڈھونڈ لیا ہے لیکن بچہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے۔ اب تو سب یہی کہہ رہے ہیں کہ لگتا ہے بچہ کسی اغوا کرنے والے کے ہاتھ لگ گیا ہے، خدا خیر کرے اور بچہ خیریت سے گھر لوٹ آئے۔'' نانی نے نہایت دکھی لہجے میں آگاہ کرتے ہوئے دعا کی تو میں نے بھی جلدی سے آمین کہا۔

شکیل صاحب سے میں زیادہ واقف نہیں تھی۔ ان کی فیملی حال ہی میں ہمارے محلے میں آکر رہائش پذیر ہوئی تھی اور چند ایک بار کے علاوہ میرا ان کی بیگم سے ملنا نہیں ہوا تھا۔ البتہ یہ معلوم تھا کہ ان کے تین عدد بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بیٹا تقریباً پانچ سال کا تھا اور بیٹیاں بالترتیب تین اور دو سال کی بہت چھوٹی ہونے کی وجہ سے بچیاں تو گلی میں نظر نہیں آتی تھیں لیکن بیٹا کاشف اکثر گلی میں کھیلتا ہوا پایا جاتا تھا۔ اکلوتا ہونے کے باوجود شکیل صاحب کی بیگم اس کے معاملے میں ذرا بے پروا معلوم ہوتی تھیں یا پھر چھوٹی بچیوں کے ساتھ گھر کی کل ذمے داریاں تنہا سنبھالنے کا مسئلہ تھا کہ کاشف کی طرف ان کی زیادہ توجہ نہیں تھی۔ کاشف کو میں نے بہت کم اچھے حلیے میں دیکھا تھا۔ زیادہ تر وہ میلے اور بے ترتیب حلیے میں گلی میں کھیلتا نظر آتا تھا بلکہ میں نے تو دو ایک بار اسے گلی سے باہر بھی دیکھا تھا۔ اس طرح کے بچے کا گم ہو جانا یا اغوا ہو جانا کوئی بعید از امکان نہیں تھا لیکن بہرحال یہ ایک بڑا واقعہ تھا جس نے مجھے بھی متاثر کیا اور میں دعا کرنے لگی کہ کاشف جلد از جلد اپنے گھر واپس لوٹ آئے۔ دعا تو سب ہی کر رہے تھے۔ میں گھر تک ہی محدود رہنے کے باوجود نانی کے پاس وقتاً فوقتاً آنے والی محلے والیوں کی وجہ سے حالات سے واقف تھی۔ کاشف کے غائب ہونے کی خبر سن کر اس کے کئی ننھیالی اور ددھیالی رشتے دار اس کے گھر پہنچ چکے تھے۔ مرد بچے کو تلاش کرنے میں شکیل صاحب کا ساتھ دے رہے تھے تو خواتین بیگم شکیل کو تسلی و دلاسہ دینے کے ساتھ ساتھ آیت کریمہ اور یا سلام کے وظائف کر رہی تھیں۔ رات دس بجے کے قریب محلے کی ایک خاتون ندرت آپا نانی سے ملنے آئیں تو انہوں نے یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ کاشف کو سچ مچ اغوا کر لیا گیا ہے اور شکیل صاحب کے پاس اغوا کاروں کا فون آیا ہے کہ اگر بچے کی سلامتی چاہیے ہو تو دو لاکھ روپے تاوان کا بندوبست کر لو۔ شکیل صاحب ایک عام سے ملازمت پیشہ آدمی تھے جن کے لیے دو لاکھ کی رقم معمولی نہیں تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے جیسے محلوں میں جہاں عام سے سفید پوش لوگ رہتے ہوں، اغوا برائے تاوان کی وارداتیں ہوتی بھی نہیں ہیں کہ

ایسی وارداتیں کرنے والے لکھ پتی اور کروڑ پتی والدین کی اولاد کا انتخاب کرتے ہیں۔ ندرت آپا بھی نانی کو خبر سنانے کے بعد ان کے ساتھ مل کر اس واقعے پر حیرت اور افسوس کا اظہار کرتی رہیں اور بولیں۔

''موئے اغوا کرنے والوں کو بھلا کیا سوجھی کہ غریب کے بچے کو اٹھا لے گئے۔ ارے اغوا کرنا تھا تو کسی ایسے آدمی کے بچے کو اغوا کرتے جس کی فیکٹریاں چل رہی ہیں۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ لگتا ہے یہ کسی چھوٹے غنڈے کا کام ہے۔ بڑے آدمیوں کی تو پہنچ بھی ہوتی ہے اسی لیے کسی امیر کی بجائے عام آدمی کے بچے پر ہاتھ ڈالا ہے۔'' نانی نے اپنے فہم سے کام لیتے ہوئے ندرت آپا کی بات پر تبصرہ کیا۔

''صحیح کہہ رہی ہیں خالہ، ہو سکتا ہے ایسی ہی بات ہو۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ شکیل صاحب نے بھی پولیس میں پرچہ کٹوا دیا ہے۔ ان کی بیگم کے کوئی رشتے کے بھائی بھی پولیس میں ہیں۔ کچھ دیر پہلے وہ آئے تھے ان کے مکان پر، سنا ہے بہت تسلی دے کر گئے ہیں اور یقین دلایا ہے کہ بچے کو بازیاب کروالیں گے۔'' ندرت آپا نے ایک اور خبر فراہم کی۔

''بس اللہ خیر کرے۔ ان اغوا کاروں کا کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ پولیس کو خبر کرنے پر مشتعل بھی ہو جاتے ہیں۔ کتنے ایسے حادثات سنے ہیں کہ پولیس کو ملوث کرنے پر اغوا ہونے والے ہی کو ہلاک کر دیا گیا۔ پیسے کے لیے کسی کی ممتا کو آگ لگانے والوں کا کوئی دین ایمان تو ہوتا نہیں ہے۔'' ندرت آپا کی دی ہوئی اس نئی خبر کو سن کر نانی نے تشویش کا اظہار کیا۔

''اللہ رحم کرے، ایک اکلوتا تو بیٹا ہے شکیل صاحب کا۔ بے چارے بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ تاوان دینا بھی ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ ابھی تو سب جمع جتھا لگا کر یہ مکان خریدا ہے۔ وہاں ان کے گھر باتیں ہو رہی تھیں کہ گھر خریدنے کے لیے ان کی بیگم نے اپنا سارا زیور بیچ ڈالا تھا اور اب ان کے پاس پیسوں کے انتظام کے لیے بس یہی صورت ہے کہ مکان بیچ ڈالیں لیکن مکان کوئی کھڑے کھڑے بکتا ہے۔ کسی اسٹیٹ ایجنسی والے نے اگر خرید بھی لیا تو کوڑیوں کے مول لے گا اور بے چارے سڑک پر آ جائیں گے۔''

میری نانی محلے داروں سے تعلق تو رکھتی تھیں اور ان کا محلے کے گھروں میں آنا جانا بھی تھا لیکن ایک حد میں رہ کر وہ

مشہور غزل گائک اقبال بانو کی گائی ہوئی ایک غزل ۷۰ دہائی میں بہت مشہور ہوئی اور اقبال بانو کی وجہ شہرت ٹھہری، غزل یہ ہے،

داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے
لوگ اپنے دیئے جلانے لگے
ایک پل میں وہاں سے ہم اُٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

غزل کے مطلع میں لفظ داغ کی وجہ سے اکثر لوگ اس غزل کو داغ دہلوی کے نام منسوب کرتے ہیں بلکہ کچھ عرصہ قبل مجھے، ہندوستان اور پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تو میں غزل لینے جب بازار گیا تو شالیمار، اور لوک ورثہ جیسے اداروں کی سی ڈیز پر بھی مجھے اس غزل کے ساتھ شاعر کا نام داغ دہلوی ہی لکھا نظر آیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل مرحوم باقی صدیقی کی ہے جو ریڈیو پاکستان میں ملازمت کرتے تھے اور انہوں یہ غزل لکھ کر خود اپنے ہاتھ سے اقبال بانو کو دی تھی، دیکھئے تاریخ ریڈیو پاکستان۔

(ذرہ حیدر آبادی کے مضمون سے انتخاب)

دن میں ایک بار جا کر شکیل صاحب کے گھر کا چکر لگا آئی تھیں اور باقی خبریں انہیں گھر بیٹھے ہی مل رہی تھیں۔ خصوصاً ندرت آپا کے ذریعے۔ ندرت آپا کا شمار ان خواتین میں ہوتا تھا جو سارا وقت محلے میں مٹر گشت کرتی رہتی ہیں اور پل پل کی خبروں سے واقف ہوتی ہیں۔ اب بھی انہیں شکیل صاحب کے گھر کی پوری خبر تھی اور نانی کی بے حد عزت کرنے کی وجہ سے وہ انہیں گھر بیٹھے ہی ہر خبر سے آگاہ کر رہی تھیں۔

''اللہ تعالیٰ بہ خیر وخوبی ان کے مسئلے کو حل کرے۔ ہم تو صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔'' نانی نے ندرت آپا کی بات سن کر مختصر تبصرہ کیا۔ اس کے بعد وہ ہمارے گھر سے روانہ ہو گئیں۔ افضل ماموں جو ڈیوٹی سے آنے کے بعد شکیل صاحب کے پاس گئے تھے۔ وہ بھی واپس لوٹ آئے اور انہوں نے بھی تقریباً ان ہی باتوں سے آگاہ کیا جو ہم پہلے ہی ندرت آپا کی زبانی سن چکے تھے۔ رات گئے تک میں، نانی اور ماموں اس واقعے پر گفتگو کرتے آخر کار سونے کے لیے اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے کہ نیند تو کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے اور ہم اس واقعے پر دکھی ہونے کے باوجود بہرحال اس کے براہِ راست متاثرین میں شامل نہیں تھے،

جوسرے سے نیندیں ہی اڑ جاتیں۔

☆......☆

آنے والی صبح گزشتہ روز سے بھی زیادہ سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ یہ چھٹی کا دن تھا اور چھٹی والے دن میں اور فضل ماموں عموماً دن چڑھے سو کر اٹھتے تھے۔ نانی البتہ اپنے روزانہ کے معمول پر کاربند رہتی تھیں لیکن اس روز میں اور ماموں بھی خلافِ معمول جلدی جاگ گئے تھے۔ شاید کاشف کے اغوا کے باعث ذہن پر پڑنے والے بوجھ کا اثر تھا کہ زیادہ دیر تک سویا ہی نہیں گیا۔ اٹھنے کے بعد ابھی ہم لوگ منہ ہاتھ دھو کر ہی فارغ ہوئے تھے کہ بیرونی دروازہ زور سے بجا۔ دروازہ بجنے کی آواز سن کر ماموں نے باہر کا رخ کیا اور پھر وہیں سے آواز لگا بولے۔ ''امی! میں ذرا باہر جارہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔''

''پتا نہیں صبح صبح کون آگیا۔ میں گرم گرم پراٹھے بنا رہی تھی۔''

''ناشتا بھی نہیں کرسکا بے چارا۔ ایک چھٹی والے دن ہی تو ذرا ڈھنگ سے کھاتا پیتا ہے ورنہ روزانہ تو دفتر پہنچنے کی جلدی میں مشکل سے ڈبل روٹی کے ایک دو پیس کے ساتھ چائے پی کر چلا جاتا ہے۔'' باورچی خانے میں مصروف نانی نے ماموں کی آواز سنی تو ماؤں والی مخصوص فکرمندی کے ساتھ بڑبڑائیں۔

''چلیں کوئی بات نہیں نانی جانے دیں جب تک ماموں واپس آتے ہیں میں آلو چھولے کی ترکاری بنا لیتی ہوں۔ پراٹھوں کے ساتھ مزہ دیتی ہے۔ ماموں کو پسند بھی ہے۔'' میں نے انہیں تسلی دی اور فریزر سے ابلے ہوئے چھولے نکال کر ترکاری کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔

''ٹھیک ہے تم ترکاری بنالو۔ میں باقی کے پراٹھے افضل کے آنے کے بعد ہی ڈالوں گی۔'' نانی مجھ سے کہتی ہوئی باہر تخت پر جا بیٹھیں۔ اصولاً مجھے انہیں پیشکش کرنی چاہیے تھی کہ وہ آرام کریں پراٹھے میں بنالوں گی لیکن نانی کے ہاتھ کے ذائقے دار ورقی پراٹھوں کے لالچ نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ ویسے بھی میری نانی ان نانیوں میں سے نہیں تھیں جو خود پر عمر سے زیادہ بڑھاپا طاری کرلیتی ہیں اور گھریلو امور سے یکسر ہاتھ اٹھا کر پلنگ سنبھال لیتی ہیں۔ نانی اچھی خاصی ایکٹیو خاتون تھیں اور زیادہ تر گھریلو امور خود انجام دیتی تھیں۔ میرے حصے میں تو کالج سے آنے کے بعد چند ایک چھوٹے موٹے کام ہی آتے تھے۔ ویسے بھی مجھے یہاں رکھنے کا مقصد کام کاج کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے افضل! ناشتے کے لیے ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔'' میں ترکاری تیار کرنے کے بعد اس پر چھڑکنے کے لیے ہرا دھنیا کاٹ رہی تھی جب مجھے نانی کی آواز سنائی دی۔

''یہیں محلے میں ہی تھا امی، پڑوس والے رشید بھائی نے دروازہ بجا کر اطلاع دی تھی کہ شکیل صاحب کا بیٹا کاشف واپس آگیا ہے۔ بس اسی بارے میں معلوم کرنے گیا تھا۔'' جواب میں افضل ماموں نے جو بات کہی اسے سن کر میں باورچی خانے میں رکی نہ رہ سکی اور تیزی سے باہر آئی۔

''کاشف واپس آگیا پر کیسے کیا شکیل صاحب نے اتنی جلدی دو لاکھ کی رقم کا بندوبست کرلیا تھا۔'' ماموں کی بات سن کر نانی نے حیرت سے پوچھا۔

''تاوان کی رقم تو سنا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے گھٹا کر پچاس ہزار کردی تھی اور شکیل صاحب نے رشتے داروں کے تعاون سے اس کا بندوبست بھی کرلیا تھا لیکن تاوان دینے کی نوبت ہی نہیں آئی اور کاشف پہلے ہی واپس آگیا۔'' ماموں نے بتایا۔

''کیسے واپس آگیا؟ کیا وہ اغوا کرنے والوں کی قید سے بھاگ نکلا تھا۔'' ماموں کی دی سنسنی خیز اطلاع پر میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''کاشف اغوا کاروں کی قید سے کس طرح نکلا اس بارے میں تو ابھی کچھ معلوم نہیں ہے کیوں کہ وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں ہے۔ شکیل صاحب نے ڈاکٹر کو بلا کر اس کا چیک اپ کروایا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بچے کو کوئی نشہ آور شے کھلائی گئی ہے۔ اس کا اثر ختم ہونے کے بعد اپنے حواسوں میں واپس آجائے گا مگر فکرمندی کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''کاشف بے ہوش ہے تو پھر گھر کیسے پہنچا؟'' ماموں کے نئے انکشاف نے میری بے تابی و تجسس میں مزید اضافہ کیا۔

''اسے جمی بھائی لے کر آئے ہیں۔ انہیں ایک بنگلے پر رنگ و روغن کرنے کا ٹھیکا ملا ہوا ہے۔ بنگلا ذرا زیادہ دور ہے اس لیے وہ وقت پر کام پر پہنچنے کے خیال سے صبح جلدی گھر سے نکل گئے تھے۔ اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے پرانے نالے کے پاس کسی کو پڑا ہوا دیکھا تو تجسس اور انسانی ہمدردی کی وجہ سے قریب سے دیکھنے چلے گئے۔ قریب پہنچے تو پتا چلا کہ وہ تو کاشف بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر واپس گھر لے آئے۔'' ماموں

نے سارا قصہ بیان کیا۔

''اللہ کا شکر ہے بچہ خیریت سے گھر واپس آ گیا۔ دوپہر تک میں اسے دیکھنے اور اس کی ماں کو مبارک باد دینے جاؤں گی۔ ابھی تو وہاں بہت رش لگا ہوا ہوگا۔'' پوری بات معلوم ہو، پر نانی نے تبصرہ کیا اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ نانی جب پراٹھے بنانے لگیں تو میں نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور دسترخوان لگانا شروع کر دیا۔ نانی نے سوجی کا حلوا تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ رات کا بچا میتھی قیمہ کا سالن اور میری بنائی ترکاری بھی تھی۔ ہم لوگ کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھے تو لطف ہی آ گیا۔ صبح صبح ملنے والی خوش خبری کی وجہ سے موڈ بھی اچھا ہو رہا تھا اس لیے کھانے میں اور بھی مزہ آ رہا تھا اور ہم تینوں ہی ناشتے سے انصاف کرتے ہوئے اس واقعے پر گفتگو بھی کرتے جا رہے تھے جس نے کل سے پورے محلے کو اپنے زیرِ اثر لے رکھا تھا۔

''ویسے ماموں یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ جب تاوان کے سلسلے میں طے پا گیا تھا اور شکیل صاحب پچاس ہزار ادا کرنے کے لیے راضی بھی ہو گئے تھے تو پھر کاشف کیسے ایسے ہی واپس آ گیا۔ وہ اتنا بڑا بچہ تو ہے نہیں کہ اغوا کرنے والوں کو جل دے کر بھاگ نکلا ہو پھر وہ ملا بھی بے ہوشی کی حالت میں ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ خود سے نہیں آیا بلکہ کوئی اسے وہاں ڈال گیا تھا۔ ڈالا بھی ایسی جگہ گیا کہ بچے کو پہچان کر علاقے کا کوئی نہ کوئی فرد اسے گھر پہنچا دے۔ مجھے تو یہ سب بڑا عجیب لگ رہا ہے۔'' میں نے سوجی کے حلوے سے بھرا چمچہ منہ میں رکھتے ہوئے خیال آرائی کی تو ماموں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور بولے۔

''واقعی ہے تو عجیب سی ہی صورتِ حال لیکن میرے خیال میں بچے کے ہوش میں آنے کے بعد بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔ پانچ سال کا بچہ اتنا سمجھ دار تو ہوتا ہے کہ خود پر گزرنے والے واقعات کو بیان کر سکے۔''

''جو بھی ہو میرے حساب سے تو اتنا ہی کافی ہے کہ بچہ صحیح سلامت واپس آ گیا۔ تم ماموں بھانجی کو بھلا کیا ضرورت پڑی ہے زیرو زیرو سیون بننے کی۔'' نانی نے ہماری گفتگو میں دخل دیتے ہوئے ٹوکا تو میری اور ماموں کی ہنسی نکل گئی۔ ماموں انگریزی فلمیں دیکھنے کے شوقین تھے۔ اسی لیے نانی کو بھی انگریزی فلموں کے مشہور کرداروں سے اچھی خاصی واقفیت حاصل تھی۔

''تم کیا دانت نکال کر ہنسے جا رہی ہو، جاؤ جا کر چائے لے آؤ۔'' نانی نے ہمارے ہنسنے پر ماموں کو تو کچھ نہیں کہا لیکن ہمیں ڈپٹ ڈالا۔ میں نے بھی ان کا موڈ بگڑتا دیکھ کر فوراً سنجیدگی اختیار کر لی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ماموں تو کمرا بند کر کے پڑھنے میں مصروف ہو گئے جب کہ میں نے برتنوں کی دھلائی اور گھر کی صفائی کا کام سنبھال لیا۔ نانی بھی کب فارغ بیٹھنے والی تھیں۔ تخت پر براجمان ہو کر دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی کاٹنے لگیں۔ میرے صفائی سے فارغ ہونے تک ان کی سبزی بھی تقریباً بن چکی تھی جب ندرت آپا کا نزول ہوا ان کے آنے پر کاشف کی واپسی کا قصہ ایک بار پھر چھڑ گیا اور میں نے بھی ایک بار پھر وہی سوالات اٹھانے شروع کر دیے جو کچھ دیر قبل ماموں کے سامنے اٹھائے تھے۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو گڑیا، کاشف کی اچانک واپسی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ پر میں نے اڑتی اڑتی ایک بات سنی ہے۔'' بولتے بولتے ندرت آپا کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تو میرے کان کھڑے ہوئے۔

''وہ کیا ندرت آپا؟'' میں نانی کے گھورنے کی پروا کیے بغیر تجسس کے مارے ان کے مزید قریب ہو گئی۔

''سننے میں آیا ہے کہ شکیل صاحب کا جو سالا پولیس میں ہے اس نے اغوا کرنے والوں کو پکڑنے کی پوری پلاننگ کر رکھی تھی۔ شکیل صاحب تاوان کی رقم لے کر کاشف کو چھڑانے جاتے تو پیچھے سے پولیس بھی پہنچ جاتی شاید یہ بات کسی طرح اغوا کرنے والوں کو معلوم ہو گئی اور انہوں نے ڈر کر خود ہی کاشف کو چھوڑ دیا۔'' انہوں نے دھیمی آواز میں بتایا تو میرا منہ کھل گیا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہے آپا کہ کاشف کو کسی جان پہچان والے نے ہی اغوا کیا تھا جب ہی تو اسے اس پلاننگ کا علم ہو گیا۔'' حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد میں نے خیال آرائی کی۔

''یہی...... یہی بات میں نے بھی سوچی ہے۔'' ندرت آپا نے پُرجوش انداز میں میری تائید کی۔

''حالات سے صاف پتا چل رہا ہے کہ اغوا کسی ایسے بندے نے کیا تھا جو شکیل صاحب کو اچھی طرح جانتا ہے اگر کسی پیشہ ور مجرم نے یہ کام کیا ہوتا تو اول تو اسے پولیس والے منصوبے کی خبر ہی نہ ہوتی اور اگر کسی طرح ہو بھی جاتی تو وہ ڈر کر بچے کو آزاد کرنے کی بجائے غصے میں قتل بھی کر

سکتا تھا۔ یہ تو کسی ایسے ہی بندے کا کام لگتا ہے جسے بچے سے انسیت ہوگی اسی لیے اس نے بچے کو نقصان نہیں پہنچایا۔'' جو کچھ میرے ذہن میں تھا ندرت آپا نے اسے پوری طرح مکمل کر بیان کر دیا۔

''یعنی یہ شکیل صاحب کے کسی قریبی دوست یا رشتے دار کا کارنامہ ہے۔'' ندرت آپا کا تبصرہ سن کر میں بے ساختہ ہی بول پڑی۔

''جو بھی بات ہے شکیل صاحب اور پولیس والے خود ہی دیکھ لیں گے۔ تمہیں زیادہ اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میری زبان سے نکلے جملے پر نانی نے فوراً ہی مجھے ٹوک دیا حالانکہ میں نے کوئی ایسی انوکھی بات نہیں کہی تھی جو اوروں کے دماغ میں نہیں آتی لیکن نانی حد درجہ محتاط طبیعت کی مالک تھیں اور قطعی پسند نہیں کرتی تھیں کہ کسی بھی ایسے ویسے معاملے میں انہیں یا ان کے افرادِ خانہ میں سے کسی کو ملوث کیا جا سکے۔ خصوصاً لڑکیوں کے لیے تو وہ بہت ہی زیادہ احتیاط کی قائل تھیں۔ ان کے ٹوکنے پر میں نے سمجھ لیا کہ اب اگر میں نے اس معاملے میں ایک بھی لفظ ادا کیا تو وہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا چنانچہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی اور اندر کمرے میں جا کر اپنی کتابیں نکال کر پڑھائی کرنے لگی۔

☆......☆

کاشف کے اغوا والے قصے نے شروع کے دو چار روز تو سب کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا اور اس موضوع پر تبصرے و تجزیے ہوتے رہے لیکن پھر آہستہ آہستہ سب اپنے معمولات میں مصروف ہوتے چلے گئے۔ اغوا کس نے کیا تھا اور کیوں اس سلسلے میں کوئی بھی بات سننے میں نہیں آئی۔

کاشف بھی ہوش میں آنے کے بعد کچھ نہیں بتا سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ اغوا کرنے والوں نے اسے زیادہ تر بے ہوشی کی حالت میں ہی رکھا تھا۔ شکیل صاحب نے بعد میں اس کا باقاعدہ میڈیکل چیک اپ کروایا تھا جس سے یہ بات پتا چلی تھی کہ بچے کو مستقل افیون کھلائی جاتی رہی تھی جس کی وجہ سے اس کا دماغ کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا چنانچہ یہ جو اُمید تھی کہ کاشف حواسوں میں آنے کے بعد اغوا کاروں کے بارے میں کچھ بتا سکے گا ختم ہوگئی اور سب نے اسی بات پر شکر کر کے اکتفا کر لیا کہ بچہ تو صحیح سلامت گھر واپس آ گیا ہے۔ میں نے بھی اس قصے کو بھلا کر اپنی پڑھائی پر توجہ دینا مناسب سمجھا اور امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگئی لیکن جلد ہی ایک نئی خبر نے ہنگامہ بپا کر دیا۔'' پولیس نے جمی بھائی کو گرفتار کر لیا ہے۔ مجھ سمیت جس نے بھی یہ خبر سنی انگشت بدنداں رہ گیا۔ بھلا جمی بھائی جیسے شریف آدمی کو پولیس نے کیوں گرفتار کر لیا تھا۔ یقیناً یہ کوئی غلط فہمی تھی۔ زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ رات کو اپنے کام پر سے دیر سے واپس آتے ہوئے وہ بے چارے پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئے ہوں گے اور پولیس والوں نے رشوت کے حصول کے لیے انہیں تھانے میں بند کر دیا ہوگا۔ خود جمی بھائی کے گھر والوں کو اس سلسلے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ان کی بیگم محلے والوں کو بس اتنا بتا سکیں کہ کل مغرب کے وقت جمی بھائی نے انہیں فون کر کے اطلاع دی تھی کہ وہ جس بنگلے میں رنگ و روغن کا کام کر رہے ہیں اس کے مالک کا اصرار ہے کہ کام جلد از جلد ختم کر لیا جائے چنانچہ وہ آج رات گھر واپس نہیں آئیں گے اور بنگلے پر ہی رکے رہیں گے۔ جمی بھائی کا فون ملنے پر اہلِ خانہ ان کی طرف سے بے فکر ہو گئے تھے اور یہی خیال تھا کہ اب وہ اگلے دن شام کے بعد ہی گھر واپس لوٹیں گے لیکن دوپہر سے پہلے ہی تھانے سے ان کے گھر فون آ گیا کہ جمشید احمد عرف جمی بھائی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اہلِ خانہ تھانے پہنچ کر متعلقہ پولیس آفیسر سے ملاقات کریں۔

تھانے سے فون آتے ہی جمی بھائی کے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ محلے والے رونے دھونے کی آوازیں سن کر ان کے گھر پہنچے تو یہ خبر سننے کو ملی۔ سن کر زیادہ تر نے یہی خیال ظاہر کیا کہ گھر والوں کو اس لیے بلایا جا رہا ہے کہ جمی بھائی کو چھوڑنے کے بدلے ان سے رشوت طلب کی جا سکے۔ ایک آدھ نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ خدانخواستہ جمی بھائی کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اور ان کی بیگم سے فون سننے میں غلطی ہو گئی ہے۔ تھانے والوں نے انہیں اتنا کہا ہوگا کہ جمشید احمد تھانے میں ہیں ان کے ورثا تھانے پہنچ جائیں اور انہوں نے تھانے کا لفظ سن کر خود ہی یہ فرض کر لیا ہوگا کہ جمی بھائی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ باتوں اور خیال آرائیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور محلے کے دو تین معتبر مرد جمی بھائی کے والد کے ساتھ اصل بات معلوم کرنے کے لیے تھانے روانہ ہو گئے۔ وہ بے چارے اکلوتے بیٹے کے بارے میں ایسی خبر سن کر بے حد ہراساں ہو گئے تھے اور اس لائق نہیں تھے کہ اکیلے تھانے جا سکیں۔ کافی دیر بعد جب ان کی معززینِ محلہ کے ساتھ واپسی ہوئی تو حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی۔ وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہے تھے اور سر

جھکائے کسی مجرم کی طرح چل رہے تھے۔ ان کی واپسی کے منتظر لوگوں نے احوال دریافت کرنا چاہا تو منہ سے ایک لفظ نہ بولے اور آنسو بہاتے ہوئے اپنے گھر میں جا کر بند ہو گئے۔ جو لوگ ان کے ساتھ تھانے گئے تھے انہوں نے بعد میں انکشاف کیا کہ جی بھائی کو کاشف کے اغوا کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے اور اس وقت وہ ایک اقبالی مجرم کی حیثیت سے تھانے میں موجود ہیں۔ انہوں نے پولیس والوں کے سامنے اس بات کا اعتراف کرلیا تھا کہ انہوں نے روپوں کے حصول کے لیے کاشف کو اغوا کر کے اپنے ایک تنہا رہنے والے دوست کے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ اور بہت سے کاموں کی طرح جی بھائی چلتے پھرتے پراپرٹی ایجنٹ کا کام بھی کرتے تھے اور کمیشن لے کر مکانوں اور دکانوں کا سودا کرواتے رہتے تھے۔ ہمارے محلے میں شکیل صاحب کو مکان بھی انہوں نے ہی دلایا تھا۔ شکیل صاحب سے وہ اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے ملے تھے اور انہیں اُمید تھی کہ اس سودے کے بدلے انہیں اچھا کمیشن ملے گا لیکن بعد میں شکیل صاحب نے انہیں کمیشن کی رقم ادا نہیں کی اور بار بار کے تقاضوں کے باوجود مسلسل اپنی تنگ دستی کا بہانہ کر کے انہیں ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے جاننے والے کے ذریعے جی بھائی کو اطلاع ملی کہ شکیل صاحب کو دفتر سے بونس کے علاوہ بیگم کے آبائی مکان میں سے ترکے کی رقم ملی ہے۔ اس اطلاع کو سن کر جی بھائی نے ایک بار پھر شکیل صاحب سے اپنی رقم کا تقاضا کیا لیکن شکیل صاحب نے دروغ گوئی سے کام لے کر ایک بار پھر انہیں ٹال دیا۔ جی بھائی لڑنے جھگڑنے والے آدمی نہیں تھے اور بہت ممکن تھا کہ وہ اپنی اس رقم کو بھول ہی جاتے لیکن ان دنوں ان کے ساتھ یہ مسئلہ چل رہا تھا کہ ان کی چھوٹی بچی کے گلے میں ٹانسلز ہو گئے تھے اور بچی آئے دن بیمار رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ بچی کے ٹانسلز کا جلد از جلد آپریشن کروالیا جائے ورنہ اس کی صحت پر برا اثر پڑے گا اور گروتھ بھی رک جائے گی۔ کہنے کو یہ ایک معمولی آپریشن تھا لیکن جی بھائی کی بیگم کے میکے میں کوئی بچہ اس آپریشن کے دوران ہی اپنی جان سے چلا گیا تھا اس لیے ان کی بیگم گورنمنٹ اسپتال میں آپریشن کروانے کے لیے راضی نہیں تھیں اور چاہتی تھیں کہ کسی اچھے پرائیویٹ اسپتال میں آپریشن کروایا جائے۔ اچھے پرائیویٹ اسپتال میں اس چھوٹے سے آپریشن کے لیے بھی اچھی خاصی رقم درکار تھی۔

جی بھائی کا خیال تھا کہ اگر شکیل صاحب کمیشن کی رقم ادا کردیں تو وہ کچھ روپے اپنے پاس سے ملا کر اور کچھ قرض لے کر آپریشن کروالیں گے لیکن شکیل صاحب نے رقم موجود ہونے کے باوجود انہیں انکار کردیا تو انہیں غصہ آگیا اور انہوں نے گھی نکالنے کے لیے انگلیاں ٹیڑھی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کاشف کے بارے میں انہیں علم تھا کہ دن بھر گلی اور آس پاس کے علاقے میں تنہا گھومتا رہتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دن موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اغوا کرلیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے افیون ملا کر میٹھی گولیاں پہلے ہی اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ وہ گولیاں انہوں نے کاشف کو کھانے کے لیے دیں اور ٹیکسی میں بیٹھ کر اسے اپنے دوست کے گھر لے گئے۔ ان کے کندھے سے لگے سوتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ٹیکسی ڈرائیور کو گمان بھی نہیں ہوا ہوگا کہ وہ بچے کو اغوا کر کے لے جارہے ہیں۔ دوست بھی تاوان کی رقم میں سے ملنے والے حصے کے لالچ میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا اور ایک غیر رجسٹرڈ سم کی مدد سے جی بھائی کے فراہم کردہ شکیل صاحب کے نمبر پر فون کرتا رہا۔ ایسے موقع پر جی بھائی ایک محلے دار کی حیثیت سے شکیل صاحب کے قریب ہی رہتے تھے تاکہ ان پر شک نہ کیا جاسکے اور حالات سے بھی واقفیت رہے۔ چنانچہ جب انہیں علم ہوا کہ اس معاملے میں پولیس بھی ملوث ہوگئی ہے تو وہ ڈر گئے، یوں بھی کاشف کی والدہ کی حالت دیکھ کر انہیں اپنے عمل پر ندامت ہونے لگی تھی اس لیے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ کاشف کو گھر واپس پہنچا دیا جائے اور انہوں نے اپنے تئیں ایک مناسب کہانی گھڑ کر کاشف کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ شکیل صاحب کا رشتے کا سالا جو پولیس میں تھا اپنے تجربے کی بنیاد پر جی بھائی کی طرف سے کھٹک گیا تھا۔ اس نے شکیل صاحب سے ان کے بعد جی بھائی کے مابین تعلقات کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو کمیشن کی رقم کے تنازع کا علم ہو گیا۔ اس کے نزدیک جی بھائی اور بھی مشکوک ہو گئے لیکن اس نے فوری طور پر ان پر ہاتھ نہیں ڈالا اور اس وقت کا انتظار کرتا رہا۔ جب کاشف کا دماغ افیون اور خوف کے اثر سے آزاد ہو جائے کاشف سنبھل گیا تو اس کے ماموں نے باتوں باتوں میں اس سے معلومات حاصل کرلیں۔ نشے میں رکھے جانے کے باعث کاشف اغوا ہونے کے بعد کی صورتِ حال تو نہ بتاسکا لیکن یہ واضح ہو گیا کہ اغوا سے پہلے وہ آخر بار جس شخص سے ملا تھا وہ جی بھائی تھے یوں شک

یقین کی حدوں پر پہنچ گیا اور جمی بھائی کو کام پر سے واپس آتے ہوئے حراست میں لے لیا گیا۔ جمی بھائی نے اپنی بیگم کو فون پر اپنے رات گھر نہ آنے کی جو اطلاع دی تھی وہ پولیس اسٹیشن سے ہی دی گئی تھی۔ پولیس کی حراست میں انہوں نے کاشف کے اغوا کا اعتراف کرنے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا اور ان کے بیان کے بعد ان کے اس دوست کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا جس نے ان کی معاونت کی تھی۔

اس واقعے پر محلے والوں نے ملے جلے ردِعمل کا مظاہرہ کیا۔ کچھ کا خیال تھا کہ بچے کو اغوا کر کے جمی بھائی نے نہایت گھٹیا حرکت کی تھی لیکن زیادہ تر کو ان کے ساتھ ہمدردی تھی اور یہ سمجھا جارہا تھا کہ جمی بھائی جیسے شریف آدمی نے نہایت مجبوری میں ایسا قدم اٹھایا تھا اور انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرنے والے شکیل صاحب خود تھے۔ میں، نانی اور افضل ماموں بھی اسی انداز سے سوچ رہے تھے لیکن جمی بھائی سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود اس بات پر متفق تھے کہ انہیں اتنا بڑا مجرمانہ قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ بہرحال جس کی جو بھی رائے تھی جمی بھائی اور ان کے دوست پر اغوا کا مقدمہ چلا۔ وہ گھر والے جن کے لیے جمی بھائی واحد کفیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس مقدمے کی کارروائی کے دوران پس کر رہ گئے۔ بیوی کے پاس موجود چھوٹا موٹا زیور اور بہنوں کے لیے جوڑا گیا جہیز مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے بک گیا اور نوبت یہاں تک آئی کہ ان کی بیگم اور بہنوں کو گھر سے نکل کر مختلف فیکٹریوں میں قلیل تنخواہوں پر نوکریاں کرنی پڑیں۔ ایک طرف یہ مالی پریشانیاں تھیں تو دوسری طرف وہ لوگ بے چارے سماجی طور پر بھی تنہا سے رہ گئے تھے اور ان میں ہمت نہیں رہی تھی کہ ایک مجرم کے قریبی رشتے دار ہوتے ہوئے لوگوں سے نارمل تعلقات رکھ سکیں۔ محلے دار بھی ان سے میل ملاپ میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگے تھے لیکن مقدمے کے دوران جب اہلِ محلّہ کی گواہی کی ضرورت پڑی تو محلے داروں نے حق گوئی سے کام لیا اور جمی بھائی کے کردار کے بارے میں وہی کچھ کہا جو سچ تھا۔ مقدمے کی سماعت کرنے والے جج بھی ساری صورتِ حال سن کر سمجھ چکا تھا کہ جمی بھائی اور ان کے دوست کوئی عادی مجرم نہیں ہیں۔ ان کے کردار کے بارے میں اچھے ریمارکس، شکیل صاحب کی بدنیتی اور جمی بھائی کی مجبوری کے علاوہ کاشف کی صحیح سلامت واپسی نے بھی عدالت کو ان کے حق میں خاصا نرم کردیا تھا لیکن بہرحال ان پر اغوا جیسے سنگین جرم کا الزام تھا اس لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ باعزت بری کردیے جاتے البتہ عدالت نے ہمدردی سے کام لیتے ہوئے انہیں نسبتاً ہلکی سزا سنائی اور وہ چودہ سال قید بامشقت کاٹنے کے لیے جیل بھیج دیئے گئے۔ ان کے دوست کو ان کے مقابلے میں کم سزا ملی۔ یوں وہ دونوں افراد جو کبھی معاشرے کے شریف افراد میں شمار ہوتے تھے اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے دن رات کاٹ رہے ہیں۔ شکیل صاحب نے اس واقعے کے سال بھر کے اندر ہی مکان فروخت کر کے ہمارے محلے سے نقل مکانی کرلی تھی۔ البتہ جمی بھائی کا خاندان اب بھی وہیں آباد ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان کے محلے والوں سے تعلقات بحال ہوگئے ہیں اور ان کی زبانی محلے والوں کو جمی بھائی کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی ہیں کہ جیل میں رہ کر وہ پنج وقتہ نمازی ہو گئے ہیں اور اپنی شرافت اور ہنرمندی کے باعث انہیں وہاں بھی بہت پسند کیا جاتا ہے۔ جیل میں کام کرنے کا انہیں باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا ہے جو وہ ملاقات کے لیے جانے والے اپنے گھر والوں کو دے دیتے ہیں یوں جیل میں رہ کر بھی انہوں نے گھر والوں کی کفالت کی کوشش جاری رکھی ہوئی ہے لیکن ظاہر ہے یہ رقم اتنی نہیں ہوتی کہ گھر کا تمام خرچا بہ خیر و خوبی چل سکے۔ اس لیے ان کی بیوی اور بہنیں بہ دستور ملازمت کر رہی ہیں۔ میں جب بھی جمی بھائی کے بچوں کو دیکھتی ہوں میرے ذہن میں بہت سے سوالات اٹھنے لگتے ہیں۔ ان کا باپ جو بہت باکردار تھا صرف ایک لغزش کے باعث سزا یافتہ مجرم ہے اور یہ معاشرہ باپ کے جرم کی سزا والدہ کو بھی دیتا ہے۔ اپنے باپ کے کردار پر پڑے اس بڑے سے سیاہ دھبے کے باعث حال و مستقبل میں ان بچوں کو نہ جانے کن کن مصائب سے گزرنا پڑتا پھر جب جمی بھائی جیل سے رہا ہو کر واپس گھر آجائیں گے تو ان کا کیا ہوگا؟ کیا وہ دوبارہ اس معاشرے میں ایک نارمل فرد کی طرح زندگی گزار سکیں گے؟ ان کی بہنیں جن کا جمع شدہ جہیز بھائی کے مقدمے کی پیروی میں بک چکا ہے کیا بیاہی جاسکیں گی؟ بڑھاپے اور بیٹے کی جدائی کے باعث میں کمزور ہوجانے والے ان کے والدین کیا اس طویل انتظار کی مدت گزار سکیں گے اور یہ کہ جس جرم کی سزا جمی بھائی بھگت رہے ہیں اس کا اصل ذمے دار کون ہے خود جمی یا شکیل صاحب، جن کی بدنیتی و بے ایمانی نے ایک شریف آدمی کو مجرم بنا ڈالا۔

غیر انسانی

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
سچ کہوں کہ میں ڈائجسٹ نہیں پڑھتا۔ گزشتہ دنوں اپنے چچا کے گھر نگر (گلگت) گیا ہوا تھا۔ وقت گزاری کے لیے شیلف میں رکھا ایک ڈائجسٹ نکال کر پڑھا۔ وہ سرگزشت کا پُراسرار کہانیاں نمبر تھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ خود پر گزرا ایک واقعہ بھی لکھ دوں۔ من و عن تمام باتیں لکھ دی ہیں اگر پسند آجائے تو نزدیکی شمارے میں شائع کردیں۔ اب میں پابندی سے سرگزشت لے رہا ہوں۔ آپ اگر چھپنے کی اطلاع نہ بھی دیں گے تو میں جان لوں گا۔
نوشاد علی
(کراچی)

میں شام کے وقت دفتر سے آیا تو روشانے سہمے لہجے میں کہا۔ ”شاد اس گھر میں کچھ ہے۔“
میں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ ”کچھ ہے ...... کیا مطلب؟“
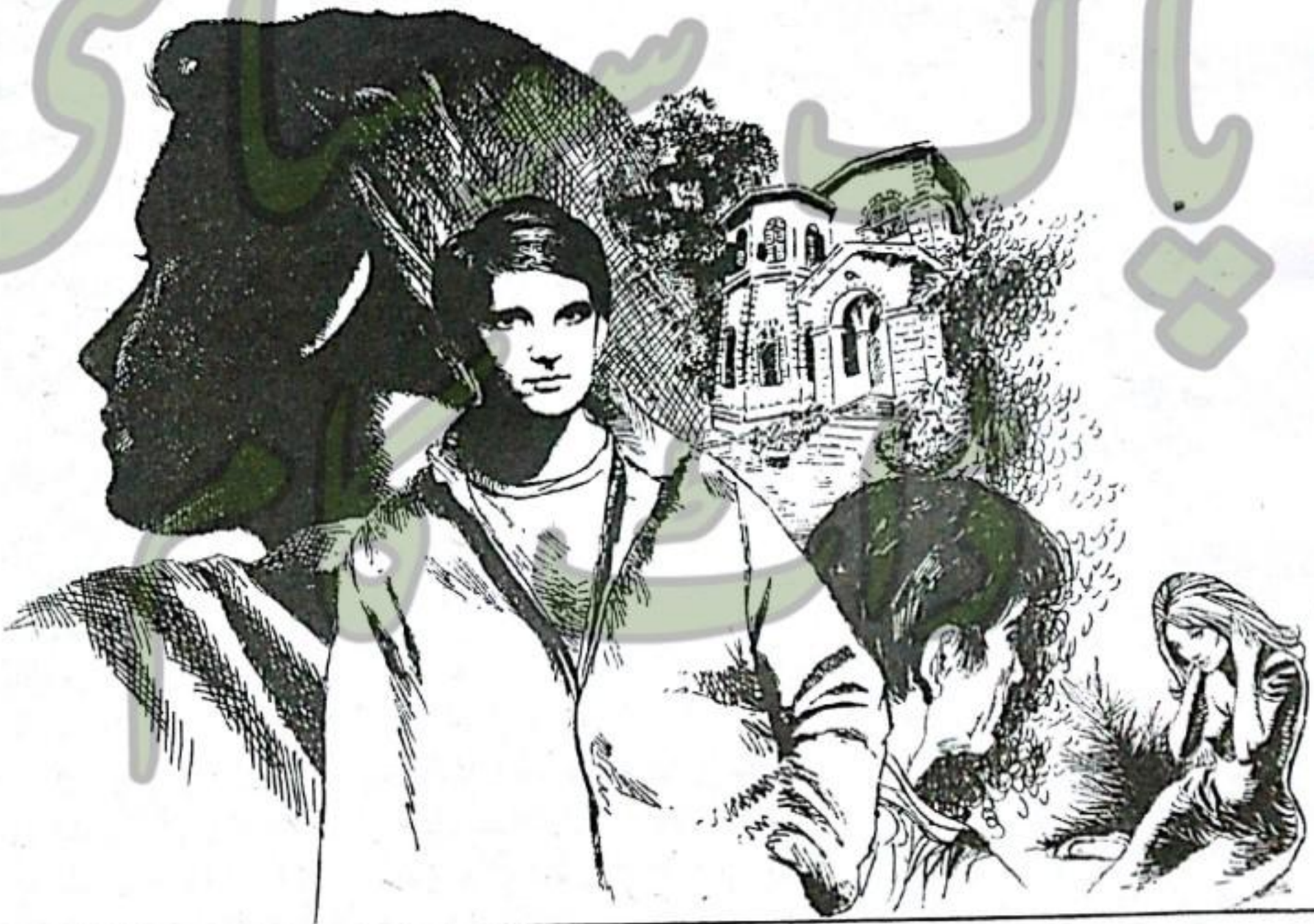
روشانے ہچکچا کر کہا۔ ”کوئی چیز ہے جو نظر نہیں آتی پر محسوس ہوتی ہے۔“
میں نے گہری سانس لی اور پھر بہ ظاہر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے اس گھر میں بھی کوئی مسئلہ نکلا۔ یعنی

اب ہم چوتھے گھر کی تلاش شروع کر دیں۔''
روشنا روہانسی ہو گئی۔ ''پلیز آپ کیا مذاق سمجھ رہے ہیں، میں سنجیدہ ہوں۔''
''میں بھی سنجیدہ ہوں۔'' میرا لہجہ کسی قدر طنزیہ ہو گیا۔ ''کہو تو آنے والے اتوار سے اگلے مکان کی تلاش شروع کر دوں۔''
حسب توقع روشنا کا منہ پھول گیا اور وہ تنتناتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ ایک سال پہلے مجھے کراچی میں جاب ملی تھی اور میں روشنا اور روشنی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ میرا نام تو شاد علی اور آبائی تعلق حیدر آباد سے ہے۔ پیشے کے لحاظ سے فارماسیوٹیکل کیمسٹ ہوں۔ ماسٹر میں نے کراچی یونیورسٹی سے کیا تھا پھر جاب کے لیے حیدر آباد واپس چلا گیا۔ اسی دوران میں شادی ہوئی اور شادی کے ایک سال بعد بیٹی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ حیدر آباد میں ترقی اور آگے بڑھنے کا اسکوپ کم ہے۔ اس لیے میں نے کراچی میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ خوش قسمتی سے جلد مجھے ایک اچھی کمپنی میں جاب مل گئی۔ تنخواہ اور دوسری سہولیات بھی مناسب تھیں۔ میں نے فوراً ہاں کر دی اور جب روشنا کو پتا چلا تو اس نے ہنگامہ کیا تھا کہ وہ کراچی نہیں جائے گی۔ مجھے پہلے ہی توقع تھی اس لیے میں نے اسے بتائے بغیر سب کچھ کیا تھا۔ ایک بار جاب مل گئی تو اسے منانا مشکل ثابت نہیں ہوا۔
روشنا میری چچا زاد بھی ہے۔ ہمارا پورا خاندان حیدر آباد میں ہی ہے۔ کراچی میں اِکا دُکا رشتے دار ہیں۔ سب سے قریبی میری ایک خالہ ہیں جو کراچی میں بیاہی گئی ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے دوران میں ان کے ہاں ہی رہا تھا۔ خالہ کی دو بیٹیاں تھیں اور ان کی پوری کوشش تھی کہ میں ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لوں۔ مگر میں کیسے کرتا، میرے دل و دماغ میں تو روشنا بسی ہوئی تھی۔ پتا نہیں اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ کراچی میں خالہ نے مجھے اپنی لڑکیوں کے لیے پھانسنے کی کوشش کی تھی اور اس نے شادی کے بعد اس معاملے میں میرا بہت دماغ کھایا۔ وہ بار بار پوچھتی کہ میں اتنے عرصے وہاں رہا تو خالہ کی لڑکیوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ مجھے ہر بار قسمیں کھا کر یقین دلانا پڑتا کہ میں نے ایک بار بھی ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ ایک تو میرے دماغ میں روشنا بسی تھی دوسرے خالہ کی لڑکیاں شکل وصورت کے لحاظ سے بس معمولی درجے کی تھیں۔ اس کے باوجود روشنا کو شک تھا۔ مگر یہ شک اتنا نہیں تھا کہ میرے لیے وبال بن جاتا۔ شادی کے شروع دنوں میں اسے ابال آتا رہا پھر وہ نارمل ہو گئی اور ایک سال بعد وہ بھول ہی گئی تھی۔ مگر جب کراچی جانے لگا تو اسے پھر سے خیال آ گیا۔
''شاد، آپ اپنی خالہ کے ہاں تو نہیں رکیں گے؟''
''وہاں کیوں رکوں گا، میں اپنا مکان یا فلیٹ لوں گا۔'' میں نے کہا۔ مگر اس کی تسلی نہیں ہوئی۔
''ابھی تو آپ اکیلے جا رہے ہیں تو کہاں رکیں گے؟''
''ایک دوست کے پاس۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم بھول رہی ہو جب تم سے شادی ہوئی تو خالہ ہم سے ناراض ہو گئی تھیں اور وہ شادی میں بھی شریک نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے اب ان کے ہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔''
اب روشنا کو تسلی ہوئی مگر جب تک میں کراچی میں اس کے بغیر رہا تو جب مجھ سے فون پر بات کرتی گھما پھرا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی کہ میں کہیں خالہ کے ہاں تو نہیں گیا۔ مجھے سیٹ ہونے اور مکان تلاش کرنے میں دو ہفتے لگے تھے۔ پھر میں نے ضرورت کا سامان لیا اور اس کے بعد روشنا اور روشنی کو بلایا تھا۔ یہ دو کمروں کا ایک پورشن تھا جس میں چھوٹا سا لاؤنج تھا اور اسی میں کچن تھا۔ مگر ہمارے لیے یہ کافی تھا۔ روشنا نے دوسرے کمرے کو ڈرائنگ روم بنا لیا۔ وہاں قالین کے ساتھ کین کے بنے ہوئے ہلکے اور چھوٹے صوفہ سیٹ ڈال دیے۔ بیڈ روم میں بھی قالین تھا اور اس پر اسپرنگ میٹریس ڈالا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی اسٹیل کی الماری لی تھی۔ روشنا اپنے جہیز کی واشنگ مشین، ٹی وی اور فریج ساتھ لائی تھی۔ باقی چھوٹی موٹی اشیا تھیں جن کا لانا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔
میری جاب سائٹ میں تھی اور مکان نارتھ ناظم آباد کے پرانے علاقے میں ملا تھا۔ یہ بڑا پلاٹ تھا جس پر چھوٹے چھوٹے پورشن بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے۔ ہر فلور پر چار پورشن تھے اور کل تین منزلہ مکان تھا۔ ایک طرح سے فلیٹ سسٹم تھا کیونکہ مشترکہ کاموں کے لیے یونین بھی تھی۔ ہمارا فلیٹ روڈ سائیڈ پر تھا اور مالک نے جگہ گھیر کر ایک گیلری جیسی بنا لی تھی جہاں کپڑے سکھائے جا سکتے تھے اور اس کی وجہ سے دروازے اور کھڑکیاں کھول کر رکھی جا سکتی تھیں گیلری لوہے کی گرل سے محفوظ تھی۔ بہ ظاہر مکان

اور علاقہ بہت اچھا تھا اور ہمیں مناسب کرائے پر مل گیا تھا۔ یہاں پانی، بجلی اور گیس کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ مگر جلد ہمیں پتا چل گیا کہ یہاں رہنے والے دوسرے لوگ سب سے بڑا مسئلہ تھے۔ پہلے مہینے تو بجلی کا بل نارمل آیا مگر دوسرے مہینے جب بل آیا تو شاک مجھے لگا تھا۔

بل یک دم ہی پندرہ سو سے نو ہزار ہو گیا تھا۔ میں سمجھا کہ اوور بلنگ کی گئی ہے مگر جب میٹر دیکھا تو وہ اس سے بھی آگے کے یونٹ بتا رہا تھا جو بل میں درج تھے۔ یعنی بل غلط نہیں تھا۔ اس مہینے میں نے صبر کر کے یہ بل بھر دیا اور میٹر پر نظر رکھنے لگا۔ جو بہت تیز رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ جب کہ باقی لوگوں کے میٹرز نارمل تھے۔ ایک دن میں دفتر سے آیا تو روشنا نے کہا۔ ”ایسا تو نہیں ہے کہ ہمارے میٹر سے کسی نے کنڈا لیا ہوا ہو۔“

میں چونکا۔ ”یہ خیال تو آیا ہی نہیں۔“

”اب چیک کریں۔“ اس نے مشورہ دیا میں نے گھر کی تمام بجلی استعمال کرنے والی چیزیں بند کیں اور پھر مین سوئچ بھی آف کر دیا اس کے بعد جا کر میٹر دیکھا تو وہ چل رہا تھا۔ اس پر میں نے یونین کے صدر کو پکڑا اور اس سے پوچھا کہ یہ کیا چکر ہے۔ اس نے چیک کیا اور بتایا کہ پانی کی دونوں موٹریں اور بیرونی سیڑھیوں کی روشنیاں میرے میٹر سے بجلی لے رہی تھیں۔ میں نے ہنگامہ کیا کہ مجھے بتائے بغیر اور پوچھے بغیر یہ کس نے کیا مگر کسی نے اقرار کر کے نہیں دیا۔ میں نے مطالبہ کیا کہ بل میں سب شیئر کریں تو یہ بھی کوئی نہیں مانا۔ موٹروں اور بیرونی روشنیوں کے ہر مہینے پانچ سو روپے الگ سے لیے جاتے تھے۔ کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا کیونکہ اس صورت میں سب کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا اور سب اس سے بچ رہے تھے۔ میں نے صدر سے صاف کہہ دیا کہ جب تک میرا نقصان پورا نہیں ہوتا میں یونین کے پانچ سو نہیں دوں گا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں رہنے والے لوگ اچھے نہیں تھے۔ مگر یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنے برے بھی ہو سکتے ہیں۔

یہاں پانی ہر روز صبح چڑھایا جاتا تھا اور عام طور سے یہ پانی رات گئے تک آتا تھا۔ اس کے بعد پانی ختم ہو جاتا مگر بالٹیوں میں ہوتا تھا جو رات کو کام آ جاتا۔ تیسرے مہینے سے یہ ہوا کہ صبح پانی چڑھتا اور چند گھنٹے بعد غائب ہو جاتا۔ اس کے بعد ہم پانی کے بغیر بیٹھے رہتے تھے۔ دو تین بار ایسا ہوا تو میں نے پھر یونین کے صدر سے بات کی اور اس نے مشورہ دیا کہ میں گھر میں پانی کی ٹنکی لے لوں کیونکہ اب یہاں سب نے ٹنکیاں لگا لی ہیں اور اوپر چڑھایا جانے والا پانی وہ براہ راست ٹنکیوں میں بھر لیتے ہیں۔ میں پریشان ہو گیا میں نے مالک مکان سے بات کی تو اس نے ٹنکی لگانے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا مکان بالکل نیا تھا اور وہ اس میں کوئی ٹوٹ پھوٹ یا خرابی برداشت نہیں کرے گا اگرچہ میں نے اسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ جو ٹوٹ پھوٹ ہوگی میں اسے اچھی طرح صحیح کرا دوں گا مگر وہ نہ مانا۔

نیچے واش روم اتنے چھوٹے تھے کہ ان میں رکھنے والی ٹنکی بھی نہیں آسکتی تھی۔ بالٹیوں میں بھر کر کتنی دیر کام چلایا جا سکتا تھا۔ روشنا تنگ آ گئی اور میں نے دوسرے مکان کی تلاش شروع کر دی۔ اس بار بھی ہمیں اسی علاقے میں ایک پورشن مل گیا۔ نیچے مالک مکان رہتا تھا۔ اوپر دو کمرے اور ان کے سامنے برآمدہ تھا۔ اسی برآمدے میں ایک طرف نیم کھلا ہوا کچن تھا۔ کرایہ مناسب تھا۔ مالک مکان اس وقت معقول لگا تھا۔ میں نے اسے ایڈوانس دیا اور پہلی تاریخ کو وہاں شفٹ ہو گیا۔ سامنے کھلا صحن تھا۔ شام کے وقت یہاں اچھی ہوا آتی تھی البتہ دن میں کمرے بہت گرم ہو جاتے تھے۔ مگر کیا کرتے مجبوری تھی۔ گزارہ تو کرنا تھا۔ دن کی گرمی کا ازالہ رات کو ہو جاتا تھا۔ میں نے دو چار پائیاں لے لی تھیں اکثر ہم ان پر ہی باہر سو جاتے، بہت مزے کی نیند آتی تھی۔

مالک مکان نے مین میٹر سے ہمیں سب میٹر لگا کر بجلی دی ہوئی تھی۔ ہمیں آئے ہوئے تیسرا دن تھا اور اتفاق سے دوپہر کا وقت تھا۔ اچانک لائٹ چلی گئی۔ ہم سمجھے کہ لوڈ شیڈنگ ہوئی ہے۔ کیونکہ گرمیوں میں تو یہ معمول کی بات ہے۔ گرمی بلا کی تھی اور کمرے اوپر ہونے کی وجہ سے دھوپ میں براہ راست تپ رہے تھے۔ روشنی بلبلا گئی تو میں اسے لے کر نیچے اتر آیا۔ نزدیک ہی بازار تھا میں وہاں سے خریداری کرتا تھا۔ روشنا نے کچھ چیزیں منگوائی تھیں۔ میں مارکیٹ آیا تو یہاں لائٹ تھی۔ پھر واپس آیا تو برابر والے گھر میں پانی کی موٹر چل رہی تھی یعنی وہاں بھی لائٹ تھی۔ میں نے مالک مکان کا دروازہ بجایا اور ان کا بیٹا آیا تو میں نے اس سے کہا۔

”دیکھو بیٹا شاید فیوز اڑ گیا ہے کیونکہ آس پاس تو لائٹ ہے۔“

''فیوز نہیں اڑا ہے۔'' لڑکے نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ابا نے مین سوئچ آف کیا ہوا ہے۔''
میں حیران ہوا۔ ''کیوں کیا گھر میں بجلی کا کوئی کام ہو رہا ہے؟''
''نہیں ابا کہتے ہیں کہ جب میٹر زیادہ چل جائے تو لائٹ بند کر دینی چاہیے۔''
میں سمجھا نہیں اس لیے میں نے مالک مکان سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی وہ کچھ دیر بعد اندر سے نکلا اور میں نے میٹر بند کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔ ''بھائی بات یہ ہے کہ اگر یونٹ زیادہ ہو جائیں تو بل زیادہ آتا ہے اس لیے میں یونٹ کم رکھنے کے لیے میٹر بند کر دیتا ہوں۔''
''یونٹ کم ہوں تب بھی بل تو دینا پڑتا ہے۔''
''ہاں مگر اس صورت میں بل کم ہوتا ہے۔''
''تو اب یہ میٹر کب کھلے گا؟''
''یہ روزانہ صبح دس سے شام چھ بجے تک بند رہے گا اس کے بعد کھل جائے گا۔''
''کیا مطلب تب تک ہم بجلی کے بغیر بیٹھے رہیں گے۔ اور کتنی گرمی ہے آپ کو معلوم نہیں ہے کیا۔''
''گرمی تو ہے پر میرا اصول ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔
میں نے اصرار کیا۔ ''بل مجھے دینا ہے اس لیے آپ میٹر چلائیں۔''
مگر نہ اس نے ماننا تھا اور نہ وہ مانا۔ میرا جھگڑا کرنا بھی رائیگاں گیا اور اس نے رکھائی سے کہا کہ اگر میں ایسے نہیں رہ سکتا تو کوئی اور گھر تلاش کر لوں۔ میں اوپر آیا تو گرمی اور غصے سے برا حال تھا۔ روشنا کو بتایا تو اسے بھی غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ کون سی انسانیت ہے کیا ہم فری میں رہ رہے ہیں، آپ کوئی دوسرا مکان تلاش کریں۔''
دوسرا مکان تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ مگر میں نے سوچ لیا کہ اس بار ایسا مکان تلاش کروں گا جس کے ساتھ مالک نہ ہو اور مکان پورا مجھے ہی ملے چاہے اس کے لیے مجھے زیادہ کرایہ کیوں نہ دینا پڑے۔ مجھے پورے ہفتے میں چھٹی کا ایک دن ملتا تھا مگر یہاں ہونے والی اذیت نے مجھے مجبور کیا کہ میں دفتر سے چند دن کی چھٹی لے کر مکان تلاش کروں۔ مالک مکان کو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں مکان تلاش کر رہا ہوں جیسے ہی ملا میں یہاں سے چلا جاؤں گا اس پر بھی وہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ اس نے صبح سے شام تک بجلی بند رکھنے کی روش برقرار رکھی تھی۔ یہ اس کی چالاکی بھی تھی۔ نیچے کا فلور دن میں اتنا گرم نہیں ہوتا تھا اور وہ بجلی کے بغیر گزارہ کر لیتے تھے شام کو جب اوپر ٹھنڈا اور نیچے کا حصہ گرم ہونا شروع ہوتا تو وہ بجلی آن کر لیتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے جو یہ وقت اسکول اور پھر کھیل کے چکر میں گھر سے باہر گزارتے تھے اور خود وہ بیوی کے ساتھ جاب کرتا تھا۔ گویا وہ ان اوقات میں بجلی بند کرتا تھا جب اسے ضرورت نہیں ہوتی تھی۔
میں مکان کی تلاش میں لگا رہا تھا اور میری تلاش بالآخر کامیاب رہی، مجھے نیو کراچی میں ایک چھوٹا مکان مل گیا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ دو منزلہ ہونے کے باوجود اس میں اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ اس میں آگے پیچھے بڑے صحن تھے۔ نیچے تین کمرے تھے اور اوپر دو کمرے تھے جو خالی تھے اور مالک نے انہیں لاک کیا ہوا تھا۔ مکان پرانے طرز کا لیکن اچھا اور صاف ستھرا بنا ہوا تھا۔ بجلی اور پانی کی کھلی سہولت تھی یعنی دونوں چیزیں چوبیس گھنٹے دستیاب ہوتی تھیں۔ ویسٹ اوپن ہونے کی وجہ سے یہاں ہوا بھی خوب آتی تھی کیونکہ پلاٹ بڑا تھا اس لیے باقی گھر خاصے بڑے اور پوش قسم کے بنے ہوئے تھے اور ان میں فیملیز بھی پوش رہتی تھیں۔ اس لیے میں خوش تھا کہ ماحول اچھا ملے گا۔ کرایہ بہت معمولی سا زیادہ تھا مگر مجھے دوسری سہولتوں اور سب سے بڑھ کر مالک مکان کے سر پر نہ ہونے کی وجہ سے مکان سستا لگا تھا۔ میں نے روشنا کو بتایا تو اسے بھی پسند آ گیا۔
ایڈوانس بھی صرف تین مہینے کا تھا۔ تمام بل کلیئر تھے۔ مالک معقول نظر آیا تھا اور اس کی رہائش لیاقت آباد میں تھی اور وہ پیشے کے لحاظ سے سول انجینئر تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ اس کا آبائی مکان تھا اور اس کا بچپن اور جوانی اسی مکان میں گزری تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اوپر والا پورشن کرائے پر دینے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس نے انکار کیا کہ اوپر مکمل مکان نہیں ہے بس دو کمرے ہیں اور ان میں کچھ سامان بھی پڑا ہوا ہے۔ اسے کرائے پر دینے کے لیے خاصا بنوانا پڑے گا۔ اس لیے فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور اگر ہوا تو وہ مجھے پہلے خبر دے گا۔ اس نے مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر دیا کہ میں کرایہ براہ راست اس کے اکاؤنٹ میں ڈال دیا کروں اور بل کی ادائیگی وہ آن لائن دیکھ لے گا۔ یعنی

اسے صرف ان کاموں کے لیے یہاں آنا جانا نہیں پڑے گا۔ مکان کی دیکھ بھال کے لیے اس نے محلے کے ہی ایک صاحب رفیق بھائی سے تعارف کرایا کہ وہ مہینے میں ایک بار آکر دیکھ لیا کریں گے اور میں انہیں مکان دکھانے کا پابند ہوں گا۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

مکان اس لحاظ سے بڑا تھا کہ اس میں ایک الگ سے نشست گاہ بھی تھی اور دو بیڈ روم اٹیچ باتھ کے ساتھ تھے۔ یہ حصہ جدید انداز کا بنا ہوا تھا جس میں امریکن کچن بھی شامل تھا۔ روشنا گھر دیکھ کر خوش ہوئی تھی اور روشنی کی خوشی یہ تھی کہ اسے بھاگنے دوڑنے اور کھیلنے کو بڑی سی جگہ ملے گی۔ وہ دو سال کی ہو چکی تھی اور ایک منٹ کے لیے بھی سکون سے نہیں بیٹھتی تھی۔ مجھے اور روشنا کو ہمہ وقت اس کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ مکان دونوں طرف سے کھلا ہوا تھا اس لیے گرمیوں میں تو بہت مزہ آیا لیکن جیسے ہی سردی کا آغاز ہوا اس کا کھلا پن کھٹکنے لگا تھا اب ہم کھڑکیاں اور دروازے بند رکھتے تھے ورنہ ہوا بہت زیادہ پاس ہوتی اور اندر خاصی سردی ہو جاتی تھی۔ یہ سرما آغاز سے کچھ شدید بھی تھا۔ اسی سرما کی ایک شام روشنا نے مجھے ڈرتے ڈرتے مکان کے آسیب زدہ ہونے کا کہا اور مجھے غصہ آ گیا تھا۔ پھر میری باتوں سے روشنا کو بھی غصہ آ گیا اور رات گئے تک ہمارے درمیان بات بند رہی تھی۔ لیکن جب روشنی سو گئی اور کچھ رسمی گفتگو کے بعد ہم کھلے تو پہلے لڑائی ہوئی اور پھر صلح کے بعد میں نے روشنا سے پوچھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہاں کچھ ہے؟''

''ساتھ والی ساجدہ باجی نے بتایا ہے۔'' اس نے سادگی سے کہا تو میں نے سر پیٹ لیا۔

''اور تم نے یقین کر لیا؟''

''تو انہیں مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''روشی خدا کے لیے، میں چند مہینوں میں جان گیا ہوں کہ ساجدہ باجی بی جمالو قسم کی خاتون ہیں اور جھوٹ بولنا ان کا شوق ہے۔''

''مگر وہ اس بارے میں سچ کہہ رہی ہیں انہوں نے تو چند واقعات بھی سنائے ہیں۔''

''کیسے واقعات؟''

''جو پچھلے کرائے داروں کے ساتھ پیش آئے۔''

''ان کے ساتھ کیا ہوا؟''

''ایک کرائے دار کی بیوی نے رات کے وقت پچھلے صحن میں کچھ دیکھا تو بے ہوش ہو گئی اور پھر ہوش آیا تو اسے دورے پڑنے لگے۔ وہ پریشان ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ دوسرے کرائے دار آئے تو ان کی چیزیں اِدھر اُدھر ہونے لگیں۔ کبھی سامان غائب ہو جاتا اور کبھی مل جاتا۔ آوازیں آتیں اور ایسا لگتا کہ کوئی اوپر والے فلور پر فرنیچر گھسیٹ رہا ہے جب کہ اوپر نہ تو کوئی رہتا تھا اور نہ ہی وہاں کوئی فرنیچر تھا۔ بس دو بوڑھے میاں بیوی تھے وہ مکان چھوڑ کر چلے گئے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا پھر میں نے روشنا سے کہا۔ ''دیکھو سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے جب تک آدمی خود نہ دیکھ لے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آپ جانتے ہیں میں کتنی ڈرپوک ہوں اگر کوئی چیز نظر آئی تو بے ہوش نہیں ہوں گی بلکہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔''

''اللہ پر بھروسا رکھو، تم پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہو۔ باقاعدگی سے قرآن کریم اور دعائیں پڑھتی ہو۔ میں بھی پابندی سے نہ سہی مگر نماز پڑھ لیتا ہوں اور روشنی بچی ہے۔ اللہ بچوں کی حفاظت خود کرتا ہے۔''

ہمیں اس مکان میں آئے ہوئے یہ چوتھا مہینا تھا اور اب تک میں نے نہ تو کچھ دیکھا تھا اور نہ محسوس کیا تھا اور نہ ہی مجھے کبھی ڈر لگا تھا۔ عقبی صحن میں نیم کا بڑا سا درخت تھا مگر اس کا مکان کی طرف والا حصہ کسی وجہ سے سوکھ گیا تھا اور یہاں صرف شاخیں تھیں۔ البتہ اس کا مخالف سمت والا حصہ بہت ہرا بھرا اور بڑا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چیکو اور املی کے کچھ درخت تھے مگر یہ زیادہ بڑے نہیں تھے۔ صحن کچھ جگہوں کو چھوڑ کر پکا تھا اور دوسری منزل پر جانے کے لیے زینہ بھی اسی طرف سے تھا۔ روشنا ہر دوسرے تیسرے دن یہاں صفائی کر دیتی تھی۔ باقی گھر اور سامنے والا صحن جہاں ہم نے خود کیاریاں بنائی تھیں وہ روز صاف کرتی تھی۔ جب ہم آئے تو گیٹ اور اندر کی دیواروں پر رنگ و روغن نہیں تھا میں نے مالک مکان سے رنگ کرانے کو کہا تو اس نے مجھ سے کہا میں خود کرا لوں اور جو رقم بنے وہ کرائے سے کاٹ لوں۔

اس لیے میں نے خود رنگ و روغن کرا لیا تھا۔ یہاں رونق اور صفائی ہو گئی تھی۔ آخر گرمیوں کی راتوں میں ہم دیر

تک باہر رہتے تھے اور پھر سونے کے لیے اندر جاتے تھے۔ اس سارے عرصے میں صبح، دوپہر، شام اور رات کسی وقت ہم نے یہاں کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ روشنا ہر دوسرے تیسرے دن تکیوں اور کمبلوں کو دھوپ دکھاتی تھی کیونکہ یہ مستقل استعمال میں رہتے تھے۔ وہ صبح دھوپ نکلنے پر اوپر ڈال آتی تھی اور جب میں شام کو آتا تو نیچے لے آتا تھا۔ اس دن اتفاق سے میں جلد آ گیا تھا۔ بعض ضروری مرمت کی وجہ سے دفتر جلد بند کر دیا گیا تھا اور میں پانچ بجے تک گھر آ گیا تھا۔ آتے ہی روشنا نے مجھے اوپر سے کمبل لانے کو کہا۔ یہ آسیب والی گفتگو کے تیسرے دن کی بات تھی۔ میں اوپر آیا تو سورج ڈوبنے کے قریب تھا اور روشنا نے کمبل ایک طرف پڑی پرانی چارپائیوں پر ڈال رکھے تھے۔ میں انہیں اٹھانے کے لیے بڑھا تھا کہ رک گیا مجھے لگا کہ ایک کمبل تلے کوئی لیٹا ہوا ہے۔ کمبل کی ساخت بالکل ایسی بن رہی تھی جیسے اس کے نیچے کوئی ہو اور وہ کسی قدر ہل بھی رہا تھا۔ یہ بھاری کمبل تھا اس کی ساخت تو ایسی بن سکتی تھی مگر یہ از خود ہل نہیں سکتا تھا۔

ایک لمحے کو میں رک گیا اور مجھے ڈر لگا تھا۔ فطری طور پر میرے ذہن میں روشنا والی بات آئی۔ مجھے خیال آیا کہ پلٹ جاؤں مگر پھر مجھے شرم آئی کہ میں روشنا کو جھٹلا رہا تھا اور خود مرد ہوتے ہوئے ڈر رہا ہوں۔ میں حوصلہ کر کے آگے آیا اور کمبل کا کنارہ پکڑ کر اسے اچانک کھینچا تو خود گرتے گرتے بچا کیونکہ کمبل بہت آسانی سے چلا آیا تھا اور میں نے زیادہ ہی زور لگا دیا تھا۔ کمبل تلے کچھ نہیں تھا اور کسی وجہ سے اس کی ساخت یوں بن گئی تھی جیسے اس کے نیچے کوئی ہو، مگر وہ ہل کیسے رہا تھا۔ میں نے دوسرا کمبل اٹھایا اور ایک بار پھر گرتے گرتے بچا۔ اس کے نیچے سے ایک سیاہ بلی نکل کر بھاگی اور اس نے منڈیر پر چڑھ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی زردی مائل آنکھوں میں جیسے بلب جل رہے تھے۔ اس نے دانت نکال کر مخصوص آواز نکالی اور دوسری طرف کود گئی۔ میں نے دل ہی دل میں اس بلی کو گالی دی جو کمبل میں گھسی بیٹھی تھی۔ میں کمبل سمیٹ کر نیچے جانے لگا۔ سیڑھیاں ایک کمرے کے ساتھ نیچے جا رہی تھیں میں اس کے دروازے کے پاس سے گزرا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کہا ہو۔ ’’بری بات گالی نہیں دیتے۔‘‘

آواز یوں تھی جیسے ہوا سرسراتی ہو اور اس دن ہوا بہت تیز چل رہی تھی اس کے باوجود میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ سرگوشی اصل میں ہوا کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ہوا آواز پیدا کر سکتی ہے لیکن وہ الفاظ تو پیدا نہیں کر سکتی ہے اور سرگوشی نسوانی تھی۔ اس سرگوشی نے مجھے بدحواس کر دیا اور میں یوں نیچے اترا کہ مجھے آج بھی تعجب ہوتا ہے کہ میں گرے بغیر نیچے کیسے پہنچ گیا اور جب کمبل لے کر آگے صحن میں آیا تو میرا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ کمبل چارپائی پر پھینک کر خود بھی ان پر ڈھیر ہو گیا۔ روشنا اتفاق سے باہر آ رہی تھی۔ میری حالت دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف آئی۔ ’’شاد کیا ہوا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

اس لمحے میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اگر میں نے روشنا کو اپنے محسوسات کے بارے میں بتا دیا تو اس کے بعد وہ کسی صورت اس مکان میں رہنے کو تیار نہیں ہو گی اور میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ اس لیے میں نے بہانہ بنایا۔ ’’پتا نہیں اوپر سے آتے ہوئے چکر سا آیا اور میں بڑی مشکل سے یہاں تک آیا ہوں۔‘‘

’’میرے خدا۔‘‘ اس نے میرے ہاتھ تھامے۔ ’’آپ تو بالکل ٹھنڈے ہو رہے ہیں پلیز ڈاکٹر کے پاس چلیں۔‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں ہے تم پانی لے آؤ اب میں ٹھیک ہوں۔‘‘

’’خاک ٹھیک ہیں آئینہ دیکھیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔‘‘

یہ سچ تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ روشنا اندر گئی اور انرجائل بنا لائی۔ اس کا گلاس پی کر میرے اعصاب قابو میں آئے اور مجھے سکون ملا تھا۔ میں نے روشنا کو قائل کر لیا کہ چکر عارضی تھے شاید میں آج ٹھیک سے ناشتا کر کے نہیں گیا تھا اس لیے چکر محسوس ہوئے۔ میں صبح ناشتا کر کے جاتا تھا اور پھر آ کر رات کا کھانا جلدی کھا لیتا تھا۔ دوپہر میں دفتر میں کچھ ہلکا پھلکا لے لیا جیسے سلاد یا سینڈوچ ورنہ باقاعدہ کھانا نہیں کھاتا تھا۔ آج صبح آفس سے دیر ہو رہی تھی اس لیے میں نے صرف آدھا پراٹھا اور انڈہ لیا اگرچہ اس کی کسر دفتر میں پوری کر لی تھی اور دس بجے رول منگوا کر کھایا تھا۔ مگر اس وقت یہ بہانہ چل گیا۔ روشنا نے تسلیم کر لیا کہ بھوک کی وجہ سے مجھے چکر آئے تھے۔ مگر ساتھ ہی اس نے مجھے سنائیں کہ اگر میں گھر سے ٹھیک سے ناشتا کر کے نہیں گیا تھا تو آفس میں کھانے کو کچھ منگوا لیتا۔ وہ کھانا بنانے کے لیے کچن میں گئی تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیا تھا۔ وہ سرگوشی تھی یا میرا وہم تھا۔ مگر ذہن اسے وہم تسلیم

کرنے کو تیار نہیں تھا۔

آواز بالکل واضح تھی اور کسی عورت نے نکالی تھی۔

میں چارپائی پر لیٹا ہوا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب اندھیرا ہوا تو مجھے ڈر لگا اور پھر سردی بھی ہو رہی تھی اس لیے میں اٹھ کر اندر بیڈروم میں آگیا جہاں روشنی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس کی باتوں سے دل بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد روشنا نے کھانا لگا دیا اور ہم نے کھانا کھایا۔ مجھ سے ٹھیک سے نہیں کھایا گیا تھا۔ روشنا نے حیرت سے کہا۔ ”اب بھی آپ نے ٹھیک سے نہیں کھایا ہے۔“

”بس پیٹ بھر گیا ہے۔“

”مجھے لگ رہا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے بہ مشکل اسے یقین دلایا کہ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے مگر اس نے رات سونے سے پہلے زبردستی دودھ کا گلاس بھر کر مجھے پینے پر مجبور کیا۔ روشنا خود سونے سے پہلے روشنی کو سلاتی تھی۔ ابھی اس کا دودھ نہیں چھڑایا تھا۔ دن میں وہ دوسری چیزیں کھاتی پیتی تھی لیکن سونے سے پہلے اسے لازمی فیڈ کرانی پڑتی تھی اور روشنا اس میں لگ جاتی تھی۔ وہ اتنی عادی تھی کہ روشنا اسے فیڈ نہیں کراتی تو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ میں یہ وقت ٹی وی دیکھ کر گزارتا تھا۔ اس وقت بھی میں ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ مجھے کھڑکی کے پاس کسی کا سایہ سا محسوس ہوا۔ ہمارے بیڈروم کی کھڑکی عقبی صحن میں کھلتی تھی۔ رات میں ہم دونوں طرف صحن میں ایک ایک انرجی سیور آن رکھتے تھے تاکہ بالکل تاریکی نہ ہو۔ مکان کی چار دیواری اونچی تھی اس کے باوجود ہم حفاظت کے خیال سے روشنی رکھتے تھے۔ عقبی صحن میں سیور کھڑکی کے دائیں طرف لگا ہوا تھا۔ اس کی روشنی کے سامنے کوئی آیا تو اس کا سایہ کھڑکی پر بنتا تھا اور اتفاق سے میں اسی سمت تھا۔

روشنا مخالف سمت میں اور دوسری طرف کروٹ لے کر روشنی کو فیڈ کرا رہی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور میں نے دیکھ لیا۔ کسی کا سر واضح تھا۔ مگر اس کے سوا اور کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کوئی انسان ہے یا پھر کوئی ایسی چیز سیور کے سامنے آئی ہے کہ اس سے انسان کے سر کا سایہ بن رہا ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ سایہ اچانک آگے آیا اور کسی عورت کا خاکہ بن گیا۔ کمر سے اوپر کا دھڑ نمایاں تھا اور عجیب بات تھی کہ سائے سے لگ رہا تھا کہ عورت نے لباس نہیں پہنا ہے یا پھر بہت چست لباس پہنا ہے جو جسم سے بالکل چپکا ہوا ہے کیونکہ اس کے شباب کا ایک ایک نقش واضح تھا۔ اچھی خاصی سردی میں بھی مجھے پسینا آگیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی وجہ کیا تھی؟ خوف یا پھر کوئی اور بات۔ یہ تو واضح تھا کہ عقبی صحن میں کوئی عورت موجود تھی۔ میں یک دم اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

روشنا نے توجہ نہیں دی اس نے سوچا ہوگا کہ میں کسی کام سے جا رہا ہوں۔ میں باہر نکلا اور گھوم کر عقبی صحن تک پہنچا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس وقت مجھے خوف نہیں محسوس ہوا تھا بلکہ تجسس تھا۔ میں نے درختوں اور پودوں میں بھی جھانک کر دیکھ لیا پھر مجھے اوپر کا خیال آیا مگر یہ خیال آتے ہی مجھے شام کا واقعہ یاد آیا اور میرے اندر دبا ہوا خوف پھر ابھر آیا تھا۔ جیسے ہی میرے اندر خوف ابھرا۔ اوپر سے ہلکی سی نسوانی ہنسی کی آواز آئی اور میں تیزی سے کمرے میں آگیا۔

دروازہ زور سے بند کر کے اندر آیا تو روشنا نے پوچھا۔ ”آپ باہر کیوں گئے تھے۔ اچھی خاصی ٹھنڈ ہے اور آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا جس پر اب کوئی سایہ نہیں تھا اور روشنا سے کہا۔ ”دیکھنے گیا تھا کہ باہر کے دروازے بند ہیں۔ کبھی کبھی روشنی کنڈی کھول دیتی ہے۔“

روشنی سوگئی تھی۔ روشنا نے اسے ٹھیک سے لٹایا۔ ہمارا گدا خاصا بڑا تھا اور اس پر ہم تینوں آرام سے آجاتے تھے۔ میں سوتے میں حرکت کرتا تھا اس لیے روشنی کو روشنا ایک کونے میں سلاتی تھی۔ کچھ دیر باتوں کے بعد ہم سونے کے لیے لیٹ گئے اور روشنا نے لائٹ بند کر دی۔ اب کھڑکی پر باہر سے آنے والی روشنی مزید نمایاں ہو رہی تھی۔ ہم نائٹ بلب نہیں استعمال کرتے تھے اور یہی روشنی نائٹ بلب کا کام کرتی تھی۔ میں کھڑکی کی طرف تھا اور رہ رہ کر میری نظریں کھڑکی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ روشنا سارے دن کی تھکی ہوئی تھی اس لیے جلد سوگئی۔ ویسے بھی اسے روشنی کی وجہ سے دن میں سونے کا کیا آرام کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ وہ ہمہ وقت ہی اس کے ساتھ لگی رہتی تھی اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑتی تھی، حد یہ کہ واش روم جاتے یا غسل کرتے وقت بھی وہ اسے پاس ہی رکھتی تھی۔ روشنی چلبلی تھی اور چیزوں میں گھستی تھی اس لیے ہمیں دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ خود کو چوٹ نہ لگا لے۔ پہلے بچے کے بارے میں ماں باپ جتنے حساس ہوتے ہیں ہم روشنی کے لیے اتنے ہی حساس تھے۔

جب تک روشنا نہیں سوئی تھی مجھے خوف تھا کہ کہیں کھڑکی پر پھر ویسا ہی سایہ نہ بنے اور وہ دیکھ کر ڈر جائے۔ وہ سوگئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں اس بات سے ڈر بھی رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ میں پھر اس سائے کو دیکھ سکوں۔ مگر وہ سایہ دوبارہ نمودار نہیں ہوا اور کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

صبح روشنا نے فجر کے لیے اٹھایا اور جب تک ہم نماز سے فارغ ہوئے روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ سردیوں میں فجر ویسے ہی دیر سے ہوتی ہے اس لیے کچھ دیر بعد دفتر جانے کا وقت ہو جاتا۔ ہم میاں بیوی کچن میں آ گئے۔ ناشتے کے دوران گپ شپ ہوتی رہی۔ روشنا نے اچانک کہا۔ ''میں نے ساجدہ باجی سے پھر پوچھا تھا انہوں نے بتایا کہ یہاں کوئی مسئلہ ہے اور خاصا پرانا ہے جب مالک مکان کے گھر والے یہاں رہتے تھے تب سے اثر ہے۔ میں نے سوچا ہے دوسرے محلے والیوں سے پوچھوں۔''

''کیا فائدہ ہر ایک الگ اسٹوری سنائے گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''دماغ خراب ہوگا اور جو نہیں ہے وہ بھی نظر آنے لگے گا۔''

روشنا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''بس تو پھر اس بات کو ذہن سے نکال دو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''مگر میں آپ کو بتا دوں جس دن میں نے کچھ محسوس کیا یا دیکھا میں روشنی کو لے یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میں اپنی بچی پر آنچ برداشت نہیں کر سکتی۔''

روشنی کا سوچ کر مجھے بھی لرزہ آ گیا تھا۔ ہماری بچی ہماری کل کائنات تھی۔ اب مجھے بھی خوف آنے لگا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ ایسی چیزیں بچوں پر زیادہ اثر کرتی ہیں۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ ہماری بچی کو کچھ نہیں ہوگا۔ ساڑھے آٹھ بجے میں دفتر کے لیے روانہ ہوا۔ میری آفس ٹائمنگ صبح نو سے شام چھ بجے تک تھی اور کیونکہ میرا شمار افسران میں ہوتا تھا اس لیے اوور ٹائم بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی میں اپنا کام پہلے ہی نمٹا لیتا تھا اور اس کے بعد صرف نگرانی کا کام رہ جاتا تھا۔ اس لیے بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ مجھے چھ بجے کے بعد بھی دفتر رکنا پڑتا ہو اور میں عام طور سے ساڑھے چھ بجے تک گھر میں ہوتا تھا۔ اس روز اتفاق سے مجھے ایک ایمرجنسی سے واسطہ پڑ گیا اور فیکٹری میں جاتے ہوئے میں اپنا موبائل بھی میز پر بھول گیا۔ پلانٹ میں جہاں دوائیں بنتی اور پیک ہوتی تھیں وہاں کچھ مسئلہ تھا۔

میں نے عام سا سستا موبائل رکھا ہوا تھا کیونکہ بائیک پر آتا جاتا تھا اور راستے میں کئی مقامات ایسے آتے تھے جہاں رہزنی کی وارداتیں معمول تھیں۔ میں پرس میں اصلی کاغذات اور زیادہ رقم بھی نہیں رکھتا تھا۔ عام سا موبائل تھا اس لیے میں دفتر میں بھی اسے میز پر چھوڑ جاتا تھا۔ کام میں پھنسا ہوا تھا اور وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا۔ جب کام نمٹا تو معلوم ہوا کہ سات بج گئے ہیں۔ میں واپس میز پر آیا، اپنا سامان سمیٹ کر اور درازیں لاک کر کے موبائل دیکھا تو اس پر روشنا کی کوئی درجن بھر مس کالز موجود تھیں۔ ظاہر ہے وہ کال کر رہی تھی۔ میں نے پہلے کال کا سوچا مگر پھر وقت کا خیال کرتے ہوئے صرف اسے میسج کیا کہ میں گھر آ رہا ہوں اور روانہ ہو گیا۔ ساڑھے سات بجے گھر پہنچا تو روشنا نے کئی بار بیل بجانے پر دروازہ کھولا اور اس کے چہرے پر خوف اتنا واضح تھا کہ مجھے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یقیناً اسے بھی کوئی تجربہ ہوا تھا۔ میں اندر آیا تو وہ میرے سینے سے لگ کر رو دی۔ میں پریشان ہو گیا۔

''روشی کیا ہوا ہے، روشنی خیریت سے ہے نا؟''

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔'' روشنا مجھے کھینچ کر نشست گاہ میں لے آئی اور دروازہ بند کر کے سرگوشی میں بولی۔ ''شاد میں نے آج یہاں ایک عورت کو دیکھا ہے۔''

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ''کیسی عورت اور کہاں دیکھا ہے؟''

''پیچھے والے صحن میں، شاد وہ ٹہل رہی تھی اور عجیب سی آواز میں گنگنا رہی تھی۔ اس کی زبان بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں دوپہر میں یہاں صحن صاف کر رہی تھی تو مجھے آواز آئی اور میں پیچھے گئی تھی۔'' کہتے ہوئے روشنا کے چہرے پر انتہائی خوف نظر آنے لگا۔ ''شاد وہ بہت حسین عورت تھی۔ میں نے آج تک اتنی حسین عورت نہیں دیکھی۔ لیکن اس نے بہت واہیات لباس پہنا ہوا تھا جس میں اس کا ایک ایک عضو واضح تھا اور اس کی چال ایسی تھی جیسے رقص کرتے ہوئے چل رہی ہو۔ میں اسے دیکھ کر بت بن گئی تھی اس وقت مجھے لگا میرا جسم پتھر کا ہو گیا ہے اور میں اسے ذرا بھی جنبش نہیں دے سکتی۔ میں چیخ مارنا چاہتی تھی مگر میرے حلق سے ذرا سی آواز بھی نہیں نکلی تھی۔''

''ممکن ہے کوئی عورت اندر گھس آئی ہو؟''

''نہیں شاد وہ انسان نہیں تھی کوئی اور مخلوق تھی آپ

میری پوری بات تو سنیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”وہ ٹہلتے ٹہلتے اچانک رکی اور اس نے میری طرف دیکھا۔ اف شاد میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس کی زرد رنگ کی آنکھوں میں کیا تھا۔ بالکل بلی جیسی آنکھیں تھیں۔ وہ مسکرائی تھی مگر مجھے اس سے بہت خوف آرہا تھا۔ شاید وہ میرا خوف بھانپ گئی اور اس نے رخ بدل لیا اور چلتے ہوئے نیم کے تنے کے دوسری طرف چلی گئی اور پھر مجھے ہوش آیا تو میں بھاگی اور اندر آ کر دروازے بند کر لیے۔ پھر میں آپ کو کال کرتی چلی گئی اور آپ نے فون ریسیو نہیں کیا تو میں سمجھ گئی کہ آپ فیکٹری گئے ہوں گے اور موبائل آفس میں ہوگا۔ مگر شاد مجھے اتنا ڈر لگا......“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اسے تسلی دے رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اب یہاں سے بھی جانا ہوگا۔ ہمیں کسی ایک جگہ چین سے رہنا نصیب ہوگا بھی یا نہیں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر اس گھر میں ایسا کوئی اثر ہے تو اس سے مجھے اور میرے بیوی بچے کو نقصان ہو سکتا ہے۔ مجھے ان دونوں کی فکر تھی اور روشنا کو ہم تینوں کا خیال تنگ کر رہا تھا اس نے کہا۔ ”شاد ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ میں نے جو دیکھا ہے وہ بالکل صاف اور دن کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اب اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یہاں آسیب ہے اور میں اپنی بچی کے ساتھ کسی آسیب زدہ گھر میں نہیں رہ سکتی تھی۔“

”پریشان مت ہو کچھ نہیں ہوگا۔“

میں نے اسے تسلی دی تو وہ سمجھی کہ میں یہاں سے جانے کی بات کر رہا ہوں۔ ”آپ دوسرا گھر تلاش کریں ہم جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں تو ہمارے لیے بہتر ہوگا۔“

میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”روشی اتنا بڑا اور اچھا گھر ہمیں اس کرائے پر کہیں نہیں ملے گا۔“

”بھاڑ میں جائے اچھا اور بڑا گھر۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”میں ایک کمرے کے مکان میں بھی رہ لوں گی مگر یہاں نہیں رہوں گی۔ اگر آپ کا خیال نہ ہوتا تو میں آج ہی روشی کو لے کر حیدر آباد چلی جاتی۔ مجھے تو ابھی سے آنے والے کل کا خوف کھا رہا ہے۔ جب آپ دفتر چلے جائیں گے تب میں اور روشی اکیلے کیسے رہیں گے؟“

میں نے پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”روشی کچھ نہیں ہوتا دیکھو اگر یہاں کچھ ہے تو اس نے تمہیں نقصان تو نہیں پہنچایا ہے نا۔“

وہ چڑ گئی۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہم انتظار کریں کہ وہ نقصان پہنچائے اور تب ہم کچھ کریں۔ اس نے مجھے خود کو واضح دکھایا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یہی نا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔ ایسی چیزیں جہاں رہتی ہیں وہاں کسی انسان کا وجود برداشت نہیں کرتی ہیں۔ یہ بتائیں آپ دوسرا مکان تلاش کریں گے یا نہیں۔“

میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”ٹھیک ہے میں دوسرا مکان تلاش کرنا شروع کرتا ہوں لیکن تم بھی اپنے حواس قابو میں رکھو۔ آج کل لوگ ایسی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمارا تماشا بن جائے گا۔“

”میں کسی سے نہیں کہوں گی لیکن آپ مالک مکان سے پوچھیں کہ اس نے آپ سے اتنی اہم بات کیوں چھپائی؟“

”میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ابھی بات کریں۔“ روشنا نے زور دیا وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھی مجبوراً مجھے مالک مکان کو کال کرنی پڑی۔ ”احتشام صاحب میں نوشاد بات کر رہا ہوں۔“

”جی نوشاد صاحب فرمائیے۔“

”مجھے آپ سے مکان کے بارے میں بات کرنی ہے۔“

”کہیے۔“

”فون پر نہیں میں بالمشافہ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”تب اتوار والے دن میرے گھر آجائیں۔“ اس نے کہا۔

”احتشام صاحب معاملہ ایمرجنسی کا ہے۔“

”کیا آپ فوری مکان چھوڑنا چاہ رہے ہیں؟“

”شاید کچھ ایسی ہی بات ہو لیکن اس سے پہلے آپ سے ملاقات لازمی ہے۔“

”تب میرے گھر آجائیں میں اس وقت گھر پر ہوں۔“ اس نے اپنا پتا سمجھا کر فون بند کر دیا۔ روشنا نے سنا تو اس نے گھر میں اکیلے رہنے سے انکار کر دیا اور مجبوراً مجھے اسے اور روشی کو بھی لے کر جانا پڑا تھا۔ احتشام الدین اپنے گھر میں ہمارا منتظر تھا۔ وہ روشنا اور روشی کو دیکھ کر حیران ہوا مگر کچھ کہا نہیں۔ انہیں اندر خواتین کے پاس بھیج دیا اور مجھے نشست گاہ میں لے آیا۔ میں نے بلا تمہید اس سے مکان کے آسیب زدہ ہونے کے بارے میں پوچھا تو اس نے گہری

سانس لی۔

''آپ تک یہ بات پہنچ گئی۔''

''بات پہلے ہی پہنچ گئی تھی مگر اب مجھے اور میری بیوی کو اس کا تجربہ بھی ہو گیا ہے۔ آپ نے ہم سے یہ بات کیوں چھپائی؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ اس مکان میں اثر ہے لیکن اس اثر سے آج تک کسی کو نقصان نہیں ہوا۔''

''وہ کسی سابق کرائے دار کی بیوی تو کچھ دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اسے بعد میں بھی دورے پڑتے رہے۔''

''اسے مرگی کا مرض تھا اور اس گھر میں آنے سے پہلے سے تھا۔ اس کی تصدیق محلے والے کر سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان کے علاوہ جو لوگ رہے انہوں نے آپ کی طرح کچھ نہ کچھ دیکھا مگر اس دیکھنے سے انہیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر آپ خود سوچیں میری بیوی اور بچی اس گھر میں رہتے ہیں۔ آج میری بیوی نے ایک عورت دیکھی ہے جو پچھلے صحن میں ٹہل رہی تھی۔ میری بچی دیکھے گی تو اس پر کیا اثر پڑے گا۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''میں آپ کا مسئلہ سمجھ رہا ہوں نوشاد صاحب، اگر آپ کو کوئی دوسرا مکان ملتا ہے تو بے شک آپ کل چلے جائیں اور مجھ سے تمام رقم لے لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''شاید مجھے ایسا ہی کرنا پڑے۔''

میں اور روشنا واپس آئے تو روشنا نے مطالبہ کیا کہ میں اگلے ہی دن سے مکان کی تلاش شروع کر دوں۔ میں نے کہا۔ ''وہ تو میں کروں گا لیکن اس دوران میں بھی تو مجھے باہر جانا پڑے گا اور ضروری نہیں ہے کہ مکان فوراً مل جائے اور میں دفتر سے کتنے دن کی چھٹی کر سکتا ہوں۔''

''تب مجھے اکیلے رہنا ہوگا۔'' روشنا سہم گئی۔ ''میں سچ کہہ رہی ہوں میں نہیں رہ سکتی اور آپ سوچیں اگر روشنی نے کچھ دیکھ لیا تو وہ نفسیاتی مریضہ نہیں بن جائے گی۔''

''تب ایک ہی حل ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کل میں ایک دن کی چھٹی لے کر تمہیں حیدر آباد چھوڑ آتا ہوں اور پھر واپس آ کر کوئی مکان تلاش کرتا ہوں۔''

''آپ اکیلے رہیں گے تو آپ کو پریشانی ہوگی۔''

''تب اس مسئلے کا اور کیا حل ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تم سوچ لو اگر تم نے صبح بھی فیصلہ کر لیا تو میں دفتر کال کر کے چھٹی کا کہہ دوں گا اور تم دونوں کو چھوڑ کر شام تک واپس آ جاؤں گا۔''

روشنا جتنی ڈری ہوئی تھی مجھے یقین تھا کہ وہ جانے کا فیصلہ کرے گی اور ایسا ہی ہوا جب ہم سونے کے لیے لیٹے تو اس نے کہا۔ ''شاد میں نے سوچ لیا ہے آپ کل صبح مجھے اور روشنی کو بس پر بٹھا دیں وہاں ہمیں کوئی لینے آ جائے گا آپ دو دفعہ سفر کریں گے تو تھک جائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں میں کر لوں گا۔'' میں نے کہا مگر اس نے اصرار کیا تو میں مان گیا۔ میں نے اسی وقت کال کر کے اپنے چھوٹے بھائی ارشاد سے کہہ دیا کہ وہ کل صبح روشنا اور روشنی کو بس اڈے پر لینے کے لیے آ جائے۔ اگلی صبح میں جلدی اٹھا۔ روشنا نے رات فیصلہ کرنے کے بعد اپنا اور روشنی کے سامان کا بیگ تیار کر لیا تھا۔ انہیں کپڑوں کا مسئلہ نہیں تھا کہ وہاں پر بھی موجود تھے۔ حیدر آباد میں میرے گھر میں میرے دو کمرے تھے جن میں ہمارا تقریباً سارا سامان ویسے ہی موجود تھا۔ اس لیے جب ہم حیدر آباد جاتے تو ہمیں اس لحاظ سے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا کہ ٹھہریں گے کہاں اور چیزیں ملیں گی یا نہیں۔

ہم سات بجے گھر سے نکلے۔ میں نے انہیں ڈائیوو کے ٹرمنل سے بس پر بٹھایا۔ بس ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوئی۔ میں نے ارشاد کو کال کر کے بس کے وہاں پہنچنے کے وقت کا بتایا اور دفتر روانہ ہو گیا۔ ساڑھے دس بجے ارشاد کی کال آ گئی کہ وہ روشنا اور روشنی کو لے کر گھر جا رہا ہے۔

میں نے سکون کا سانس لیا کہ ایک مرحلہ تو مکمل ہوا۔ اب دوسرا مرحلہ جس کا سوچ کر میرا دل ڈوب رہا تھا وہ اگلے مکان کی تلاش تھی۔ اتنے عرصے کراچی میں رہ کر اور بار بار اس مرحلے سے گزر کر مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کرائے کا مکان تلاش کرنا کارِ دارد سے کم نہیں تھا۔ کرائے بہت زیادہ تھے اور اس سے بھی زیادہ مالکوں کے نخرے تھے۔ مگر مجھے ایک بار پھر اس مرحلے سے گزرنا ہی تھا۔ شام کو میں واپس آیا تو خالی گھر میں داخل ہوتے ہوئے مجھے خوف سا محسوس ہوا تھا۔ صبح تک روشنا اور روشنی تھے تو مجھے ایسا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ میں سیدھا گھر میں داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ روشنی کم ہو گئی تھی میں نے اندر کی روشنیاں آن کیں تو مجھے عقبی صحن کی روشنی کا خیال آیا مگر پھر کھڑکی والا سایہ یاد آیا تو میں نے وہاں روشنی کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور عقبی صحن کو تاریک رہنے دیا کہ نہ روشنی

ہو گی اور نہ سایہ بنے گا۔

اس سے پہلے بھی مجھے کئی بار اکیلے رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ روشنا کراچی آنے کے بعد کئی بار حیدر آباد رہنے کے لیے جا چکی تھی اور وہ عام طور سے دو تین ہفتے وہاں گزار کر آتی تھی اس لیے مجھے تجربہ تھا کہ روشنا کی غیر موجودگی میں اپنی روٹین کیسے سیٹ کرنی ہے۔ رات کا کھانا میں باہر سے لے آتا یا باہر ہی کھا کر آتا تھا اور صبح کے ناشتے کے لیے ڈبل روٹی، مکھن اور انڈے وغیرہ لے آتا تھا۔ جب بھوک لگی تو میں باہر نکلا۔ کھانے لانے کی بجائے میں نے ایک ہوٹل میں ہی کھا لیا اور ناشتے کا سامان لے کر واپس آیا۔ ساڑھے نو بجے کا وقت تھا اندر آکر میں نے گیٹ کو لاک کیا اور کمروں کی طرف بڑھا تھا کہ مجھے عقبی صحن سے کسی عورت کی کھنکتی ہوئی ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے اور میں تیزی سے داخلی دروازے سے اندر آیا اور اسے بند کر لیا۔ خاصی سردی میں مجھے پسینا آ گیا تھا اور کتنی دیر میں اپنے دل کی دھڑکن قابو میں کرتا رہا۔

میں رات میں قہوہ لیتا ہوں اگر روشنا نہیں ہوتی تو خود بنا لیتا ہوں مگر اس رات میری اتنی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ میں کمرے سے نکل کر کچن تک آتا۔ بیڈ روم کا دروازہ بھی میں نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے روشنا اور روشنی سے بات کی اور پھر لیٹ گیا۔ اگرچہ کھڑکی اب تاریک تھی مگر میں جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور کبھی کبھی اس کی آواز اندر تک آتی تھی۔ ساتھ ہی ایسا لگتا جیسے کوئی صحن میں چل رہا ہے۔ پیروں کی آہٹ واضح سنائی دیتی تھی۔ مگر ایسی آوازیں ہوا بھی پیدا کرتی ہیں۔ میں ان آوازوں سے توجہ ہٹاتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہا تھا اور دل ہی دل میں عہد کر رہا تھا کہ اب جلد از جلد دوسرے مکان کی تلاش شروع کروں گا۔ اس وقت مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ اکیلے رہنے پر روشنا کے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔ رات کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔ اچانک مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے آواز دی۔

''شاد جی۔''

میں سوتے میں ہی سوچ رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اسی لمحے آواز دوبارہ آئی۔ ''خواب بہت دیکھ لیے اب ہمیں حقیقت میں دیکھیں نا شاد جی۔''

اسی لمحے میں بیدار ہو گیا۔ میرا دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا اور گلا بالکل خشک تھا۔ میں نے پاس رکھی بوتل اٹھائی لیکن وہ خالی تھی۔ روشنا روز رات سونے سے پہلے پانی کی بوتل بھر کر گلاس کے ساتھ رکھتی تھی۔ وہ نہیں تھی اور سوتے وقت مجھے بھی خیال نہیں آیا۔ میں کچھ دیر ہچکچاتا رہا مگر پیاس شدید تھی اس لیے اٹھنا پڑا۔ آواز نسوانی تھی اور اس میں ایک خاص نوعیت کی لوچ تھی جو مردوں کو متاثر کرتی ہے۔ آواز میں نے واضح سنی تھی مگر میرا خیال یہی تھا کہ میں نے خواب میں آواز سنی تھی۔ میں کچن میں آیا اور کولر سے پانی نکال کر پی رہا تھا کہ میری نظر باہر کے کھلے دروازے پر گئی۔ اسے میں رات خود بند کر کے سویا تھا مگر اس وقت یہ کھلا ہوا تھا۔ اسے کس نے کھولا؟ میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا اور باہر صحن میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ اصولاً تو مجھے دروازہ اندر سے بند کر کے بیڈ روم میں لوٹ جانا چاہیے تھا مگر اس کی بجائے میں باہر نکل آیا۔ صحن بالکل خالی تھا۔ میں کونے تک آیا تو یہ دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا کہ عقبی صحن میں روشنی تھی۔ جب کہ میں نے وہاں کی روشنی جلائی ہی نہیں تھی۔ اس کا بٹن بھی اندر کمرے میں تھا۔ کوئی اور اندر آئے بغیر اسے آن نہیں کر سکتا تھا۔ میں سست قدموں سے عقبی صحن کی طرف آیا اور جیسے ہی وہاں پہنچا میں جیسے بت بن گیا تھا کیونکہ وہاں ایک عورت موجود تھی اور روشنا نے ٹھیک کہا تھا کہ اس نے آج تک اتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ بہت شاہانہ اور تیکھے سے نقوش تھے۔ سنہری مائل بال آبشار کی طرح اس کی کمر سے نیچے جا رہے تھے اور بالوں میں چھپ جانے کے باوجود صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی پتلی کمر پیچھے سے خم کھائی ہوئی تھی۔

اس کی لمبی ٹانگیں سڈول تھیں اور سبک نازک سے پاؤں سنہرے رنگ کی سینڈل میں نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے عجیب سا لباس پہنا ہوا تھا جو پوری طرح اس کے جسم پر چسپاں تھا اور یوں چڑھا ہوا تھا کہ اس میں معمولی سی شکن بھی نظر نہیں آ رہی تھی پھر کپڑا ایسا باریک کہ اندر کے تمام خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ اگر میں بت بنا رہ گیا تھا تو بے وجہ نہیں بنا تھا۔ آج کل میڈیا اور انٹرنیٹ نے عام آدمی کے لیے دنیا جہان کا حسن کھینچ کر اسکرین پر کر دیا ہے اور میں نے بے شمار حسین ترین عورتیں اور لڑکیاں دیکھی تھیں مگر اس جیسا حسن کہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ صحن کے وسط میں سیدھی تن کر کھڑی ہوئی تھی اور اس کا سر اوپر کی طرف اٹھا ہوا

تھا۔اس وجہ سے بھی جسم بہت نمایاں ہو رہا تھا۔سیور کی روشنی براہ راست یوں اس پر پڑ رہی تھی کہ اس کا انگ انگ واضح تھا۔نہ جانے وہ کتنی دیر یونہی سر اٹھائے کھڑی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔مجھے خوف تو کیا سردی کا احساس بھی نہیں رہا تھا حالانکہ میں معمولی ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں باہر نکل آیا تھا۔اچانک اس نے سر نیچے کیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔اس کی مسکراہٹ میں ایسا سحر تھا کہ میں جیسے رہی سہی عقل بھی کھو بیٹھا۔اس نے لوچدار آواز میں کہا۔

"تم آگئے؟"

"ہاں تم نے بلایا تھا۔" میں نے غیر ارادی طور پر کہا۔

"مگر تم نے آنے میں دیر کی۔" اس کے لہجے میں شکوہ آگیا۔"میں کب سے یہاں کھڑی تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"کیوں؟" اس بار بھی میں نے بلا ارادہ پوچھا۔

"تم نہیں جانتے کیا؟" اس کے لہجے کا شکوہ بڑھ گیا۔"خیر چھوڑو یہ بتاؤ میں کیسی لگی تمہیں؟"

"بہت خوب صورت، بے انتہا حسین۔" میں نے بے ساختہ کہا۔"میں نے آج تک تمہاری جیسی دلکش عورت نہیں دیکھی۔"

وہ یوں مسکرائی جیسے اسے میری تعریف سے دلی خوشی ہوئی ہو۔اس نے ایک ادا سے کہا۔"حالانکہ تمہاری بیوی بھی کم حسین نہیں ہے۔"

یہ سچ تھا روشنا بہت حسین عورت تھی۔کم عمری میں جب میں نے اسے پسند کیا تو اس کے پس پشت یہی وجہ تھی لیکن جب وہ میری زندگی میں آئی تو اس نے اپنی اچھی سیرت اور خدمت گزاری سے خود بہ خود وہ مقام حاصل کرلیا جو کوئی عورت حاصل نہیں کر سکتی تھی۔اب مجھے خیال بھی نہیں آتا تھا کہ میری بیوی حسین ہے۔بلکہ وہ مجھے بیوی ہونے کی وجہ سے حسین لگتی تھی۔آج اس عورت نے کہا تو مجھے خیال آیا اور میں نے اقرار کیا۔"ہاں وہ حسین ہے مگر تم جیسا حسن نہیں رکھتی ہے۔"

اس نے پھر خاص انداز سے اپنا جسم گھمایا، وہ لحہ بہ لحہ اپنی پوزیشن بدل رہی تھی جیسے مجھے موقع دے رہی ہو کہ میں اس کے خدوخال پوری تفصیل کے ساتھ دیکھ سکوں۔اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اپنا سراپا کیسے ملاحظے کے لیے پیش کرنا چاہیے۔"سچ کہہ رہے ہو؟"

"اگر قسم کھا سکتا تو قسم کھا کر یقین دلا دیتا۔"

"مجھے اور دیکھنا چاہو گے؟" اس نے دعوت انگیز انداز میں پوچھا اور میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔میں نے ہچکچا کر کہا۔

"تم سامنے تو ہو اور کیا دیکھوں؟"

"وہ سب کچھ جو میں سامنے نہیں دکھا سکتی، صرف خلوت میں دکھا سکتی ہوں۔" اس نے مزید کھلتے ہوئے کہا۔

سچ تو یہ ہے کہ میری مردانہ حس رفتہ رفتہ اس کے زیرِاثر آرہی تھی اور میں کمزور پڑ رہا تھا۔اس کے باوجود میں نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے تم غیر عورت ہو۔"

وہ متوالی چال چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔"یہ سب فرسودہ باتیں ہیں، ہر وہ عورت تمہاری ہوتی ہے جو خود تمہارے پاس آئے، آؤ میرے ساتھ۔"

اس کا ہاتھ اتنا گرم تھا جیسے اسے ایک سو چار ڈگری کا بخار ہو۔ایک بار روشنی کو بہت تیز بخار ہوا تھا تب بھی وہ اتنی گرم نہیں ہوئی تھی جتنا گرم اس عورت کا ہاتھ محسوس ہو رہا تھا۔اس سے باقاعدہ حرارت نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔وہ آگے بڑھی تو میں جیسے کسی ناقابلِ شکست کشش کے زیرِاثر اس کے ساتھ کھنچا چلا گیا تھا۔اس کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔اب تک جو گفتگو ہوئی تھی اور وہ جس طرح خود کو دکھاتی اور پیش کرتی رہی تھی۔اس کے بعد اس کے عزائم سمجھنا کسی دس بارہ سال کے بچے کے لیے بھی مشکل نہیں تھا میں تو ایک جہاندیدہ شادی شدہ مرد تھا۔اس کے باوجود میں یوں اس کی بات مان رہا تھا کہ کوئی دس بارہ سال کا بچہ بھی آج کل کسی کی بات یوں نہیں مانتا ہے۔اس نے مجھ پر سحر کر دیا تھا یہ سحر آسیبی تھا یا اس کے حسن کا میں نہیں کہہ سکتا مگر میں اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس کے خلاف مزاحمت کر سکوں۔وہ مجھے کشاں کشاں لیے جا رہی تھی۔

اندر سے کوئی مجھے کہہ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ نہ جاؤں اور میرے پاؤں بلا ہچکچاہٹ اٹھ رہے تھے۔وہ مجھے چھت پر لائی تو میں نے دیکھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر تیز روشنی تھی۔روشنی کے ساتھ ساتھ اندر سے تیز خوشبوؤں کی لپٹیں بھی آرہی تھیں اور اس خوشبو میں عجیب سی گرمی تھی۔جیسے جیسے میں کمرے کے پاس جا رہا تھا یہ گرمی واضح محسوس ہو رہی تھی اور جب میں کمرے میں داخل ہوا تو

مجھے لگا جیسے جون کا مہینا ہو اور سورج عین سر پر ہو۔ تب شاید یہ کمرا اتنا تپ جاتا ہوگا جتنا کہ دسمبر کے آخر میں رات کے اس پہر گرم تھا۔ مجھے باقاعدہ پسینا آنے لگا۔ کمرا اعلیٰ ترین فرنیچر سے مزین تھا اور یہ سرخ رنگ کی کسی لکڑی سے بنا ہوا تھا یا اس پر سرخ پالش کی گئی تھی۔ دیواروں پر سرخی مائل سنہری رنگ تھا۔ فرش پر اسی رنگ کا دبیز قالین تھا وہاں ہر چیز سرخ تھی یا سنہری تھی۔ وسط میں مسہری تھی جس پر بہت دبیز گدا تھا اور اس پر ریشم کی سرخ چادر پڑی تھی۔ چھپر کٹ پر باریک سنہری پردے لہرا رہے تھے۔ وہ مجھے لے کر مسہری کی طرف بڑھی۔ مگر میرا گرمی سے برا حال ہو رہا تھا اور دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''مجھے گرمی لگ رہی ہے میں باہر جاؤں گا۔''

''بس کچھ دیر رک جاؤ گرمی ختم ہو جائے گی۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ مگر ہر گزرتے لمحے گرمی کی شدت میں جیسے اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

''میں یہاں نہیں رک سکتا۔''

شاید اس نے بھی محسوس کر لیا کہ میں یہاں نہیں رکوں گا وہ بجھ سی گئی۔ ''اچھا ابھی جا رہے ہو تو کل آؤ گے؟''

اس کی طرف سے رضامندی پا کر میں فوراً مان گیا۔ ''ہاں کل آؤں گا۔''

اس نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ ''اچھا چلے جاؤ مگر یاد رکھنا تم نے کل آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔''

میں دروازے سے باہر آیا۔ فوراً مجھے خنکی کا احساس ہوا اور میری آنکھ کھل گئی۔ تب میں نے دیکھا کہ میں بستر پر لیٹا ہوں اور کمبل سرک کر گدے سے نیچے قالین پر چلا گیا تھا اور اسی وجہ سے مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ میں نے کمبل اوپر کھینچتے ہوئے سوچا کہ کیا میں نے خواب دیکھا تھا۔ ہاں وہ خواب ہی تھا ورنہ میری آنکھ اپنے بستر پر کیوں کھلتی؟ مگر اتنا واضح خواب تھا کہ اس کا ایک ایک منظر مجھے یاد تھا خاص طور سے وہ عورت اور اس کا ہر نقش جیسے میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر اس کے بارے میں سوچنے لگا اور مجھے خیال آیا کہ اگر ایسا سچ ہوتا تو کیا میں اس عورت کی خلوت میں چلا جاتا؟ وہ ایسی حسین عورت تھی کہ اس کی دعوت سے کوئی زاہد خشک بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میری تو کوئی اوقات نہیں تھی۔ اگر میں اس شاہانہ مسہری تک چلا جاتا تو شاید میری واپسی نہ ہوتی۔

مگر کیا یہ روشنا کے ساتھ بے وفائی نہیں ہوتی؟ روشنا کا خیال آتے ہی میرا دل جیسے ندامت میں ڈوب گیا تھا۔ میں تو کسی اور عورت کے بارے میں سوچ کر بھی اس سے بے وفائی ہی کر رہا تھا۔ شرمندگی کے بعد جب پھر اس عورت کا خیال آیا تو اسی کے بارے میں سوچتا چلا گیا اور جب چونکتا تو اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا۔ اسی کشمکش میں فجر ہو گئی اور اذان ہونے لگی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر مجھے اندر سے سکون ملا تھا۔ پھر میں دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ کچن میں آیا تو ٹھٹک گیا۔ پانی کا گلاس ہمیشہ کولر پر رکھا ہوتا ہے لیکن اس وقت یہ کچن کے ماربل ٹاپ پر رکھا ہوا تھا اور یہ جگہ دروازے کے نزدیک تھی۔ مجھے یاد آیا کہ خواب میں جب میں نے کھلا دروازہ دیکھا اور میں اس کی طرف بڑھا تھا تو گلاس میں نے یہاں رکھ دیا تھا۔ سنسنی کی ایک لہر سی میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ تو کیا وہ خواب نہیں تھا۔ سچ مچ وہ عورت مجھے اوپر لے گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے جو ہوا اور عورت نے مجھ سے جو وعدہ لیا وہ سب حقیقت تھا۔

اگرچہ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ یہاں کچھ تھا اور وہ خوب صورت عورت کی صورت میں سامنے آتا تھا مگر اس واقعے کو میں ایک خواب ہی سمجھ رہا تھا اور اب لگ رہا تھا کہ اس میں حقیقت بھی تھی۔ مجھے جھرجھری سی آئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ آنے والے جمعے اور ہفتے کی چھٹی لے لوں گا۔ اتوار کی چھٹی ہوگی اور ان تین دنوں میں دوسرا مکان تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ دفتر جا کر میں نے بات کی اور مجھے جمعے ہفتے کی چھٹی مل گئی۔ یہ بدھ کا دن تھا یعنی دو دن بعد میں اپنی مہم کا آغاز کر سکتا

تھا۔ جیسے جیسے شام کا وقت قریب آ رہا تھا میرے دل میں پھر سے خوف بھر رہا تھا کہ مجھے گھر جانا ہوگا۔ جہاں وہ عورت تھی اور وہ ایسی تھی کہ آدمی اس کے سحر سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اب میرا خوف آسیب کا نہیں تھا بلکہ اس کے حسن کی سحر کاری کا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے گزشتہ رات وعدہ لیا تھا کہ میں آج اس کی خلوت میں آؤں گا۔ وہ مجھے لے جاتی۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا مگر جیسے میں کل بے بس تھا اسی طرح آج بھی بے بس ہو جاتا۔

شاید اسی لیے میں ہچکچاتے ہوئے گھر گیا تھا۔ مجبوراً اندر آیا اور ہیلمٹ و جیکٹ اتار رہا تھا کہ اچانک وہی پُر اسراری خوشبو پھیلنے لگی اور میں نے بے ساختہ بلند آواز سے کہا۔ ''پلیز ابھی نہیں ابھی مجھے کھانے کے لیے جانا ہے۔''

جواب میں خوشبو کی نوعیت بدل گئی اور اب اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو میرے آس پاس چکرانے لگی تھیں۔ گویا مجھے دعوت دی جا رہی تھی کہ کھانے کا بندوبست بھی گھر میں ہو سکتا ہے۔ مجھے راستے میں دیر ہو گئی اور مغرب کی نماز نکل گئی تھی مگر میں نے قضا پڑھنے کے لیے واش روم کا رخ کیا اور وضو کر کے آیا تو خوشبو غائب تھی۔ ابھی نماز پڑھ کر اٹھا تھا کہ خوشبو پھر چکرانے لگی۔ وہ یقیناً میرے قریب تھی مگر سامنے نہیں آئی تھی اور میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ سامنے آئے ورنہ میں اس کے سحر میں آ جاتا۔ خوشبو ہر گزرتے لمحے تیز ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ اچانک ہی عشا کی اذان شروع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی خوشبو پھر غائب ہو گئی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور گھر سے نکل آیا۔ باہر نکل کر میں لاک لگا رہا تھا کہ مجھے لگا کہ چھت کی منڈیر کے پاس کوئی ہے۔ وہاں تاریکی تھی اور واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں گیٹ سے پیچھے ہٹا تو ایک نسوانی ہیولہ منڈیر سے دور ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ وہی تھی۔

اب مجھے فکر ہونے لگی تھی کہ وہ میرے پیچھے کیوں پڑی تھی؟ ٹھیک ہے میں خوش شکل تھا اور مناسب آدمی تھا مگر ایسا خوبرو جوان بھی نہیں تھا کہ جس کے پیچھے لڑکیاں اور عورتیں آتیں۔ وہ خود خاص چیز تھی۔ تب اس نے مجھے کیوں منتخب کیا تھا؟ مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے یہی سوال میرے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ نماز کے بعد جب لوگ اٹھنے لگے تو مجھے اچانک خیال آیا اور میں نے وہاں ایک طرف چند افراد کے ساتھ بیٹھے امام صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور انتظار کرنے لگا کہ ان کے پاس موجود لوگ اٹھ جائیں تو میں ان سے ملوں۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک ایک کر کے تمام ہی لوگ اٹھ گئے تو میں امام صاحب کے پاس پہنچا۔ کچھ عرصے سے میں اسی مسجد میں نماز پڑھتا تھا یعنی جب موقع ملتا تو یہیں پڑھتا تھا۔ اس لیے امام صاحب سے واقف تھا اور ان کی شہرت بھی اچھے اور نیک شخص کی سی تھی۔ سلام دعا کے بعد میں نے ان سے کہا۔

''امام صاحب مجھے آپ سے ایک معاملے میں مشورہ درکار ہے۔ میں ایک مشکل میں پڑ گیا ہوں۔''

''آپ فرمائیں میرے بس میں جو ہوا میں آپ کے لیے کروں گا۔'' انہوں نے خلوص سے کہا تو میں نے انہیں مناسب الفاظ میں اپنا مسئلہ بتا دیا۔ وہ غور سے سنتے رہے جب میں نے اپنی بات مکمل کر لی تو انہوں نے کہا۔

''آپ کا مسئلہ گمبھیر لگ رہا ہے۔ اگرچہ میں ان چیزوں کا ماہر نہیں ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ عالم دین ہوں مگر روحانیت کا عملی تجربہ نہیں رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کا مسئلہ آسانی سے حل ہونے والا نہیں ہے۔''

میں فکر مند ہو گیا۔ ''تب امام صاحب میں اس عورت سے کیسے بچوں آخر اس نے مجھے ہی کیوں چنا ہے؟''

''کیونکہ آپ اس گھر میں ہیں۔'' وہ سوچتے ہوئے بولے۔ ''دیکھئے ایسی چیزوں کا تعلق شیاطین سے ہوتا ہے اور شیطان کا بنیادی مقصد انسان کی عاقبت کو خراب کرنا ہے۔ اس لیے اس ایسے ہر معاملے کے پیچھے یہی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ شیطان ہر اس عمل میں خلل ڈالتا ہے جو انسان کو اچھائی کی طرف لے جاتا ہے اور ہر اس چیز کو آسان اور خوب صورت بنا کر پیش کرتا ہے جو انسان کی آخرت کو برباد کر سکتی ہے۔ آپ اس معاملے کو بھی اسی تناظر میں لیں۔ اول وہ آپ کو گناہ پر مائل کر رہی ہے اور دوسرے اس سے آپ کا گھر برباد ہو جائے۔ تیسرے ایک بار آپ کی شیطان سے تعلق قائم کر لیں تو وہ آسانی سے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ اس لیے وہ آپ کو ناجائز تعلق قائم کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔''

یہ تو سامنے کی بات تھی کہ وہ انسان نہیں تھی مگر امام

صاحب سے یہ سب سن کر مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ ”وہ انسان نہیں ہے؟“

”بالکل آپ خود بتائیں کہ کوئی انسان ایسی ماورائی حرکت کرسکتا ہے۔“

”تب میں کیا کروں؟“

”اس سے بچت کی ایک ہی صورت ہے کہ جو وہ عورت چاہ رہی ہے اس سے ہر صورت بچیں اور جلد از جلد اس جگہ سے چلے جائیں۔ اُمید ہے کہ اللہ آپ کے لیے بہتر کرے گا۔“ وہ بولے۔ ”میرے ذہن میں تو یہی مشورہ آرہا ہے۔“

میں ان کا شکریہ ادا کر کے اٹھ رہا تھا تو انہوں نے اچانک کہا۔ ”شیطان کو سب سے زیادہ تکلیف اس سے ہوتی ہے کہ کوئی انسان لاالہٰ الا اللہ کہے کیونکہ جو شخص یہ کلمہ دل سے کہتا ہے اللہ آخرت میں اسے بخش ہی دیتا ہے اور یہی شیطان کی سب سے بڑی شکست ہے۔“

میں امام صاحب کی بات پر غور کرتا ہوا مسجد سے اٹھ گیا۔ ایک ہوٹل میں آیا جہاں کھانا کھایا اور پھر بہت دیر وہیں بیٹھا رہا۔ صرف بیٹھے رہنے کی خاطر میں نے کئی بار چائے پی۔ جب میں آیا تو رش تھا مگر پھر لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے اور آخر میں صرف میں بیٹھا رہ گیا۔ جب ایک لڑکے نے کرسیاں الٹی کر کے میزوں پر رکھنا شروع کیں تو میں چونکا۔ گھڑی دیکھی تو حیران ہوا کہ ایک بج رہا تھا۔ ہوٹل بند ہونے والا تھا۔ باہر نکلا تو ہو کا عالم تھا اور سردی شدت کی تھی۔ تیز ہوا اس کی شدت میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔ میں سڑک پر چلنے لگا۔ آج بائیک نہیں لایا تھا۔ کیونکہ یہ ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ میں گھر کی طرف جارہا تھا مگر میرا گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں سیدھے راستے کی بجائے گلیاں بدل کر چلتا رہا۔ جب گھر نزدیک آنے لگتا تو میں گلی بدل دیتا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر اسی طرح چلتا رہا اور ایک بار رکا تو گھر کے سامنے تھا۔ میں نے سوائے اگلے صحن کے تمام روشنیاں بند کر دی تھیں اس لیے مکان تاریک اور کسی قدر ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ میں اندر جانا نہیں چاہ رہا تھا مگر کب تک باہر گلی میں کھڑا رہتا۔ ایک تو سردی تھی اور دوسرے کوئی اس وقت مجھے باہر دیکھ لیتا اور پوچھتا کہ میں یہاں کیوں کھڑا ہوں تو میں کیا جواب دیتا۔ مجبوراً مجھے دروازہ کھول کر اندر جانا ہی پڑا تھا۔ جیسے ہی میں اندر آیا اور گیٹ اندر سے بند کیا عقبی صحن میں روشنی ہو گئی اور یہ بہت تیز روشنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں سے خوشبو کی لپٹیں اور گنگناتی نسوانی آواز آنے لگی۔ مجھے لگا جیسے یہ آواز مجھے بلا رہی ہے اور میں ایک بار پھر بے ساختہ اس طرف کھنچ رہا ہوں۔ اب یہ خواب ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں سویا نہیں تھا اور سب جاگتے میں دیکھ رہا تھا۔

میں عقبی صحن میں پہنچا تو وہاں وہ عورت موجود تھی اور اس حلیے میں تھی کہ اسے دیکھ کر میری نظریں جھک گئیں۔ آج اس کا لباس سرے سے غائب تھا اور اس کے لمبے بال آگے سے اس کی ستر پوشی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی

جارحیت

بین الاقوامی مواعید کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی حکومت کا مسلح طاقت کے استعمال پر اتر آنا۔ ماضی میں اس کی تعریف مختلف شکلوں میں کی جاتی رہی ہے۔ مثلاً اعلان جنگ، حملہ، بمباری، ناکہ بندی اور فوج کی نقل و حرکت، باہمی جھگڑوں کے پُرامن تصفیے سے انکار یا بین الاقوامی اداروں (مثلاً اقوام متحدہ) کے کہنے کے باوجود جنگ بند کرنے سے گریز۔ یہ تمام کوائف جارحیت کے مترادف ہیں۔ متعدد ذرائع سے جارحیت کا سدباب کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں مثلاً میثاق انجمن اقوام، معاہدۂ باہمی استمداد، منشور جنیوا، معاہدۂ پیرس اور اقوام متحدہ کا منشور جس کی رو سے جنگ کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نورمبرگ میں جنگی جرائم کی سماعت کرنے والے ٹربیونل کا خیال تھا کہ جرمنی نے واضح طور پر ایک جارحانہ حکمتِ عملی وضع کر کے اس پر عملدرآمد کیا تھا اور اس نظریے کے تحت مختلف نازی رہنماؤں کو جن کے متعلق خیال تھا کہ انہوں نے متذکرہ حکمت عملی وضع کرنے اور اس پر عمل درآمد کرانے میں حصہ لیا تھا قابل مواخذہ سمجھا گیا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں بھارت نے جارحیت کر کے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بھارت گزشتہ 53 سال سے کشمیر کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔

مرسلہ: ضرب علی خاصخیلی۔ جامشورو

آنکھوں میں عجیب سی چمک اور خمار تھا۔ وہ کھڑی تھی مگر ساکت نہیں تھی عجیب طرح سے بل کھا رہی تھی اور اپنے جسم کو بے باکانہ انداز میں حرکت دے رہی تھی۔ ابتدائی چند لمحے کے بعد میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا اور اپنی لوچدار آواز میں بولی۔ ”میری طرف کیوں نہیں دیکھ رہے، کیا میں اچھی نہیں لگ رہی؟“

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھوں مگر میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو پھر اس کے سحر میں آجاؤں گا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”تم بے لباس ہو میں تمہاری طرف نہیں دیکھ سکتا۔“

وہ چلتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔ میرے لیے بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا کہ اس کی طرف دیکھنے سے خود کو روکوں۔ اس کے نزدیک آنے سے خوشبوؤں کے ساتھ گرمی کی لپیٹ بھی آ رہی تھی۔ میں اس مشکل سے نکلنا چاہتا تھا اور کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں سر جھکائے کھڑا تھا وہ میرے نزدیک آئی اور اس نے پھر کہا۔ ”میری طرف دیکھو۔“

پتا نہیں میں نے کیوں سر نہیں اٹھایا۔ شاید اللہ کو بچانا مقصود تھا۔ اس نے کہا۔ ”چپ کیوں ہو کچھ تو کہو۔“

اور تب میرے اندر سے کسی نے کہا۔ ”لا الہٰ الا اللہ۔“

اور میں نے زبان سے بے ساختہ یہی پاک کلمہ دھرا دیا۔ ادھر میری زبان سے یہ اقرار نکلا اور ادھر وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی تھی۔ ایک لمحے سے بھی پہلے خوشبو اور گرمی غائب ہو گئی۔ وہاں موجود روشنی بجھ گئی تھی اور تاریکی میں ایک ہیولہ سا نظر آنے لگا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ”چپ کرو مت کہو۔“

مگر میں نے پھر کہا۔ ”لا الہٰ الا اللہ۔“

ایک بگولہ سا میرے پاس سے گزرا اور چھت کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی میں جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا۔ میں اندر کی طرف بھاگا اور دروازہ بند کرتے کرتے بھی کلمہ پڑھتا رہا۔ میں کمرے میں گھسا اور دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔ اوپر ایسا لگ رہا تھا جیسے طوفان آیا ہو شور بے پناہ تھا۔ کوئی چھت پر بھاری چیزوں کو گھسیٹتا پھر رہا تھا۔ میں اپنے بستر میں دبکا ہوا مسلسل لا الہٰ الا اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ یہ بہت طویل اور نہ گزرنے والی رات تھی۔ میں لفظوں میں نہیں بیان کر سکتا تھا کہ میں نے یہ رات کس طرح گزاری۔ بے شک بچانے والی ذات اللہ کی ہے اور اسی نے مجھے اس رات جسمانی اور ایمانی طور پر بچایا تھا۔ صبح ہوئی اور مؤذن نے اللہ کی کبریائی بیان کی تو میری زبان رکی تھی اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا پیاسا تھا۔ مگر اذان کے احترام اور شکرانے میں، میں دم سادھ کر بیٹھا رہا۔

جیسے ہی اذان کی آواز آئی اوپر بھی سکون ہو گیا تھا۔ اذان ختم ہوئی تو میں نے اٹھ کر پانی پیا اور وضو کر کے مسجد کے لیے روانہ ہوا۔ میں نے بہت عرصے بعد فجر کی نماز مسجد میں پڑھی تھی۔ میں نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اس سے التجا کی مجھے اس آزمائش سے بچائے۔ میں اس کا کمزور بندہ ہوں اور ایسی آزمائش سے ہر بار نہیں گزر سکتا۔ اوپر والے نے اپنے بندے کی کمزوری کی لاج رکھ لی۔ اسی دن مجھے دفتر کے ایک ساتھی نے پیشکش کی کہ اس کے بھائی کا فلیٹ خالی ہے۔ بھائی فیملی سمیت دبئی شفٹ ہو گیا تھا اور تین چار سال سے پہلے اس کی واپسی کا امکان نہیں تھا۔ اس نے سارا سامان ایک کمرے میں کر دیا تھا اور باقی فلیٹ وہ کسی با اعتماد فرد کو کرائے پر دینا چاہتا تھا۔

مقصد کرائے سے زیادہ اپنے سامان کی حفاظت تھی۔ فلیٹ بہت اچھا اور بہت اچھے علاقے میں تھا۔ ہمیں ایک بیڈروم، ایک لاؤنج اور ایک ڈرائنگ روم ملا تھا۔ میں نے اسی دن جا کر فلیٹ دیکھا۔ مجھے پسند آیا۔ کرایہ بھی مناسب تھا۔ میں نے اسی وقت بات کر کے اپنے کولیگ سے چابی لے لی۔ وہ مجھے جانتا تھا اور اعتماد کرتا تھا اس لیے اس نے زبان پر بھروسا کر کے مجھے چابی دے دی۔ میں نے احتشام صاحب کو کال کر کے بتایا کہ مجھے دوسرا مکان مل گیا ہے اور میں کل ہی ان کا مکان خالی کر دوں گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں چابیاں دی جاؤں اور ان سے ایڈوانس کی رقم لے لوں۔ میں نے دوسرے دن کی چھٹی لی اور اپنا سامان منتقل کیا۔ میں ایک مزدور بھی لے آیا تھا تاکہ وہ میرے ساتھ سامان اٹھواتا رہے۔ جب میں آخری چیز اٹھا کر باہر نکل رہا تھا تو پھر وہی خوشبو محسوس ہوئی اور سرگوشی نے کہا۔

”جا رہے ہو؟“

”ہاں کبھی نہ آنے کے لیے۔“ میں نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔